جدید دنیائے اسلام

مصنفہ

ڈاکٹر لوتھراپ سٹاڈرڈ

(اے ۔ ایم ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی)

مترجمہ

محمد جمیل الدین (بدایونی)

بی اے (علیگ) ڈپٹی کلکٹر

[illegible] پروپرائٹر

عثمانی پریس بدایوں میں طبع ہوئی

بار اول ۔۔ [illegible] جلد

میں اپنی اس ناچیز خدمت کو مخدومی محترمی مولوی سید
محفوظ علی صاحب بی۔ اے (علیگ) کے اسم گرامی سے معنون کرتا ہوں
جن کے جذبات اسلامی اور خصوصیات علمی و ادبی اظہر من الشمس ہیں اور
انھیں کی ترغیب و مشورت اس جسارت کا سبب ہوئی ہے

دل ما دگر ز رحمِ از ہیچ میرزی خجل است
التفات منشئے گرمیِ بازار دل است

محمد [illegible] الدین

سے معلوم کرکے ایسے صحیح نتائج پر پہونچنا اس شخص کی اعلیٰ قابلیت اور خداداد ذہانت کی دلیل ہی۔ علاوہ ازیں اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہوکہ یورپی اقوام نے علوم میں کس درجہ ترقی کی ہو اور ان کی تحریرات ہر رطب و یابس اور کلیات وجزئیات پر کسی مبسوط اور مدلل ہوتی ہیں کہ محض ان کے مطالعہ سے ایک ذی فہم ایسی معلومات حاصل کرسکتا ہی جس سے ہم صاحب البیت ہونے پر بھی بخوبی واقف نہیں ہیں۔

اس کتاب میں مصنف نے یہ کوشش کی ہو کہ ارتقائے اسلامی کی دو دلچسپ اور عجیب کہانی اوس کے مختلف یعنی معاشرتی، مذہبی، تمدنی، سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں سے بیان کریں۔ مصنف نے کتاب کو دیباچہ، مقدمہ، نو فصلوں، اور خاتمہ پر تقسیم کیا ہی۔ دیباچہ میں صرف اسلامی دنیا کے موجودہ ہیجان کا ذکر کرکے اپنے موضوع کتاب کو مجملاً بیان کیا ہی۔ مقدمہ میں اسلامی قوت کے عروج وزوال پر بحث کی ہی۔ اور اُس میں یہ دکھایا ہو کہ عربوں نے استحکام قوت کے ساتھ ہی یونانی وعجمی تمدنی سے پورا نفع اُٹھاکر اپنی عالی ظرفی اور وسیع الخیالی کا ثبوت دیا۔ اور ایک جدید تمدن یعنی تمدنِ عرب کی تعمیر کی مصنف نے قدیم یونانی اور عجمی روایات کے اعادہ و نزوال سبب بتایا ہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خالص نژاد یعنی فتح العرب سلطنت سے جدا ہوکر بادیہ نشینی کی طرف عود کرگئے اور مولد العرب قدامت پسندی اور مطلق العنانی کی روایات میں مبتلا ہوگئے اس درماندہ اسلامی دنیا کو انیسویں صدی کی یورپ سے مقابلہ کرنا پڑا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی ممالک یکے بعد دیگرے مغربی حملوں کی نذر ہوگئے اور جنگ عظیم میں عمل تسخیر اپنے اوج کمال پر پہونچ گیا۔ فصل اول میں اسلامی نشأۃ ثانیہ کا ذکر ہی اور مصنف نے یہ دکھایا ہی جس کے متعلق میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں تک حق بجانب ہو کہ اس کی ابتدا محمد بن عبدالوہاب نجدی کے مساعی سے ہوئی۔ اس وہابی تحریک کا مقصد اسلام کو بدعات مابعد سے پاک و صاف کرنا اور اسلامی سلطنت کو بیدار کرنا تھا یہ تحریک اگرچہ سیاسی طور پر ناکامیاب

تمہید

مترس از انقلاب فتنہ خیزے ٭ کلیدش زندگی را در کشاید
زمیں را لرزہ از صد جا شگافد ٭ ہزاراں چشمۂ نو بر کشاید

(سر محمد اقبال)

اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ امریکہ کے ماہر سیاسیات ہیں۔ ان کی عمر چالیس سال کی ہے۔ ۱۹۰۵ء میں قانونی ڈگری ہارورڈ یونیورسٹی سے حاصل کی خیال تھا کہ سفر یورپ کے بعد وہ مستقل طور سے وکالت شروع کریں گے لیکن ۱۹۰۸ء میں جب وہ فرانس میں موجود تھے تو یورپ کے سیاسی مطلع کا تکدر دیکھ کر انھیں شوق ہوا کہ سیاسیات میں استعداد پیدا کر کے اپنے وطن اور قوم کی خدمت بجا لائیں۔ چنانچہ امریکہ واپس آکر یونیورسٹی مذکور میں سیاسیات کے مطالع میں مصروف ہو گئے۔ اور ۱۹۱۴ء سے متواتر بالکل وقت سیاسی تقریروں اور تحریروں میں صرف کر کے ایک پبلسٹ کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اس وقت تک متعدد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر موصوف کی تصانیف پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص ایشیا کے سفر نہ کرنے پر بھی ممالک ایشیا کے متعلق ایسی جامع اور بسیط معلومات رکھ سکتا اور واقعات کا صحیح اندازہ کرنے پر قادر ہو سکتا ہے۔ اسلامی اقوام کا حال محض کتابوں اور رسالوں

اہالیان یورپ و امریکہ کے سامنے اسلامی دنیا کی تحریکات عظیم کی صحیح اور غیر جانبدارانہ تشریح پیش کریں۔ بلاشبہ مصنف نے اس اظہار حال میں نہایت صاف بیانی اور حق گوئی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ لارڈ میسٹن کا جو مضمون سنڈے ٹائمس میں شائع ہوا تھا اُس کا اقتباس ۱۲ ر نومبر ۱۹۲۱ء کے ہمدم میں شائع ہوا ہے لارڈ موصوف نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اہل برطانیہ کو اس کتاب سے سبق لینا چاہیے۔ اور اپنی مسلمان رعایا کے خیالات کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

اس کتاب کے دو پہلو ہیں۔ اولاً دول یورپ کو مطلع اور متنبہ کرنا ہے جیسا کہ لارڈ موصوف نے نتیجہ نکالا۔ مجھ کو اس پہلو سے کوئی سروکار نہیں۔ دوسرا پہلو خود ایشیائی اقوام سے تعلق رکھتا ہے مصنف نے مشرقی اقوام کے میدان عمل میں سرگرمیاں اور کامیابیاں دکھا کر نہایت واضح طور پر ترقی کن اصلاحی عمل اور قلتہ انگیزی کے امتیازات کی توضیح کی ہے اور میری منشا اس ترجمہ کے پیش کرنے سے یہ ہے کہ میرے ابنائے وطن اس آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ فرمائیں۔ مصنف کے مشورہ پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور جہاں تک ممکن و مناسب ہو اُس پر عمل کریں۔

ہندوستان آج حکومت برطانیہ کے تابع فرمان ہے اور اپنی آزادی کے مساعی میں [illegible] ہو چکا ہے کہ ان کے ... ہندوستانی نصب العین کو تسلیم کرکے ریفارم اسکیم عطا کی ہے۔ میں اس متنازعہ مسئلہ میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ان اصلاحات سے ہندوستانیوں کو حکومت میں حقیقی اقتدار کسی حد تک حاصل ہوا یا نہیں۔ لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان اصلاحات نے انتخاب کنندگان اور نمائندگان دونوں کے لیے جدید ذمہ داریاں پیدا کر دی ہیں اس سے قبل حکومت میں ہمارا ہاتھ نہ تھا اور ہمارے لیڈروں کی مساعی محض طلب حقوق اور ملازمت کو اس کی غلطیوں کے انتباہ پر منحصر تھیں۔

اب حالت جداگانہ ہے۔ ہم پر خود ذمہ داریاں عائد ہو گئیں اور یہ ذمہ داریاں ہماری توجہ کی ایسی طالب ہیں کہ حقوق کے سوال کو پس پشت ڈالنا پڑے گا۔ ہم کو ان ذمہ داریوں کا احساس پیدا کر کے اپنے ابنائے وطن کی جہالت کا استیصال کرنا ہے جو ہماری

رہی اور مذہبی تجدید میں بھی تنگ خیالی کی ملزم ٹھہرائی گئی لیکن اس نے اسلامی اقوام کو بیدار ضرور کر دیا اور مسلمانوں میں بطور خود اصلاحی تحریک شروع ہوگئی جسے مغربی خیالات کی رو سے مزید تقویت پہونچی۔ فصل دوئم میں اتحاد بین الاسلامی کی ابتداء اور ترقی کا حال لکھا ہے جس کے بانی سید جمال الدین الافغانی ہیں اس تحریک کا منشاء و مقصد مسلمانوں کا اقتصادی اور سیاسی اتحاد و استحکام ہے فصل سوئم میں مصنف نے یہ بتایا کہ اسلامی اقوام پر مغربی اثرات کا کیا نتیجہ ہوا اور وہ کس طرح جادہ پیمائے ترقی ہوئیں فصل چہارم میں سیاسی انقلاب کا ذکر ہے اس سلسلہ میں دکھایا گیا ہے کہ اسلام میں قرون اولیٰ کے بعد جو شخصی اور استبدادی حکومتیں قایم ہوئیں اُس سے اسلامی اقوام قعر مذلت میں گر گئیں۔ اور مغربی حملوں اور اندرونی اصلاحی تحریکات سے بیدار ہوکر اسلامی اقوام اب دستوری نظامات اور اصلاحات کے قیام و بقا کے لیے بیتاب ہیں فصل پنجم میں تمام اسلامی اقوام میں قوم پرستی کی تحریکات کے نشو و نما کا ذکر ہے فصل ششم فصل ماسبق کا جزو ہے اور ہندوستان کی تحریک قوم پرستی سے تعلق رکھتی ہے چونکہ اس تحریک کے بانی اہل ہنود ہیں لہذا مصنف نے اس پر جداگانہ بحث کی ہے فصل ہفتم و ہشتم میں مصنف نے اقتصادی اور معاشرتی انقلابات پر بحث کی ہے فصل نہم میں معاشرتی بے چینی کے اسباب اور بالشویک تحریک کا ذکر کیا ہے اس کے بعد خاتمہ ہے جس میں مصنف اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ [illegible] مشرق متحرک اور کامل طور پر متحرک ہوگیا...... دنیائے اسلام جو ایک ہزار سال تک جمود سکون کی حالت میں رہی اب پھر ایک مرتبہ سرگرم تگاپو نظر آتی ہے" لیکن مصنف اس اسلامی جدوجہد کا نتیجہ بتانے کی جرات نہیں کرتا۔ بلکہ صرف یہ امید ظاہر کرتا ہے کہ موجودہ تکلیف جو عظیم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مبہم بھی ہے اس نوزائندہ مشرق کا درد زہ ہی ثابت ہوگی جو نئی دنیا میں عنقریب اپنا مقام اور وقار حاصل کرنے والا ہے"

مصنف نے اپنے خط میں اس کتاب کی علت غائی یہ تحریر کی ہے کہ وہ

خیال کرنے میں حق بجانب بھی ہوتی ہو کیونکہ رہنمایان قوم مطالبہ دستوریت کے استدلال میں موجودہ طرز حکومت پر بعض وقت ایسی ایسی نکتہ چینیاں کرتے ہیں جن سے عوام میں حکومت موجودہ سے تنفر پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہو خطرہ ہوتا ہو کہ کہیں انقلاب تک منجر نہ ہو۔ لیکن ملک کی اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالت ہنوز کسی انقلاب کی متحمل نہیں ہو۔ ہم کو امن وامان کے ساتھ بہت سی سیاسی تعلیم لینے اور بہت سی معاشرتی اصلاحیں اور اقتصادی ترقیاں کرنی ہیں۔

میں موجودہ حکومت پر کوئی مخالف یا موافق تنقید کرنہیں سکتا اول الذکر اس وجہ سے نہیں کہ یہ امر بحیثیت ملازمت حکومت میری حالت کے موزوں نہیں ثانی الذکر اس لیے نہیں کہ ملک کے مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ محض خوشامد و چاپلوسی پر محمول سمجھی جائے گی۔ لیکن میں ایک بات کہنے کی جرات کرسکتا ہوں جس سے شاید کسی کو اختلاف نہ ہوگا وہ یہ کہ موجودہ گورنمنٹ "خواہ ہماری فلاح وبہبودی کا باعث ہوئی" یا "اس کی بدولت ہم غلاموں کی نسل بن گئے" ایک بات میں ضرور کامیاب ہوئی کہ اوس نے ملک میں امن قایم کردیا۔

یہ وقت نہایت موزوں ہو کہ ہم اپنی حالت درست کرکے اپنی توقعات کو حاصل کریں اور اپنی سیاسی جدوجہد میں ان تمام فتن سے دور رہیں جن سے اس تخریبی دَور کا اعادہ ہو جو انقلاب فرانس کے بعد رونما ہوا تھا۔

مجھے افسوس ہو کہ اس ترجمہ کا اعلان نومبر ۲۲؁ ۱۹ء میں کیا گیا تھا اور فی الحقیقت یہ تیار بھی تھا۔ لیکن ۲۳ ر دسمبر ۲۲؁ ۱۹ء کو جب میں مکمل کتاب پریس میں دینے کے لیئے جارہا تھا۔ رامپور اور بریلی کے درمیان میرے اسباب کے ساتھ کل مسودہ ضایع ہوگیا اور چونکہ میری رخصت ختم ہوچکی تھی لہذا مجھے کارمنصبی کی بجاآوری سے کافی فرصت نہ ملی جو اس کام کو ازسرنو بعجلت ختم کرسکتا۔ اب کامل ایک سال کی تاخیر و تعویق کے بعد

بدبختی کا سبب اصلی ہو۔ اس سے میری مراد مروجہ تعلیم یعنی صرف و نحو جغرافیہ و حساب و تاریخ و ہندسہ سے ناواقفیت نہیں ہو۔ بلکہ میرا منشا یہ ہو کہ نوجوانان ملک میں خود اعتمادی، استقلال فکر، وطن پرستی اور آزادی کے جذبات پیدا کیے جائیں۔ سب سے ضروری امر یہ ہو کہ طلبۃ الاولیٰ کو بیدار کیا جائے اور اُن کے ذہن نشین کیا جائے کہ مذہبی نفاق و نفاق اور فرقہ بندی سے پرہیز کریں کیونکہ دستوریہ اور آزادی ملک محض مختلف فرقوں اور مذہبوں کے مناقشات کی وجہ سے معرض التوا میں ہیں۔ ان امور کے حصول کے لیے لازمی ہو کر جاہلانہ جنسی تعصبات کو دور کرکے کل اقوام ہند مادر وطن کی جامعیت کے پرچم کے زیر سایہ جمع ہو جائیں۔ ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ پر اور ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ پر ترجیح دینا ایک ظلم ہو جس کے ہوتے ہوئے ملک میں امن و امان ناممکن ہو۔ اس ظلم کے مٹانے کی یہی صورت ہو کہ کل قوم و طبقات متحد ہو کر پرستار وطن بنیں۔

اس تعلیم کا شروع محض روزانہ زندگی کے عمل ہی میں ہوسکتا ہو اور اصلاحی اسکیم کی کم از کم یہ برکت مسلمہ ہو کہ تعلیم یافتہ طبقہ انتخابات کے موقع پر اپنے طرز عمل اور روش سے عام رائے دہندوں کو یہ تعلیم دے سکتا ہو کہ وہ حق انتخاب کی ذمہ داری کو محسوس کریں اور انتخاب میں مقامی، قرابتی، مذہبی، ذاتی تعلقات کو بالائے طاق رکھ کر ایسے نمائندے منتخب کریں جو فی الحقیقت ایمانداری سے حق نمائندگی ادا کریں اور اپنے انتخاب کو حصول اعزاز و ثروت کا ذریعہ نہ بنائیں۔

اس دور میں معاشرتی اور اقتصادی انقلابات کی بدولت ہر طرف اضطراب و سراسیمگی کے آثار رونما ہیں۔ اس اضطراب و سراسیمگی میں سیاسی جدوجہد خیالات میں اور خلفشار پیدا کر رہی ہو۔ ہندوستان کی حالت اس بارے میں غیر معمولی طور پر عجیب ہو۔ یہاں چونکہ حکومت غیر ملکی ہو لہذا جذبات حریت کی عام اشاعت اور حصول جمہوریت کی جائز کوشش باغیانہ و مفسدانہ خیال کی جاسکتی ہو۔ بعض حالات میں گورنمنٹ ایسا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

دنیائے اسلام آج سخت ہیجان کے عالم میں ہے۔ مراکش سے لیکر
چین اور ترکستان سے لیکر کانگو تک پچیس کروڑ پیروان اسلام جدید خیالات جدید جذبات
اور جدید توقعات سے بیدار ہو رہے ہیں۔ ان میں ایک عظیم انقلاب ... ...
کل نوع انسان پر پڑ کر رہے گا۔

اس انقلاب کو اگرچہ جنگ گزشتہ سے بہت زیادہ ترقی ہو گئی ہے
لیکن اس کی ابتدا بہت پہلے سے ہو گئی تھی۔ ایک صدی سے زیادہ ہوا کہ اس کا بیج
بویا گیا۔ اور اس وقت سے برابر نشو و نما ہوتا رہا۔ ابتداً اس تحریک کا نمو آہستہ اور
پنہاں ہوا۔ اور آج اس عظیم ہنگامہ رستخیز کے بعد یہ تحریک دفعتاً اور تعجب انگیز طور پر
اپنے شباب کو پہنچ گئی۔

اس کتاب میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ میں اس دلچسپ اور
عجیب ارتقا کی کہانی اس کے مختلف جوانب یعنی معاشرتی، مذہبی، تمدنی، سیاسی اور
اقتصادی پہلوؤں کے لحاظ سے بیان کروں۔ میرا نصب العین یہ ہے کہ ان مناظر کی
ابتدا اور نشو و نما کی تصویر کھینچوں تاکہ ان کی نوعیت کے اجزا ترکیبی اور ان کے قوائے
عملیہ کا صحیح اندازہ ہو جائے۔ میں نے اس میں مرز بوم کے اختلافات کا پورا لحاظ رکھا ہے
اور مختلف تحریکات کے نتائج متقاربہ اور اصول متحدہ کو ہمیشہ مدنظر رکھا ہے۔

اگرچہ اس کتاب کا اصل بحث دنیائے اسلام ہے لیکن اس میں

اس کی اشاعت ہو رہی ہے۔ والامر بید اللہ تعالےٰ

میں اس موقع پر برادر معظم مولوی محمد سلیمان صاحب، مولوی محمد یحییٰ صاحب۔ ایم۔ اے۔ وکیل۔ مولوی فضل علی صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی اور مولوی غلام یوسف صاحب عزیز کا مشکور ہوں جنھوں نے کاپیوں کی صحت اور پروف کے مطالعہ میں مجھے پوری مدد دی۔

آخر میں ناظرین کرام سے درخواست ہے کہ اگر اس کتاب میں کوئی ابہام یا فروگذاشت ہو تو اُسے میری بے بضاعتی پر محمول کریں۔

"محمد جمیل الدین"

قاضی ٹولہ۔ بدایوں

۱۱ نومبر ۱۹۲۳ء

قدیم اسلامی دنیا کا انحطاط اور زوال

تاریخ انسانی کا غالباً سب سے تعجب انگیز واقعہ اسلام کا عروج ہے۔
س کی ابتدا ایسی سرزمین اور قوم سے ہوئی جو اولاً کسی شمار میں نہ تھی۔ اسلام ایک ہی
مدی میں نصف کرۂ زمین پر پھیل گیا۔ اس نے بڑی بڑی سلطنتوں اور مدتوں کے مستقل
ہبوں کو تہ و بالا کر کے نفوس اقوام کو نئی ترکیب دی۔ اور ایک مکمل جدید دنیا یعنی دنیا ء اسلام
ا تعمیر کی۔

اس ترقی پر جس قدر غور کیا جاتا ہے اسی قدر یہ زیادہ عجیب معلوم
ی ہے۔ دوسرے بڑے مذاہب کو کامیابی آہستہ آہستہ اور بہت کشمکش کے بعد
مل ہوئی۔ اور آخر کار کسی زبردست بادشاہ کی امداد سے جو خود اس مذہب کا
ہو گیا ہو ان کا عروج ہوا۔ مسیحی مذہب کے لیے قسطنطین[1]، بودھ کے لیے

قسطنطین۔ اس کا نام فلیویس دیلیریس اوریلیس کانسٹینٹیئس الملقب بہ قسطنطین اعظم ہے۔ ۲۷ فروری ۲۷۴ء
ام نسا پیدا ہوا۔ اوائل میں یہ مشرق میں ڈیوکلیشین کے دربار میں رہا۔ جب اس کا باپ قیصر روما منتخب ہوا
کو مغربی حصہ سلطنت یعنی اسپین و فرانس و برطانیہ دیا گیا تو اس نے قسطنطین کو اپنے پاس بلا لیا۔ یہ
کے بندرگاہ بولانی پر اپنے باپ سے ملا۔ اور انہیں کے ساتھ انگلستان گیا۔ ۲۵ جولائی ۳۰۶ء
اس کا باپ مرا تو یہ اس کا جانشین ہوا۔ اس نے عیسائیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔ اور گلیریس
نہ احکام کی پروا نہ کی۔ اس زمانے میں رومۃ الکبریٰ کا نظام قیاصرہ دا غسطوس ایسا غلط اور ناقابل

ہندوستان کے غیر مسلم ہندو عنصر کا ذکر بھی لازمی ہے۔ اس طریقے پر یہ کتاب کُل بلاد مشرقی ادنے و وسطی سے تعلق رکھتی ہے۔ مشرق اقصے پر براہ راست کوئی تبصرہ نہیں ہے۔ لیکن وہاں کے بھی متوازی واقعات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اور یہ امور ہمیشہ پیش نظر رہنے چاہئیں۔

"مصنف"

ہنیں کی۔ اس کا آغاز ایک ریگستانی ملک میں ہوا جس میں آبادی بہت کم اور اس کے باشندے خانہ بدوش اور گزشتہ تاریخ عالم میں غیر معروف تھے۔ اسلام جب اس عظیم

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴) اور اس کی تبلیغ کے لیے ہر طرح کی کوشش کی۔ اصل ارکان مذہب تمام ملک میں مناروں پر کندہ کرا دیے اور اس امر کے لیے محتسب مقرر کیے کہ عوام ان اصولوں کی پابندی کریں۔ علاوہ بریں اس نے ایشیا افریقہ اور یورپ میں مبلغین روانہ کیے۔ یہ ۲۴۲ ق۔م میں تھا۔ بودھ مذہب کے اصولوں کے منضبط کرنے کے واسطے اس نے ایک مجلس شوریٰ ۲۵۰ ق۔م میں منعقد کی۔ مترجم

۵۲ کیخسرو۔ شاہنامہ اور نیز مرزا فرصت شیرازی کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زردشت کا ظہور سلطنت گشتاسپ کے چوتھے سال میں ہوا۔ گشتاسپ کا دوسرا نام ولیستپا ہے اور یونانی میں اس کو ہستاسپ کہتے ہیں۔ ان دونوں مصنفین کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ گشتاسپ اور اس کے لڑکے اسفندیار نے مذہب زردشت کی ترویج میں سعی بلیغ کی۔ مصنف نے جو کیخسرو کو لکھا ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ فردوسی نے جو کیانی بادشاہوں کے نام دئے ہیں ان کی مطابقت ان ناموں سے بمشکل ہوتی ہے جو تاریخ یونان میں ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں مرزا صاحب موصوف نے جو کتبات آثار قدیمہ سے نقل کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے کوئی صحیح سلسلہ نسب نہیں دیا ہے اور نہ سلاطین کی فہرست مکمل ہے۔ ایک کتبہ میں گشتاسپ نے اپنے آپ کو پسر دارا لکھا ہے۔ لیکن شاہنامہ میں گشتاسپ پسر لہراسپ درج ہے۔ اس لہراسپ کا دوسرا نام کامبیز یعنی کیکاؤس اور یونانی میں (کمبائسس) ہے۔ غالباً انھیں غلطیوں کی وجہ سے مصنف نے ان حامیان دین زردشت میں سے کسی کو کیخسرو لکھ دیا ہے۔ مرزا فرصت نے چند سلاطین کے ناموں کی مطابقت کی ہے۔ اس کو ناظرین کی معلومات کے لیے لکھا جاتا ہے "کورش" یعنی کیخسرو (سائرس) کیکاؤس (کمبائسس) کا لڑکا ہے۔ اور پانسو انسٹھ سال قبل مسیح حکمراں تھا۔ تیس سال حکومت کی (کامبیز) کیکاؤس پسر کیخسرو کو لہراسپ بھی کہتے ہیں۔ وہ ۵۲۹ ق۔م حکمراں تھا (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ)

اشوک[1]، اور زرتشتیوں کے لیے کیخسرو ایسے سلاطین تھے جنہوں نے اپنے اختیار کردہ عقائد کو اپنی دنیوی عظیم قوت سے امداد دی۔ بخلاف اس کے اسلام نے اس طرح تمدنی

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳) عمل تھا کہ گلیریس کے خلاف بغاوت ہونے پر چھ مختلف دعویداران سلطنت پیدا ہوگئے نتیجہ یہ ہوا کہ طوائف الملوکی اور بدنظمی پھیل گئی۔ اور قسطنطین نے موقعہ سے پورا فائدہ اٹھا کر اپنے رقیبوں کو یکے بعد دیگرے مغلوب کر لیا کہا جاتا ہے کہ انہیں لڑائیوں کے دوران میں اس نے دوپہر کے وقت آسمان میں ایک نورانی صلیب دیکھی جس پر "اس کی مدد سے فتح ہے" لکھا ہوا تھا۔ اسی واقعہ سے اس نے باطل پرستی کو چھوڑ کر دین مسیحی اختیار کیا۔ ۳۲۳ء میں وہ مشرقی و مغربی دونوں رومی سلطنتوں کا تنہا حکمراں ہو گیا۔ مورخین اس کے مسئلہ پر مختلف الرائے ہیں کہ وہ درحقیقت اس معجزہ اور خواب دیکھنے کی وجہ سے عیسائی ہوا یا محض سیاسی اغراض کے لیے۔ لیکن اس نے اشاعت دین مسیحی کے لیے جو نمایاں کام کیے وہ قابل ذکر ہیں۔ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس نے جلسہ مشورتی بمقام نیسیا (نیقیا) منعقد کیا۔ اور اس جلسہ کا خود صدر رہا۔ اس مجلس کے بعد اور نیز اس سے قبل اس نے یہ بھی کوشش کی کہ حضرت مسیح کی الوہیت کے منکرین اور راسخ الاعتقاد مسیحیوں کو ایک ہی کلیسا کے متبع کر دیے۔ علاوہ ازیں اس کے ایسے وعظ بھی موجود ہیں جس میں اس نے باطل پرستی کا رد کیا اور نئے مذہب کا اثبات اور اس پر استدلال کیا ہے۔ اس کے شغف کے بہترین شہادت یورپ کا مورخین کے حسب ذیل اقتباس سے ملتی ہے:-

"مسیحیت کی بابت تاریخی اہمیت اس میں نہیں ہے کہ وہ بذات خود عیسائی ہو گیا۔ بلکہ اس نے بحیثیت ایک مدبر کے وہ طرز عمل اختیار کیا کہ نئے مذہب کو پہلی مرتبہ ایسا دنیوی اقتدار مل گیا جس کی بدولت یہ سب سے مستحکم معاشرتی اور سیاسی نظام ہو گیا۔ اور اس نے نوع انسان کی قسمتوں پر بڑا اثر ڈالا" مترجم

[1] اشوک۔ اول شہنشاہ ہند چندر گپت کا پوتا اور بندوسار کا لڑکا ہے۔ یہ اپنے باپ کی وفات کے وقت اوجین کا صوبہ دار تھا۔ تخت نشینی ہونے پر اس نے بدھ مذہب اختیار کیا (بقیہ نوٹ بصفحہ آئندہ)

کے لیے نمایاں طور پر متلاشی تھیں۔ بنی اکرم صلعم[۱۵] سے قبل کئی پشتوں سے ملک عرب میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی تھی قوم عرب اپنی موروثی بُت پرستی سے تجاوز کر کے طبعًا برتر امور کی متمنی ہو چلی تھی۔ اس دماغی اور روحانی ہیجان میں دعوت اسلام نے نفیر صور کا کام کیا۔ بنی اکرم صلعم خالص عرب اور اپنی قومی روح کا مکمل مجسمہ تھے۔ انہوں نے ایک سادہ اور زبردست وحدانیت کی تلقین کی۔ جس میں نہ بت پرستی تھی اور نہ دینیات کے پیچیدہ مسائل۔ انھوں نے سامی قلوب کے اُس سرچشمہ کو کھول دیا جو ہمیشہ سے مذہبی جوش سے لبریز تھا۔ عرب قوم جو اپنے جوش کو ابتک خانہ جنگیوں میں صرف کرتی تھی اب اپنی دیرینہ رقابتوں اور خوں ریز جنگ و جدال کو یک قلم بھول گئی۔ اور اپنے نئے مذہب کی روشنی میں متحد ہو گئی۔ اور ریگستانوں سے اپنے حنیفی اور واحد خدا کے واسطے دنیا کے فتح کرنے کو چل کھڑی ہوئی۔

اس طور پر اسلام تُند باد صرصر کی طرح سرزمین عرب سے برآمد ہو کر اُن

---

[۱۵] مصنف کا یہ فقرہ کہ "محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے قبل کئی پشتوں سے ملک عرب میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی تھی .... نفیر صور کا کام کیا محض مسیحی پادریوں کا اتباع ہے۔ اس مسئلہ پر کافی بحث ہو چکی ہے اور مجھکو اُن دلائل کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ مغربی مصنفین خود اس سے واقف ہیں کہ مسیحی پادریوں نے اس قسم کے فقرے محض اس لیے تراش لیے تھے کہ بعثت اعظم کی اہمیت اور مافوق العادت عظمت کو گھٹا دیں۔ چونکہ اس ظہور اعظم کی خوبیوں سے انکار تو دن کو رات اور سفید کو کالا بتانا تھا۔ لہذا اس پر ایسے فقرے چُست کئے جس سے کم از کم عوام میں تذبذب پیدا ہو جائے۔ اور اس دین فطرت کے علم اور موید من اللہ ہونے کا عقیدہ کمزور ہو جائے لیکن واقعات اور نیز مسیحی مورخین کو بھی مصنف کی رائے سے اختلاف ہے۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا جلد نمبر ۱۶ مطبوعہ ۱۸۸۳ء صفحہ ۵۴۵ پر تحریر ہے۔ "رسول خدا صلعم کی پیدائش اور جوانی کے زمانہ میں یہ خیال میں (بقیہ نوٹ بصفحہ آئندہ)

پرسوار ہوا تو اس کے معاونین کی تعداد بہت قلیل تھی اور بہت بڑی مادی طاقتوں سے مقابلہ تھا۔ لیکن اُس نے ایسی آسانی سے فتح پائی جو سراسر اعجاز تھی۔ اور دو ہی نسلوں میں چمکتے ہوئے ہلال نے پیرینیز سے لیکر کوہ ہمالیہ تک اور صحرائے ایشیاء متوسط سے لیکر صحرائے افریقہ متوسط تک فتح حاصل کی۔

اس عجیب و غریب فتح کے متعدد وجوہ تھے۔ اور ان میں خاص اسباب عربوں کے خصائل، نبی اکرم (صلے اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم کی نوعیت اور ہمعصر مشرقی دنیا، کی عام حالت تھی۔ اگرچہ اس وقت تک عرب بالکل غیر معروف رہے تھے۔ لیکن یہ لوگ اُن غیر معمولی قابلیتوں کے اہل تھے جو اس وقت خودسازی

(بقیہ نوٹ صفحہ ۸) اور سات سال شاہی کی۔ ڈاریوس کا نام دارائے اکبر ہے اور ۵۲۱ ق م۔ میں حکمران تھا اور ۳۶ سال سلطنت کی۔ زرکزس اسفندیار کا نام ہے اس کے باپ کا نام دارا ہے ۴۸۵ قبل مسیح میں حکمران تھا اور ۲۰ سال شاہی کی۔ ارٹکسرکزس کا نام اردشیر اور بہمن ہے وہ ۴۶۵ ق۔ م۔ میں تخت نشین ہوا اور ۴۰ سال سلطنت کی۔

ڈاریوس دوم ۴۲۴ قبل مسیح میں تخت نشین ہوا اور ۱۹ سال سلطنت کی۔ اردشیر دوم ۴۰۵ قبل مسیح میں تخت نشین ہوا اور ۴۶ سال سلطنت کی۔

اردشیر سوم ۳۶۱ قبل مسیح میں تخت نشین ہوا اور پانچ سال سلطنت کی اس کا دوسرا نام اوکس بھی ہے۔ داریوس سوم جس کو دارا بعد بہن کو دماں بھی کہتے ہیں ۳۳۶ قبل مسیح میں تخت نشین ہوا اور اس کو اسکندر رومی نے مغلوب کیا۔ مترجم

ان سلطنتوں کی اصلی زندگی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ ان کے مذاہب بالکل مضحکہ خیز مذہب تھے۔ ایران کا موروثی زرتشتی مذہب مسخ ہو کر مجوسیت کی شکل میں نمودار ہو چکا تھا۔ اس کے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۸) ہوتی تھی۔ بعض وقت زیادہ گہری موجوں میں یہودیت کا اثر نمودار ہوتا تھا۔ مگر اصلی بُت پرستی اور توہم پرستی کی موجیں نہایت بلند تھیں"۔ دوسری جگہ پر میور نے لکھا ہے۔

"آنحضرت صلعم کی بعثت سے پہلے عرب کی حالت مذہبی تبدیلی کے قبول کرنے سے ایسی ہی دور تھی جیسے باہمی اتفاق اور اتحاد پیدا کرنے سے دور تھی۔ عربوں کے مذہب کی بنیاد ایسی سخت بُت پرستی تھی جس کی جڑیں نہایت گہری جمی تھیں۔ جس نے صدیوں تک مصر و شام کے عیسائیوں کی تمام کوششوں کا ایسا مقابلہ کیا تھا کہ گویا ان کا اس پر کچھ اثر ہی نہ تھا۔" مترجم

ط۵ بزنطینی سلطنت (جس کو بلگرامی نے مشرقی سلطنت اس وجہ سے لکھا کہ وہ رومی مشرقی سلطنت تھی۔ اپنی دارالسلطنت بائزنٹیم سے موسوم ہے۔ یہ ان سات پہاڑیوں میں سے ایک کا نام ہے جس پر موجودہ قسطنطنیہ واقع ہے۔ فی الحقیقت یہ سلطنت اپنی رعایا تہذیب اور دیگر اثرات کی وجہ سے یونانی کہلانے کی مستحق ہے۔ اس سلطنت کا حقیقی بانی قسطنطین اعظم ہے۔ جس نے بزنطیم کو ۳۲۶ء میں اپنا دارالسلطنت قرار دیکر قسطنطنیہ کے نام سے مشہور کیا۔ رومی سلطنت میں جو دو بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں اس کا اظہار اس امر سے ہوا کہ ۳۳۰ء میں قسطنطنیہ حضرت مریم علیہا السلام کے نام سے معنون ہوا۔ اور ازاں بعد اس نے محض مشرقی سلطنت کی حیثیت سے ترقی کی۔ ازمنہ مظلمہ و متوسطہ میں یہ سلطنت تہذیب کی امین رہی اور اطالوی و یونانی شہروں پر بربروں کے حملوں کے بعد نشاۃ ثانیہ کا مخرج بنی۔ مشرقی سلطنت کا باضابطہ قیام ۳۹۵ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ تھیوڈو ولیس اعظم نے سلطنت کو مستقل طور پر اپنے لڑکوں ارکیڈلیس اور ہنوریس میں تقسیم کر دیا۔ ایشیائی حصہ مع مصر و تھریس و موزیہ و مقدونیہ اور یونان کے ارکیڈلیس کے حصہ میں آیا۔ مشرقی سلطنت نے بیڑوشی حملوں کو پسپا کر کے (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ)

اقوام سے دوچار ہوا جو روحانیت سے معرا تھیں۔ ہمسایہ بزنطینی[1] و عجمی سلطنتیں بظاہر نہایت شاندار و پرشوکت نظر آتی تھیں لیکن محض پرکاہ ثابت ہوئیں۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۶) بھی نہ آتا تھا کہ کچھ ہی دنوں میں عرب قوم کے کارنامے ایمانیوں اور یونانیوں کے کارناموں کی حیثیت سے تاریخ عالم میں درج ہوں گے .... ظہور (خاتم النبیین) سے قبل عربوں کا مذہب فضول اور مردہ تھا۔ اکثر قصص اور نظموں سے ثابت ہوتا ہے کہ دیوتاؤں سے بے توجہی اور غفلت عام تھی۔ لیکن مردہ مذہب کی بدل کی تمنا عام تھی۔ بعض ایسے افراد بھی تھے جو صرف انکار سے مطمئن نہ تھے بلکہ بہتر اور برتر تعلیم کے متمنی تھے۔ ایسے اشخاص حنیف کہلاتے تھے اور ان کے نام حسب ذیل ہیں:- امیہ بن الصلت طائفی - زید بن عمرو مکی - ابوقیس بن ابی الانس و ابوعامر مدنی - مگر یہ لوگ اپنے عقائد کی اشاعت کے کوشاں نہ ہوئے - بلکہ اپنے تزکیہ اور تصفیہ نفس میں مشغول تھے "۔ علاوہ ازیں سر ولیم میور نے جو لکھا ہے حسب ذیل ہے: " آنحضرت صلعم کے ایام جوانی میں جزیرہ نما عرب کی حالت کسی تبدیلی اور ترقی کے قبول کرنے کے لائق نہ تھی۔ شاید اس سے پہلے کسی زمانہ میں ان لوگوں کی اصلاح سے اس قدر ناامیدی پیدا نہیں ہوئی جیسی آپ کے وقت میں - بعض وقت جب ایک سبب کو ایک نتیجہ پیدا کرنے کے لیے ناکافی سمجھ لیا جاتا ہے تو اس کے لیے اور وجوہ جمع کیے جاتے ہیں۔ مثلاً نبی اکرم صلعم کے متعلق لکھا جاتا ہے کہ ان کا اٹھنا تھا کہ ساتھ ہی سارے کا سارا عرب ایک نئے اور روحانی ایمان کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ عرب اس وقت بڑی بھاری تبدیلی کے لیے جوش میں تھا۔ اور اس کے قبول کرنے کے لیے بالکل تیار تھا - ہمارے نزدیک جب ٹھنڈے دل کے ساتھ اسلام سے پہلے کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو تاریخ اس نتیجہ کو جھٹلاتی ہے - پانچ صدیوں تک عیسائیوں کی متواتر کوششوں اور مواعظ کا یہ نتیجہ ہوا تھا کہ چند آدمی بعض قبائل سے اس مذہب میں داخل ہو گئے - اس طرح عرب کی مذہبی سطح پر عیسائیت کی کمزور سی کوشش کی کبھی کبھی کوئی چھوٹی سی لہر ابھار (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ)

بت پرستی کی نمائشات اور پست یونانی دماغ کے تراشیدہ عقائدِ الوہیت کا ایسا اثر ہو چکا تھا کہ وہ مسیحی تعلیم کا قابل نفریں خاکہ رہ گئے تھے۔ مجوسیت و رومی نصرانیت دونوں کو اُن ملاحدہ نے جو وحشیانہ مظالم اور شدید نفرت کے بانی تھے پارہ پارہ کر دیا تھا۔ مزید برآں رومی اور ایرانی سلطنتیں مطلق العنان سلطنتیں تھیں۔ ان کی رعایا پامال ہو چکی تھی۔ اور ان کے دل سے حُبِّ وطن اور وفاداریٔ سلطنت بالکل محو ہو چکی تھی۔ آخری بات یہ کہ اسی زمانے میں دونوں سلطنتوں میں ایک خونریز جنگ ہو چکی تھی جس سے دونوں تھک گئی تھیں۔[15]

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۰) بنیاد ڈالی۔ شاہنشاہ ایلیکسیس کومنینس (۱۰۸۱ء تا ۱۱۱۸ء) کی درخواست پر اول جنگ صلیبی واقع ہوئی۔ صلیبی نبرد آزماؤں کی حرص اور خود غرضی کی وجہ سے مشرقی سلطنت کا زوال ہو گیا۔ چوتھی جنگ صلیبی کے موقع پر قسطنطنیہ لوٹ لیا گیا۔ اور سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔ ۱۲۶۱ء میں یونانیوں نے برائے نام شاہنشاہ انتخاب کیا عثمانی ترکوں کے حملے سے سلطنت فنا ہو گئی۔ انھوں نے ۱۳۹۳ء میں بلیغاریہ جسے اب اعلیٰ شہر کہتے ہیں مسخر کیا اور بلقان پر تاخت کی اور ۱۴۲۲ء میں قسطنطنیہ کا محاصرہ شروع ہوا اور بالآخر ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد خان ثانی نے فتح کر لیا۔ اور اُس وقت سے لیکر اس وقت تک قسطنطنیہ خدا کے فضل سے ترکان آلِ عثمان کے قبضہ میں ہے۔ مترجم

۱۵ اسکندر اعظم کے فتح ایران کے بعد یہ بدنصیب ملک تقریباً چار سو سال تک طوائف الملوکی میں مبتلا رہا۔ بالآخر ساسانی خاندان نے ایک فرد اردشیر بابکان نے قدیم ایرانی سلطنت کے کھنڈروں پر جدید سلطنت کی بنا ڈالی۔ اس خاندان کے عروج پر ہمسایہ مشرقی سلطنت سے سرحدی نزاعات اور قتال و جدال شروع ہوئے۔ اس خاندان کے دوسرے فرمانروا شاپور اول نے ۲۶۰ء میں شہنشاہ ولیرین کو لڑائی میں گرفتار کیا ایک صدی بعد جولین (بقیہ نوٹ بصفحہ آئندہ)

نمائشی موبدوں کا فریب ایسا طاری تھا کہ عوام ان کے شکنجہ ظلم و عذاب میں گرفتار تھے اس لیے عوام موبدوں سے متنفر اور دل میں ان کو ذلیل سمجھتے تھے۔ مشرقی مسیحیت کو

(بقیہ نوٹ صفحہ ۹) حملہ آوروں پر اپنی سطوت و جبروت کا سکہ جما دیا۔ اور یہ سلطنت آخر دم تک ایشیائی حملوں کے خلاف یورپی چوکی کا کام دیتی رہی۔ قسطنطین کے بعد چار سو سال تک وحشی اقوام کے حملوں کا دور رہا۔ اس زمانہ میں صرف شہنشاہ جسٹینین کا زمانہ قابل ذکر ہے۔ اس نے اپنے جنرلوں بلیساریس اور نارسس کی امداد سے کچھ مغربی حصہ بشمول رومۃ الکبریٰ کے فتح کر لیا تھا۔ اسی زمانہ میں قوانین مدون ہوئے۔ اور ایا صوفیہ کا گرجا تعمیر ہوا۔ لیکن اس کے دربار میں اسکندری شان و شوکت اور عیاشی کا دور رہا۔ انہیں اصراف کی وجہ سے ساتویں صدی کا انحطاط شروع ہوا۔ لمبارڈی والوں نے اطالیہ پر قبضہ کر لیا۔ سلافی اور بلغاریوں نے جزیرہ نما بلقان میں سکونت اختیار کی اور ایرانیوں نے ۶۱۴ء میں شام پر حملہ کر کے بیت المقدس کو غارت کیا۔ اور قسطنطنیہ پر چڑھائی کی ایرانیوں کی شکست کے بعد عربوں نے مصر و شام کو فتح کیا۔ اور ایشیا ر کوچک بھی خطرہ میں پڑ گئی۔ ملک کا بڑا حصہ ہاتھ سے نکل گیا۔ اور تمدن روبہ انحطاط ہوا۔ ۷۱۶ء لغایت ۷۱۸ء میں لیو اسوری نے عربوں کو چند شکستیں دیکر کمزور کر دیا۔ اس میں سب سے بڑا حملہ خلیفہ سلیمان اموی کے زمانہ میں ہوا۔ امیر لشکر خلیفہ کا بھائی مسلمہ تھا۔ مدافعت نہایت عمدہ طور پر کی گئی۔ اور حملہ آور فوج سردی کی غیر معمولی شدت سے تباہ ہو گئی۔ ۸۶۷ء لغایت ۱۰۵۶ء مقدونی خاندان حکمراں رہا۔ عربوں میں انحطاط پیدا ہو گیا۔ اور قسطنطنیہ تجارتی مرکز ہو گیا۔ اسی زمانہ میں بلغاریوں نے دین مسیحی قبول کر لیا اور روس بھی مسیحی حلیف ہو گیا۔ مقدونی خاندان کے زمانہ سے سلطنت کا تدریجی زوال شروع ہوا۔ سلجوقی ترکوں نے بسرکردگی الپ ارسلان جنگ منزیکرٹ ۱۰۷۱ء میں فتح پائی۔ اور رومونس چہارم کو قید کر لیا۔ اور روم میں ترکی سلطنت کی (بقیہ نوٹ صفحہ آیندہ)

طریقے خوب جانتے تھے - یہ کوئی خون کے پیاسے وحشی نہ تھے جو لوٹ، مار اور غارتگری کے خواہش مند ہوتے - برخلاف اس کے وہ جبلّی طور پر خداداد وصاف سے متصف تھے آن شائستہ صفات کو جو قدیم تہذیبوں سے حاصل ہو سکتی تھیں سیکھنے کے متمنی تھے - یہ فاتحین اور مفتوحین ایک ہی مذہب کے پیرو ہو گئے - ایک دوسرے سے مناکحت کرنے لگے - لہذا سرعت کے ساتھ ایک دوسرے میں ضم ہو گئے - اس اختلاط سے ایک جدید تمدن یعنی عربی (سارسناک[1]) تہذیب پیدا ہوئی - عرب کی طبعی قوت نے یونانی رومی اور ایرانی تہذیب کو مستحکم کر دیا - اور عربی ذہانت اور اسلامی روح نے اس پر جلا کر کے اپنی تہذیب میں ملا لیا - پہلی تین صدیوں (۶۵۰ - ۱۰۰۰ء) میں بلاد اسلامی دنیا کے سب سے زیادہ مہذب اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ حصے تھے - ان میں جابجا بارونق شہر عالیشان مسجدیں اور پُر سکون درسگاہیں تھیں - ان درسگاہوں میں دنیائے قدیم کی حکمت کی حفاظت اور قدر کی جاتی تھی - نصرانی مغرب سے جو ازمنہ مظلمہ[2] کی تاریک شب میں چھپا ہوا تھا اسلامی مشرق کا کھلا ہوا تقابل تھا -

---

[1] سیرسینس اس لفظ کی اصل کی بابت اختلاف ہے بعض کا قول ہے کہ یہ دراصل شرقیین کی تحریف ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ شرقہ سے ہے جس کے معنے حلیف کے ہیں - ازمنۂ متوسط میں یوروپ کے نصرانی اپنی تمام مسلمانوں کو اس نام سے موسوم کرتے تھے - اس سے قبل یونانی اور رومی سیراسنی کا اطلاق شام و عرب کے صحاری کے خانہ بدوش عربوں پر اطلاق کرتے تھے جو رومی سلطنت کے سرحدوں پر مصر سے لیکر دریائے فرات تک تاخت کرتے تھے - مترجم

[2] ازمنہ مظلمہ یورپ کا وہ تاریخی زمانہ ہے جو تقریباً ازمنہ متوسط سے مطابق ہوتا ہے - اس کا آغاز روما کی مغربی سلطنت کے انحطاط سے ۴۷۶ء میں ہوتا ہے - اور فتح قسطنطنیہ یعنی ۱۴۵۳ء میں ختم ہوتا ہے بالفاظ دیگر یہ زمانہ پانچ لغایت پندرہویں صدی تک رہا - ہیلیمؔ کہتا ہے (بقیہ نوٹ بصفحۂ آیندہ)

یہ تھی حالت اس عالم کی جسے اسلامی سیلاب کا مقابلہ کرنا پڑا۔ نتیجہ جو کچھ ہوا ناگزیر تھا۔ ان جوشیلے صحرا نشینوں کے شدید حملے سے ایک مرتبہ جو مشرقی روما کی افواج اور ایرانی زرہ پوشوں کی باقاعدہ صفوف درہم برہم ہوئیں تو مقابلہ کا خاتمہ ہوگیا۔ پھر کوئی محب وطن مقابلہ کو نہ اٹھا۔ پامال شدہ رعایا نے نئے آقاؤں کو خاموشی سے بلکہ گرمجوشی سے قبول کرلیا۔ اور بیشمار ملاحدہ نے اپنے آزار دہ ہم مذہبوں کی شکست پر خوشیاں منائیں جو اپنے ہم مذہبوں سے بمقابلہ اجنبی فاتحین کے بہت سخت متنفر تھے۔ قلیل زمانہ میں اکثر رعایا نے اس نئے مذہب کو جو ان کے پست مذہب کے مقابلہ میں نہایت شگفتہ اور سادہ تھا قبول کرلیا۔ عرب اپنی حکومت کے مستحکم کرنے کے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۱) ایران کے میدان مصاف میں مارا گیا۔ شہنشاہ جسٹینین کو بھی بدقسمتی سے سابقہ پڑا۔ اس کی ناکامیابی اس کی ناقابلیت کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اس کا مدمقابل خسرو نوشیرواں غیرمعمولی قابلیت کا تھا۔ بلیساریس کو بھی بست سالہ جنگ میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اس قدر فائدہ ضرور ہوا کہ صلح ہوگئی جس کی رو سے یورپی شہنشاہ کو تیس ہزار اشرفی سالانہ کا خراج دینا پڑا۔ لیکن لڑائیاں پھر شروع ہوگئیں حتی کہ موریس نے جو طبریس دوم کا داماد تھا ایک باعزت صلح منوالی۔ کیونکہ خسرو ثانی اپنی جلاوطنی کے ایام میں موریس کے دربار میں رہا تھا۔ یہ بادشاہ تخت نشین ہونے کے بعد بھی رومیوں کا ممنون احسان رہا لیکن جب باغی فوکس نے موریس کو معزول کیا تو خسرو ثانی نے اپنے مربی کا انتقام لینے کے لیے فوج کشی کی۔ ایشیائی صوبوں کو تاراج کرنے کے بعد ایرانی افواج باسفورس تک پہنچ گئیں بادی النظر میں رومی سلطنت کا خاتمہ معلوم ہوتا تھا لیکن ہرقل نے سلطنت کو اس خطرہ صعب سے بچالیا۔ ہرقل سب سے بڑا شہنشاہ ہی نہ تھا بلکہ سب سے بڑا سپہسالار بھی تھا۔ اس نے دشمن کو پسپا ہی نہ کیا بلکہ سات حصوں میں نمایاں کامیابی حاصل کرکے ایرانی قوت کا خاتمہ کردیا۔ اگرچہ یہ لڑائیاں بدرجہ مجبوری رومیوں نے لڑی تھیں لیکن ان کا آخر خود رومیوں کے لیے بھی تباہ کن ثابت ہوا۔ انہیں آخری لڑائیوں کی طرف سورۂ الروم میں اشارہ ہے۔ مترجم

عرب ان مقامات میں بہت کم تھے زیادہ تر شامی وایرانی نومسلم اور مولد العرب مخلوط النسل تھے۔ یہ لوگ شخصی سلطنت کی روایات سے متاثر اور خلفاء کی خوشامدانہ اطاعت کو مستعد تھے۔ خلفاء بھی ان خوشامدی اشخاص کی روزبروز طرفداری کرنے لگے۔ اور انھیں میں سے درباری منصب دار اور سپاہی مقرر کیے گئے۔ خوددار عرب ملول وافسردہ ہوکر بتدریج اپنے صحرا کو واپس ہوئے اور حکومت کی گاڑی منزل کی قدیم خود مختاری کے پامال شدہ راستہ پر پڑ گئی۔ خاندان عباسیہ کے عروج پر یعنی ۷۵۰ء میں جب دارالخلافۃ بغداد کو منتقل ہوا تو ایرانی عنصر غالب ہوگیا۔ مشہور خلیفہ ہارون رشید (الف لیلہ کا ہیرو) ایرانی بادشاہ کا مکمل نمونہ اور اسفندیار اور کیخسرو کا سچا جانشین تھا۔ اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ سے اتنا ہی مختلف تھا جتنا کہ خیال میں آسکتا ہے۔ دیگر مقامات کی طرح بغداد میں بھی یہ شخصی سلطنت خود صاحب اختیار کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ اس کے تاریک اثر میں خلفاء یا تو متوہم ظالم یا حرم کی کٹ پتلیاں ہوگئے جن کے کمزور ہاتھ عظیم اسلامی سلطنت کا بالکل ہی انتظام نہ کرسکے۔

سلطنت بتدریج پارہ پارہ ہوگئی۔ خانہ جنگیوں سے اس کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں۔ کوئی باہمت سردار نہ تھا اور خالص صحرائی عربوں کی تقویت بخش آمیزش سے محروم ہوکر سیاسی اتحاد مفقود ہوگیا۔ دبا ہوا قبائلی اور خصوصی میلان ہر جگہ عود کرنے لگا۔ جب اس توسیع کے چشمے خشک ہونے لگے تو اسلام کی سرعت اشاعت اس کے مخالف پڑی۔ اسلام نے مختلف اقوام و قبائل کے لاکھوں آدمیوں کو متبع کرلیا تھا لیکن ان پر ہنوز کامل رنگ نہیں چڑھا تھا۔ نبی اکرم صلعم نے صرف اُن خیالات کی تبلیغ کی تھی جو عربوں میں اندر ہی اندر پیدا ہو رہے تھے اور ان کی جبلّت کے موافق تھے۔ اس لیے انھوں نے درحقیقت عربوں ہی کو اپنا متبع بنایا تھا۔ لیکن جب دوسری غیر عرب قومیں بھی اسلام لائیں تو انھوں نے طبعاً تعلیم اسلام کو اپنی قومی خصوصیات اور ذہنیت کی

مگر دسویں صدی عیسوی میں عربی تمدن میں تنزل کے آثار پیدا ہو گئے۔ ابتداً یہ تنزل تدریجی تھا یہاں تک کہ تیرھویں صدی کے ہولناک حادثہ تک اس تمدن میں انقلاب کے آثار نمایاں تھے۔ اور مغربی نصرانیت پر فوقیت رکھتا تھا۔ تاہم دسویں صدی میں اس کا ندیں عہد ختم ہو گیا۔ زوال کے متعدد اسباب تھے۔ اولاً گروہ بندی کا سلسلہ عود کرنے لگا جو ہمیشہ سے قبائل عرب کے لیے تباہ کن تھا۔ مختلف قبائل امارت اسلام کے لیے کوشاں ہوئے۔ اور ان کے تنازعات خونریز خانہ جنگیوں کی شکل میں نمودار ہوئے۔ ان باہمی لڑائیوں میں قرون اولے کا جوش ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اسلام کے اولین علمبرداروں یعنی حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ وغیرہ جیسے پاک نفوس کے بجائے دنیوی جاہ طلب اشخاص پیدا ہوئے اور انہوں نے عہدہ خلافت کو اپنی خودمختاری اور سطوت کے اظہار کا ذریعہ خیال کیا۔ دارالسلطنت۔ شام میں دمشق اور عراق میں بغداد کو منتقل ہوا۔ اس تبدیلی کی وجہ ظاہر ہے۔ مکہ میں خودمختاری ناممکن تھی۔ تندر اور آزاد صحرائے عرب کسی کو آقا نہیں مان سکتے تھے۔ ان کی جبلی جمہوریت کو دربار رسالت سے خلعت قبول ہو چکا تھا۔ کل مومن اخوۃ کا عام اعلان کر دیا گیا تھا۔ مکہ کی خدائی حکومت جمہوری تھی۔ حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ کا انتخاب جمہور نے کیا تھا اور وہ اپنے آپ کو باتباع شریعت جس کی تعلیم رسول کریم صلعم نے بذریعہ قرآن کی تھی رائے عامہ کا پابند سمجھتے تھے۔

دمشق میں اور اس سے زیادہ بغداد میں حالات بالکل مختلف تھے۔ خالص

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۳) کہ یہ زمانہ ایسی جہالت کا نہ تھا جیسا کہ بعض مورخین ہم کو یقین دلاتے ہیں۔ اسی زمانہ میں فن معماری میں ترقی ہوئی۔ اور یورپ کے بڑے حصہ نے دین مسیحی قبول کیا۔

مترجم

قایم کی۔ اس کو نہ صرف اسپین کے مسلمانوں نے بلکہ شمالی افریقہ کے بربروں نے بھی جائز تسلیم کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور خلافت مصر میں قایم ہوئی۔ یہ خلافت فاطمیین[۵] مصر کی تھی۔ جو اپنا حق بحیثیت اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا دختر رسول خدا صلعم قایم کرتے تھے۔ عباسی خلفاء کا بتدریج انحطاط ہوتا گیا۔ اور بالآخر وہ نئے عنصر یعنی ترکوں کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن گئے۔

قبل اس کے کہ ہم تاریخ اسلام کے اس اہم واقعہ کو بیان کریں کہ اقتدار حکومت مولد العرب کے ہاتھوں سے منتقل ہو کر ترکوں میں کیونکر پہنچا یہ ضروری ہے کہ ہم اولاً اس تدنی اور روحانی انحطاط پر غور کریں جو مولد العرب زمانہ کے آخر حصہ میں انحادسیاسی

---

[۵] فاطمیین مصر۔ خلیفہ مقتدر باللہ عباسی کے عہد میں اس خاندان کی بنیاد قایم ہوئی۔ جس نے اولاً مغرب میں اور ازاں بعد مصر میں تقریباً تین سو سال حکومت کی۔ اس خاندان میں جس شخص نے اولاً دعویٰ خلافت کیا وہ عبید اللہ الملقب بہ مہدی تھا۔ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ براہ راست اولاد حضرت خاتون جنت علیہا السلام سے ہے۔ یہ امر تحقیق ہے کہ یہ عبید اللہ بن میمون القداح کی اولاد سے تھا جس نے فرقہ اسمعیلہ کی بنا ڈالی قرامطہ اسی فرقہ کی ایک شاخ ہیں۔ عبید اللہ فرقہ اسمعیلیہ کا امام تھا۔ خلیفہ مکتفی باللہ کے عہد میں عبید اللہ کے ایک مبلغ ابوعبید اللہ نے صوبہ افریقیہ میں بہت سے پیروان بنائے تھے جو اس وقت میں خاندان اغلب کے زیر حکومت تھا۔ اور اس مبلغ کے فتوحات سے مشرقی افریقیہ خاندان اغلب سے نکل گیا۔ جب مقتدر تخت نشین ہوا تو عبید اللہ اپنی جدید سلطنت کو روانہ ہوا۔ اور ۳۰۳ھ میں شہر المہدیہ کی بنا ڈال کر اسے اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس نے مصر پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ناکامیاب رہا۔ یہ سعادت اس کے ایک جانشین المعز لدین اللہ کی قسمت میں تھی۔ اس خاندان نے ۲۹۷ھ لغایت ۵۶۷ھ تک حکومت کی اور شمالی افریقیہ کے سواحل کے علاوہ مصر وسقلیہ و کچھ حصہ اطالیہ و فلسطین و شام بھی فتح کیا۔

بنا پر تعبیر کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی اسلام کو مسخ اور محرف کر ڈالا۔ اس کی انتہائی مثال ایران میں پائی گئی۔ وہاں خالص اسلامی توحید کو پیچیدہ اور بعیدہ از فہم عقائد سے جو تشیع کے نام سے موسوم ہیں تبدیل کر دیا گیا۔ یہی تحریفی میلان (گو کسی قدر کمی کے ساتھ) شمالی افریقہ کے بربروں کی پیر پرستی اور ہندی مسلمانوں کے عقیدے ہمہ اوست میں پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں تبدیلیاں ایسی ہیں کہ جن کو رسول اللہ صلعم ضرور رد کرتے۔

ان مذہبی اختلافات کے ساتھ ساتھ سیاسی اتحاد بھی پارہ پارہ ہوگیا۔ پہلا تجزیہ بنو عباس کے خلافت پر متمکن ہونے پر ہوا۔ معزول شدہ خاندان بنو اُمیہ کا ایک شخص بھاگ کر اسپین پہنچا اور وہاں اس نے ایک مقابل کی خلافت قرطبہ[۱] میں

---

[۱] خلافت بنی امیہ کے دور میں طارق نے اسپین پر حملہ کیا ۱۱ھ میں راڈرک شاہ اسپین کو شکست دی۔ عربوں نے اسپین کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔ ابو مسلم خراسانی اصحاب محمد کے خروج کے بعد محمد بن سفاح عباسی خلیفہ ہوا۔ اور خاندان بنی اُمیہ کا قتل و استیصال شروع ہوا اس خاندان کا ایک شخص عبد الرحمٰن بھاگ کر جنگلوں میں پھرتا تھا۔ سفاح کے زمانہ میں تو بنی اُمیّہ کا استیصال اور اس کے بعد ابو مسلم وغیرہ کے جھگڑے رہے۔ لیکن جب سفاح کے مرنے پر منصور جانشین ہوا تو والی افریقہ نے بیعت قبول کر کے کچھ معمولی تحائف بھیجے۔ اس پر منصور نے معاندانہ خط لکھا جس پر عبد الرحمن والی افریقہ برافروختہ ہوگیا۔ اور اس نے کل مغرب میں خلیفہ منصور کی معزولی کا اعلان کیا۔ اس سے فتنہ بڑھا۔ حتیٰ کہ عہد ہارون میں قیروان میں اغلب کا خاندان قایم ہوگیا۔ اور اسی قیروان کے مناقشہ کے دوران میں اسپین والوں نے اپنا ایک خلیفہ بالاتفاق منتخب کیا۔ یہ عبد الرحمن بن معاویہ خلیفہ ہشام کا پوتا تھا جو اپنے انتخاب کے وقت افریقہ کے ریگستانوں میں مارا پھرتا تھا۔ اس نے اس عہدہ کو بخوشی قبول کر کے قرطبہ میں عربی خلافت بنی اُمیہ کی بنا ڈالی ۲۵ ستمبر ۷۵۶ء کو عبد الرحمن اندلس میں آیا تھا۔
مترجم

فنون لطیفہ اور علوم و خیالات کی بھی قدر کی - ان جدید تحریکات کا نتیجہ قابل تعریف تمدنی اور دماغی گلکاری تھا - جس پر عربی تہذیب کو ناز ہے - کچھ عرصہ تک آزاد خیالی کا نشو و نما رہا - اور اس عرصہ میں جدید خیالات اور دلیرانہ تصورات کے خزاین جمع ہوگئے - یہ کام تنہا عربوں کا نہ تھا بلکہ اس میں نصرانی یہودی ایرانی مفتوحین بھی شریک تھے - ان میں سے اکثر پہلے ملاحدہ میں شمار کئے جاتے تھے اور ظالمانہ پیغمبر بطنی راسخ الاعتقادی اور مجوسیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے رہ چکے تھے -

رفتہ رفتہ یہ روشن خیالی کا زمانہ گزر گیا - مخالف قوتیں پیدا ہو کر مستحکم ہوگئیں - آزاد خیال طبقہ جو عام طور پر معتزلہ کے نام سے پکارا جاتا تھا ابتدائی اسلام کے سادہ عقائد دین کا اتباع کرتے ہوئے اس کا مدعی تھا کہ ہر چیز کو عقل کے معیار پر جانچنا چاہیئے - برعکس اس کے قدامت پسند طبقہ اسناد و تقلید کو معیار قرار دیتا تھا - ان میں سے اکثر نو مسلموں نے جو پیغمبر بطنی راسخ الاعتقادی کی روایات سے متاثر تھے قرآن شریف کی بڑی بڑی تفاسیر لکھیں اور احادیث نبوی کی جو صحابہ اور تابعین سے منقول تھیں تدوین و تعبیر کی - ان سرگرمیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھ ہی عرصہ میں بتدریج ایسا اسلامی فقہ اور دینی مسلک پیدا ہوگیا جو زمانہ وسطے کی مغربی نصرانیت کی طرح شدید و پیچیدہ اور متحکمانہ تھا -

معقول و منقول کا جھگڑا قدرتی طور پر تلخ اور طویل تھا - نتیجہ پہلے ہی سے معلوم تھا - معقول پر فتح پانے میں ہر چیز نے منقول کی امداد کی - مشرق کی کل تاریخی روایات جو زیادہ تر قومی اور مقامی میلان سے پیدا ہوئی تھیں قدامت کے موافق تھیں - صحرائی آزاد بدوی کے

و مذہبی کے تجزیہ کے ساتھ ساتھ ہوا۔

رسول اللہ صلعم کے زمانہ کے عرب تازہ دم اور خرابیوں سے مبرا تھے۔ یہ لوگ عنفوان قوت کے جوش سے لبریز اور معارک کے متلاشی تھے اور مقاصد عالی اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ سامی جوش مذہبی سے انھیں پورا حصہ ملا تھا۔ ان کا یہ جوش تعصب سے بری تھا یعنی وہ تنگ خیال نہیں۔ بلکہ وسیع النظر گو اپنے عقائد میں راسخ تھے۔ ان کا دین بہت ہی سادہ تھا۔ نبی اکرم صلعم کی تعلیم کا لب لباب توحید اور چند عبادات پر مشتمل تھا توحید کا پکا عقیدہ اور اسی قدر رسالت منجانب اللہ ہونے پر ایمان رکھنا اور بعض فرائض ماموره یعنی طہارت نماز روزہ زکوٰۃ اور حج ادا کرنا۔ یہی مشرقی دنیا کی فاتح عربوں کا اسلام تھا۔

ایسے سادہ احکام مذہب عرب دماغ کو پابزنجیر نہیں کر سکتے تھے۔ عرب دماغ ذی ہوش متجسس اور تعلیم کا شایق اور ان حالات سے تطابق عمل پیدا کرنے کے لیے جو اس کے تفنۂ صحرائی جواری کیفیات سے زیادہ رفیع اور پیچیدہ تھے ہر وقت مستعد تھا۔ اس وقت عربوں نے اپنے مفتوحین کی ترقی یافتہ معاشرت سے نہ صرف مادی منفعت اور عیش و عشرت کا مذاق حاصل کیا بلکہ انھوں نے پرانے تمدن کے

---

۵ رسالت منجانب اللہ اور الوہیت کو غلط مبحث نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ ان دونوں کے امتیاز کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف یہی نہ کیا کہ الوہیت کا دعوی نہ کیا بلکہ ایسے صفات سے بالکل انکار کیا جو خاص اللہ سے منسوب ہیں وہ اپنے آپ کو ان انبیائے ملہم من اللہ کا خاتم ظاہر فرماتے تھے جن کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہم السلام سے ہو کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچا تھا۔ اور آخرین دکا ملترین رسول اپنے آپ کو بتاتے تھے۔ مصنف

فلسفیانہ تصورات کے دائرہ میں محدود نہیں رکھا۔ بلکہ انھوں نے زیادہ
پرخطر میدان میں قدم بڑھایا۔ معتزلہ واعظین نے مکہ کی جمہوری خلافت
کے زمانے کی یاد دلائی جبکہ امیر المومنین بجائے تخت نشینی بادشاہ کے جمہور کا
انتخاب کردہ اور رائے عامہ کا پابند ہوتا تھا۔ بعض دلیر طبائع نے خوارج
جیسے وسط عرب کے تند و سرگرم فرقوں سے سلسلہ ارتباط قایم کیا۔
یہ خوارج قدیم صحرائی آزادی کے حامی تھے۔ اور شخصی خلافت کو تسلیم
نہیں کرتے تھے۔ بلکہ جمہوریت کے رفیع اصول کا اعلان کرتے تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ خلفاء آزاد خیال فرقے کے مخالف ہو کر قدامت پسند فقہا
کی طرف اسی طرح مائل ہو گئے . . . . جس طرح کردہ
شاہی پسند مولد العرب کو سرکش پاک نژاد صحرائی عرب پر ترجیح دیتے تھے۔
بنی عباس کے دور میں سلطنت قدامت پسندی کی علانیہ حامی ہو گئی۔ قدیم
راسخ الاعتقادی کا علم بلند کیا گیا۔ اور معتزلین کو مقہور او قتل کیا گیا۔ یہاں تک
کہ بارہویں صدی عیسوی میں عربی حریت کے آخری نقش پا کو مٹا دیا گیا۔
اسلامی تخیل کے قواعد منضبط کر دئے گئے۔ تجدید کی سرگرمیاں سرنگوں
معتزلہ فقہا کی یاد بھی جاتی رہی۔ اسلامی وسعت خیال کا خاتمہ ہو گیا۔ اور یہ
تنگ نظری ہمارے زمانہ تک قایم رہی۔

گیارہویں صدی کے اوایل میں عربی تمدن کا انحطاط ایسا واضح ہو گیا
تھا کہ انقلاب کا تموج ہوا میں ظاہر تھا۔ چونکہ جدید عرب اپنی اصلی قوت کو ضائع
کر چکے تھے۔ لہذا انہیں مجبوراً اپنی سیاسی قوت کو دوسرے کے ہاتھوں
میں جاتے دیکھنا پڑا۔ جدید عرب کے سیاسی جانشین ترک ہوئے۔ یہ ترک
آل خانہ بدوش اقوام کے مغربی شعبے تھے جو زمانہ قدیم سے مشرقی وسطی

سیلاب نے اس روایت کو کچھ عرصہ کے لئے روک دیا تھا۔ لیکن قدیم
میلانِ طبع نے پھر فوراً اپنا سکہ جمانا شروع کیا۔ اور چونکہ خلافت خدائی جمہوریت
سے خود مختار سلطنت میں مبدل ہوئی لہٰذا اس سیاسی تبدیلی سے اس پرانی
روایت کا زور بڑھ گیا۔

میدانِ حکمرانی میں مطلق العنانی نے فتح حاصل کی اس سے دیگر اعتقادات
میں بھی بالآخر کامیابی یقینی ہوگئی۔ جس طرح خود مختار حکومت میں آزادیٔ عمل
پسندیدہ نہیں ہے اسی طرح آزادیٔ خیال کی رواداری عرصہ تک نہیں
ہوسکتی۔ چونکہ خلفاء بنو امیہ دنیادار تھے آزاد خیالی اُن کے قلوب کو
پسندیدہ معلوم ہوتی تھی۔ لہٰذا خلفاء دمشق نے قلیل عرصہ کے لئے معتزلی
عقائد سے دلچسپی ظاہر کی۔ لیکن اُنہیں بہت جلد معلوم ہوگیا کہ ان عقائد میں
سیاسی آزادی بھی مضمر ہے۔ فرقہ معتزلہ نے اپنی جد وجہد کو صرف خالص

سلہ ارتقاء انسانی پر بالعموم اور تاریخ مشرق پر بالخصوص جو ماحول اور توریث کا اثر پڑتا ہے وہ بہت اہم ہے
لیکن ایسے مختصر رسالہ میں اس پر بحث نہیں کی جاسکتی۔ پروفیسر ایلسورتھ ہنٹنگٹن نے آب و ہوا
اور جواری کیفیات کے اثرات کے بارے میں اپنی متعدد تصانیف میں خوب بحث کی ہے۔ مثلاً "ایشیا کی نبض"
مطبوعہ بوسٹن ۱۹۰۷ء اور "تمدن اور آب و ہوا" مطبوعہ یال یونیورسٹی پریس ۱۹۱۵ء اور "دنیوی قوت اور
ارتقاء" مطبوعہ یال یونیورسٹی پریس ۱۹۱۹ء نیز ملاحظہ ہو۔ ارمنیس وامبیری کی کتاب "اسلام انیسویں
صدی میں یعنی تاریخ تمدن کا مطالعہ" باب سوم مطبوعہ لپزگ ۱۸۷۵ء۔
مشرقی تاریخ میں قومی اثرات کے اجمالی حالات کے لئے
ملاحظہ ہو میڈیسن گرانٹ کی کتاب "نسل عظیم کا انتقال"
مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۶ء۔ مصنف

یورپ اور مشرق اوسط کی نسلوں سے بہت مخلوط ہو گئے ہیں۔ اور مغربی و عربی تمدن میں ایسے رنگ گئے ہیں کہ وہ اپنے نو آباد اجداد سے بالکل مختلف ہیں۔ آج بھی عثمانی ترک ان ناپسندیدہ تورانی خصایل کا کافی اظہار کرتے ہیں۔ جو ایشیاء وسطے کے اُن غیر ترتیب یافتہ ترکوں کے خصوصیات ہیں جنہیں ترکمان اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی مغربی اخوان عثمانی ترکوں سے ممیز ہو جائیں۔

سوال یہ ہے کہ ترکوں کے ابتدائی خصائل کیا تھے۔ اول اور سب سے مقدم اُن کی خصلت پیشہ ورسپاہی کی تھی۔ تعمیل حکم اُن کا فرض اولین تھا۔ جدت تخیل سے معرا۔ اور بدرجہ اقل متفحص تھے۔ ترکوں کے غبی دماغ میں خیال بہت کم پیدا ہوتے تھے۔ اور اگر کوئی خیال ذہن نشین ہو جاتا تھا تو وہ اُس کو فوجی احکام کی طرح مانتے۔ بلا کسی چون و چرا کے تعمیل کرتے اور بلا غور و خوض کے اتباع کرتے تھے۔ جب عرب کے مرتعش ہاتھوں سے عنانِ حکومت چھوٹی تو امارت ایسی قوم کے پنجۂ آہنین میں آئی۔

اسلام اور کل دنیا کے لئے اس سے زیادہ اور کوئی مصیبت نہیں ہوسکتی تھی اسلام کے لئے اس اعتبار سے کہ عنانِ حکومت[ا] ایک غبی متعصب کے ہاتھ میں

[ا] ترکوں کو عام طور پر مغربی اقوام اور مصنفین نے بلا کسی وجہ خاص کے غبی اور متعصب فرض کر لیا ہے۔ میں حق و دم کو پہلے لیتا ہوں۔ میدان مصاف اور اس کے بعد کے واقعات اس خصوصیت کے اطلاق کے لئے ناکافی ہیں۔ ورنہ کوئی قوم بھی اس خصلت ذمیمہ سے پاک نہیں مل سکتی۔ دیکھنا یہ ہے کہ ترکوں نے اپنے محکوم غیر مسلم اقوام سے امن و امان کے زمانہ میں کیا برتاؤ کیا۔ مغرب کی متمدن اقوام نے اپنے مستعمرات میں (بقیہ صفحہ ۲۴)

ایشیاء کے مرغزاروں میں گھومتے رہتے تھے۔ اور من حیث الجمیعت اراتوا آلتک یا تورانی کہلاتے تھے آغاز فتح ایران سے عربوں کو ترکی خانہ بدوشوں سے سابقہ پڑا۔ ترکوں کے متواتر حملے شمالی مغربی گوشہ فارس پر مسلمان سرداروں کو روکنے پڑے۔ خلافت کے زرین عہد میں ترکوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ بلکہ اصلاً وہ کار آمد ثابت ہوئے۔ چونکہ ترک غبی اور تنگ نظر تھے۔ لہذا وہ دو کام نہایت عمدہ کر سکتے تھے یعنی تعمیل حکم اور جنگ۔ بالفاظ دیگر وہ نہایت اچھے پیشہ ور سپاہی تھے۔ خلفاء ان سے بہت خوش تھے۔ اور اپنی افواج و باڈی گارڈ کے لئے انہیں کو بھرتی کرتے تھے۔

جب تک خلافت میں قوت رہی تب تک حالات درست رہے۔ لیکن جب اس میں کمزوریاں نمودار ہوئیں حالت بالکل برعکس ہو گئی۔ ترکی تنخواہ دار ترقی کر کے ہر عہدہ اقتدار پر پہونچ گئے۔ اور آقا کا کام کرنے لگے۔ مشرقی سرحدوں کے دروازہ کھول دے اور اپنے ہموطنوں کے انبوہ داخل کر لیئے۔ یہہ انبوہ منفرداً نہیں آئے۔ بلکہ قبایل میں اپنے موروثی سرداروں کے ساتھ آئے اور اپنی مرضی کے موافق ادھر اُدھر گھومنے لگے۔ اِن قبایل کا جہاں جی چاہتا تھا مقابی اشخاص کو لوٹ مار کر نکال دیتے اور خود بس جاتے تھے۔

ترکوں نے بہت جلد اپنے قدیم مذہب کو چھوڑ کر دین اسلام قبول کر لیا۔ لیکن اسلام نے ترکوں کے طبائع میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اِن نوآمدہ اتراک کا اندازہ کرنے کے لئے ہم کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ آجکل کے قسطنطنیہ یا ایشیاء کوچک کے عثمانی ترکوں کے مشابہ تھے۔ موجودہ عثمانی ترک

حربی قوت میں بہت رفعت حاصل کی - لیکن یہ جدید قوت بلاپس و پیش ایسے غیر مناسب طور پر استعمال کی گئی کہ اسکا تباہ کن اثر خود اسلام پر پڑا - ان نو وارد ترکی قبایل کا اولین قابل الذکر کارنامہ فتح ایشیائے[۵] کوچک و قبضہ بیت المقدس تھا - یہ دونوں واقعات گیارہویں صدی کے اختتام پر رونما ہوئے - اس وقت تک ایشیائے کوچک مسیحی دنیا کا جزو تھی - ساتویں صدی کا اصلی عرب سیلاب فتح شام کے بعد کوہ طارس پر رک گیا - مشرقی سلطنت نے اپنی حالت سنبھال لی تھی اگرچہ سرحد پر اکثر ہنگامہ ہوا کئے - لیکن عربی و مشرقی سرحد بدستور قایم رہی - مگر اب ترکوں نے اس حد فاصل کو توڑ کر ایشیائے کوچک کو فتح کرلیا - اور مسیحی مشرقی جائے پناہ یعنی قسطنطنیہ بھی خطرہ میں پڑ گیا - بیت المقدس کو ۶۳۷ء میں بلاشبہ عربوں نے فتح کرلیا تھا اور وہ مسلمانوں ہی کے قبضہ میں تھا - لیکن خلیفہ دویم حضرت عمرؓ نے عیسائی مقامات مقدسہ کی نہایت احتیاط سے حرمت کی اور ان کے جانشینوں نے نہ مقامی نصرانیوں کو آزار پہونچایا اور نہ زائرین کے ساتھ کوئی بد سلوکی کی جو مسیحی دنیا کے ہر گوشہ سے دوانا بیت المقدس میں آتے تھے - ترکوں نے یہ سب کچھ لوٹ دیا - غارتگری کے طامع اور کفار سے متعصبانہ طور پر متنفر ترکوں نے مقامات مقدسہ کو تباہ کرکے نصرانیوں پر ظلم کیا - اور زیارت کرنا ناممکن کردیا -

یہ دونوں مصایب جو نصرانی دنیا پر ایک ساتھ ٹوٹے سخت ہولناک تھے عیسائی مغرب جو اس وقت اپنے مذہبی جوش کے انتہا پر تھا خوف و غیظ سے

---

۵ ۱۰۷۱ء میں مشرقی سلطنت کی افواج منزیکرٹ کی جنگ عظیم میں تباہ ہونے کے بعد ترکوں نے ایشیائے کوچک پر تاخت کی - اور ۱۰۷۶ء میں بیت المقدس پر قبضہ کرلیا - مصنف ۲ و ۳ کا نوٹ صفحہ ۲۲ پر

آئی - جس کے زمانہ میں روشن خیالی کی ترقی ناممکن ہو گئی - بلاشبہ اسلام

(بقیہ صفحہ ۲۳) کبھی بھی اقوام غیر کو ایسے حقوق و مراعات و مناصب نہیں دئے جیساکہ
اس مسئلہ میں اپنی عالی حوصلگی کا اظہار کیا ہے - آرمینیا یا دیگر مسیحی اقوام محکومہ کے جو قصص
اخباروں میں نظر آتے ہیں اس کے ذمہ دار مغربی تہذیب ہے - جسنے مختص قومی تفرق
بہترین نظام مان رکھا ہے - اگرچہ اسکا نسل سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہ اُن کے
قلوب میں ایسی راسخ ہو گئی ہے کہ طبیعت ثانیہ بنگئی ہے - مشرقی اقوام جو پستی اور انحطاط
مبتلا تھیں مغرب کو اپنا رہبر کامل سمجھکر ہر امر میں اس کا اتباع کرنے لگیں ہیں - چنانچہ
ترکی کی عیسائی اقوام بھی بجائے اس کے کہ وہ اپنے آپ کو سلطنت کا جزو سمجھتیں بالکل
منفرد رہیں اور بطور خود اپنی قومیت کے گیت الاپنے لگیں - اس نوائے بے ہنگام کو دول
یورپ نے اور بلند کر دیا - ورنہ سلطنت کا عموماً سلوک غیر مسلم اقوام سے قابل ستایش ہے - اور اسی سال کے
اوائل میں جو خطوط مسلم ورلڈ میں ایک انگریزی سپاہی کیطرف سے شائع ہوئے ہیں اسپر شاہد ہیں - بعض
موخین کی رائے حسب ذیل ہے -

ڈیپر اپنی مشہور تصنیف ہسٹری آف دی کانفلکٹ بیٹوین ریلجن اینڈ سائنس میں لکھتا ہے کہ انصاف و عدالت اور
مذہبی بے تعصبی میں اپنے عہد کے تمام عیسائی دنیا پر ترکوں کو وہی فوقیت رہی ہے جو چھٹی صدی عیسوی میں
عربوں کو تنزل یافتہ بیزنطاین کے مقابلہ میں تمام یورپ پر حاصل تھی - ایڈورڈ کریسی نے تاریخ روم میں ترکوں کو
تہذیب تمدن اور علمی ایجادات اور اختراعات کے لحاظ سے پندرہویں اور سولہویں صدی کے تمام یورپ
میں سب سے برتر قوم تسلیم کیا ہے وہ کہتا ہے کہ انسائیکلوپیڈیا کی قسم کی کتابیں لکھنے کا یورپ میں ترکوں ہی کی تقلید سے
رواج ہوا - یورپ کی زبانوں میں سب سے پہلے انسائیکلوپیڈیا والا میرٹ نے لکھی - لیکن ایک ترکی مصنف کاتب چلپی کی کشف الظنون
العلوم ہی کے مطالعہ سے اسکو رہنمائی ملی تھی - کسرٹ رسد رسانی و فوجی شفاخانوں کا باقاعدہ انتظام ترکوں ہی سے یورپ نے سیکھا قلعہ کی
تعمیر میں تمام یورپ ترکوں کا شاگرد ہے - فوجی باجا تمام یورپ نے ترکوں ہی سے حاصل کیا چیچک کے ٹیکہ کا اصلی موجد ایک ترک تھا مترجم

یورپ سے بہت آگے تھی لیکن عربی تہذیب میں جمود آ جاتا تھا اور مغربی نصرانیت باوجود اپنی جہالت ناشائستگی اور بربریت کے شباب زندگی سے معمور اور بظاہر بہتر امور کی مشتاق تھی۔ اگر مشرق و مغرب کے دوستانہ تعلقات جو گیارہویں صدی میں پیدا ہو چکے تھے بڑھتے رہتے تو دونوں کو بڑا فائدہ ہوتا۔ مغرب میں عربی تہذیب کا اثر جس میں یونان و روم کے پرانے علوم شامل تھے ہماری نشأۃ ثانیہ کو بہت پہلے بیدار کر دیتا۔ اور مشرق میں ازمنہ متوسط کے مغرب کا اثر جس میں لاانتہا قوتیں بھری ہوئی تھیں اسلامی تہذیب کو انحطاط کے مرض سے بچا لیتا جو آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔

لیکن تقدیر الٰہی یوں نہ تھی۔ دنیائے اسلام میں مہذب اور سلیم الطبع عرب کی جگہ متعصب اور بے رحم ترک کو ملی تھی۔ اسلامی حملے پھر شروع ہو گئی۔ لیکن اس بار[۵۱] کسی نصب العین کے حصول کے لئے نہیں تھے۔ بلکہ محض خونخواری

---

[۵۱] مشرقی سلطنت پر حملے تو ہمیشہ ہی ہوتے رہے۔ اسلام سے قبل ایرانی بادشاہوں سے مسلسل اور متواتر لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اور جب مسلمانوں نے ایران کو فتح کر لیا تو خلفائے بنی امیّہ اور بنی عباس دونوں سے وقتاً فوقتاً جنگ و جدال ہوتے رہے۔ جب بنی عباس پر زوال آیا اور زمام اختیار سلجوقیوں کے ہاتھ میں آئی تو بھی پہلے کی ایسی لڑائیاں ہوئیں لیکن اس زمانے میں مشرقی سلطنت کی کمزوری اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ خود رعایا نے حملہ آوروں کا ساتھ دیا۔ چنانچہ عیسائی مؤرخین خود لکھتے ہیں کہ سلجوقیوں کو اپنی تاخت و تاراج میں شہنشاہ کی رعیت سے بہت مدد ملی۔ رعایا کی بے اطمینانی کے اسباب متعدد تھے۔ سلطنت و پیشوایان دین دونوں کے مظالم و استحصال بالجبر نے ہزارہا اشخاص کے قلوب کو پھیر دیا تھا اور زمین کی ملکیت چند اشخاص میں محدود ہو جانے سے آبادی بہت کم ہو گئی تھی۔ در اصل سلجوقیوں اور رومیوں کی جنگ بھی محض نزاعات سرحدی کی حیثیت رکھتی تھی لیکن مشرقی سلطنت کے ضعف و مظالم نے انکو آسانی سے فاتح بنا دیا۔ جس میں نہ غارتگری اور نہ ظلم محرک تھے۔ (مترجم)

کلپنے لگا - پیٹر راہب جیسے بے شمار فدائیان مذہب نے تمام یورپ جنون کے درجہ تک مشتعل کر دیا - دیوانگی کا حاصل دیوانگی ہی - ان غیر معمولی جنگوں میں جو جنگ صلیبی کہلاتی ہیں شرکت کرنے کے لئے مجاہدین کا سیلاب ممالک مغرب سے اسلامی ارض مشرق میں امڈ آیا - ترکون کے اسلامی فتوحات اور اس کا طوفانی جواب حروب صلیبی[1] دو کے لئے سب سے بڑے مصائب تھے - انھوں نے مشرق و مغرب کے روابط کو بالاستقلال درہم و برہم کر دیا - ۱۰۰۰ء میں عیسائی اور مسلمانوں کے تعلقات اچھے خاصے تھے اور ان میں ترقی کے آثار نمایاں تھے - اسلام کے اولین سیلاب سے جو نفرت پیدا ہوئی تھی وہ زایل ہو رہی تھی - اور نصرانیت کے حدود مستقل ہو چکے تھے - کسی فریق کو دوسرے فریق کی آراضی پر دخل کی خواہش نہ تھی - دراصل جس ملک کے متعلق نزاع تھا وہ اسپین تھا یہاں مسلمان اور عیسائی متواتر دست و گریباں رہتے تھے - باینہمہ اسپین کے واقعات فریقین میں سرحدی تنازعات سے زاید وقعت نہ رکھتے تھے - فی الجملہ اسلام اور نصرانیت کے مراسم باہمی اس زمانے میں دوستانہ روابط کی شکل اختیار کرتے جاتے تھے

اگر روابط دوستانہ اسی روش پر قایم رہتے تو بنی نوع انسان کی ترقی نہایت ہی اہم نتایج پر منتج ہوتی - اس زمانہ میں اگرچہ دنیا اسلام علم و تمدن میں مغربی

---

[1] صفحہ ۲۶ حروب صلیبی ان لڑائیوں کا نام ہے جن کے نبرد آزما تیغوں کی جگہ صلیب کے نشان اپنے سینوں پر لگاتے تھے اور اس مذہبی تمغے کی بدولت اپنے آپ کو ارض مقدس اور مدفن مسیح کو غیر مذہب والوں سے چھین لینے کا ذمہ دار سمجھتے تھے - اس مہم کا خیال دوساندیش پاپاؤں اور پرجوش مسیحیوں کے دل میں عرصہ سے چلا آتا تھا لیکن اس کا عملی اظہار ۱۰۹۵ء میں ہوا - یہ سلسلہ خونیں حروب ۱۲۹۱ء میں ختم ہوا - ان میں سب سے اہم تیسری حرب صلیبی تھی جس میں سلطان صلاح الدین کی شخصیت سب سے نمایاں ہے مترجم

رویہ انحطاط تھی ترکی بیرحم حکومت کا مطیع ہو گیا - اور مزید ہولناک مصائب کا منتظر تھا۔ یہ مصائب بھی اصلاً تورانیوں کے ہاتھوں پہونچے[1] - بارہویں صدی کے اختتام پر تورانی اقوام کے مشرقی شعبے عارضی طور پر چنگیز خاں کی سرکردگی میں متحد ہو گئے اس وحشی نے اپنا منحوس خطاب "اِل" رکھا - اور دنیا کو لوٹنے کے لئے چل کھڑا ہوا - اس نے پہلے شمالی چین پر تاخت کر کے اُسے بڑی طرح غارت کیا۔ پھر اُس نے اپنا تباہ کن رُخ مغرب کی طرف کیا - اس خوفناک مغل نے اسطرح عروج حاصل کیا - کہ اس کا نام مہذب دنیا کے دماغ میں آج بھی عفونت پیدا کر دیتا ہے - چنگیز خاں اپنے ساتھ ہوشیار چینی دستکار رکھتا اور بارود سے قلعوں کو اُڑاتا تھا

---

[1] پہلا حملہ تورانیوں کا بسرکردگی چنگیز خاں ہوا - اولاً اسنے محمد شاہ خوارزم سے صلح کی اور تبادلہ تجارت ہوا - لیکن اس کا ایک سفیر مارا گیا اور اُس نے معاوضہ طلب کیا - شاہ موصوف نے انکار کیا - جسکا نتیجہ خوارزمی شاہی کی تباہی ہوا - اور محمد شاہ بحیرہ خزر کے کنارے بے یار و مددگار مرا - محمد شاہ کا لڑکا جلال الدین بھی تباہ حال رہا - اور بالآخر یکہ و تنہا دریائے سندھ کو عبور کر کے ہندوستان میں پناہ گزیں ہوا -

دوسرا حملہ منگو خاں کے عہد میں ہوا - اسنے ایران میں طوائف الملوکی کا حال سُنکر اپنے بھائی ہلاکو خاں کو نظم و نسق کیلئے بھیجا چونکہ اس بدنظمی کا سبب فرقہ باطنیہ تھا لہذا یہ بھی حکم تھا کہ امام فرقہ رکن الدین کا استیصال کیا جائے۔ مغلوں کے خوف سے رکن الدین نے صلح و آشتی کے پیام بھیجے - اور عارضی صلح اس شرط پر ہو بھی گئی کہ پچاس قلعہ مسمار کر دیئے جائیں - قلعوں کے مسمار ہونیکے بعد مغلوں نے حملہ کر دیا - اور مرد و عورت بچے بوڑھے سب کو تہ تیغ کر کے اس فرقہ کا نام و نشان مٹا دیا۔ اسکے بعد ہلاکو خاں نے بغداد کی طرف رُخ کیا - خلیفہ کے سامنے پہونچکر اسنے ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا - انکاری جواب ملنے پر محاصرہ شروع ہوا - تو خلیفہ نے اپنے آپکو حوالے کر کے دروازے کھول دیئے - ۱۵ - فروری ۱۲۵۸ء کو فاتح افواج نے داخل شہر ہو کر قتل و غارتگری شروع کر دی - سات دن قتل عام کا دور رہا - کہا جاتا ہے آٹھ لاکھ نفوس تہ تیغ ہوئے (مترجم)

غارت گری اور تباہی کے لئے تھے ۔ اس وقت سے یورپ کے وسطانی حصوں
پیرجانہ مایوس کن جہالت میں دست بدست لڑائی شروع ہوگئی ۔ مزید براں یہ تف
آئی تھی کہ یہ جنگ صدیوں تک رہی ۔ حروب صلیبی ان حملوں کا جواب
جو عیسائیت پر ترکوں نے چھ سو سال تک کئے اور بالآخر وائنا[1] کی دیوار کے
نیچے ۱۶۸۳ء میں ختم ہوئے لازمی طور پر ان صدیوں کی طویل المدت لڑائیوں سے
تنفر اور تعصب پیدا ہوگیا ۔ جس سے آج بھی اسلامی اور نصرانی تعلقات ناخوشگوار
ہیں ۔ مصطفےٰ کمال کے ترکی قوم پرستوں کے یونانیوں پر اور یونانی افواج کا
ایشیائے کوچک میں مظالم جو ہم اپنے صبح کے اخباروں میں پڑھتے ہیں اُن
باہمی ظلموں کا تتمہ ہیں جو ترک اور کروسیڈر ایک دوسرے کے ساتھ آٹھ سو سال
ہوئے ارض مقدس میں کرتے تھے ۔

ہماری اس کتاب کو ترکوں اور نصرانیوں کی ان پرانی لڑائیوں کی
تفاصیل سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے ان لڑائیوں کا تذکرہ صرف
و مغرب کے قدیم حجاب کی حیثیت سے کیا جاتا ہو ۔ اسلامی مشرق جسمیں عربی تمدن

---

[1] محاصرہ وائنا کا بانی مبانی وزیر اعظم قرا مصطفےٰ پاشا تھا جو اسکا متمنی تھا کہ وہ جنوب اور مائن کے کل علاقے
فتح کرکے ایک ترکی صوبہ قایم کرے اور خود اسکا دراصل شاہ بنجائے ۔ غالباً کسی وزیر نے اپنے ملک کا
نقصان نہیں پہونچایا جیسا کہ قرا مصطفےٰ نے جب ترکی افواج جو تقریباً دو لاکھ تھیں وائنا کے قریب پہونچیں تو
دارالسلطنت کو خالی کردیا لیکن جرمن صوبجات اور پولینڈ سے کمک آئی اور ترکی فوج نے اپنی کیمپ تک کی
حفاظت نہ کی تھی کہ تین طرف سے حملہ ہوا اور سخت ہزیمت واقع ہوئی ترک نہایت پریشانی میں
رو بفرار ہوئے اور بڑی غنیمت اعدا کو نصیب ہوئی اس شکست سے ترکوں کا اقتدار بالکل تنزل پذیر
ہوگیا ۔ (مترجم) ۔

شدہ قوموں کے استقلال کا نتیجہ تھی جن کی لاانتہا مساعی سے ایک عجیب سلسلۂ آبپاشی کا تعمیر ہوا تھا جس نے عراق کو سدابہار باغ اور دنیا کے لئے غلے کی منڈی بنا دیا تھا۔ صدیاں گزر گئیں اور عراق میں مختلف دور ہوئے۔ لیکن ان سب فاتحین نے ان آبپاشی کے انتظامات کو نہ صرف قدر کی نظروں سے دیکھا بلکہ ان کے استقامت میں ہر طرح سے کوشش کی تھی۔ یہی ذرائع آبپاشی ساری شادابی کا مخرج تھے۔ مغلوں نے دیدہ و دانستہ با قاعدہ طور سے انھیں تباہ کر ڈالا۔ آہ! دنیا کا سب سے قدیم تمدن اور اس کے ساتھ ہی انسانی تہذیب کا گہوارہ بڑے طور پر تباہ ہو گیا۔ آٹھ ہزار سال کے مسلسل انسانی مساعی کلیتاً برباد ہو گئے۔ جزیرۃ العرب کی زمین ایک مضر صحت دلدل بن گئی۔ اور اسی حالت میں آج تک ہے۔ خشک سالی کے زمانے میں یہ زمین تپتی ہے اور دریائے سیلاب کے اوقات میں ترائی ہو جاتی ہے۔ اس میں چند مخلوط النسل فلاحین کچے جھونپڑوں میں رہتے اور ان خانہ بدوش بدویوں سے ڈرتے ہیں جو اپنے اونٹ اس آراضی پر چراتے ہیں جو سابق میں مزروعہ تھی۔

عربی تہذیب کو خصوصاً مشرق میں زوال بغداد سے سخت صدمہ پہونچا۔ اس تاتاری فتنہ سے قبل اس کو ایک مہلک صدمہ مغرب میں پہنچ چکا تھا۔ اسلام نے قرون اولیٰ میں شمالی افریقہ کے پار اسپین میں انتہائی عروج و استحکام حاصل کیا تھا حتےٰ کہ اسپینی مسلمان تمدن کے اعتبار سے مشرقی مسلمان کے پہلو بہ پہلو تھا۔ اسپین میں اسلامی دارالسلطنۃ قرطبہ تھا اور یہی مغربی دارالخلافتہ بھی تھا۔ یہ ایک بہت بڑا شہر اور غالباً بغداد سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھا۔ صدیوں تک ہسپانی اسلام نصرانیوں کو شمال کوہستانی ممالک میں محصور رکھ کر با موں رہا۔ جب سے ہی عربی قوت کا انحطاط ہوا عیسائیوں نے

اور اس کے رسالے ہر جگہ پامال ثابت ہوئے۔ ان مغلوں کا شمار دنیا کے خونخوار ترین وحشیوں میں ہے۔ ان کی فتوحات کا نہ تو یہ مطلب تھا کہ وہ اپنی مفتوحہ ممالک میں آباد ہو جائیں یا صرف لوٹ مار کریں بلکہ ان کے دل میں زیادہ تر ایک شیطانی خواہش خونریزی اور غارتگری کی تھی۔ کل آبادیوں کے ذبح کروا لینے شہروں کے مسمار کرنے اور زراعت کے تباہ کرنے میں ان کو لطف آتا تھا۔ اس کے بعد وہ نئی جگہ پہ چلے جاتے تھے چنگیز خاں جب مغرب کی طرف بڑھا اس کے چند سال بعد وہ مر گیا۔ لیکن اس کے جانشینوں نے اس کام کو اسی سرگرمی سے جاری رکھا نصرانیت اور اسلام دونوں وبائے مغلیہ میں مبتلا تھے۔ کل مشرقی یورپ تباہ ہو کر غیر مہذب ہو گیا تھا۔ روسیوں میں مغلیہ نقش پا کا اثر آج بھی نظر آتا ہے۔ نصرانیت کے اقوام اسلامی مصائب کے مقابلہ میں ہیچ تھے۔ مغل حملے پولینڈ سے آگے نہ بڑھے۔ اور مغربی یورپ جو مغربی تہذیب کا گہوارہ تھا اس سے محفوظ رہا۔ اسلام کی حالت دگرگوں تھی۔ مغلیہ افواج شمالی مغربی گوشہ سے داخل ہوئیں۔ اور کل اسلامی دنیا پر یعنی ہندوستان سے لیکر مصر تک طوفان کی طرح پھیل کر لوٹ مار اور قتل و غارتگری کرتی چلی گئیں۔ از منہ متوسط کا خوشگوار ایرانی تمدن ترکی تکالیف سے چھوٹ کر تازہ زندگی کے لئے کوشش کر رہا تھا۔ لیکن مغلوں نے اسے پامال کر دیا۔ اس کے بعد مغل اسلامی تمدن کے مرکز یعنی بغداد کی طرف بڑھے بغداد کے دور ہارون الرشید کی شوکت اور لاکھوں کی زمنی آبادی میں انحطاط ہو گیا تھا تاہم یہ ایک بڑا شہر اور دار الخلافہ اور عربی تمدن کا مسلمہ مرکز تھا۔ ۱۲۵۸ء میں مغلوں نے حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کی کل آبادی کو قتل کروا ڈالا۔ بغداد کو صفحہ زمین سے مٹا دیا۔ یہ مصیبت کی انتہا نہ تھی۔ بغداد جزیرۃ العرب کا دار السلطنت تھا۔ یہ دریاؤں کے درمیانی زمین ابتدائے تاریخ سے دلدلوں اور ریگستانوں سے نکالی گئی تھی۔ اور ان بیم فراموش

استعمال کیا۔ ۱۴۵۳ء میں آل عثمان نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے قدیم مشرقی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔
اور ایک صدی کے اندر اسلامی مشرق کو ایران سے مراکش تک فتح کر لیا اُسی زمانہ میں کل جزیرہ نمائے
بلقان کو فتح کر کے ہنگری میں وائنا کی دیواروں تک بڑھ گئے۔ اپنے مغلیہ بھائیوں کے برخلاف
عثمانی ترکوں نے ایک پائدار سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ یہ سلطنت ایک وحشیانہ قسم کی تھی چونکہ ترک
تہذیب کو بہت کم سمجھتے تھے وہ صرف فوجی ترقیوں کے قدردان تھے جنکی انھوں نے پوری قدردانی کی
اور اچھی طرح زمانہ کے قدم بقدم رہے۔ اپنے عروج کے زمانہ میں ترکوں کے پاس سب سے اچھا توپخانہ
اور ثابت قدم پیدل فوج تھی اور یورپ اُنسے ہر وقت خائف تھا۔

اس عرصہ میں یورپ حقیقی ترقی کر رہا تھا۔ اور جبکہ اسلامی مشرق تغلیہ غارتگری اور سپاہیانہ
ترکی فوجی حکومت کے نیچے پست ہو رہا تھا نصرانی مغرب نشاۃ ثانیہ دامریکہ اور ہندوستان کے بحری
راستہ کے دریافت ہونے سے محظوظ ہو رہا تھا۔ ان معلومات کے اثر میں مبالغہ نہیں ہو سکتا پندرہویں
صدی کے آخر میں جب کولمبس اور واسکوڈی گاما نے یہ قابل یادگار سفر کئے تو مغربی تمدن
مغربی اور وسطی یورپ کے محدود احاطہ میں بند تھا۔ اور اپنی حفاظت کے لئے تورانی وحشیوں سے
جنگ کر رہا تھا جسمیں کامیابی کی بڑی امید نہ تھی۔ مغل تاتاریوں نے اسکو پامال کر رکھا تھا اور
ترک اپنی جنگی قوت کے شباب میں بہت کامیابی کے ساتھ جنوب و مشرق سے بڑھتے چلے آتے تھے
اور یورپ کے قلب تک کو خطرہ میں ڈال رکھا تھا۔ یہ تورانی وحشی جنکے قبضہ میں ایشیا شمالی افریقہ
اور شرقی یورپ تھا۔ ایسے زبردست تھے کہ مغربی تمدن کو اپنی جگہ پر قائم رہنا دشوار تھا۔ حقیقتاً
مغربی تمدن دیوار سے سہارا لئے لڑائی میں مصروف تھا۔ یہ دیوار غیر محدود سمندر تھا ہم مشکل سے سمجھ
سکتے ہیں کہ ہمارے ازمنہ متوسط کے آباؤ اجداد سمندر کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ اُنکے لئے سمندر
ہاتھ پیر پھیلا دینے والے اور مجبور کن شئے تھی۔ اسکو وہ تاریکی اور ہول کا مسکن جانتے تھے۔ چونکہ ازمنہ
متوسط کے یورپ کو حملہ آور ایشیا سے مقابلہ کرنا تھا اور کوئی مدد نہیں تھی اسکا تواز ن میں
کام کرنا تعجب انگیز نہیں۔ مگر چشم زدن میں یہی دریائی دیوار ایک فراخ شاہراہ بن گئی۔ اور یورپ جسکو

مسلمانوں کو جنوب کی طرف دبانا شروع کیا۔ ۱۲۱۲ء میں ہسپانی اسلامی طاقت جنگ لاس نواس دی طولوسا میں شکست کھا کر پارہ پارہ ہوگئی۔ اب فاتح نصرانیوں کو صرف ٹکڑوں کا چن لینا باقی رہا۔ خود قرطبہ بہت جلد نکل گیا۔ اور اسکے ساتھ ہی اسپین کے اسلام کی شوکت بھی روانہ ہوگئی۔ ان متعصب ہسپانی عیسائیوں نے عربی تہذیب کو اسی طرح بیخ و بن سے اکھیڑا جیسا کہ ابن زمانہ میں لامذہب مغل کر رہے تھے۔ بلا شبہہ اسپین کے باقی ماندہ مسلمان بالکل جنوب میں غرناطہ پر مقاومت کرتے رہے۔ اور یہ مقاومت اس وقت تک قایم رہی کہ کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا۔ لیکن یہ مقاومت صرف آخری جانکنی تھی ورنہ مغربی عربی تہذیب کا حقیقت میں تو اس سے پہلے ہی خاتمہ ہوچکا تھا۔

اس اثنا میں اسلامی مشرق کا مغلیہ فتنہ سے خون ہو رہا تھا۔ مغلیہ حملہ آوروں کی لہر پر لہر آرہی تھی۔ آخری قابل الذکر حملہ مشہور "بدنام" "تیمور لنگ" کا پندرہویں صدی کے آغاز میں تھا۔ اس زمانہ تک مغربی مغلوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ لیکن اس سے اُن کے رویہ پر کوئی اثر نہ پڑا تھا۔ اس امر کے اظہار کے لئے کہ تیمور لنگ اپنے جد کا خلف الرشید تھا یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ انسانی سروں کا منارہ بنانا اسکا مشغلہ تھا۔ اور سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ ستر ہزار سروں کا منارہ فارس کے شہر اصفہان کی فتح پر بنایا گیا تھا۔ مغلیہ حملوں کے بند ہونے پر تباہ اور برباد شدہ اسلامی مشرق عثمانی ترکوں کے زیر حکومت آیا۔

عثمانی ترک یا آل عثمان اصلاً ان ترکی قبایل میں سے تھے جو سلجوقی سلطنت کے زوال کے بعد ایشیاء کوچک میں داخل ہوئے۔ ان میں چونکہ متواتر قابل سلاطین ہوئے لہٰذا انھوں نے عظمت حاصل کرلی۔ اور بتدریج قرب و جوار کے ترکی اقوام کو ملالیا۔ اور اس مستحکم قوت کو مشرق اور مغرب میں پرحوصلہ فتوحات حاصل کرنے کیلئے

پچھلوؤں ہی پر مشرقی یورپ اور انڈیز میں حملہ کیا اسلام کا بڑا حصہ مراکش سے لے کر
ایشیا متوسط تک محفوظ رہا۔ اس وقفہ سے اسلامی دنیا نے کوئی نفع نہیں اٹھایا۔
خواب غفلت میں مدہوش یورپ کے کفار کو حقیر جاننے والے اور ہر شکست کو قضاء الٰہی ماننے
والے مسلمان پرانی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور مغربی خیالات اور مغربی ترقی سے نہ واقف تھے
اور نہ واقف ہونے کی کوشش کرتے تھے۔

یہ تھی پست حال دنیائے اسلام۔ جسے انیسویں صدی کے اس یورپ سے
مقابلہ کرنا پڑا۔ وہ یورپ جس کی سرگرمیاں صنعتی انقلاب سے بڑھ گئی تھیں اور ان
جدید علوم سے مسلح تھا جس کی مثال سابق میں کبھی نہیں ملتی۔ اور جدید اختراعات نے
قدرت کے اسرار کو منکشف کر کے اسکے حملہ آور ہاتھ میں ایسے ہتھیار دے دئے تھے۔ جو
اس سے پہلے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتے تھے۔ نتیجہ ناگزیر تھا۔ از کار رفتہ اسلامی سلطنتیں
مغربی حملوں کے سامنے یکے بعد دیگرے زیر ہو گئیں۔ اور کل اسلامی دنیا بہت جلد یورپی
طاقتوں میں تقسیم ہو گئی۔ انگلستان نے ہندوستان و مصر پایا۔ روس نے کوہ قاف
کے پار جا کر ایشیا متوسط پر قبضہ کیا۔ فرانس نے شمالی افریقہ کو فتح کیا۔ اور دیگر اقوام
یورپ نے اسلامی وراثت کے چھوٹے چھوٹے حصے پائے۔ ان فتوحات کا آخری درجہ جنگ
عظیم میں ظاہر ہوا۔ اس جنگ کے اختتام پر جو صلح نامے کے شرائط لکھے گئے ان سے ترکی سلطنت
خاتمہ ہو گیا اور ایک بھی اسلامی سلطنت ایسی نہیں رہی کہ حقیقت میں آزاد کہا جاسکے۔ اسلامی دنیا
مغلوبیت کم از کم کاغذ پر تو مکمل ہو گئی۔

کم از کم کاغذ پر اس لئے کہ عین ظاہری کامیابی کے وقت مغربی حکومت کو ایسا چیلنج
گیا کہ جس کی مثال پہلے نہیں ملتی۔ اس مغربی فتوحات کے صد سالہ زمانہ میں اسلامی دنیا میں
اندرونی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ مغربی تمدن کے روز افزوں سیلاب نے آخر کار جذبۂ
مشرق کو بیدار کر دیا۔ اور اسلام بالآخر اپنی کمزوری سے واقف ہوا۔ اس حقیقت کیا

راہ گریز تھی دفعتاً مالک بحر اور اس اعتبار سے مالک دنیا بن گیا ۔ انسانی تاریخ میں قوموں
کے سب سے بڑی تبدیلی کی صورت آبادانی و توسع پذیر ہو گئی ۔ بجائے اس کے کہ وہ اس
حالت میں ہو کہ خواہ ایشیائی اقوام کا حملہ کریں اور جن پر براہ راست حملہ کر کے فتح
ناممکن تھا یورپ والے اپنی مرضی کے مطابق پہلوؤں پر حملہ کر سکتے تھے ۔ مزید براں دنیا
پلہ یورپ کی طرف بھاری ہو گیا ۔ کل جدید دنیا پردہ سے باہر ہو گئی جہاں سے یورپ نے بہا
دولت پیدا کر کے اپنی اندرونی معاشرت میں نئی روح پھونکی اور ایسی ترقی کا سنگ بنیاد رکھا جو
قدیم ایشیائی حریف پر بہت جلد تفوق حاصل کرنے میں معین ہوا ۔ امریکہ اور انڈیز کے علاقے
میں جامد اسلامی مشرق کے وسائل ہیچ تھے ۔ اس طریقہ پر مغربی تمدن تیزی اور سرعت کے
ساتھ جلد جلد ترقی کرنے لگا اس نے ازمنہ متوسطہ کے زنجیروں کو دور کر دیا ۔ اور پائیں
طلسم سے کر موجودہ زمانہ کی روشنی میں چل نکلا ۔

ان سب امور کا اسلام پر کوئی اثر نہ ہوا ۔ اسلامی مشرق نے مغربی تہذیب کی گاڑی
اُدھر علی اور پستی میں گرنے لگا ۔ اس کی جنگی قوت بھی بہت جلد غایب ہو گئی ۔ کیونکہ ترک
عیش میں مبتلا ہو گئے اور فنون حرب کی ترقی مسدود ہو گئی پھر زمانہ تک مغرب اندرونی نزاعات
اور آل عثمان کا کارناموں سے مرعوب ہونے کی وجہ سے مشرق پر حملہ کرنے کی ہمت نہ کر سکا ۔ لیکن
سنہ ۱۶۸۳ء میں ترکوں نے جو بے سوچے سمجھے ویانا پر حملہ کیا اُسمیں اُنہیں تباہ کن شکست دینے کے
بعد مغرب کو معلوم ہو گیا کہ ترکی سلطنت کمزوری کے انتہائی درجہ کو پہنچ گئی ہے ۔ اس وقت سے
لیکر ترکی سلطنت جس پر بے تحاشا مغربی حملے متواتر ہوتے رہتے تھے فنا ہونے سے محض
اس لئے بچ گئی کہ مغربی سلطنتیں آپس میں رشک و حسد رکھتی تھیں اور ترکی غنایم پر
لڑتی تھیں ۔

مگر اسلامی دنیا نے بحیثیت مجموعی مغربی حملوں کی ضرب کا احساس انیسویں
صدی کے قبل تک نہیں کیا اٹھارہویں صدی کے دوران میں مغرب نے اسلامی صفوف کے

عظیم اخلاقی انقلاب ہونے والا ہے جس کی محرک جبر کی بجائے انسانی قوت ارادی ہوگی
اس تحریک کے ختم کے بعد نصرانی اشتراکیت کی تحریک ظہور میں آئی۔ جس کا منشا یہ تھا۔ کہ
اشتراکیت کے اصول کو صنعت کی تعاون عمل میں بطیب خاطر استعمال کیا جاوے۔
اور یہہ دونوں تحریکیں صنعت و حرفت کی خرابیوں کے خلاف احتجاج تہیں۔ اور چونکہ
انکا منشا یہ تھا کہ بلا مداخلت حکومت خرابیوں کو دور کیا جاوے۔ لہذا یہ سیاسی
نہ تھیں۔ موجودہ مسئلہ اشتراکیت فرڈینیڈ لاسل و کارل مارکس اور فریڈیرک اینجلس
کی بلند پروازیوں کا نتیجہ ہے۔ یہہ عملی اور سیاسی ہے۔ یہہ قدیم روایت کو ترک کرکے
حکومت کے زور سے اپنے مقاصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مارکس نے اشتراکیت
کو عملی مسئلہ بنا دیا۔ لیکن اُس نے حصول مقصد کے لئے جدال و قتال کی بھی ضرورت
ثابت کی جس کی بدولت خود اس تحریک کے مؤیدین میں دو گروہ ہو گئے۔

ایک گروہ کا یہہ ادعا ہے کہ جزوی اصلاحات کو قبول کرنا مارکس کے
تعلیم کے خلاف ہے کیونکہ ایسا کرنے سے سرمایہ داروں کی مغلوبیت
معرض التوا میں آجاتی ہے۔

دوسرا گروہ ہر ایسی اصلاح میں مدد دینے کو تیار ہے جو صحیح ہو۔
بالفاظ دیگر اوّل گروہ اس پر زور دیتا ہے کہ کل نظام عمل متحد رکھا
جاوے اور اُس کو طبقہ کی خود شناسی سے حاصل کیا جاوے
گروہ دویم غیر مزدوری پیشہ جماعت سے بھی تعاون عمل
کی اجازت دیتا ہے۔

ان دونوں فریق کو "انقلاب پسند" اور "ترمیم پسند"
یا مارکسٹ" اور "مصلحین" کہتے ہیں۔

سنہ ۱۹ء کی انتخابات سے اور نیز دیگر سیاسی تجربوں سے

پچیس کروڑ پیروانِ اسلام میں مراکش سے لیکر چین تک اور ترکستان سے [illegible] تک ایک
ایسا ہیجان پیدا ہو گیا کہ جس نے اگرچہ خاص شکل اختیار نہیں کی ہے تاہم اس کی قوت
اور شدت میں کلام نہیں ہو سکتا۔ پہلی چنگاری صحرائے عرب یعنی مہدِ اسلام میں [illegible]
روشن ہوئی تھی۔ اور انیسویں صدی کے آغاز میں اسلام کی اصلاح کے لئے وہابی
تحریک شروع ہوئی جس نے فوراً حیاتِ اسلامی کی دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دیا۔ [illegible]
سے اپنے موقع پر اتحادِ بین الاسلامی شروع ہوا۔

مزید براں ان ضروری اندرونی تحریکات کے ساتھ مغرب سے بیرونی تحریکات کا
ایک طوفان آیا۔ یعنی دستوری حکومت اور قوم پرستی۔ سائنس کی تعلیم و نظام کارخانہ جات
یہاں تک کہ اشتراکیت[1] و بالشویزم کے جدید خیالات اور احساسات شروع ہوئے۔
ان نئی طاقتوں کے باہمی تاثیر سے برانگیختہ اور یورپ کے تعدی پیہم کے دباؤ
سے برافروختہ ہو کر اسلامی دنیا حیات اور عمل کی طرف بیش از پیش کمر
بستہ ہوئی۔ جنگ عظیم ایک نہایت پرزور تصادم ثابت ہوئی۔ اور آج اسلام
بڑی طاقتوں کے ساتھ ایک جدید اسلامی دنیا کی تعمیر کے لئے بے چین ہے۔
اسلامی مستقبل کی تعمیر میں کون کون سی طاقتیں بروئے کار ہیں؟ اسی سوال
کے حل کرنے اور صحیح اندازہ کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

”مصنف“

---

[1] اشتراکیت یعنی سوشلزم ایک اقتصادی نظریہ ہے جس کا منشا یہ ہے کہ ذرائع پیداوار پبلک
ملکیت ہو جائیں یہ لفظ سب سے پہلے انگلستان میں استعمال ہوا اور رابرٹ اووین (۱۷۷۱ء تا
۱۸۵۸ء) کے خیالات کا اظہار اس لفظ سے کیا گیا۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا میں عنقریب ایک

نوٹ متعلق صفحہ ۳۴ سطر ۲

متصور ہے -

چونکہ موجودہ حکومت روس کسی معلومہ نظریہ پر عمل پیرا نہیں ہے اس لئے اس کی کوئی "علمی تعریف" کرنا محال ہے -

لیکن لینن اور اُس کے کارپردازوں کے بیانات کے بموجب یہہ معلوم ہوتا ہے کہ بالشویزم سے وہ طرز حکومت مراد ہے جس کے اراکین سرمایہ داری کے مخالف ہوں -

ارضی سوال کے متعلق بالشویکی جواب یہ ہے کہ "خود انفصالی اصول پر تصفیہ کیا جاوے" لیکن عمل اس اصول سے بالکل جدا ہے ۱۹۱۸ء میں بالشویکیوں کی تعداد قلیل تھی لیکن چونکہ اسلحہ اور سامان خورش کے تنہا مالک تھے اُنھوں نے اپنے مخالفین کو خوف زدہ کردیا۔ اِس کے اصول و عقائد ہنوز مستنبط نہیں ہوسکے ہیں لیکن سب زیادہ ترنفی پر مبنی ہیں -

بالشویکی جب سے برسرِ اقتدار ہوئے اُنہوں نے کل اخبارات حتے کہ اشتراکیں کے اخبارات بھی بند کردیے -

. . .

مجالس عامہ آزادی تقریر اور تعلیم مذہبی ممنوع تھیں اُن کے بجائے اشتراکی نصاب تعلیم قایم کیا

متعلق صفحہ ۳۷

دیگر اثرات برسرکار ہوئی۔ ایک طرف تو سلطنت کی کاروائی کی کمی سے اشتہاہات بڑہے اور دوسری طرف اس مطالبہ پر زور دیا گیا کہ مزدوروں کو صنعت و حرفت پر مزید اختیار و اقتدار حاصل ہو۔

موجودہ سیاسی نظامات کو خریداروں کا نمایندہ تسلیم کرکے یہہ ضرورت پیدا ہوئی کہ مزدوروں کا نظام نمایندگان قایم کیا جاوے۔ لہذا گلڈ اشتراکین ملکیت تو سلطنت کی رکہنا چاہتے ہیں لیکن صنعت و حرفت کا انتظام قومی گلڈوں کی سپرد کرنا چاہتے ہیں یعنی ہر قسم کے کارخانوں کا ایک گلڈ ہو جس میں کل کام کرنے والے شامل ہوں اور بیرونی خارجی اثرات سے محفوظ ہوں۔ یہہ اراکین اپنی منتظمیں منتخب کریں اور اپنی محنت کے ثمرات سے خود ساختہ قواعد کے بموجب بہرہ اندوز ہوں اس سے منشا یہہ ہے کہ صنعت و حرفت کی ایک پارلیمنٹ قایم کی جائے جس کا مرتبہ سیاسی پارلیمنٹ کے مساوی ہو اور نزاعات دونوں پارلیمنٹوں کی مشترکہ کمیٹی طے کرے (مترجم)

بالشویزم اس طرز حکومت کا نام ہے جو روس میں کرنسکی کی حکومت کے زوال کے بعد بسرکردگی لینن قایم ہوئی بالشوی کی در اصل معنی "اکثریت" کے ہیں۔ لیکن سیاسی تعریف کے بموجب اس لفظ سے "انقلاب کی"

فصل اوّل

مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ

اٹھارھویں صدی تک اسلامی دنیا اپنے ضعف کی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ نئی قوت کے کسی جگہ بھی آثار نہیں پائے جاتے تھے۔ ہر جگہ جمود و تنزل نمایاں تھے۔ آداب و اخلاق قابل نفرت تھے۔ عربی تہذیب کے آخری آثار مفقود ہو کر ایک قلیل تعداد عیاشانہ عشرت میں اور عوام وحشیانہ ذلت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ تعلیم مردہ ہو چکی تھی اور چند درسگاہیں جو ہولناک زوال میں باقی تھیں وہ افلاس و غفلت کی وجہ سے دم توڑ رہی تھیں۔ سلطنتیں مطلق العنان تھیں اور ان میں بد نظمی و خونریزی کا دور دورہ تھا۔ جگہ جگہ کوئی بڑا خود مختار جیسے سلطان ترکی یا ہند کے شاہان مغلیہ کچھ ظاہری شان قائم کیے ہوئے تھے۔ اگرچہ صوبجات کے امراء اپنے آقاؤں کی طرح آزاد سلطنتیں جو ظلم اور استحصال بالجبر پر مبنی تھیں قائم کرنے کے ہمیشہ کوشاں تھے۔ اسی طرح امراء متواتر سرکش مقامی رئیسوں اور قطاع الطریق کی جماعتوں کے خلاف جو ملک کو ازدیاد پہنچاتے تھے برسرپیکار رہتے تھے۔ اس منحوس طرز حکومت میں رعایا لوٹ مار و ظلم و پامالی سے نالاں تھی۔ دیہاتی اور شہریوں میں محنت کے محرکات مفقود ہو گئے تھے۔ لہٰذا تجارت اور زراعت دونوں اس قدر کم ہو گئی تھیں کہ محض سد رمق کے حصول کے لیے کی جاتی تھیں۔

گیا تھا۔

حقوق ملکیت اگرچہ مسدود نہیں کئے گئے لیکن افسران سلطنت کے بالکل ماتحت رکھے گئے۔ مترجم

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب خلافت کی شکل کو خداداد جمہوریت سے مشرقی مطلق العنانی میں تبدیل کیا تو آزادی پسند عرب متنفر ہو کر اپنے صحراؤں کو واپس آ گئے یہاں انھوں نے اپنی بدوی آزادی کو قائم رکھا۔ خلفا اور سلاطین کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ ان وسیع و دور دراز پیاس سے دم گھوٹنے والے اور جلتی ہوئی ریگستانی ویرانوں میں بہت زیادہ پیش قدمی کریں۔ جہاں کہ جلد باز حملہ آوروں کے جنگل میں اپنے پیروں ناگہانی موت کے منہ میں جا تا ہے۔ عرب بدن نے کسی کو آقا تسلیم نہیں کیا۔ اپنے گلوں اور ریوڑوں کو لیکر ادھر اُدھر گھوما کرتے۔ جا بجا ریگستان کے وسط میں سرسبز نخلستان آباد ہو جاتے ہیں ان ریگستانوں میں انھوں نے اپنی ابتدائی مذہبی اور سیاسی خوبیوں کو قائم رکھا خانہ بدوش بدوی اپنے شیخ قبیلہ کی زیر اثر زندگی بسر کرتا تھا۔ اور نخلستان کے متوطن عرب کسی سربرآوردہ خاندان کے امارت کو تسلیم کر لیتے تھے۔ لیکن ان امرا کو بہت ہی کم اختیارات حاصل تھے۔ رسومات قدیمہ اور شیخی عوام کی رائے سے اُن کے اختیارات محدود تھے اور اُن کی خلاف ورزی خطرناک تھی۔ گو ترکوں نے ساحلِ بحرِ قلزم اور بلاد مقدسہ پر برائے نام اقتدار حاصل کر لیا تھا لیکن نجد یعنی اندرونی وسیع حصہ آزاد تھا۔ مذہب اور سیاسیات میں نجدی عرب اپنے اجداد کے عقائد کے مقلد تھے صنعتِ اسلام کی خرابیوں کو انھوں نے حقارت سے رد کر دیا۔ اور ابتدائے اسلام کی سادہ دینیات کو جو اُن کی طبائع کے موافق تھے۔ وہب الاعتصام رکھا۔

اس دیرینہ تر اور بہتر عہد کی فضا میں عبدالوہاب کی صدا پیدا ہوئی ابتدا ہی سے اُن کو مطالعہ کتب اور مذہب کا شوق تھا۔ اور بہت جلد اُن کے علم اور تقدس کی شہرت ہو گئی۔ عنفوان شباب ہی میں وہ حج بیت اللہ کو گئے۔ انھوں نے مدینہ میں بھی تحصیل علم کرنے کے بعد ایران تک سفر کیا۔ اور بالآخر نجد واپس آ گئے۔ واپسی پر اپنے

مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا تصوف کے طفلانہ توہمات کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا مسجدیں ویران و سنسان پڑی تھیں۔ عوام جہاں اُن سے بھاگتے تھے اور تعویذ گنڈے اور مالا میں پھنگر گدے فقرا اور دیوانے درویشوں سے اعتقاد رکھتے تھے۔ اور بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کو جاتے تھے اور اُن کی پرستش بارگاہ ایزدی کے شفیع اور ولی کے طور پر کی جاتی تھی کیونکہ اُن جہال کا خیال تھا کہ خدا ایسا برتر ہے کہ وہ اُس کی طاعات بلا واسطہ نہیں ادا کر سکتے ہیں قرآن مجید کی اخلاقی تعلیم کو نہ صرف پس پشت ڈال رکھا تھا بلکہ اُس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی افیون و شراب خوری عام ہو رہی تھی زنا کاری کا زور تھا اور ذلیل ترین اعمال قبیحہ کھلم کھلا نے حیائی کے ساتھ کیے جاتے تھے یہانتک کہ مقامات مقدسہ یعنی مکہ اور مدینہ افعال قبیحہ کے قعر مذلت بن گئے تھے۔ اور حج جس کو رسول اللہ نے فرایض میں تسلیم کیا تھا بدعات کی وجہ سے حقیر ہو گیا تھا فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی اور محض بے روح رسمیات اور مبتذل توہمات کے سوا کچھ نہ رہا تھا اگر محمد صلعم پھر دنیا میں آتے تو وہ اپنے پیروان کے ارتداد اور بت پرستی پر بیزاری کا اظہار فرماتے۔

اس جہالت کے زمانہ میں وسیع عربی ریگستان یعنی مہد اسلام سے مومنین کو صراط مستقیم کی طرف دعوت دینے والی صدا پیدا ہوئی۔ اس مخلص مصلح یعنی عبدالوہاب نے ایسا نور ہدایت روشن کیا جو اسلامی دنیا کے ہر گوشہ میں پھیل گیا اور مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کر کے قرون اولی کے جوش کو تازہ کر دیا مسلمانوں کی اہم نشاۃ کا یہیں سے آغاز ہو گیا۔

محمد بن عبدالوہاب تقریباً ۱۷۰۰ء میں صحرائے عرب کے وسطی علاقہ یعنی نواح نجد میں پیدا ہوئے۔ اسلامی دنیا کی پستی میں صرف نجد ہی ایک صاف مقام تھا۔

لیکن تقدیر الٰہی یوں نہ تھی سلطان ترکی جب وہابی سیلاب کو نہ روک سکے تو انھوں نے اپنے مشہور و معروف طاقتور نائب محمد علی سے استمداد کی جو جانباز البانی اس وقت مصر پر کامل طور پر قابض ہو گیا تھا۔ مغربی فوقیت کو اس نے علانیہ تسلیم کر کے متعدد یورپی افسر اپنی ملازمت میں رکھ لیئے تھے۔ جنھوں نے نہایت سرعت کے ساتھ ایک زبردست فوج کی ترتیب دی جس میں زیادہ تر البانیہ کے پہاڑی جنگجو تھے۔ اور جس کا نظام اور تربیت یورپ کے نمونہ پر مرتب کیا گیا تھا محمد علی نے سلطان کی طلبی کے حکم کی فوراً تعمیل کی اور یہ بہت جلد واضح ہو گیا کہ وہابی جوش بھی یورپ کی بندوقوں اور توپوں کا جو کارآزمودہ ہاتھوں میں تھیں مقابلہ نہ کر سکتا تھا تھوڑے عرصہ میں مقامات مقدسہ واپس لے لیئے گئے۔ اور وہابی افواج ریگستان میں پسپا کر دی گئیں بڑھنے والی وہابی سلطنت سراب کی طرح غائب ہو گئی۔ وہابیت کا سیاسی دور ختم ہو گیا۔[۱]

لیکن وہابیت کے روحانی دور کا اب آغاز ہوا۔ نجد اصلاحی جوش کا مرکز رہا اور یہاں سے نئی روح کی تنویر اطراف عالم میں پھیل گئی۔ مقامات مقدسہ میں بھی وہابیت نے مذہبی لہجہ کی درستی کر دی اور بے شمار حجاج جو تمام دنیائے اسلام

---

[۱] وہابی تحریک کے لیے ملاحظہ ہو موسیو لے شاتلی ایر کی کتاب "انیسویں صدی میں اسلام" مطبوعہ پیرس ۱۸۸۸ء۔ ڈبلیو جی۔ پالگریو کی کتاب "مشرقی مسائل پر مضامین" مطبوعہ لندن ۱۸۷۲ء ڈی بی میکڈونلڈ کی کتاب "اسلامی دینیات" مطبوعہ لندن ۱۹۰۳ء صفحہ ۔ ایچ برگہارٹ کی کتاب "بدوؤں اور وہابیوں کے تذکرے" مطبوعہ لندن ۱۸۳۱ء دو جلد۔ اے شو کو کا مضمون "وہابیوں کی الٰہیات" جو جرنل ایشیاٹک نمبر ۴ جلد ۲ صفحہ ۲۰۸ پر شائع ہوا۔ (مصنف)

مشاہدات کے لحاظ سے اُن کے دل میں غیظ وغضب پیدا ہوا اور انھوں نے ملت اسلامیہ کی اصلاح کی تبلیغ کا مصمم ارادہ کر لیا۔ سالہا سال تک وہ اطراف عرب میں گھومتے رہے اور بالآخر اُنھوں نے قبیلہ سعود کے شیخ محمد کو جو نجد میں سب سے بڑے سردار تھے اپنا ہم خیال بنا لیا اس سے عبدالوہاب کو اخلاقی اقتدار اور مادی تقویت حاصل ہو گئی اور اُنھوں نے اس زریں موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ بتدریج صحرائی عربوں میں رسول خدا صلعم کے زمانہ کی طرح سیاسی اور مذہبی اتحاد قایم ہو گیا درحقیقت عبدالوہاب پہلے خلفا حضرت ابوبکر صدیق و عمرؓ کے سچے پیرو تھے ۱۷۶۵ء میں جب وہ مرے تو سعود اُن کے قابل جانشین ہوئے۔ جدید وہابی سلطنت قریب قریب مکہ کی خلافت کا نمونہ تھی۔ اگرچہ سعود کی فوجی طاقت زیادہ تھی لیکن اُنھوں نے اپنے آپ کو رائے عامہ کا پابند سمجھا۔ اور اپنی رعایا کی جائز آزادی میں کبھی مداخلت نہ کی طرز حکومت اگرچہ سخت لیکن عادلانہ اور اچھا تھا۔ وہابی قضاۃ لایق اور ایماندار تھے۔ امن عامہ ایسے کامل طور سے قایم کیا گیا تھا کہ رہزنی کا سدباب ہو گیا تھا تعلیم سرگرمی سے پھیلائی جاتی تھی ہر نخلستان میں مدرسے تھے۔ اور بدوی قبایل میں معلم بھیجے جاتے تھے۔

نجد کو مستحکم کر کے سعود نے دنیائے اسلام کو فتح اور پاک کرنے کے اہم کام کی تیاری کی۔ اوّل منزل مقصود بلاد مقدسہ تھے۔ اُنیسویں صدی کے شروع میں یہ مقصد حاصل ہو گیا۔ ان وہابی عساکر کے مقابل کوئی چیز نہ ٹھہر سکی کیونکہ یہ وہابی ترکوں کی منافرت سے مشتعل تھے ترکوں سے اُن کی منافرت نے دینی اور امارت اسلامیہ کو غصب کر لینے کی وجہ سے تھی جو عرب خیال کے بموجب صرف عربوں کا حصہ تھی۔ ۱۸۱۴ء میں جبکہ سعود شام پر فوج کشی کی تیاری کر رہے تھے فوت ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے لیئے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہابی کل مشرق کو خس وخاشاک سے صاف کر کے ایک ہی وار میں اسلام کو خرابیوں سے پاک کر دینگے

کا دوسرا پرتو تھی فی الواقع ایک ہی قرن میں خالص وہابی تحریک بڑھ کر ایک عام تحریک
یعنی نشاۃ اسلام میں مبدل ہو گئی۔ اس میں بھی بجائے خود مختلف صورتیں پیدا
ہو رہی تھیں اور ان میں سے خاص تحریک وہ ہے جو اتحاد بین الاسلامی کہلاتی ہے۔ اس
تحریک کا جہاں تک سیاسی تعلق ہے اس کو میں دوسری فصل میں ذکر
کروں گا فی الحال ہم کو اسلامی بیداری کے دیگر پہلوؤں پر خصوصاً جن کا مذہب
اور تمدن سے تعلق ہے غور کرنا چاہیئے۔

وہابی تحریک صحیح معنوں میں خالص اصلاح تھی۔ اس کا مقصد خرابیوں کی اصلاح
ضعیف الاعتقادی کی رسومات کا انسداد اور ابتدائے اسلام کا احیاء تھا۔ بعد کی کل
افزونیاں مثلاً ازمنہ متوسط کی فقہا کی تحریرات و تاویلات اور رسمی و صوفیانہ بدعات
اور پیر پرستی غرضکہ ہر قسم کی تبدیلیاں رد کی گئی تھیں۔ رسول اللہ کے تعلیم کردہ خالص
توحید اپنی تمام شان سادگی کے ساتھ تلقین کی جاتی تھی اور قرآن کو نصوص ظاہری
کے ساتھ انسانی اعمال کا تنہا رہنما مانا جاتا تھا اس اصولی سادگی کو سخت اخلاقی قوانین سے
وابستہ کر دیا تھا نماز روزہ و دیگر احکام شرع جن کی رسول خدا صلعم نے تعلیم فرمائی تھی احتیاط
سے ادا کیے جاتے تھے سادہ ترین طرز معاشرت کی پابندی کرائی جاتی تھی ریشمی ملبوس
قیمتی غذا و شراب و افیون و تمباکو و قہوہ اور دیگر لذات قطعاً ممنوع تھے۔ مذہبی عمارات
میں بھی فن معماری کی ممانعت تھی وہابیوں نے مدینہ میں روضۃ النبیؐ اور مساجد کے
مناروں کو بدعات سیئہ سمجھ کر منہدم کر دیا۔ باوجود اپنے اخلاقی خلوص کے وہابی بہت
تنگ نظر تھے۔ اور یہ اسلام کی خوش قسمتی تھی کہ اُن کا سیاسی اقتدار جلد جاتا رہا
اور ازاں بعد مجبوراً اُن کو اپنی مساعی اخلاقی تعلیم کے لیے محدود کرنے
پڑے۔

اکثر نقادان مذہب اسلام اس وہابی تحریک کو اس امر کے ثبوت میں پیش

سے سالانہ حج کے لیے آتے تھے پرجوش مصلح بنکر واپس گئے۔ وہابیت کے خمیر نے دور دراز مقامات میں ہلچل ڈالدی مثلاً شمالی ہند میں ایک وہابی مجاہد سید احمد[1] نے پنجابی مسلمانوں کو ابھارکر حقیقتاً ایک مذہبی سلطنت قایم کرلی مگر اُن کی ناگہانی موت سے شمالی ہند میں وہابی فتوحات کا امکان جاتا رہا۔ اس سلطنت کو سکھوں نے ۱۸۳۱ء میں برباد کردیا لیکن جب انگریزوں نے اس ملک کو فتح کیا تب بھی وہابی عقائد کی سلگتی ہوئی چنگاریوں نے بہت کچھ پریشان کیا یہ خیالات عرصہ تک باقی رہے اور اسباب غدر میں ممد ہوئے۔ اور انھیں عقائد نے افغانستان اور شمالی[2] مغربی سرحد کے وحشی قبایل کو ہمیشہ کے لیئے مذہبی تعصب میں رنگ دیا۔ انھیں سنین میں مشہور سید محمد بن سنوسی اپنے وطن الجزائر سے مکہ آئے اور اُن وہابی اصول کو اخذ کیا جن کی بنا پر اس عظیم بین الاسلامی اخوت کی بنیاد ڈالی جو اُن کے نام سے موسوم ہے۔ فارس میں بابی[3] تحریک اگرچہ اصولاً وہابیت سے بالکل بیگانہ تھی لیکن بلا شبہ یہ بھی وہابی اقتضا

---

[1] یہ سید احمد خاں علی گڈھ والے سر سید احمد خاں نہیں ہیں جو اُنیسویں صدی کے وسط کے ایک آزاد خیال مسلمان تھے مصنف یہ حضرت سید احمد صاحب بریلی کے رہنے والے اور مولانا اسمٰعیل شہید کے پیر تھے۔ مترجم

[2] شمالی ہند کے مسلمانوں کے اندرونی جوش مذہبی سے جو خوف انگریزوں کو اُنیسویں صدی کے وسط میں تھا اس کو سر ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب "مسلمانان ہند" مطبوعہ لندن ۱۸۷۱ء میں بیان کیا ہے مصنف سر سید احمد خاں علیہ الرحمۃ نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب "مسلمانان ہند" کا جواب "اسباب بغاوت ہند" نامی تمام لندن میں لکھ کر شایع کیا وہ ملاحظہ طلب ہے ۱۲ مترجم۔

[3] بابی تحریک کے متعلق ملاحظہ ہو موسیو کلیمانتوارت کی کتاب "بابی مذہب" مطبوعہ پیرس ۱۸۸۹ء کاونٹ ارتھروی گوبینو کی کتاب "تین سال ایران میں" مطبوعہ پیرس ۱۸۵۹ء مسلمانوں کی نشاۃ کی ان سب ابتدائی تحریکات کا اچھا خلاصہ موسیو واستانلی ایر کی کتاب مذکورۃ الصدر میں موجود ہے ۱۲ (مصنف)

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ أَمْرِ دِينِكُمْ فَخُذُوا بِهِ وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيِي فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ (مسلم)

میں بھی صرف ایک انسان ہوں جب میں کسی مذہبی امر کی بابت حکم دوں تو اُس کو قبول کرو اور جب میں امور دنیا کی بابت حکم دوں تو میں ایک انسان سے زیادہ نہیں ہوں "

اور دوسری جگہ پر اُس زمانہ کو جس میں انقلاب کامل لازمی ہوگا پیش نظر رکھ کر اس طرح فرماتے ہیں :-

إِنَّكُمْ فِي زَمَانٍ مَنْ تَرَكَ مِنْكُمْ عُشْرَ مَا أُمِرَ بِهِ هَلَكَ ثُمَّ يَأْتِي زَمَانٌ مَنْ عَمِلَ مِنْهُمْ بِعُشْرِ مَا أُمِرَ بِهِ نَجَا (ترمذی)

"تم ایسے زمانہ میں ہو کہ اگر تم اوامر کا دسواں حصہ بھی ترک کر دو تو تم برباد ہو جاؤ گے اس کے بعد ایسا زمانہ آنے گا کہ جو شخص اوامر میں دسویں حصہ کی بھی پابندی کرے گا تو وہ نجات پا جاوے گا"[1]

قبل اس کے کہ ہم زمانۂ حال کے اسلامی مصلحین کے خیالات و مساعی پر بحث کریں بہتر ہوگا کہ ہم مستند مغربی نقادوں کے اُن دعاوی پر غور کریں کہ اسلام فطرتاً اصلاح اور علوم انسانی کی توسیع کی تدریجی متابعت کرنے کے ناقابل ہے عیسائی مخالفین کے علاوہ[2]

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح مصنف

[2] اس علم مناظرہ کی بہترین جدید مثالیں ریورینڈ ایس ۔ ایم زویمر کی تصانیف ہیں جو عربوں میں مشہور مبلغ رہا ہے بالخصوص اس کی کتاب "عربستان یعنی مہد اسلام" مطبوعہ ایڈنبرا ۱۹۰۰ء اور "اسلام کا الزام" مطبوعہ لندن ۱۹۰۸ء نیز ملاحظہ ہو کتاب "موسومہ" موجودہ اسلامی دنیا" جو اُن مکتوبات کا مجموعہ ہے جو بمقام قاہرہ ۔ مصر ۱۹۰۶ء میں پروٹسٹنٹ مشنری کانفرنس میں پڑھے گئے تھے ۱۲ مصنف

کرتے ہیں کہ اسلام اصلاً تنزل کا میلان رکھتا ہے اور جبلی طور پر ارتقائی وسعت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ مگر یہ تنقیدات غیر مستند معلوم ہوتی ہیں ہر مذہبی اصلاح کی پہلی منزل یہ ہے کہ وہ اپنی ابتدائی عقائد کی طرف بلا تمیز کے عود کرے۔ مذہبی مصلح کے لیے بدعات ما بعد سے بلالحاظ اُن کے اوصاف کے انکار کرنا ہی اصلاح کا واحد ذریعہ ہے ہماری اپنی پروٹسٹنٹ اصلاح اسی طریقہ پر شروع ہوئی اور اراسمس جیسے ہمدردِ بنی آدم نے پروٹسٹنٹ کی تنگ نظری سے تنگ اور معترض و متنفر ہو کر تحریک کو نے سود سمجھا تھا اور اس نے اپنے خیال کا یوں اظہار کیا کہ تحریک حقیقی تہذیب کے لیے خطرناک تھی اور پوپ کی قدامت کی بجائے بائبل کی قدامت کو قائم کرتی تھی۔

امر واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی بیداری کی اصلاحانہ شروعات فوراً زیادہ تعمیری راہوں پر وسعت پذیر ہوئیں۔ اور ان میں سے بعض حقیقی حریت سے رنگ گئیں۔ اوائل انیسویں صدی کے مسلم مصلحین اپنے مذہبی ماضی کی تھوڑی ہی تحقیق کرپائے تھے کہ انھیں اعتزالی عقائد کا علم ہوا۔ ہم اُس نزاع کا پہلے ذکر کر چکے ہیں جو اسلام کے شروع ایام میں معقول اور منقول کے مابین بڑی شدومد سے ہوا تھا اس نزاع میں منقول نے ایسی فتح پائی تھی کہ معتزلین کی یاد بھی جاتی رہی تھی مگر اب یہ یادیں دوبارہ تازہ ہونے لگیں اور آزاد خیال مصلحین کو یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ معتزلی علما کی تحریرات اور کلام قدیم دونوں سے اُن کے خیالات کی تائید ہوتی تھی۔ اس اصول نے کہ بُرہانِ عقلی نہ کہ کورانہ نقلی تقلید معیار ہوگی اُن تمام اور اصلاحات کے لیے جن کی مصلحین سب سے زیادہ خواہشمند تھے دروازے کھولدیے برسبیل تمثیل مصلحین کو ذیل کی حدیث کتب احادیث میں ملی۔

قدامت اور اسناد کی وہی کورانہ تقلید اور آزاد خیالی اور علوم سائنس سے وہی بدگمانی اور مخالفت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی مقدس کتابیں بالخصوص شریعت کی کتب پڑھنے سے اور نیز گزشتہ ایک ہزار سال کی مسلم تاریخ پر نظر ڈالنے سے ایسی حالت نظر آتی ہے جو فی الجملہ موجودہ ترقی اور تہذیب کے بالکل منافی ہے^۱ لیکن کیا پندرھویں صدی کے شروع میں یہ سب امور نصرانیت پر صادق نہیں آتے تھے۔ اسلامی شریعت کا مسیحی قوانینِ مذہب سے مقابلہ کرو

---

^۱ جس اسلامی دور کا مورخ ذکر کرتا ہے وہ زیادہ تر انحطاط کا زمانہ ہے۔ اس میں کوئی سوال نہیں ہو سکتا کہ اسلام نے عالمگیر ترقی کی اور قرون اولیٰ اسلامی روایت و درایت کا بہترین زمانہ تھے۔ اگر فی الحقیقت اسلامی شریعت ترقی کی سدِ راہ ہوتی تو قرون اولیٰ کے مسلمان جن کا مدعائے زندگی اپنی مذہب کی محبت و تقلید تھا کبھی ترقی نہ کر سکتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی ممالک میں تنزل محض اسلامی احکام کی پابندی نہ کرنے سے پیدا ہوا۔ موجودہ ترقی سے علوم و فنون بالخصوص سائنس کی ترقی مراد ہے یورپ نے ان علوم کو مسلمانوں ہی سے سیکھا اور وہی موجودہ تہذیب کے موجد ہیں۔ یورپ کو تو صرف اُس میں ترقی کرنے کا فخر حاصل ہے۔ علم کیمیا محض عربوں کی ایجاد ہے (مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو دیباچہ قانون ایران) رہی تہذیب مغربی تہذیب و تمدن کی نمایاں صورت اُس کی صنعتی و حرفتی ترقی ہے اس میں بھی مسلمانوں کی ترقیاں نہایت نمایاں ہیں۔ اسلام میں جو تجارت کی فضلیت بیان کی گئی ہے وہ قابل لحاظ ہے اسی کے واسطے کلام پاک میں فضل خدا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے شریعت اسلام صنعت و حرفت و تجارت کی موید اور حامی ہے۔ ہاں وہ موجودہ انڈسٹریلزم کی عیوب کی مخالف ہے وہ محض مادیت کا والہ و شیدا بننے نہیں دیتی ہے اور نہ اُن مظالم کو روا رکھتی ہے جسے خود یورپ روزانہ برا کہتی ہیں۔

مترجم

رینان جیسے مستشرقین اور لارڈ کرومر جیسے اسلامی ممالک کے منتظمین بھی جو اعتراض کرتے ہیں وہ اسی قسم کے ہیں لارڈ کرومر اپنے بیان میں اس نازک بحث کا جامع خلاصہ ان الفاظ میں کرتے ہیں "اسلام کی اصلاح ہی نہیں ہوسکتی یعنی اصلاح شدہ اسلام اسلام ہی نہیں رہتا بلکہ دوسری چیز ہو جاتا ہے۔" یہ تنقید چونکہ اصحاب کی ہے جنھوں نے اسلام کا غور سے مطالعہ کیا ہے اور اکثر مسلمانوں کے ذاتی طور پر بڑے دوست رہے ہیں لہذا وقعت کی نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل ہے تاہم مذاہب پر مورخانہ نظر ڈالنے سے اور خصوصاً گزشتہ صدی کے اسلامی مصلحین کے خیالات اور ان کے مساعی کے نتائج پر غور کرنے سے ان مایوس کن الزامات کا بطلان ہوتا ہے۔

اوّلاً یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کی آج وہی حیثیت ہے جو نصرانیت کی پندرھویں صدی میں آغاز اصلاح[۲] کے وقت تھی منقول کو معقول پر ترجیح فوقیت

---

[۱] کرومر کی کتاب "عہد حاضرہ کا مصر" جلد دوئم صفحہ ۲۲۹ مطبوعہ لندن ۱۹۰۸ء۔ موسیو رینان کی خیالات کے لیے ملاحظہ ہو اس کی کتاب "اسلام اور سائنس" مطبوعہ پیرس ۱۸۸۳ء۔ مصنف

[۲] اصلاح سے وہ مسیحی کلیسا کا انقلاب مراد ہے جو سولھویں صدی میں ہوا اور جس کی بدولت اکثر سلاطین یورپ نے رومی کلیسا سے قطع تعلق کرکے پراٹسٹنٹ عقائد اور نظام کا اتباع کیا۔ سب سے پہلے اس پر عمل جرمنی میں کیا گیا اور اس کی آغاز لوتھر کے اعتراضات سے ہوئی اور دو سال میں لوتھر اور مقلدین یورپ کے تزامات پر کل مغربی یورپ متوجہ ہو گیا اسی زمانہ میں ایک تحریک ہو گئی اور دوسری کالون نے شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سولھویں صدی کے وسط میں پروٹسٹنٹ کے دو نظامات کلیسا جاری ہو گئے یہ اثرات کل مسیحی دنیا میں پھیل گئے۔ ڈنمارک وسویڈن وانگلستان کا شاہی مذہب پروٹسٹنیٹ ہو گیا۔ شمالی یورپ کے جرمن قومی اقوام زیادہ تر اس جدید فرقہ کا اتباع کرنے لگیں لیکن اس کا اثر دیگر ممالک پر بھی پڑا۔

مترجم

اور شکنجہ کشی کی دھمکی دیکر اُس کو مجبور کیا گیا کہ وہ اس قابل نفریں الحاد سے توبہ کرے کہ زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہو

امر واقعہ یہ ہو کہ محمد صلعم، علم کی وقعت کرتے تھے آپ کے خود الفاظ اس کی بہترین شہادت ہیں۔ بعض احادیث حسب ذیل ہیں۔

(۱) علم کو اگر ضرورت پڑے تو سرحد چین تک تلاش کرو۔ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ کَانَ بِالصِّین

(۲) مہد سے لحد تک علم کی تلاشش کرو۔ اطلبوا العلم من المهد الی اللحد

(۳) علم کا ایک لفظ سو نمازوں سے قیمتی ہو۔ کلمۃ یسمعها الرجل خیرٌ له من عبادة سنة

(۴) علما کی روشنائی شہدا کے خون پر فضیلت رکھتی ہو۔ ان مداد العلماء افضل من دم الشهداء

(۵) علم دین کا ایک لفظ سیکھ کر ایک مسلمان بھائی کو سکھانا صد سالہ عبادت سے افضل ہو۔

(۶) نبی کے وارث علما ہیں۔ العلماء ورثة الانبیاء

(۷) خدا نے عقل سے برتر کوئی چیز نہیں پیدا کی۔

(۸) بلا شبہ ایک شخص نے نماز ادا کی۔ روزہ رکھے زکوۃ دی حج کیا اور دیگر کارہائے خیر کیئے تاہم اُس کو جزا اُسی قدر ملے گی جتنی عقل اُس نے صرف کی۔

ان احادیث اور اسی قسم کی دیگر احادیث سے ثابت ہوتا ہو کہ موجودہ اسلامی مصلحین کو اپنی آزاد روی میں کتب ہائے مقدسہ سے کافی معاونت ملتی ہو بلا شبہ میرا یہ منشا نہیں ہو کہ چونکہ اسلام آزاد اور ترقی پذیر ہو اس لیے اسلام کی اصلاحی تحریک کی کامیابی خود بخود یقینی ہو صفحات تاریخ میں اس کے خلاف بہت سے اندوہناک مثالیں ملتی ہیں درحقیقت ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ اسلام میں خود اوائل ایام کی اُمید افزا آزادانہ تحریک بالکل نیست و نابود ہو گئی۔ مگر تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہو کہ جب زمانہ ترقی کی موافقت کرتا ہو تو مذاہب اصلاح پاکر اور وسعت خیالی پیدا کر کے ترقی کی صلاحیت

دونوں میں ایک ہی روح ہے۔ بر سبیل تمثیل روپیہ کو سود پر قرض دینے کی بابت شرعی ممانعت کو دیکھو اس ممانعت پر اگر عمل کیا جاوے تو موجودہ اصول کے بموجب کاروبار اور صنعت ناممکن ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ مثال جو اکثر اس ثبوت میں پیش کی جاتی ہے کہ اسلام عملی طور پر موجودہ تہذیب کے منافی ہے[1] لیکن نصرانی قانون مذہب نے بھی سود کی ایسی ہی ممانعت کی ہے اور یہ ممانعت اس سختی سے نافذ تھی کہ صدیوں تک یہودی کل یورپ کی تجارت کے اجارہ دار ہو گئے تھے اور پہلے عیسائی جنھوں نے روپیہ قرض دیا یعنی لومبارڈی کے رہنے والے وہ تقریباً مرتد سمجھے جاتے تھے۔ ہر شخص اُن سے متنفر تھا اور اکثر اُن کو آزار پہنچایا جاتا تھا۔ اب آزادیِ خیال اور علمی تحقیقات کے متعلق مسلمانوں کی مخالفت کے مسئلہ پر غور کرو کیا اسلام اس سے زیادہ بھی نفرت انگیز منظر دکھا سکتا ہے جو کم از کم بظاہر حال ہے نصرانیت کی تاریخ میں واقع ہوا جبکہ گلیلیو اکبر یورپ کے محکمۂ احتساب کے سامنے طلب کیا گیا

---

[1] مسئلہ سود میں فی نفسہ جو احکام شرعی ہیں وہ نہایت صحیح ہیں۔ جہانتک ربوا کا تعلق اُس قرضہ سے ہے جو ضروریات زندگی وغیرہ کے لیے لیا جاوے اُس کا حرام اور مضر ہونا بدیہی ہے چنانچہ مصنف نے خود فصل اقتصادی انقلاب کے فقرہ ہشتم کے آخر میں ذکر کیا ہے۔ رہا تجارت یا بنک میں روپیہ لگانا اور اس پر سود لینا اس کے متعلق خود مسلمان علماء میں اختلاف ہے۔ علماء مصر و عراق اور بعض علماء ہند اس کے جواز کا فتویٰ دے چکے ہیں۔ ایسے مسئلہ کو جس پر خود مسلمانوں میں اختلاف ہو پیش کرنا بعید از عقل ہے۔ چونکہ اسلامی دنیا میں صرف خانگی مصارف پر سود لیا جاتا تھا اور اس کی سختی سے ممانعت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب تجارتی اغراض کا سود رائج ہوا تو قدیم عقیدہ کے بموجب مسلمانوں میں شک و شبہ پیدا ہوا لیکن یہ کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس سے اسلام کو موجودہ ترقی کا منافی قرار دیا جائے ۱۲

مترجم

کہ دراصل اُن کا عمل کیا ہو۔[1]"

موجودہ زمانہ کی اسلامی حُریت کی پہلی ہمت افزائی جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس پرانے معتزلہ ادبیات کی دریافت سے ہوئی جو ہزار سال پہلے کا تھا یقینی امر ہو کہ اسلام کسی زمانہ میں بھی آزاد خیال اشخاص سے خالی نہیں رہا۔ اس کے تاریک ترین دور میں بھی مروجہ ظلمت کے خلاف چند آوازیں بلند ہوئی تھیں۔ مثلاً سولہویں صدی میں مشہور الغزالی نے لکھا تھا کہ "یہ ذرا بھی ناممکن نہیں ہو کہ وہ ادراک جو خدائے تعالےٰ نے ازمنہ ماضیہ کے لوگوں کو عطا نہ فرمائے ہوں آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ رکھے ہوں۔ مبداء فیاض ہر قرن کے عقلا کے قلوب پر اپنے انعام اور تجلیات کی تراوش کو کبھی بند نہیں کرتا۔[2] اسلام کے عہد تاریک کی ان متفرق صداؤں نے زمانہ حال کے مصلحین کی ہمت بڑھائی اور انیسویں صدی کے وسط تک ہر اسلامی ارض میں دور اندیش لوگوں کی جماعتیں پیدا ہو گئیں۔ بلاشبہ اُن کی تعداد شروع میں ناقابل التفات تھی اور متعصب ملاؤں[3] نے اُن کی تکفیر کی اور عام جہال اُن سے نفرت کرنے لگے۔ پہلا ملک جس میں کہ مصلحین کا اثر نمایاں طور پر محسوس ہوا ہندوستان تھا یہاں ایک جماعت نے سرکردگی

---

[1] اسمٰعیل حامد کی کتاب "شمالی افریقہ کے فرانسیسی مسلمان" مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۰۶ء مصنف

[2] منقول از کتاب الاسلام مصنفہ پیروں مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۱۸ء مصنف

[3] مسلمانوں کے مذہبی علماء کو ملا کہتے ہیں اگرچہ یہ پوری طور پر نصرانی پیشوایان دین کے مطابق نہیں ہیں آنحضرت صلعم پوجاریوں کے عہدہ کے خلاف تھے لہذا اسلامی شریعت میں ایسا کوئی مختص پیشوایان دین کا طبقہ یا فرقہ معین نہیں ہو جیسا کہ نصرانیت۔ یہودیت۔ مذہب براہمہ یا دیگر مذاہب میں ہو۔ ہر مسلمان ہر مذہبی کام کو اصولاً سرانجام دے سکتا ہو لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ایسے اشخاص کا فرقہ پیدا ہو گیا جو اسلامی دینیات اور شریعت کے ماہر تھے۔ بالآخر یہ اشخاص عملاً پیشوایان دین ہو گئے اگرچہ اصولاً ان کو دینیات کے قانون دانوں میں شمار کرنا چاہیئے درویشوں کے بھی مذہبی فرقے پیدا ہو گئے لیکن ابتدائی اسلام ان سے بالکل نابلد تھا۔ مصنف

پیدا کر لیتے ہیں کوئی انسانی جماعت جب وہ اچھی طرح شاہراہ ترقی پر چلنے لگتی ہو تو صرف
عقائد کی بنا پر رجعت قہقری نہیں کرتی۔ یہ ممکن ہو کہ وہ رُک جائے لیکن اگر ارتقائے قوت زور
لگاتی رہتی ہو تو قہری موانعات یا تو رفع کر دیئے جاتے ہیں یا ان سے پہلوتہی کی جاتی ہو
یا بالکل مٹ جاتے ہیں یہ ممکن نہیں ہو کہ اب اسلامی دنیا پر ارتقائی اثرات کی کمی ہو جائے
اب[1] اسلام مغربی تہذیب سے خوب انس پا چکا ہو اور مغربی خیالات کا نفوذ روز بروز
اُس میں روز بروز بڑھ رہا ہو اسلام اب اگر چاہے بھی تو نہ وہ ترک تعلقات کر سکتا ہو اور
نہ اپنے آپ کو جدا کر سکتا ہو لہٰذا ہر شئے سے اس کی اصلاح کامل کی فال ملتی ہو۔ لیکن لارڈ کروم
جیسے ناقدین یہ اعتراض یقیناً کرتے ہیں کہ اصلاح شدہ اسلام اسلام ہی نہ ہوگا۔ مگر یہ کیوں؟ اگر
لوگ اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے رہیں اور تبلیغ محمدی سے قوت روحانی اخذ کرتے رہیں تو
اُن کو نام سے کیوں محروم کیا جائے موجودہ نصرانیت، زمانہ متوسط کی نصرانیت سے بہت مختلف
ہو اور متعدد نصرانی فرقوں میں بہت بڑا اصولی اختلاف ہو تاہم وہ سب لوگ جو اپنے
آپ کو عیسائی سمجھتے ہیں ان کو سب لوگ بھی سوائے ان متعصبین کے جو فقہا زمانہ سے جدا
ہیں عیسائی ہی سمجھتے ہیں۔

آؤ اب ہم اسلامی مصلحین کی تنقید کریں یہ تنقید ان کی کتب مقدسہ اور تواریخ کے اندازہ
پر نہ ہوگی بلکہ اُن کے اقوال و اعمال سے کیونکہ ان میں سے ایک انجزائری نے نہایت معقول
طور پر کہا ہو کہ آدمیوں کا اندازہ اُن کے کتابوں کے حروف سے نہ کرنا چاہیئے بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے

---

[1] اسلام کو مغربی تہذیب یا اصلاً مغربی بوع الارض سے یہ نفع تو ضرور ہوا کہ مسلمان اپنی خواب غفلت
سے بیدار ہو رہے ہیں۔ اور مغربی سیاسیات کا اخلاق سے بعض اوقات معرا ہونا اُن کو اپنے مذہب کی عظمت
کا یقین کامل دلاتا ہو مذہب اسلام کو خود کسی امداد یا فیض کی ضرورت نہیں ہو۔ ہاں مسلمانوں کو خواب غفلت
سے بیدار ہو کر اسلام کی متابعت کی ضرورت ہو اور فضا میں اس تموج کے آثار پائے جاتے ہیں۔ مترجم۔

"قانونی و ذہنی ترقی کا سدِ راہ نہیں ہے" وہ اسلام کی موجودہ پستی پر اظہارِ رنج کرتے ہوئے کہتا ہے "موجودہ اسلام اپنے مذہبی پیشواؤں کے انتظام اور سخت تعصب و مہلک جہالت اور متوہمانہ رسوم کے باعث درحقیقت نبی آخر الزماں کے تعلیم کردہ اسلام پر ایک اتہام ہے" وہ اپنے الفاظ کو حسبِ ذیل آزادانہ اقرارِ ایمانی کے ساتھ ختم کرتا ہے "کیا اسلام ترقی کے مخالف ہے؟ میں اس کا جواب نہایت زور کے ساتھ نفی میں دونگا۔ اسلام بعد اخراج فقہ نہایت سادہ مذہب ہے اس کے اصلی ارکان خدائے واحد کا اقرار اور رسالت محمد صلعم پر ایمان رکھنا ہے باقی محض بدعات اور غیر ضروری امور ہیں"[۵۵]

اسی عرصہ میں آزاد خیال اشخاص بلادِ اسلامی کے دیگر حصص میں اپنا اثر پیدا کر رہے تھے۔ جنگ کریمیا کے بعد سے عبدالحمید[۵۶] کی خود مختاری کے زمانہ تک آزاد خیال ترک فی الواقع حکومت کے سرگروہ تھے۔ رشید پاشا و مدحت پاشا جیسے ترکی آزاد خیال وزرا نے سلطنتِ عثمانی کی آزادی اور تجدید کی سچی مگر ناکامیاب کوششیں کیں لیکن سلطان عبدالحمید کے مہلک مظالم بھی ترکی حریت کو فنا نہ کر سکے۔ احرار یا تو چھپ رہے یا ممالکِ غیر کو چلے گئے اور ۱۹۰۸ء میں انقلاب پیدا کر کے ظالم (عبدالحمید) کو معزول کیا اور نوجوان ترکوں کا اقتدار قائم کر دیا۔ مصر میں حریت کی بنیاد مستحکم ہوگئی اور اس کے نمائندہ ایسے مسلم برآوردہ اشخاص ہوئے جیسے شیخ محمد عبدہ رکن جامع الازہر جو لارڈ کرومر کے واجب الاحترام دوست تھے۔ دور افتادہ اسلامی ٹکڑے جیسے روسی تاتار بھی نئی روح سے بیدار ہوئے اور ان میں روشن خیال[۵۷]

---

۵۵ صلاح الدین خدا بخش کے مضامین درباره ہندوستان و اسلام، صفحات ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۸ مطبوعہ لندن ۱۹۱۲ء ۔ مصنف

۵۶ ۱۸۵۶ء لغایۃ ۱۸۷۶ء ۔ مصنف

۵۷ روسی تاتاریوں میں آزاد خیالی کی تحریکات کی بابت ملاحظہ ہو ابینیس و ہمبری کی کتاب "بلادِ مشرق میں مغربی تمدن"، مطبوعہ لندن ۱۹۰۶ء ۔ مصنف

سرسید احمد خاں علیہ الرحمۃ نے بلحاظ تحریک آزادی کا آغاز کیا جماعتیں قایم کیں کتابیں اور اخبارات شایع کیئے۔ اور علی گڑھ میں مشہور کالج کی بنیاد ڈالی۔ ابتدائی آزاد مصلحین کا اچھا نمونہ سرسید احمد ہیں۔ طبعاً قدامت پسند اور دینیات میں بالکل راسخ الاعتقاد ہونے کے باوجود انھوں نے حقیقی وہابی جوش سے اسلام کی موجودہ پستی کی مذمت کی وہ مغربی خیالات کے علانیہ قدر دان تھے۔ اور مغربی اوصاف کے اخذ کے خواہشمند تھے۔ چنانچہ ۱۸۶۶ء میں لکھتے ہیں" ہم کو یورپی سائینس کی تصانیف پڑھنا چاہیے اگرچہ یہ مسلمانوں کی لکھی ہوئی نہیں ہیں اور خواہ ہم کو اُن میں ایسے امور ملیں جو قرآنی تعلیم کے خلاف ہیں ہم کو زمانۂ سابق کے عربوں کا اتباع کرنا چاہیئے۔ جن کو فیثا غورث کی تصانیف پڑھکر یہ خوف نہیں ہوتا تھا کہ اُن کے عقائد میں تزلزل پیدا ہو جائے گا۔

ہندوستانی آزاد خیال مسلمانوں کا گروہ روز بروز بڑھتا گیا۔ اور اُنھوں نے مولوی چراغ علی اور سید امیر علی[۲] جیسے لیڈر پیدا کیئے۔ جنھوں نے نئے عیب انگریزی میں عالمانہ کتابیں لکھیں جو تمام دنیا میں معروف ہیں یہ لوگ اپنے آپ کو جدید معتزلین کہتے ہیں اور انھوں نے ایسی اصلاحات چلیے کہ شریعت کی مکمل جانچ و پرتال۔ اور اسلام کی نئی زمانہ کے موافق تجدید کی۔ دلیرانہ تبلیغ کی۔ ایک دوسرے سربرآوردہ شخص یعنی صلاح الدین خدابخش نے اس نقطۂ خیال کو خوب ادا کیا ہے وہ لکھتا ہے" رسول خدا (صلعم) کا کبھی بھی یہ خیال نہ تھا کہ وہ اپنی اُمت کے خیالات کو پابہ زنجیر کر دیں یا اُن کے واسطے ایسے مقررہ غیر قابل تبدیل و تغیر قوانین بنا دیں۔ قرآن شریف مومنین کے لیئے ایک کتاب ہدایت ہے اور وہ اُن کے معاشرتی و اخلاقی و

---

[۱] اقتباس از مضمون نوشتہ موسیو لیوں کا ہون جولا دنیا اور رام بو کی عام تاریخ جلد ۱۱ صفحہ ۴۰۹ پر درج ہے۔ اس میں اُنیسویں صدی کی اسلامی دنیا کی ذہنی ترقی پر نہایت عمدہ عام تبصرہ ہے ۱۲ مصنف

[۲] بالخصوص ان کی نہایت مشہور کتاب "اسپرٹ آف اسلام" مطبوعہ لندن ۱۸۹۱ء مصنف

سے متحد ہیں اور اپنے آپ کو جاہل عوام کا پیدائشی لیڈر اور متمتع سمجھتے ہیں۔ یہ انقلاب پسند سیاسی اقتدار کے بھوکے ہیں اور اس مغربی اقتدار سے جو اُن کے بلند عزائم کا سدراہ ہو ناراض ہیں لہٰذا ان میں سے اکثر انتہائی قوم پرست ہیں اور اتحاد بین الاسلامی کے انقلابی منصوبات میں غرق ہیں درحقیقت اکثر ہم کو ایک عجیب منظر نظر آتا ہے کہ ایک ملحد اپنے آپ کو ایک مسلم جانباز کی حیثیت سے پیش کر کے نئی دروبشانہ سرگرمی کا اظہار کرتا ہے مسٹر بخش اس قسم کے لوگوں کا نہایت اچھا خاکہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے "میں ایک جنٹلمین سے واقف ہوں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ اُن کی زندگی کی کامیابی اُن کے مذہب کی بدولت ہے۔ اگرچہ ظاہر میں وہ کل تعلیم اسلام کا اتباع کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً عام جلسوں میں بھی اپنے ہم مذہبوں کے ترجمان اور نمائندہ کا کام کرتے ہیں لیکن یہ معلوم کر کے مجھے بڑا اچنبہ آیا کہ اپنے مذہب اور اس کے بانی کے متعلق اُن کی ایسی رائے تھی جس کو وہ انتہائی غصہ سے اور کمین حقارت سے رد کرتا۔"[1]

ہم تحریک بین الاسلامی اور قوم پرستی کے باب میں ان دونوں کی اچھی طرح سے تنقید کرینگے جس چیز پر میں یہاں زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اصل اسلامی اصلاحات جن کو مذکورہ بالا سچے مصلحین عمل کر رہے ہیں ان پر اس کا کیسا خراب اثر پڑے گا؟ جاہل عوام کے مذہبی تعصبات کو مشتعل کرنے کے لیئے ان کی بداندیشانہ خواہشات اور ہر مغربی شے سے سوائے جنگی ترقیات کے منافرت کلی کا اظہار ہوتا ہے جیسا کہ ایک سربرآوردہ نوجوان ترک کے قلم سے نکلا ہے وہ لکھتا ہے "ہاں مسلمانوں کا مذہب تمہاری ترقی کی دنیا کا علانیہ مخالف ہے! اے یورپ کے باطریق تم کو معلوم ہو کہ ایک عیسائی اس کی کچھ ہی منزلت کیوں نہ ہو صرف نصرانی ہونے کی وجہ سے ہماری نظروں میں ایسی ہستی ہے جو تمام انسانی مراتب سے محروم ہے۔ ہمارا استدلال سادہ اور قطعی ہے ہم کہتے ہیں کہ جس شخص کی قوت تمیز اس قدر درماندہ ہو کہ خدائے

---

[1] صلاح الدین خدا بخش کی تصنیف مندرجہ بالا صفحہ ۲۴۱ مصنف

خواہان ترقی پیدا ہوئے۔

آزاد خیال مصلحین جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے بلاشبہ اسلامی تمدنی ترقی کے جنوبی یہ قدامت پسند بہترین یتیمی ہیں ایسی صحت بخش تبدیلی کے قبول کرنیوالے ہیں تاہم وہ اپنے موروثی توازن کو قائم رکھنا چاہتے ہیں یہ سچے مذہبی لوگ ہیں اور ان کا ایمان ہے کہ اسلام زندہ اخلاقی قوت ہے۔ اور اسی سے اپنی غذائے روحانی اخذ کرتے ہیں۔

مگر اسلامی دنیا میں اور جماعتیں بھی ہیں جو مغربیت کی ایسی شکار ہو گئی ہیں کہ ان کو اپنی روحانی اور تمدنی ماضی سے کم و بیش کوئی ربط نہیں رہا۔ اسلامی دنیا کے زیادہ مہذب حصص میں خصوصاً ہند و الجزائر و مصر جیسے ممالک میں جو یورپی تسلط میں عرصہ سے ہیں ایسے مغربی تعلیم یافتہ یا مغربی طرز کے ٹھاٹھ بنائے مسلمان ہیں جن کا مذہبی رویہ بے التفاتی سے لیکر الحاد تک کے مختلف درجہ کا ہے۔ ان کے قلوب سے سابق اسلامی جوش بالکل رخصت ہو گیا۔ اسمٰعیل حامد الجزائری اپنے ابنائے وطن کے اس فرقہ کی روش کو خوب بیان کرتا ہے "یورپین الحاد کا اثر الجزائر کے مسلمانوں پر بھی پڑا ہے اگرچہ یہ اپنے مذہب کی ظاہری رسومات سے ارتباط رکھتے ہیں لیکن عموماً غیر نافع مذہبی خیال کی یادتیوں سے تجاہل برتتے ہیں اگرچہ یہ خود اپنے مذہب کو خود ترک نہیں کرتے ہیں لیکن ان کے خواب و خیال میں بھی غیر مسلم کو مسلم بنانا نہیں آتا اگرچہ یہ چاہتے ہیں کہ اپنی اولاد تک اس کو پہنچا دیں لیکن دیگر انسانوں کی نجات کے لیے ذرا بھی پروا نہیں کرتے یہ نہ تو ایمان ہے اور نہ آزاد خیالی بلکہ سرد مہری ہے۔"[1]

ان لاابالی آزاد منشوں سے بڑھ کر ایک دوسرا طبقہ ہے جو بالکل ہی مختلف روش پر ہے ان میں نہایت ہی متضاد جذبات کا اجتماع ہے۔ یہ وہ نوجوان ہیں جن کے دماغوں میں انتہائی مغربی خیال مثلاً الحاد، اشتراکیت، بالشویزم وغیرہ وغیرہ بھرے ہوئے ہیں۔ طرفہ یہ ہے کہ یہ پرجوش انقلاب پسند مغرب کی مشترکہ منافرت کے لیے اسلام کے متعصب قدامت پسندوں

---

[1] اسمٰعیل حامد کی کتاب موسومہ شمالی افریقہ میں فرانسیسی مسلمان صفحہ ۲۶۸ جو ۱۹۰۶ء میں بمقام پیرس طبع ہوئی

بدقسمتی سے عام مسلمانوں میں ایسے لیکچروں کا جلد اثر ہوتا ہے اگرچہ آزاد خیال مصلحین اسلام میں روزافزوں اقتدار حاصل کر رہے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ ابھی قلیل التعداد منتخب جماعت ہے جن کے نیچے جاہل عوام ہیں جو دیرینہ جہالت کی تاریکی میں مبتلا ہیں اور اپنی ہی دنیا کے مدح سرا ہیں اور اسی کو انسانی ہستی کا بہترین نمونہ اور تعصب سے ہر بیرونی چیز کو خراب و قابل نفرت اور فریب دہ سمجھتے ہیں ان کو اگر مغرب کی برتری کا اعتراف بھی مجبوراً کرنا پڑتا ہے تو اُن کی نفرت کسی طرح سے کم نہیں ہوتی۔ اس تبدیلی کی روح سے جو اُن کو پرانے راستوں سے نکال رہی ہے اندھا دھند سرکشی کرتے ہیں۔ اس عالمگیر مغربی اقتدار سے جو اُن کو چاروں طرف سے دبا رہا ہے اُن کا غصہ اور بھی بڑھ جاتا ہے ایسے لوگ اتحاد بین الاسلامی اور تحریک قوم پرستی کے رہنماؤں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ہیں جو اُن کو اپنے ناجائز اغراض کے لیے حسب دل خواہ ڈھال لیتے ہیں۔

درحقیقت اسلام آج آزادانہ اصلاحی اور مبالغہ آمیز وطن پرستی کی انقلابی قوتوں میں مفترق ہے ارتقائی اصلاح کی تنہا امید صرف لبرل سے وابستہ نہیں ہے بلکہ رفتار زمانہ بھی اُن کے موافق ہے کیونکہ اسلامی دنیا میں مسلسل طور پر مغربی ترقی سرایت کر رہی ہے اور یہ عمل اسی طرح سے جاری رہے گا سوائے اس کے کہ مغربی تہذیب خود برباد وتباہ ہو جائے۔

اگرچہ آزاد خیالوں کی کامیابی اغلب معلوم ہوتی ہے لیکن یہ غالی وطن پرست اور انقلاب پسند نہ معلوم کیا کیا تاخیرات باجنگی اور متعصبانہ رکاوٹیں پیدا کر دیں گے۔ اسلامی اصلاحات اور مشرق و مغرب کے تعلقات خطروں سے خالی نہیں۔ ان نامبارک امکانات پر ہم بعد میں بحث کریں گے۔

واحد کی شہادت سے انکار کرے اور مختلف الانواع معبود پیدا کرے تو وہ انسانی حماقت کا بدترین مظہر ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اُس سے بات کرنا ہی ہماری عقل کی حقارت اور رب العالمین کی عظمت کے خلاف ایک گناہ ہے جھوٹے معبودوں کا پرستار ناسپاسی کا عفریت ہے وہ کونین میں ملعون ہے اُس سے لڑ کر اُسے مسلمان کرنا یا اُس کو مٹا دینا مسلمان کا سب سے مقدس فرض ہے ہمارے خدائے واحد کے یہی ازلی احکام ہیں اس دنیا میں ہمارے لیئے مسلم یا غیر مسلم صرف دو فرقے ہیں محبت خیرات واخوت مسلموں کے لیئے ہے ذلت منافرت اور جنگ غیر مسلم کے لیئے غیر مسلموں میں سب سے زیادہ گناہگار اور مغضوب وہ ہیں جو خدا کو پہچان کر دنیوی والدین سے اُس کی پیدائش بتاتے ہیں۔ اور اُس کے لڑکا اور ماں ثابت کرتے ہیں یہ ہولناک ضلالت ہماری نظروں میں ہر قسم کے فسق سے بڑھی ہوئی ہے! ایسے مردودوں کی موجودگی ہماری ہستی کے لیئے عذاب ہے۔ اُن کے اصول ہماری مذہبی پاکیزگی کی سخت توہین ہیں اُن کے ارتباط سے ہمارے جسم ناپاک ہو جاتے ہیں اُن سے کسی قسم کا تعلق رکھنا سوہان روح ہے۔

"تم کو نفرت کرتے ہوئے ہم نے تمہاری سیاسی مجالس اور فوجی نظام کو سیکھا۔ علاوہ بریں قدرت نے تمہارے ذریعہ سے ہم تک نئے اسلحہ پہنچا دیئے تم نے خود ہمارے جہاد و شہدا کے غیر فانی عقیدہ کو پھر مشتعل کر دیا۔ ہمارے نوجوان ترک۔ ہمارا بابی فرقہ۔ ہماری نئی اخوتیں یہ سب مختلف الاشکال فرقے ہیں ان کا منشاء اور غرض ایک ہی ہے ان کا کیا مقصد ہے آیا عیسائی تہذیب کا اتباع ہرگز نہیں۔"[۱]

---

[۱] یہ مضمون شیخ عبدالحق نے شریف پاشا کے اخبار مشروطیت میں ماہ اگست ۱۹۱۲ء میں لکھا تھا لیکن میں نے اسے کو ای سردی ایر کی کتاب "اسلام و حمایت قومی" مطبوعہ قسطنطین تک البحر یہ ۱۹۱۳ء سے نقل کیا ہے ۱۲ (مصنف)

فصل دوم

اتحاد بین الاسلامی

تمام بڑی تحریکات کی طرح نشأۃ اسلامی بھی پیچ در پیچ ہے۔ اس کی ابتدا سادہ اور خالص وہابی احتجاج سے ہوئی اُس نے . . . نہایت مختلف اور بعض اوقات تقریباً متضاد صورتیں اختیار کیں فصل ماسبق میں ہم اسلام کے اصلاح ارتقائی اور اصلاح کے اُس پہلو کا ذکر کر چکے ہیں جس کا رجحان مغربی تہذیب کی ترقی کن روح اور رسوم ظاہری کے اتباع کی طرف ہے اس کے ساتھ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ یہ آزاد مصلحین ابھی تک جماعت اقل یعنی منتخب اشخاص ہیں درانحالیکہ عام مسلمان جو ابھی تک جہالت میں غرق ہیں اور دیرینہ خواب غفلت سے ہنوز اچھی طرح بیدار نہیں ہوئے ہیں دوسرے لیڈروں کے زیر اثر ہیں جو مصلحین سے بکسر مختلف الخیال ہیں اور پُر امن طریقوں کے مقابلہ میں فتنہ کی طرف اور مغربی تعلیم کے قبول کرنے کی بجائے اس کی مخالفت پر مائل ہیں یہ فتنہ انگیز قوتیں بھی بجائے خود پیچیدہ ہیں اور اُن کی تقسیم عام ادراک کے تحت میں اتحاد بین الاسلامی اور قوم پرستی کی تحریکات میں ہو سکتی ہے اُن دو خیالات میں سے پہلے یعنی اتحاد بین الاسلامی کی بحث اس فصل میں کی جاوے گی۔

اتحاد بین الاسلامی اپنے بسیط معنی میں سچے مسلمانوں کے باہمی اتحاد کا ولولہ ہے اور یہ رسول خدا صلعم کے زمانہ سے ہے جبکہ آنحضرت صلعم اور اُن کے چند متبعین اپنے ہموطن بت پرستوں کے مقابلہ میں جو اُن کے درپے تخریب تھے مذہبی رشتہ سے متحد ہو گئے

فی الحال یہ امید لگی ہو کہ کُل بلاد اسلام میں متعدد اور صاحب اقتدار قلیل التعداد جماعتیں ہیں جن میں صرف مغربی تعلیم یافتہ اشخاص بلکہ راسخ الاعتقاد قدامت پسند بھی ہیں جو اسلام کے انحطاط سے واقف ہیں اور آزاد اور ارتقائی طریقوں پر مکمل اصلاح کو عملاً ضروری اور مقدس فرض سمجھتے ہیں۔ ابتک طے نہیں ہوا ہو کہ اصلاح کس طرح ہوگی۔ ذرائع اصلاحات کی مفصل بحث ہمارے پیش نظر امور کے لیئے ضروری نہیں[1] ہو۔ تاریخ ہم کو بتاتی ہو کہ جب اصلاح کرنے کی سچی خواہش موجود ہوتی ہو تو کسی نہ کسی طریقہ سے اصلاح پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہو۔

یہ یقینی امر ہو کہ اصلاحی روح نے اپنے مختلف مکاشفات سے کل اسلام میں ایک گہری تبدیلی پیدا کردی ہو موجودہ اسلامی دنیا سو سال پیشتر کی اسلامی دنیا سے بالکل مختلف ہو وہابی انقلاب نے خرابیوں کو مٹا کر ایک خالص تر مذہبی نور ایمان کو پھر روشن کردیا ہو اس کے متعصبانہ جوش کا بھی معاوضہ اخلاق سے ہوگیا آزاد خیالوں کے اصول اور مغربی ترقی کی اشاعت سرعت سے ہو رہی ہو مستقبل کے لیئے اگر بہت سے مخاطرہ ہیں تو بہت سی امیدیں بھی ہیں۔

---

[1] ان جائز تدابیر کی بحث کے لیئے ملاحظہ ہو ڈبلیو۔ ایس۔ بلنٹ کی کتاب مستقبل اسلام مطبوعہ لندن ۱۸۸۲ء ای۔ بی۔ شاتلی ایر کی کتاب "انیسویں صدی کا اسلام" مطبوعہ پیرس ۱۸۸۸ء ڈاکٹر پیرون کی کتاب اسلام مطبوعہ پیرس ۱۸۷۷ء۔ ایچ این بریلسفورڈ کا مضمون "اسلام میں عہد حاضرہ کا نفاذ" جو ستمبر ۱۹۱۰ء میں فورٹنائٹلی ریویو میں شایع ہوا۔ سر تھیوڈور ماریسن کا مضمون "کیا اسلام میں اصلاح ہوسکتی ہو" جو اکتوبر ۱۹۰۸ء میں نائنٹینتھ سنچوری اینڈ آفٹر میں شایع ہوا۔ موسیو پکتال کا مضمون اسلامی اخلاق جو جولائی ۱۹۱۹ء میں ریویو پولیٹک انٹرنیشنل میں شایع ہوا۔ ۔ ۔ کا مضمون اسلام بعد از جنگ جو پندرہ جنوری ۱۹۱۹ء کو ریویو دی پیرس میں شایع ہوا۔ مصنف

سامنے ہر نسل۔ ہر زبان۔ ہر تمدن کے مسلمان مشترکہ عبادت کے وجد میں ایک دوسرے سے ملاقی ہوتے ہیں اور حاجی کا قابل فخر خطاب لیکر واپس جاتے ہیں یہ ایسا خطاب ہی کہ جس کی وجہ سے ان کے مسلمان بھائی پایان عمر تک اُن کا احترام کرتے ہیں۔ حج سے جو سیاسی منافع متصور ہیں وہ ظاہر ہیں حقیقتاً یہ سالانہ بین الاسلامی کانگریس ہی جہاں بلاد اسلامی کے ہر حصہ کے نمائندے مذہبی مفاد پر بحث کرتے ہیں اور اسلام کے تحفظ اشاعت کی تدابیر سوچتے ہیں یہاں پر تقریباً اسلامی بیداری کے تمام جنگجو رہنماؤں مثلاً عبدالوہاب محمد بن سنوسی وجمال الدین الافغانی اور بہت سے اشخاص نے اپنے فرائض کے ادا کرنے کی اہمیت کو محسوس کیا۔[1]

اب رہی دوسری شق یعنی خلافت تو اس نے اپنے ابتدائی زمانہ میں ایک بڑا تاریخی کام کیا ہی اور ہم اس کے متعلق اوپر ذکر کر چکے ہیں تاتاری فتنہ میں بغداد تباہ ہوگیا اور اس کے بعد خلافت کی ہستی محض موہوم رہ گئی لیکن ترکی سلاطین نے اوس کو پھر زندہ کیا انھوں نے اس خطاب کو اختیار کیا اور راسخ الاعتقاد اسلامی دنیا نے اُن کو خلیفہ تسلیم کیا۔[2]

---

[1] اگرچہ غیر مسلم کو مکہ جانے کی ممانعت ہی لیکن چند یورپیوں نے بھیس بدل کر حج کیا ہی اور انھوں نے اپنے تجربات کو لکھا ہی ان میں سے ایک ہورگرونج کی کتاب مکہ ہی جو دو جلد میں بمقام ہیگ ۱۸۸۸ء میں طبع ہوئی اور "حج مکہ" جو ۱۹۰۹ء میں بمقام لندن طبع ہوئی بہترین تازہ تصانیف ہیں۔ نیز ملاحظہ ہو تصانیف برٹن ویورکہارڈ ث ایک آزاد خیال مسلمان غضنفر علی خاں نامی نے حال میں ایک گرانقدر کتاب "حجاج کے ساتھ مکہ کو" ۱۹۰۴ء مطابق ۱۹۰۲ء کا حج اکبر لکھی ہی جس کا دیباچہ ارمینس وامبری نے لکھا ہی یہ کتاب لندن میں ۱۹۰۴ء میں طبع ہوئی۔ (مصنف) مصنف

[2] ایران کے شیعہ کسی سنی یا راسخ الاعتقاد کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے اور صرف اپنے شریف سلطان کو مذہبی پیشوا مانتے ہیں۔

تھے۔ آنحضرت صلعم مسلمانوں کے لیئے باہمی برادرانہ اتحاد کے اصول کو نہایت اہم سمجھتے تھے اور آنحضرتؐ نے اُس کو مسلمانوں کے قلوب میں ایسا راسخ کر دیا کہ تیرہ صدیوں کے دوران میں اس میں کوئی کمزوری نہیں پیدا ہوئی۔ آج ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے رشتہ اُس رشتہ سے بہت زیادہ مضبوط ہی جو ایک عیسائی کا دوسرے عیسائی سے ہی بلا شبہ مسلمان آپس میں بُری طرح لڑتے ہیں لیکن ان جھگڑوں میں خانہ جنگی کی صورت ہمیشہ باقی رہتی ہی اور مشرکین کی تعدی کے وقت یہ جھگڑے معرض التوا میں آجاتے ہیں۔ اسلام کے عظیم اتحادی احساس سے غالبًا سب سے بڑا پتہ اس امر کا ملتا ہی کہ اسلام کا اپنے پیروان پر ایسا زبردست اثر کیوں ہی۔ کسی دوسرے مذہب کا اپنے پیروان پر ایسا اثر نہیں ہی اسلام نے نصرانیوں اور ہندوؤں[1] کے وسیع ممالک فتح کیئے اور مجوسیت[2] کو روئے زمین سے نکالدیا لیکن ایسی ایک بھی مثال نہیں ملتی کہ جو قوم ایک مرتبہ مسلمان ہوگئی اُس نے کبھی بھی ترک مذہب کیا ہو۔ یہ ممکن ہی کہ وہ بالکل مٹ گئے ہوں مثلاً اسپین میں ہوئے لیکن مٹ جانا ارتداد نہیں ہی۔

اسلامی اتحاد کو اُس کے دو اصلی ارکان یعنی حج اور خلافت سے بڑی سہولت ہو۔ مغربی عام رائے کے خلاف حج بہ نسبت خلافت کے متواتر اتحادی اثرات پیدا کرنے کا بڑا باعث ہی آنحضرتؐ نے حج کو مذہب کا بڑا رکن بتایا اور ہر سال پورے ایک لاکھ حاجی حج میں تیع ہوتے ہیں جو دنیائے اسلام کے ہر گوشہ سے آتے ہیں۔ یہاں مقدس کعبہ کے

---

[1] اسلام نے صرف مذہب براہمہ کی وطن ہندوستان ہی میں قدم نہ جمایا بلکہ جزیرہ بلسے جاوا و سماترا کی تقریبًا کل آبادی کو مسلمان بنا لیا جہاں پہلے مذہب براہمہ کا بہت زور تھا۔ (مصنف)

[2] ہندوستان کی قلیل پارسی جماعت جن کا مرکز بمبئی ہو مذہب زرتشت کے باقی ماندہ نمائندے ہیں ساتویں صدی میں جب مسلمانوں نے ایران کو فتح کر لیا تو ان دشتی پناہ گزینوں نے یہاں آکر طرح اقامت ڈالی۔

اب ہم کو موجودہ اتحاد بین الاسلامی کی کامیابی کی تحقیق کرنی چاہیئے۔ بلا شبہ [illegible]
پہلی منزل وہابی تحریک تھی عبدالوہاب نے نجد میں جو وہابی سلطنت قائم کی تھی وہ مکہ
کے خلفا کی الٰہی جمہوریت کے نمونہ پر تھی اور جب عبدالوہاب کے جانشین [illegible] سعود نے
اپنے جوشیلے عساکر کو بلاد مقدسہ پر چھوڑا تو وہ اس کو خلوص کی فتوحات [illegible] دنیا [illegible] اسلام
کے استحکام کا پہلا قدم خیال کرتا تھا اگرچہ وہابیت کو اس عظیم مقصد میں شکست [illegible] تاہم
اس نے شمالی ہندوستان اور افغانستان جیسے دور دراز ممالک میں [illegible]
سیاسی ہنگامے برپا کیئے۔ مگر یہ سب وہابیت کے اجزائے ترکیبی تھے۔ [illegible]
کے سیاسی زوال اور اسلامی حکمرانوں کی پستی اخلاق کے خلاف [illegible] تھے۔ [illegible]
مغرب سے خوف یا نفرت کی بدولت برپا نہ ہوئے تھے۔ کیونکہ یورپ [illegible]
دور افتادہ مقامات مثل یوروپی ترکی اور ہندوستان کے حقیقتاً اسلام [illegible]
ہوا تھا۔ اور اسی وجہ سے آئندہ خطرہ کا احساس کامل نہ ہوا تھا۔

مگر انیسویں صدی کے وسط میں حالت بالکل بدل گئی الجزائر کی فرانسیسی فتح اور [illegible]
قفقاز پر روسی قبضہ اور کل ہندوستان پر انگریزی تسلط نے دور اندیش مسلمانوں کو [illegible]
یقین دلا دیا کہ اسلام کو مغربی اقتدار کے تحت میں آنے کا [illegible] خطرہ [illegible]
اتحاد بین الاسلامی کی تحریک نے مغربی مخالفت کی اصل صورت اختیار کی اور [illegible]
سے برابر اسی شکل سے قائم ہے۔ مغربی مداخلت کی مقاومت ابتداءً منتشر [illegible]
متحد تھی کہیں کہیں پر بہادر اشخاص جیسے عبدالقادر الجزائری[1] اور

---

[1] عبدالقادر کے والد ایک مرابط تھے جن کے کچھ مرید بھی تھے۔ جبکہ فرانسیسی حملہ الجزائر پر جاری تھے اور اہل ملک فرانسیسی مظالم اور دستبرد سے نہایت برافروختہ تھے عبدالقادر کے والد نے شہر اوران پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ شہر والوں نے عبدالقادر کو اپنا سردار منتخب کیا۔ یہ ۱۸۰۸ء کے قریب پیدا ہوئے اور

مگر یہ آستانہ[1] سلطان خلفاء وہ مذہبی اقتدار نہ حاصل کرسکے جو اُن کے پیشرو مکہ اور بغداد والوں کو حاصل تھا۔ عرب کی آنکھوں میں بالخصوص ترکی خلیفہ گردش ایام کی یادگار تھے۔ اور حقیقتاً وہ اس سے کبھی بھی راضی نہ ہوئے سلطان عبدالحمید نے بلاشبہ خلافت کی سابقہ عظمت کی تجدید کی کوشش کی۔ لیکن جو کچھ کامیابی اُن کو حاصل ہوئی وہ زیادہ تر عام اتحاد بین الاسلامی کے خیالات کی مدد کی وجہ سے تھی صرف خلیفہ کے نام کے اقتدار کی بدولت نہ تھی۔ موجودہ اتحاد بین الاسلامی کے اصلی لیڈروں نے یا تو محض عبدالحمید کی مشروط اطاعت کی۔ یا سنوسی کی طرح بالکل مخالفت کی۔ یورپ نے اس کو محسوس نہ کیا اور عبدالحمید کو مسلمانوں کا پوپ سمجھ کر اس سے خائف ہو گئے۔ آج بھی بہت سے مغربی ناظرین کا خیال ہے کہ اتحاد بین الاسلامی کا مرکز خلافت ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے اخبار نویس نہایت امیدوں کے ساتھ یہ بحث کرتے ہیں کہ آیا غیر معتمد ترکی سلاطین میں خلافت رہنے یا شریف مکہ کی طرف انتقال ہونے یا بالکل معدوم ہونے سے اتحاد بین الاسلامی کے پرکٹ جائینگے۔ مگر یہ خیال بین طور پر کوتاہ اندیشی پر مبنی ہے۔ بلاشبہ اسلام میں آج بھی عہدۂ خلافت کی بڑی توقیر ہے لیکن موجودہ اتحاد بین الاسلامی تحریک کے دوراندیش لیڈر عرصہ سے ایک وسیع تر بنا پر کام کر رہے ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ اتحاد بین الاسلامی تحریک کی اصلی قوت محرکہ خلافت نہیں ہے بلکہ حج اور سنوسیہ جیسے بڑے بین الاسلامی اخوتوں کے نظامات ہیں جن کا ذکر عنقریب کیا جائے گا۔[2]

---

[1] قسطنطنیہ کا ترکی نام ہے مصنف۔ یہ لفظ دراصل استانہ بول ہے چونکہ باب عالی یا آستانہ یہاں واقع ہے لہٰذا یورپی حصہ قسطنطنیہ کا استامبول کہلاتا ہے ایشیائی حصہ اسلامبول مشہور ہے۔ مترجم

[2] مسئلہ خلافت پر ملاحظہ ہو سر ولیم میور کی کتاب "خلافت اس کا عروج انحطاط اور سقوط" مطبوعہ لندن ۱۹۲۴ء مسٹر مارک سائیکس کی کتاب "خلیفہ کی آخری میراث" مطبوعہ لندن ۱۹۱۵ء اور x x کا مضمون "اسلام اور جنگ" جو ماہ جنوری ۱۹۱۵ء کو ریویو دی پیرس میں شائع ہوا، اور "ہندوستانی وفد خلافت" جو جولائی ۱۹۲۰ء کی ایشین ریویو کی خاص قسم میں شائع ہوا۔ مصنف

اسلام کی مسلمانوں نے عام طور سے ہمدردی کی لیکن ان کو کوئی قابل قدر مدد نہ ملی۔ اور بلا مدد کے وہ مغلوب ہوگئے۔

مگر مغرب سے خوف اور نفرت کا زور بتدریج بڑھنے لگا۔ ایسا [illegible] قریب یہ نظر آیا کہ تمام اسلامی دنیا میں ایک کنارے سے دوسرے کنارہ تک چنانچہ پانچویں صدی کی لہر دوڑ گئی۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں الجزائر کے قبائل نے بغاوت شروع کی اور تمام شمالی افریقہ میں جوشیلے اولیا اٹھ کھڑے ہوئے جنھوں نے جہاد کی تلقین کی سب سے بڑی بغاوت جو کی سوڈان میں مہدیوں کی تھی اور باوجود انگلستان کی بہترین کوشش کے یہ شورش

بقیہ صفحہ ۴۸ | کہ درمیانی حصہ یعنی کوہ قاف پر قبضہ کرے ۱۸۲۹ء میں صلحنامہ ادرنہ ترکوں سے یہ علاقہ روس کو تفویض کردیا ۱۸۲۹ء لغایۃ ۱۸۵۹ء میں اس کوہستان کی قبایل برابر روسیوں سے جنگ کرتی رہیں جب کبھی نزاعات بند ہوئیں تو بحر خزر کے کنارہ جدید دشمن روس پیدا ہوگیا۔ یہ شمائیل تھا۔ جو بہادر ملا قاسی کا فرماں بردار مرید تھا اس نے اپنے سردار کی وفات کے بعد قبیلہ لسغی کی سرداری اختیار کی اس نے مختلف قبایل کو متحد کرکے متعدد فتوحات حاصل کیں۔ اجولکو کے قلعہ سے اس کا نکل آنا اس کے متبعین اور دشمن دونوں کی نظر میں کرامت معلوم ہوتا تھا۔ روسیوں نے جو کچھ مساعی کیں اُن کو شمائیل نے بیکار کردیا ۱۸۴۲ء میں جنرل گریبٹ نے چڑھائی کی تو یہ اقوام نہایت پریشان تھیں لیکن شمائیل نے اشکری کے جنگل میں روسیوں کو شکست فاش دی۔ متعدد روسی جنرل مامور ہوئے لیکن کوئی مستقل نتیجہ نہ پیدا کرسکا ۱۸۵۶ء میں پھر روسیوں نے جدوجہد شروع کی شمائیل کی انتہائی کوششیں کوئی نتیجہ حاصل نہ کرسکیں۔ اور روسی بتدریج بڑھنے لگے اور ۱۸۵۸-۵۹ء شمائیل کے خاص قلعہ ویڈن پر قبضہ کرلیا۔ اکثر قبائل نے روسی اطاعت قبول کرلی اور ۶ر ستمبر ۱۸۵۹ء کو شمائیل قید ہوگیا۔

مترجم

(بقیہ صفحہ ۶۴) اپنے ہم وطنوں میں اپنے علم و زہد کے لیے مشہور تھے فنون حرب و شہسواری میں بھی ان کو اچھی مہارت تھی۔ انھوں نے دو مرتبہ حج کیا۔ ایک مرتبہ کمسنی میں اپنے والد کی معیت میں اور دوبارہ ۱۸۲۸ء میں۔ اس زمانہ میں وہ عزلت نشین تھے اور اپنے تقوے و زہد اور پابندی شریعت کے لیے مشہور تھے انھوں نے دس ہزار فوج جمع کرکے اپنے والد کے ساتھ اوران پر حملہ کیا جو فرانسیسی قبضہ میں تھا۔ مئی ۱۸۳۲ء میں موقع پر پہونچکر تین دن تک حملہ جاری رکھا لیکن ناکامیاب رہے۔ اس کے بعد فریقین میں سخت جنگ و جدال جاری رہی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مارچ ۱۸۳۳ء میں ڈیوک روویگو خرابی صحت کی وجہ سے واپس گئے اور جنرل ورال مقرر ہوئے۔ اس عرصہ میں عبدالقادر نے اپنا اثر بڑھالیا۔ اور بالآخر صلح ہوگئی جس سے اہل فرانس غیر مطمئن رہے۔ کچھ عرصہ تک امن و امان قایم نہ رہا لیکن فرانسیسیوں کو امیر عبدالقادر کے اقتدار پر حسد ہوا اور اس بنا سے کہ امیر اُن کی حدود میں مداخلت کررہا ہے لڑائی چھیڑ دی ۲۸ جون ۱۸۳۵ء کو فرانسیسیوں کو شکست فاش ہوئی اور بڑے نقصان اٹھانے پڑے۔ امیر کو ذلیل کرنے کے لیے اس کے پایہ تخت پر حملہ کیا گیا لیکن شہر خالی پڑا تھا اُسے جلاکر فرانسیسی بے نیل مرام واپس آئے ۱۸۳۶ء میں مارشل کلوزل نے طلمسین پر حملہ کرکے قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد امیر نے تین ہزار فرانسیسیوں کو ہزیمت دی ۱۱ جولائی ۱۸۳۶ء کو عبدالقادر کو ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ بالآخر فرانسیسیوں نے صلح کی درخواست کی اور ۳۰ مئی ۱۸۳۷ء کو صلح طے ہوگئی۔ چونکہ امیر سے سرحدی نزاعات ہوتے تھے جنگ کا دوبارہ اعلان فریقین میں ہوگیا ۱۸۳۹ء میں فرانسیسیوں کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا ۱۸۴۱ء میں فرانس سے بڑی کمک آئی اور عبدالقادر کو ہر جگہ پسپا ہونا پڑا اکثر قبایل نے امیر کا ساتھ چھوڑ دیا۔ قلعہ تکدامت اور دار السلطنت معسکر امیر کے قبضہ سے نکل گیا۔ اب ہر طرف سے قبائل نے ہتھیار ڈالنے شروع کردیے اور کوئی فرانس کے قبضہ میں آگیا۔ بالآخر امیر نے اپنے آپ کو فرانسیسیوں کے حوالہ کردیا اور اُن کو خلاف معاہدہ ۲۹ جنوری ۱۸۴۸ء کو پیرس لے گئے اور مقید کردیا ۱۸۵۲ء میں اُس کو آزادی ملی اور بروصہ میں رہنے لگا۔ ۱۸۵۵ء میں وہ قسطنطنیہ چلا گیا اور وہاں بعد دمشق ہجرت کی ۵ الحاق گرجستان کے بعد روس کو بڑی فکر رہی

زیادہ خطرناک جنگ آچین[1] تھی جو غیر محدود زمانہ تک جاری رہی اور آج بھی بالکل فرو نہیں ہوئی۔

اس زمانہ کی جنگی شورشوں کی نمایاں خصوصیت یہ ہو کہ ان میں اتحاد مفقود تھا یہ تمام خروج مقامی آبادی کے فوری جوش کا نتیجہ تھے۔ بلاشبہ یہ خوف اور نفرت کی ایک ہی روح سے زندہ اور ایک ہی مذہبی جوش کے توقعات سے مشتعل تھیں لیکن کسی ایسی مرکزی قوت کی موجودگی کی شہادت نہیں ملتی ہو کہ جس نے باضابطہ تدابیر بنائی ہوں اور کسی مقررہ پروگرام کے موافق عمل کیا ہو۔ یہ بغاوتیں زیادہ تر صوفیانہ مسئلہ مہدویت سے پیدا ہوئیں۔ مہدویت ابتدائے اسلام میں غیر معروف تھی اور قرآن شریف سے اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا ہو۔ لیکن احادیث میں جو رسول خدا کے اقوال ہیں یہ پایا جاتا ہو کہ رسول خدا نے ایک شخص کے ظہور کی پیشین گوئی کی ہو جس کا لقب "المہدی" ہوگا اور جو دنیا کو مساوات اور انصاف سے معمور کر دے گا اس سے ایک عام صوفیانہ امید پیدا ہوئی کہ ایک مؤید من اللہ کا ظہور ہوگا جو تمام دنیا میں اسلام کے جھنڈے گاڑ کر باطل پرستی کو مٹا دے گا۔ اور مسلمانوں کی کامرانی ہمیشہ کے لئے قایم کر دے گا۔ اس مسئلہ نے اسلامی تاریخ پر بڑا اثر ڈالا مختلف اوقات میں جوشیلے سربرآوردہ اشخاص نے خروج کیا۔ اور مہدویت یا صاحب الزماں ہونے کا دعوے کیا اور مسلم عوام نے

---

[1] آچن یا اچین یا اچہ۔ شمالی سماترا کا ایک ضلع ہو۔ خاص شہر کوٹا راجہ ہو۔ آبادی زیادہ تر مسلمان ہو لیکن توہم پرستی بہت زیادہ ہو عرصہ دراز تک خود مختار رہا سترھویں صدی میں پرتگالیو کا مقابلہ کامیابی سے کیا۔ ۱۸۷۳ء میں ہالینڈ والوں نے فتح کیا۔ لیکن بغاوت جاری رہی حتیٰ کہ ۱۹۰۸ء میں فرو ہوئی۔ اندرونی حصہ کوہستانی ہو اور ساڑھے سات لاکھ کی آبادی ہے۔ مترجم

اُس وقت تک قایم رہی جب تک کہ صدی کے آخر میں کچنر نے خرطوم پر قبضہ کیا افغانستان میں بھی مذہبی جوش کا دور تھا جس کی ہندوستانی مسلمانوں نے بھی ہمدردانہ ہم آہنگی کی۔ ان دونوں نے حکومت برطانیہ کو بڑی مشکلات میں ڈالا۔ وسطی ایشیا میں بھی مذہبی جوش کا اظہار ہوا اور اس کا مرکز باقتدار نقشبندیہ؎۱ فرقہ تھا۔ یہاں سے یہ مشرق کی طرف چینی ممالک میں پھیل گیا۔ اور چینی مسلمانوں نے چینی ترکستان اور یون نن؎۲ دونوں جگہ بغاوتیں کیں۔ ڈچ ایسٹ انڈیز میں بھی بغاوتوں کا کامل سلسلہ تھا۔ اور ان میں سب سے

؎۱ نقشبندیہ خاندان صوفیوں کے ایک مشہور خاندان کا نام ہے جس کا سلسلہ حضرت بہاءالدین نقشبند سے چلا ہے جو ساتویں صدی ہجری کے قریب شہر بخارا میں تھے چونکہ آپ کے ہاں نقاشی و گلکاری کا کام ہوتا تھا یعنی مشجر اور چکن وغیرہ تیار ہوتی تھی اس وجہ سے یہ لقب پڑ گیا بعض لوگوں کا بیان ہے چونکہ اس خاندان میں دل کی شکل پر تصور جما کر شغل کیا جاتا ہے اس سبب سے نقشبندیہ خاندان کہلاتا ہے ۱۲ مترجم

؎۲ سنہ ۵۰ مانچو کے اجنبی خاندان کے زوال کے لیئے جو شورش الموسوم بہ "تپائی" شروع ہوئی اُس کی فرو ہونے پر بھی افواج شاہی کو یون نن میں سلیمان نے قابض نہ ہونے دیا۔ اس جماعت کے خلاف سلطنت نے کوئی سرگرمی نہ دکھائی لیکن ۱۸۷۲ء میں جب سلیمان کے متبنیٰ شاہزادے حسن نے انگلستان کو سفارت اس غرض سے بھیجی کہ سلطنت برطانیہ اُس کے باپ کی سلطنت کو تسلیم کرے تو شاہی سلطنت کو ناگوار ہوا فوراً ایک فوج قاہرہ اس صوبہ کو روانہ کی گئی۔ حملہ میں ایسی جد و جہد کی گئی کہ ایک سال ہی میں مسلمانوں کا پایۂ تخت تالیفو فتح ہو گیا۔ اور سلیمان کے طرفداران خاص دارالسلطنت اور کل صوبہ بھر کے بالکل ہی نیست و نابود کر دیے گئے۔

مترجم۔

قوت کے مقابلہ میں مقامی جوشش کے تند ترین سیلاب کی ناتوانی نے صاحب فکر
مسلمانوں کو باور کرا دیا کہ اگر اسلام یورپ کے جوئے کو اتارنا چاہتا ہے تو اُس کو دنوں
تک تیاری اور متحدہ مکمل سعی کرنا ضروری ہے ان لوگوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ہم کو مغربی طریقے
سیکھنا چاہئیں اور قوت کا استعمال مغربی طریقے پر کرنا چاہیئے مزید براں انھوں نے یہ بھی
محسوس کیا کہ قبل اس کے کہ اسلام کو مغربی سیاسی اقتدار سے خلاصی ملے کامل روحانی
بیداری ہونی چاہیئے تاکہ وہ اخلاقی قوتیں پیدا ہو جائیں جو حریت کی جنگ میں اور اُس
کے بعد دوبارہ تعمیر کی کامیابی کے لیئے ازبس ضروری ہیں۔ اتحاد بین الاسلامی اور
احرار کے نقطۂ خیال کا اتصال اسی مقام پر ہوتا ہے دونوں اسلام کی موجودہ پستی کو
تسلیم کرتے ہیں اور دونوں روحانیت کی پیدایش نو کے متمنی ہیں یہ دونوں گروہ اس امر
پر مخالف ہیں کہ یہ نشاۃ کس قسم کی ہو آزاد خیال طبقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام میں مغربی خیالات
پورے طور سے سرایت کر جائیں برخلاف اس کے اتحاد بین الاسلامی کے پیرو یہ
یقین کرتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو نئی زندگی کے لیئے
درکار ہیں اور اُن کی رائے ہے کہ دنیائے اسلام کو صرف مغربی اسلوب اور مادی ترقیات
ہی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ایسے اتحاد بین الاسلامی کی تحریک جس کے حامیوں کو اُس کی
اہمیت کا صحیح اندازہ ہو گیا باقاعدہ طور پر انیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوئی یہ تحریک
دو مرکزوں پر قایم ہوتی ہے یعنی نئی قسم کی مذہبی اخوتیں جیسے سنوسیہ یا اُن اصحاب غور و فکر
کی تبلیغی جماعتیں جن کے سرگروہ جمال الدین تھے اولاً ہم اخوتوں پر غور کرینگے۔

اسلام میں صدیوں سے مذہبی اخوتیں پائی جاتی ہیں ان سب میں ایک ہی قسم کا
عام نظام ہے یعنی یہ کہ وہ زاویوں میں منقسم ہیں جن کے سرگروہ مقدم کہلاتے ہیں جو تھوڑا
بہت اختیار اخوان پر رکھتے ہیں سنوسی جیسے اخوتوں سے قبل جو نئے نظام پر بنائے گئے
ہیں پرانی اخوتوں کا دنیوی معاملات پر بہت کم اثر ہوتا تھا۔ ان کے اغراض تقریباً مذہبی

مجنونانہ طور پر اُن کا اتباع کیا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ بعض مسیحوں نے یہودیوں میں جوش پیدا کر دیا تھا۔[۱] یہ قدرتی بات تھی کہ مغربی تعدی سے روز افزوں ہراس اور ناتوانی کے عرصہ میں عام مسلمان ان مصائب سے نجات دلانے والے مہدی کا انتظار کریں، تاہم مہدویت فطرتاً کوئی عملی یا مستقل نتیجہ نہ پیدا کر سکی۔ یہ صرف گھاس کی آگ تھی جو جا بجا بہت زور سے شعلہ زن ہوئی اور پھر بجھ گئی۔ اور عوام اس طلسم کے باطل ہونے سے پہلے سے بھی زیادہ پست ہمت اور مردہ دل ہو گئے۔

اتحادِ بین الاسلامی کے معاونین نے ان سب کو محسوس کیا یورپ کے باقاعدہ

---

[۱] مسیحا کا ظہور مسیحا جس کو یونانی میں کرسٹو کہتے ہیں اس سے ایسی ذات مراد ہے جس کے بنی اسرائیل اپنی غلامی اور کامیابی کے لیے منتظر ہیں اس قومی توقع نے مختلف صورتیں اختیار کیں مثلاً "ایک ایسا نبی جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ داؤد علیہ السلام کے خاندان کا بادشاہ" "متحمل خادم" "اور بنی آدم سے مشابہ ذات"۔ بنی اسرائیل کی حکمرانی ختم ہونے پر اس خیال سے موجودہ سیاسیات کی تعبیر کی حیثیت تو کھوئی اور محض اس کا یہ منشا رہ گیا اسرائیلی دینیات میں ارشاً ابد ارث منتقل ہونے لگا۔ لہذا بنی اسرائیل ایسے موید من اللہ بادشاہ کے منتظر رہنے لگے جس پر کتاب مقدس کے الفاظ کا ایسا کامل اطلاق ہو کہ پہلے کسی پر نہ ہوا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن مقامات پر یہ الفاظ واقع ہوئے ہیں اُن کو پیش گوئیاں مان لیا اسی بنیاد پر وقتاً فوقتاً متعدد مسیح کاذب نمودار ہوئے چنانچہ ۳۸ء میں یہودی سٹامی پیدا ہوا۔ خلافت بنی امیہ کے زوال پر بھی ظہور مسیح کی بڑی امید تھی۔ ابوعیسیٰ اصفہانی نے اپنے آپ کو مقدمۃ الجیش مسیح ظاہر کیا۔ بارھویں صدی کے وسط میں آذربائیجان کے یہودیوں میں داؤد الروی نے دعویٰ کیا۔ ابراہیم ابوالعفیا سرغوسی نے دعویٰ پر بنا روایات کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابربنیل نے ظہور مسیح کا وقت ۱۵۰۳ء مقرر کیا۔ سولھویں صدی میں متعدد مسیح پیدا ہوئے۔ مترجم

لڑکے کو جس طریقے سے جانشینی ملی اس سے سنوسی جذبات کا سچا اندازہ ہوتا ہے سید محمد کے دو لڑکے تھے جن میں المہدی چھوٹا تھا ابھی وہ دونوں بچے ہی تھے کہ ان کے باپ نے ان کے امتحان لینے اور یہ معلوم کرنے کا ارادہ کیا کہ ان دونوں میں کون زیادہ راسخ الاعتقاد ہے۔ کل زاویہ کی موجودگی میں اُنھوں نے دونوں لڑکوں کو ایک دیجے درخت خرما پر چڑھنے کا حکم دیا۔ اور تب انھوں نے اللہ اور رسول کا نام لیکر پیڑ پر سے کود پڑنے کو کہا چھوٹا لڑکا فوراً کود پڑا اور زمین پر بلا کسی ضرر کے پہنچ گیا بڑے نے کودنے سے انکار کیا۔ حق حکمرانی المہدی کو مل گیا۔ جس نے اپنے آپ کو مشیت ایزدی پر چھوڑنے میں پس و پیش نہیں کیا تھا۔ عمر بھر سنوسی المہدی نے اپنے باپ کے انتخاب کو صحیح ثابت کیا اور بڑے اعلیٰ درجہ کی دانشمندی اور تقوے کے ساتھ زندگی بسر کی۔ اس نے اُخوت کی طاقت کو اور وسیع کیا اپنی حکومت کے آخر عہد میں اس نے سعد مقام کو لیبیا کے ریگستان میں بعید ترین نخلستان جوف کو منتقل کیا وہ ۱۹۰۲ء میں مر گیا اور اُس کا بھتیجا احمد شریف اُس کا جانشین ہوا۔ اور آج کل اس فرقہ کا سردار ہے اور نہایاں قابلیت کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔

اسی سال کی کامیاب کارگزاری کے بعد سنوسی فرقہ اسلام میں آج ایک اہم جز ہے اور اس کے پیرو اسلامی دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں عربستان میں اس کے پیرو بکثرت ہیں اور بلاد مقدسہ مکہ اور مدینہ میں روحانی زندگی پر اس فرقہ کا گہرا اثر ہے مگر آج بھی سنوسیوں کا شعاعی مرکز شمالی افریقہ ہی ہے کل شمالی افریقہ میں مراکش سے لیکر سالی لینڈ تک مختلف مقامات میں اس کے زاویہ بنے ہوئے ہیں جو بڑے زاویہ کے بسرکردگی شیخ سنوسی ماتحت ہیں۔ سنوسیوں کا حصن حصین جوف صحرائے لیبیا کے وسط میں واقع ہے اس مخفی جگہ کو اس وقت تک ایک یورپی کی آنکھ (ڈاکٹر نا ٹیگل) نے دیکھا ہے چونکہ اس کے ہر چہار طرف بالکل ریگستان ہے اور کوئیں کوسوں دور ہیں اور راستہ صرف

اور صوفیانہ عبادات کی نوعیت کے تھے۔ ان کی خصوصیت سخت نفس کشی اور ایسے مذہبی
شغف تھے جن پر حال وقال والے درویش عمل کرتے ہیں اگر کوئی سیاسی اثر یہ ڈالا
کرتے تھے تو وہ عارضی اور مقامی ہوتا تھا ان کے باہمی رقابتوں اور حسد کی وجہ سے اتحاد عمل
ناممکن تھا اس قسم کے پرانے طرز کی اخوتیں آج بھی بہت سی موجود ہیں لیکن بجز اس کے کہ
جدید قسم کی اخوتوں کا ان پر کچھ رنگ چڑھا ہو یہ سیاسی اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔
جدید قسم کے نظامات کی ابتدا انیسویں صدی کے وسط سے ہوتی ہو ہر لحاظ سے
ان میں سب سے زیادہ اہم فرقہ سنوسیہ ہو اس کے بانی سید محمد بن سنوسی الجزائر ہیں
مضافات مستغنم میں ۱۸۰۰ء کے قریب پیدا ہوئے جیسا کہ ان کے لقب سید سے ظاہر
ہو وہ اولاد رسول اللہؐ سے تھے اور اس لئے عزت و منزلت کی حالت میں پیدا ہوئے
اوائل میں اس نے علم و تقوی کی طرف بڑا میلان ظاہر کیا فاس کے جامعہ مراکشی میں اس
نے علم دین حاصل کیا۔ اور بعد میں مروجہ مذہبی خرابیوں کی اصلاح کے تلقین کرنے کو شمالی
افریقہ میں دور دور سفر کیا۔ اس کے بعد وہ حج کرنے کے لئے مکہ آیا اور وہاں پر وہابی مصلحین
نے اس کے اصلاحی جوش کو اور زائد مشتعل کر دیا۔ اسی زمانہ میں یہ معلوم ہوتا ہو کہ اس نے
اپنے عظیم خالص سلسلہ کا نظام مستقل طور پر قایم کیا اور ۱۸۴۳ء میں وہ شمالی افریقہ کو واپس آیا
اور طرابلس میں بود و باش اختیار کر کے کوہستان میں اپنا پہلا زاویہ بیضا درنہ کے قریب
بنایا اس کی شخصیت ایسی با اثر اور اس کی نظامی قابلیت ایسی عظیم تھی کہ تمام شمالی افریقہ
سے مریدین اس کے پاس جمع ہونے لگے بلکہ طرابلس میں ترکی حکام اس کی طاقت
سے ہراساں ہوئے اور تعلقات اتنے کشیدہ ہوگئے کہ سید محمد نے فوراً اپنے صدر مقام
کو جنوب کی جانب ریگستان لیبیا میں جربوب کے نخلستان میں منتقل کر لیا ۱۸۵۹ء میں
اُن کا انتقال ہوا تو ان کا سلسلہ شمالی افریقہ کے بڑے حصہ میں پھیل گیا تھا۔
سید محمد کے بعد ان کے بیٹے سنوسی المہدی نے اس کام کو برابر جاری رکھا اس

چند بار دو مختصر جملوں سے زیادہ نہ حاصل کر سکے۔ سنوسی المہدی کے پسندیدہ اقوال میں سے ایک یہ ہے "ترک اور عیسائی، میں ان دونوں کو ایک ہی ضرب میں توڑ ڈالوں گا" مصری سوڈان کی مہدوی شورش کے سرگروہ محمد احمد کے متعلق بھی شیخ سنوسی کا طرز عمل بالکل اُن کے مخصوص انداز کے مطابق تھا جب محمد احمد نے کامیابی سے سرشار ہو کر اپنے سفیر کو سنوسی کی خدمت میں استمداد کے لیئے بھیجا تو شیخ سنوسی نے مدد دینے سے انکار کیا اور فخریہ لہجہ میں کہا کہ مجھے ڈنگولہ کے اس فقیر سے کیا مطلب ہے کیا میں خود مہدی نہیں ہوں اگر میں چاہوں۔

اس کج دار و مریز کا منشا یہ نہیں ہے کہ سنوسی بیکار بیٹھے ہیں۔ معاذ اللہ۔ بلکہ وہ متواتر تعلیم و تربیت اور تبلیغ کے روحانی اسلحہ سے برابر مصروف کار رہے۔ سنوسیوں کا پروگرام یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ اسلامی افریقہ کو متحد کرلیں اور بعدہ اسلام کے قرون اولیٰ کی تجدید شدہ امامت میں کل اسلامی دنیا کو متحد کرکے ایک الٰہی سلطنت میں تمام مسلمانوں کو شامل کرلیں جو بالفاظ دیگر پین الاسلامی تحریک ہے لیکن ان کا عقیدہ ہے کہ قبل اس کے کہ اسلام نصرانی اقتدار سے اپنی سیاسی رہائی حاصل کرے یہ ضروری ہے کہ اپنی روحانی زندگی کو استوار کرے اس غرض کے لیئے وہ متواتر اپنے زیر اثر آبادیات کے اخلاق و آداب کی درستی کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی نخلستان میں بہتر کاشت کی حوصلہ افزائی اور قافلوں کے راستوں پر کنوؤں اور آرام گاہوں کی تعمیر کرا کے اور تجارت کی ترقی و توسیع سے مادی حالات کی بہتری کے بھی کوشاں ہیں۔ سوڈانی مہدویوں کے قتل و غارت نے سنوسیوں کو متنفر کردیا۔ اور اُن کے شیخ کی زبان سے ملامت و سرزنش کے سخت الفاظ کہلوائے۔

یہ سب امور اس فرقہ کے نئے مثالی ضبط و تحمل کا پتہ دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سال بسال قرن بہ قرن سنوسی آہستہ آہستہ خاموشی اور ہوشیاری سے ترقی کر رہے ہیں وہ

سنوسی تجربہ کار رہنماؤں کو معلوم ہیں جن میں سے ہر ایک بجائے اس کے کہ شیخ کے مسکن کا پتا بتانے کا ملزم ہو ہزار مرتبہ موت کو ترجیح دے گا۔ لہذا سنوسی شیخ خاموشی کے ساتھ علحدہ بیٹھا ہوا کل شمالی افریقہ میں اپنے احکامات جاری کر رہا ہے۔

فرقہ سنوسیہ کا اثر بہت گہرا ہے مقامی زوایا محض خانقاہ سے زیادہ حیثیت رکھتے ہیں مقدم کے علاوہ وہاں وکیل یا سول گورنر (ملکی عامل) بھی رہتا ہے اور یہ افسران نہ صرف اپنے زاویہ کے ممبران پر بلکہ کل جماعت پر امتیازی اختیارات رکھتے ہیں کم از کم شمالی افریقہ میں سنوسیوں سے اس قدر لوگ ڈرتے ہیں کہ وکیل یا مقدم کی ہر بات کو مانتے ہیں اور اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ لہذا مختلف یورپی مستعمرات کے عہدہ داروں یعنی برطانوی یا فرانسیسی یا اطالوی حکام نے اقتدار کے علاوہ ایک باطنی حکومت بھی ہو جس کے تصادم سے نوآبادیات کے عمال احتراز کرتے ہیں۔

سنوسی بھی اپنی طرف سے اس کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں کہ دول یورپ سے کوئی علانیہ نزاع نہ ہو جاوے۔ اُن کا محتاط اور دانشمندانہ رویہ حیرت انگیز ہے۔ نصف صدی سے زائد ہوا کہ یہ فرقہ بڑے اقتدار پر ہے لیکن اس وقت تک بڑے معرکہ کے خطرہ میں نہیں پڑا افریقہ کے مختلف حصص میں جو مذہبی بغاوتیں ہوئیں اس میں مقامی سنوسیوں نے بلاشبہ حصہ لیا اور طرابلس میں اطالوی حملہ اور جنگ گزشتہ کے موقع پر بھی یہ صادق آتا ہے لیکن یہ فرقہ باضابطہ طور پر میدان میں نہیں آیا۔

درحقیقت یہ رویہ جس میں دانشمندانہ خودداری اور متکبرانہ علحدگی ملی ہوئی ہیں نہ صرف عیسائیوں سے برتا جاتا ہے بلکہ دیگر سلاطین اسلام سے بھی یہی روش اختیار کی جاتی ہے سنوسیوں نے اپنی کل آزادی عمل کو ہمیشہ قایم رکھا ہے ترکوں سے ان کے تعلقات کبھی بھی مخلصانہ نہ تھے۔ عیار عبدالحمید بھی جو کہ اتحاد بین الاسلامی تحریک کے حامی ہونے کی وجہ سے بڑے صاحب اقتدار تھے سنوسی سے اپنی تحریک کے اظہار استحسان میں

موجودہ اسلامی حیات کی تیزگامی کا بہترین اظہار یہ ہے کہ پچھلے سو سال میں اس کا تبلیغی جوش از سر نو زندہ ہوگیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے مسلمان بنانے کی پرزور قوت کا ہمیشہ اظہار کیا ہے۔ قرون اولیٰ میں اس کی تبلیغی کامیابیاں غیر معمولی تھیں اور زمانۂ انحطاط میں بھی اس کی اشاعتی قوت کبھی مفقود نہیں ہوئی۔ از منۂ متوسطہ میں اسلام ہندوستان اور چین میں برابر پھیلتا رہا اور ترکوں نے اس کو بالاستقلال بلقان میں نصب کردیا۔ چودھویں اور سولھویں صدی کے درمیان میں اسلامی مبلغین نے مغربی افریقہ، ڈچ انڈیز اور فلپائن جیسے دور دراز ممالک میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں مگر کل اسلامی دنیا پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی جوش یقیناً کم ہوگیا۔ اور اٹھارویں صدی میں اس کا جزر انتہا کو پہنچ گیا۔

اسلامی بیداری کے پہلے جھونکے نے اشاعت دین کی سلگتی ہوئی چنگاریوں کو نئے جوش سے شعلہ زن کردیا اور یورپ کے سوا ہر جگہ اسلام نے اپنی دور دراز سرحدوں پر وسیع ترقی شروع کی۔ ایک حد تک ہر مسلمان فطرتاً مبلغ ہے اور طبعاً اپنے مذہب کو غیر مسلم ہمسایوں میں شائع کرتا ہے۔ لہٰذا یہ کام صرف مذہبی ماہرین ہی نے نہیں کیا بلکہ بے شمار سیاح تجار اور غریب تارکانِ وطن مزدوروں نے بھی سر انجام دیا۔ بلاشبہ بہت سے فدائیان بہت

بقیہ نوٹ صفحہ ۷۵ | میں سنہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ محمد ابن عثمان کی کتاب "ممالک سنوسیہ کی سیاحت براہ طرابلس" جس کا ترجمہ عربی سے ہوا اور پیرس میں سنہ ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا ۱۲

سلہ اسلام کی عام تبلیغی سرگرمیوں کے لیے ملاحظہ ہو جانسین کی کتاب "اشاعت اسلام" مطبوعہ برلن سنہ ۱۹۰۹ء۔ موسیو ٹاؤنسینڈ کی کتاب "ایشیا اور یورپ" صفحات ۴۶ لغایت ۴۹ و ۶۰ و ۶۱ و ۸۱۔ اے۔ بی۔ شاٹلی ایر کی کتاب "انیسویں صدی کا اسلام" مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۰۵ء محمڈن ورلڈ ٹوڈے کے مختلف مضامین مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۳ء ۱۲

عظیم باطنی قوت حاصل کر رہے ہیں اور اس سے محترز ہیں کہ قبل از وقت تو پیچ کے غریب
میں آجائیں۔ اسی عرصہ میں وہ شمالی افریقہ میں اپنے زاویوں اور مدرسوں کا سلسلہ پھیلا کر
لوگوں کو اپنے مقدموں اور وکلا کی آواز کا مطیع بنا رہے ہیں اور جنوب کی طرف وہ لاکھوں
باطل پرست حبشیوں کو داخل اسلام کر رہے ہیں[۱]۔

---

[۱] ان اسلامی فرقوں کے لیئے بالعموم اور فرقہ سنوسیہ کے لیئے بالخصوص ملاحظہ ہو ڈبلیو ایس بلنٹ کی کتاب "مستقبل اسلام" مطبوعہ لندن ۱۸۸۲ء۔ او۔ ڈیپونٹ اور ایکس۔ کوپولانی کی کتاب "مسلمانوں کی مذہبی اخوتیں" مطبوعہ پیرس ۱۸۹۷ء۔ ایچ دوویری ایر کی کتاب "سیدی محمد بن علی السنوسی کی اخوت اسلامی" مطبوعہ پیرس ۱۸۸۴ء۔ ای۔ ایل بشاتلی ایر کی کتاب "مسلمان مجاہد کی اخوت" مطبوعہ پیرس ۱۸۸۷ء ایل رین کی کتاب "مرابطہ واخوان" مطبوعہ الجزائر ۱۸۸۴ء اے سروسی ایر کی کتاب "مسلمانوں کی قوم پرستی" مطبوعہ قسطنطین الجزائر ۱۹۱۳ء سیمیاں کی کتاب "الجزائر میں اسلامی اخوتیں" مطبوعہ الجزائر ۱۹۱۰ء۔ احمد عبد اللہ کا جو خود بھی سنوسی ہے مضمون "السنوسیہ" جو مئی ۱۹۱۳ء میں نورتھم میں شایع ہوا۔ اسے آر۔ کولکوہون کا مضمون "اتحاد بین الاسلام" جو جون ۱۹۰۶ء میں نارتھ امریکن ریویو میں شایع ہوا۔ ٹی۔ آر۔ تھریلفال کا مضمون "سنوسی اور اس کی جہاد کی دھمکی" جو مارچ ۱۹۱۰ء میں رسالہ نائنٹینتھ سنچوری میں شایع ہوا۔ کپتان ایچ۔ اے۔ ولسن کا مضمون "مسلمانوں کا خطرہ" جو ستمبر ۱۹۰۷ء میں نائن ٹینتھ سنچوری اینڈ آفٹر میں شایع ہوا۔ اور "اسلام کی قوت اور اس کی مذہبی اخوتیں" جو ۲۵ نومبر اور ۱۰ دسمبر ۱۹۰۵ء کو ربی کورسپانڈان میں شایع ہوا انکو بالصدر اما، بالخصوص سنوسیوں کے متعلق نہایت مختلف ہیں بعض تو نہایت خوف افزا ہیں اور بعض اس تحریک کی اہمیت کو بالکل گھٹا دیتے ہیں۔ اس کل بحث پر سب سے عمدہ توازن کمیدان بینفر رسے کے مضمون "اسلامی خطرہ" میں پایا جاتا ہے جو ۱۹۰۶ء میں فرانسیسی افریقہ کی کمیٹی کی کارروائی میں شایع ہوا۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی سنوسی سے ملاقات کا حال سیدی محمد الحشائشی کے مضمون "سنوسیوں اور تاریخ کے درمیان" جو رسالہ "اسپیشن آف دی فرنچ کالونیز

اسلام جنوب میں جس طرح بڑھ رہا ہے اُس کا ثبوت عالی کے ایک واقعہ سے اچھی طرح ہوتا ہے۔ چند سال ہوئے کہ افسران برطانیہ کو دفعتاً معلوم ہوا کہ اسلام نیاسا لینڈ پر تسلط کر رہا ہے تحقیقات سے یہ معلوم ہوا کہ یہ زنجباری عربوں کی کارستانی ہے انھوں نے اپنی تبلیغ سنہ ۱۹۰۰ء میں شروع کی۔ دس سال بعد جنوبی نیاسا لینڈ کے ہر موضع میں ایک اسلامی معلم اور خس پوش مسجد موجود تھی اگرچہ یہ تحریک علانیہ یورپین کے خلاف تھی لیکن برطانوی حکام کو دوسری جگہ کے فسادات کے ڈر سے اُس کو دبانے کی جرأت نہ ہوئی۔ بہت سے یورپی ناظرین کو اندیشہ ہے کہ کوئی دن جاتا ہے کہ اسلام دریائے زمبیسی کے پار جاکر جنوبی افریقہ میں داخل ہو جائے گا۔

یہ کامیابیاں محض باطل پرستی ہی کے مقابلہ میں نہیں حاصل ہوئی ہیں بلکہ افریقی مسیحیت کو زک دیکر بھی حاصل کی جاتی ہیں مغربی افریقہ میں یورپی مشنوں کے نئے عیسائی مسلمان ہوتے جاتے ہیں اور براعظم کے دوسرے کنارہ پر یعنی مشرقی افریقہ میں قدیم حبشی کلیسا جو عرصہ دراز سے اسلام کے خلاف ایک سرحدی حصن کا کام دیتا تھا اب اسلامی سیلاب کی رو میں اُس کے غرق ہونے کا اندیشہ ہے حبشی جنگجویانہ حملوں سے نہیں بلکہ پر امن خلط ملط سے مسلمان ہو رہے ہیں پچاس یا ساٹھ سال ہوئے جن قبایل میں مشکل سے ایک بھی مسلمان تھا آج جزاً یا کلیتاً شریعت اسلام کے پیرو ہیں۔[1]

اسلامی تبلیغی کامیابیوں میں غالباً سب سے زیادہ قابل ذکر افریقی فتوحات ہیں۔ ان کامیابیوں کی داستان صرف یہاں ختم نہیں ہوتی جیسا کہ اسلامی دنیا کے دیگر حصص

---

[1] اے گوپُرنیو کا مضمون "اسلام اور حبش" جو ریویو دو ماند مسلمان میں ۱۹۱۸ء میں شایع ہوا۔ نیز ملاحظہ ہو پروٹسٹنٹ مشنری کے بیٹڈ رکوبیٹ کا مضمون "حبش میں اسلام اور نصرانیت" جو اپریل ۱۹۲۱ء میں دی مسلم ورلڈ میں شایع ہوا۔

نے اپنی زندگی اس کام کے لیئے وقف کر دی۔ مذہبی جماعتوں پر یہ بالخصوص صادق آتا ہے سنوسیوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ اور ان قدرتی خانقاہوں یعنی نخلستان صحاری سے ہزار ہا مربوط (زاہد) جنکی آنکھیں نور اسلام سے منور اور سینے جوش سے معمور تھے اسلام کی عجیب و غریب تعلیم کی نشر و اشاعت کے لیئے چل کھڑے ہوئے یہ لوگ از منہ متوسط کے نصرانی گداگر راہبوں کی طرح جوش مذہبی سے مشتعل تھے۔ گزشتہ پچھلی صدی میں مغربی اور وسطی افریقہ کے حبشیوں میں اسلامی تبلیغ کی کامیابی غیر معمولی تھیں۔ ہر صاف دل یورپی ناظر ایک ہی قصہ بیان کرتا ہے بیس سال ہوئے ایک انگریز نے بہت ٹھیک لکھا کہ "اسلام وسط افریقہ میں حیرت انگیز ترقی اور باطل پرستی کا استیصال کر رہا ہے۔ اس کے مقابلہ میں عیسائی تبلیغ ایک خرافات[1] ہے" ایک فرانسیسی پروٹسٹنٹ مبلغ بھی اسی طور سے لکھتا ہے "ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام قلب افریقہ کی طرف ایسی رفتار سے ترقی کر رہا ہے جو بعض وقت کم تو ہو جاتی ہے مگر رکتی کبھی نہیں۔ تمام ،، موانعات حائلہ کے باوجود وہ بے تکلف اپنی منزل مقصود کی طرف گامزن ہے اور اس کو کوئی ہراس نہیں ہے اسلام کو اپنی کامیابی پر اس قدر وثوق ہے کہ وہ اپنے سب سے اہم رقیب یعنی نصرانیت سے بالکل بے پروا ہے عیسائی تو فتح افریقہ کے خواب ہی دیکھتے رہے مگر مسلمان اس کی تعبیر پوری کر رہے ہیں[2]۔"

---

[1] ٹی۔ آر تھریلفال کا مضمون "سنوسی اور ان کا آنے والا جہاد" جو رسالہ "انیسویں صدی" میں مارچ ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا۔

[2] ڈی۔ اے۔ فورتریٹ کی کتاب "وسطی افریقہ میں اسلام اور مسیحیت" صفحہ ۵۶ مطبوعہ پیرس ۱۹۱۱ء۔ افریقہ میں مسلمانوں کی دیگر تبلیغی جدوجہد کے حالات کے لیئے ملاحظہ ہو جی بونیٹ موری کی کتاب "افریقہ میں دین اسلام اور مسیح" مطبوعہ پیرس ۱۹۰۶ء ای ڈبلیو۔ بلاڈن کی کتاب "نصرانیت و اسلام اور حبشی نسل" مطبوعہ لندن ۱۸۸۸ء

متکبرانہ طرزِ عمل نے حکومتِ چین کو خوف زدہ کر دیا اور اُس نے کُل مراعات واپس لیکر
اُن پر ظلم و تعدی شروع کر دی۔ اوائل اُنیسویں صدی میں اسلامی بیداری کی لہر دیگر بلادِ اسلامیہ
کی طرح چین میں پہنچی اور چینی مسلمانوں نے جوشِ مذہبی کے تلاطم سے مشتعل ہو کر بغاوتوں کا سلسلہ
شروع کر دیا جس کی انتہائی صورت سنہ ۱۸۶۰ء کی بغاوتِ عظیم یونن اور مغربی ترکستان میں
نمودار ہوئی حسبِ معمول اُن پُرجوش مسلمانوں نے ایک خوفناک جنگی قوت کا اظہار کیا ترکستان
کے باغیوں کو ایک قابل سردار یعقوب بیگ مل گیا۔ اور چند سال کے لیئے ترکستان اور
یونن حقیقی طور پر آزاد ہو گئے اکثر یورپی ناظرین کا یہ خیال تھا کہ باغی متحد ہو کر ایک مستقل اسلامی
سلطنت مغربی چین میں قایم کر لینگے۔ اور کُل سلطنت پر تاخت کریں گے۔ یعقوب بیگ
کی شہرت بلادِ اسلام میں پھیل گئی اور سلطانِ ترکی نے امیر المومنین کے ممتاز خطاب سے
اُسے سرفراز کیا۔ سالہا سال کے سخت جدال کے بعد جس میں ہیبت ناک قتلِ عام بھی ہوئے
حکومتِ چین نے بغاوت کو فرو کیا۔ چینی مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہو گئی اور اس وقت
تک اپنی پہلی قوت کو نہیں پہونچے ہیں لیکن اُن کا جوش آج بھی غیر مغلوب ہے اور
اُن کی تعداد ایک کروڑ نفوس ہے۔ اس طریقہ پر چینی اسلام باوجود اپنی رجعت قہقری کے
آئندہ کے لیئے ایسا عنصر ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔[1]

مذکورہ بالا تماثیل میں گذشتہ صدی میں اسلامی جد و جہد کی فہرست ختم نہیں ہو
جاتی مثلاً ہندوستان میں اسلام سرعت کے ساتھ استقامت پذیر ہو رہا ہے [illegible]

---

[1] بروم ہال کی کتاب "چین میں اسلام" مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۰ء۔ نگارندہ کا مضمون
"چینی مسلمانوں کا تبصرہ" جو جنوری سنہ ۱۹۱۰ء میں ریویو دو موند مسلمان میں شایع ہوا
"چین میں اسلام" پر مضمون جو تھا "دِی ورلڈ ٹو ڈے" میں بمقام لندن سنہ ۱۹۱۰ء میں
طبع ہوا۔

کی مزید تمثیل سے ظاہر ہوگا فصل سابق میں ہم نے روسی تاتاریوں میں آزاد تحریک کا ذکر کیا ہے مگر وہ اس ملک میں مسلمانوں کی بیداری کا صرف ایک ہی رُخ تھا اُس کا دوسرا رُخ مسلمان بنانے کے جوش کا نمایاں احیاء ہے۔ یہ تاتاری عرصے سے روسی حکومت کے زیر فرمان ہیں اور راسخ الاعتقاد کلیسا نے انھیں عیسائی بنانے کی مسلسل اور متواتر کوششیں کیں۔ اور بعض حالات میں اُنھیں ظاہرا کامیابی بھی ہوئی لیکن اوائلِ انیسویں صدی میں اسلامی بیداری کی لہر تاتاریوں میں پہونچی تو اُنھوں نے فوراً اپنے عیسائی شدہ بھائیوں میں کام کرنا شروع کیا اور تھوڑے عرصہ میں ان میں سے اکثر باوجود راسخ الاعتقاد کلیسا کی عظیم مساعی اور روسی عمال حکومت کی تعزیری کارروائیوں کے دائرہ اسلام میں دوبارہ شامل ہو گئے۔ اپنے روسی حکمرانوں کے موانعات کے علی الرغم تاتاری مبلغین نے بالخصوص شمالی ترکی فنی قبایل کو دائرہ مذہب میں داخل کرنا شروع کر دیا۔[1]

انیسویں صدی میں چین میں بھی اسلامی قوت کا غیر معمولی اظہار ہوا۔ اسلام شروع ہی زمانہ میں عرب تجار اور عرب تنخواہ دار سپاہیوں کی جماعتوں کے ذریعہ سے چین پہنچ گیا تھا چینی عورتوں سے صدیوں کی مناکحت کے باوجود ان کے اخلاف عام چینی آبادی سے نمایاں طور پر ممیز ہیں اور اپنے آپ کو جدا اور با امتیاز سمجھتے ہیں۔ ان چینی مسلمانوں کا اصل مرکز یونن کے جنوبی صوبہ اور اُس کے ماورا اور وسطی صوبجات میں ہے ان چینیوں کے علاوہ جو من حیث القوم مسلمان ہیں اسلامی آبادی کا دوسرا مرکز مشرقی یا چینی ترکستان ہے جس میں ترکی نسل کے لوگ آباد ہیں جنھیں چینیوں نے اٹھارھویں صدی ہی میں فتح کیا تھا۔ کچھ عرصہ قبل تک چینی مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ ان کے

---

[1] ایس بروبوفنی کوف کا مضمون "روس میں مسلمان" جو جنوری ۱۹۱۱ء میں دی مسلم ورلڈ میں شایع ہوا۔

اور اپنی کل عمر اس خطرہ سے بلاد اسلامی کو متنبہ کرنے اور مدافعانہ تدابیر کی سعی میں صرف کی۔ یورپی نوآبادیات کے عمال نے اُنھیں بہت جلد خطرناک شورش پسند سمجھ لیا۔ انگریز خصوصیت سے جلد خائف ہوگئے اور اُن کے درپے تخلیف دہی ہو کر نشانہ مظالم بنایا۔ یہ کچھ زمانہ تک ہندوستان میں قید رہ کر تقریباً ۱۸۷۱ء میں مصر گئے اور عربی پاشا کی یورپی مخالفت کی تحریک میں ان کا بھی حصہ تھا۔ ۱۸۸۲ء میں جب انگریزوں نے مصر پر قبضہ کیا تو جمال الدین کے اخراج کا حکم دے دیا اور وہ سیر و سیاحت کرتے ہوئے بالآخر قسطنطنیہ پہنچے۔ یہاں سلطان عبدالحمید کی ذات اُن کے لیے ایک فیاض مربی ثابت ہوئی۔ سلطان چونکہ اس وقت بین الاسلامی تحریک کو ترتیب دے رہے تھے لہذا سلطان قدرتی طور پر جمال الدین کی شخصیت سے مسحور ہوگئے اور انھوں نے فوراً اپنے اتحاد بین الاسلامی کے دفتر تبلیغ کا اُنھیں سردار بنا دیا۔ درحقیقت یہ اغلب ہے کہ سلطانی بین الاسلامی تدابیر کی کامیابی زیادہ تر جمال الدین کی قابلیت اور سرگرمی سے ہوئی۔ جمال الدین ۱۸۹۷ء میں کبرسنی میں فوت ہوئے۔ اور آخر وقت تک اپنے مشاغل میں مصروف رہے۔

جمال الدین کی تعلیم کا حسب ذیل خلاصہ ہے: مسیحی دنیا باوجود اپنی قومی اور نسلی اندرونی اختلافات کے مشرق کے خلاف اور بالخصوص مسلمانوں کی مخالفت میں اسلامی سلطنتوں کے تباہ کرنے کے لیئے بالکل متحد ہے۔ پیٹر راہب کی متعصب روح اور حروب صلیبیہ آج بھی موجود ہیں۔ مسیحیت آج بھی ملت اسلام کو مجنونانہ نفرت اور حقارت سے دیکھتی ہے۔ اسکا چند طریقوں سے اثبات ہوتا ہے۔ مثلاً بین الاقوامی قانون جس میں اسلامی قومیں مسیحی قوموں کے مساوی نہیں سمجھی جاتیں۔ مسیحی حکومتیں اسلامی سلطنتوں پر حملہ یا اُن کی تذلیل اور تحقیر کرنے کا عذر تو یہ پیش کرتی ہیں کہ یہ سلطنتیں پست و بد بری حالت میں ہیں۔ تاہم یہی حکومتیں بلاد اسلامی میں ہر ایک اصلاح و احیار کی ہر کوشش کا ہزارہا ترکیبوں حتیٰ کہ جنگ و جدال سے دم گھونٹ دیتی ہیں۔ اسلام سے نفرت بعض ہی میں نہیں بلکہ کل عیسائی

کا بھی وہی حال ہے[1]۔ یورپی اقتدار اشاعت اسلام کا بجائے مانع ہونے کے ممد ہے کیونکہ مغربی ترقیات مثلاً ریل، ڈاکخانہ جات۔ اور مطابع مسلمانوں کو اسلامی تبلیغ کے لیئے کارآمد معاون مل جاتے ہیں۔

اب ہم کو موجودہ تحریک اتحاد بین الاسلامی کے دوسرے مرکزی سرچشمہ پر غور کرنا چاہیئے خصوصاً اس تحریک پر جس سے جمال الدین کی شخصیت وابستہ ہے سید جمال الدین الافغانی اُنیسویں صدی کے اوائل میں ایران کے شہر اسد آباد مضافات ہمدان میں پیدا ہوئے حقیقتاً وہ ایرانی النسل نہ تھے بلکہ افغانی النسل تھے جیسا کہ اُن کے نام سے ظاہر ہے اور سید کے خطاب سے جس کے معنی اولادِ رسولؐ ہیں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی رگوں میں عربی خون ہے۔ جمال الدین اعلیٰ ذہانت سے متصف عظیم الشان ذاتی مقناطیسی اثر سے معمور اور قوائے عملیہ سے لبریز تھے۔ اُن کی عمر پُرشور اور گوناگوں معاملات میں گزری یہ بڑے سیاح اور بلاد اسلامی کے سوا مغربی یورپ سے بھی خوب واقف تھے ان سیاحتوں اور وسیع مطالعہ سے اُنھوں نے معلومات کا ذخیرۂ کثیر جمع کر لیا تھا جس کو وہ اپنی مختلف سرگرمیوں میں موثر طور پر استعمال کرتے تھے۔ جمال الدین پیدائیشی مبلغ تھے اس لیئے دور دور کے لوگ اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور بلاد اسلامیہ میں جہاں بھی وہ گئے اُن کی زبردست شخصیت نے ایک دماغی ہیجان پیدا کر دیا۔ شیخ سنوسی کے برعکس اُنھوں نے دینیات سے بہت کم تعلق رکھا اور کُل وقت سیاسیات میں صرف کیا۔ جمال الدین ہی پہلے مسلمان تھے جنھوں نے مغربی تسلط کے آنے والے خطرہ کو پوری طور پر محسوس کیا

---

[1] محمد ٹن ورلڈ ٹوڈے مطبوعہ لندن ۱۹۱۰ء میں "جاوا اور سماترا میں اسلام پر مضمون" ملاحظہ ہو۔ اے کباٹون کی کتاب "جاوا، سماترا، اور مشرقی ڈچ انڈیز (جس کا ترجمہ ڈچ سے ہوا) مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۱ء"

کی زیادتی ہو نہ کہ کمی"[۵۱] آرمینس وامبیری مشہور ہنگریا کا مستشرق بیان کرتا ہے کہ جنگ کریمیا کے بعد وہ ایک اتحاد بین الاسلامی کی جنگجویانہ مجلس میں موجود تھا جو عالی[۵۲] پاشا کے محل میں منعقد ہوئی تھی۔ اور اسلامی دنیا کے دور دراز حصص کے وکلا اُس میں موجود تھے۔

سلطان عبدالحمید نے جن بنیادوں پر اپنی عالی حوصلہ بین الاسلامی تحریک کی تعمیر کی وہ اس قسم کی تھیں سلطان عبدالحمید موجودہ زمانہ کے عجیب ترین شخصیتوں میں تھے وہ غیر معمولی ذہانت کے آدمی تھے لیکن اُن کے دماغ میں کچھ ایسا عجیب قسم کا خلل تھا جو جنوں کی حد تک پہنچا تھا انہوں نے عالی حوصلہ اور عظیم تجاویز قایم کر کے اُنھیں خفیہ اور پیچیدہ طریقوں سے نافذ کرنے کی کوشش کی یہ طریقے اگرچہ بسا اوقات زیرکانہ سیاسی چالوں کا پہلو لیئے ہوئے تھے لیکن بعض وقت فضول اور طفلانہ ہوتے تھے چونکہ وہ طبعاً خود مختار رہتے تھے لہذا وہ اس کے کوشاں رہتے تھے کہ چھوٹے سے چھوٹا فیصلہ بھی اُن کی مطلق العنان مرضی کے تحت میں رہے اگرچہ اُن کی رہنمائی بڑے ہوشیار خوشامدی کرتے تھے جو اُن کے توہمات اور اُفتاد طبیعت سے پورا نفع اُٹھانا جانتے تھے۔

سلطان عبدالحمید ۱۸۷۶ء میں بڑے سخت مصائب و نوائب کے زمانہ میں تخت نشین ہوئے۔ ایک تباہ کن روسی جنگ ملک کے سر پر آگئی تھی اور حکومت اُن مدبرین کے ہاتھوں میں تھی جو ٹرکی کو جدید سلطنت میں تبدیل کرنے کی کوشش

---

۵۱ منقول از کتاب "مشرقی مسایل پر مضامین" مصنفہ ڈبلیو۔ جی۔ پالگریو صفحہ ۱۱۱ مطبوعہ لنڈن ۱۸۷۲ء۔ مصنف

۵۲ اے۔ وامبیری کی کتاب "بلاد مشرق میں مغربی تمدن" صفحہ ۳۸۱ مطبوعہ لنڈن ۱۹۰۶ء۔ مصنف

اقوام میں بالاشتراک ہے۔ اور اس روح کا یہ اثر ہو کہ تباہی اسلام کی تخت پڑ دینے کی کوشش کیجاتی ہے ہر اسلامی جذبہ اور ہر خواہش کی مسیحیت کی طرف سے توہین و تحقیر کی جاتی ہے۔ یورپ والے جس چیز کو اپنے ملکوں میں قوم پرستی اور وطن پرستی کہتے ہیں اُوسی کو مشرق میں جنون سے موسوم کرتے ہیں جس چیز کو مغرب میں خودداری اور فخر اور قومی عزت کہتے ہیں مشرق میں اُوسے جنگی جوش سے موسوم کرتے ہیں جس چیز کا مغرب میں قومی جذبہ جانکر احترام کرتے ہیں مشرق میں اُسے جنون جدت پسندی خیال کرتے ہیں[1]۔ ان تمام امور سے یہ عیاں ہو کہ تمام اسلامی دنیا کو تباہی سے بچنے کے لیئے ایک مدافعانہ اتحاد میں منسلک ہو جانا چاہیئے اس عمل کے لیئے مغربی ترقی کے علوم کو حاصل کرنا اور مغربی قوت کے راز کو سیکھنا از بس ضروری ہے۔

جمال الدین کی تعلیمات کا لب لباب یہ ہے جس کی تبلیغ فصاحت اور وثوق کے ساتھ برسوں کی گئی۔ مغربی مداخلت سے جو خوف اور نفرت کی حالت تمام بلاد اسلامی میں پھیل رہی تھی اُسے پیش نظر رکھ کے یہ معلوم کرنا بہت آسان ہے کہ جمال الدین کا کتنا بڑا اثر تھا بلاشبہ جمال الدین اپنی موعظت میں تنہا نہ تھا دیگر با اثر مسلم بھی انھیں طریقوں پر وسط انیسویں صدی سے شورش پیدا کر رہے تھے ان پیشرودں میں سے مشہور ترک عالی پاشا تھا جس نے یہ کہا تھا "ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ مذہبی جنون

---

[1] منقول از مضمون "اتحاد بین الاسلامی و بین الترکی" نوشتہ X جو ریویو دو موند مسلمان میں مارچ ۱۹۱۳ء کو شائع ہوا۔ ایڈیٹر کہتا ہو کہ یہ مستند مضمون ایک عالی مرتبت مسلمان یعنی "ایک مسلمان افسر اعلیٰ" کا لکھا ہوا ہے۔ جمال الدین کی دیگر سرگرمیوں کے لیئے ملاحظہ ہو اے سروی ایر کی کتاب "مسلمانوں کی قوم پرستی" صفحات ۱۰ لغایتہ ۱۳۔ مصنف

جاری رہی اس امر کا صحیح اندازہ کرنا دشوار ہے کہ یہ تبلیغ کس حد تک کامیاب ہو سکی۔ اوّلاً نوجوان ترکوں کے انقلاب نے، جو ۱۹۰۸ء میں واقع ہوا اور جس میں عبدالحمید معزول ہو گئے اس تبلیغ کا خاتمہ کر دیا۔ اور ایک حد تک اُس کے اثر کو زائل کر دیا۔ ترکی اور کسی یورپی اوّل درجہ کی طاقت کے درمیان کوئی لڑائی نہ ہوئی جس میں اس کا صحیح امتحان ہو سکتا۔ ان وجوہ سے کوئی نظری اندازہ کرنا بے سود ہے۔ اکثر اسلامی حکمرانوں اور مشاہیر نے عبدالحمید کی روحانی سیادت کو نہایت احترام سے قبول کر لیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ عامۃ المسلمین اُن کی مذہبی عزت کرنے لگے بعید ترین مقامات میں طاقتور اسلامیوں کے صاحب سطوت خلیفہ کو حامی دین متین اور اُن کی سلطنت کو اسلام کا حصن حصین سمجھنے لگے۔ لیکن مذہبی سرگرمی اور عملی کارروائی میں بڑا فرق ہے۔ مزید براں عبدالحمید کو سنوسی جیسے طاقتور اتحاد بین الاسلامی کے سردار کی حمایت حاصل کرنے میں کامیابی نہ ہوئی سنوسی اُن کے مقاصد سے بدگمان اور اُن کی رائے پر معترض تھے۔ مسلمان آزاد خیال اُن کی مطلق العنانی و انقلابات شورش اور حکومت کی کمزوری کی وجہ سے انھیں ناپسند کرتے تھے۔ لہٰذا امر متنازعہ فیہ یہ ہے کہ اگر عبدالحمید کسی جہاد میں اسلامی دنیا سے مسلح امداد کے خواستگار ہوتے تو اُن کو عام طور سے مدد ملتی یا نہیں

تاہم عبدالحمید نے خیالات اتحاد بین الاسلامی کی اشاعت کو تمام بلاد اسلامی میں ترقی دی اس بڑے مقصد میں اُن کو کامیابی ہوئی اور یہ کامیابی بحیثیت خلیفہ کے نہیں ہوئی بلکہ اُس نے مغرب کے روز افزوں خوف اور نفرت کو منتقل کر دیا تھا۔ اس طریقہ پر ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ عبدالحمید کی بین الاسلامی تبلیغ نے ایک عمیق اور دیرپا اثر پیدا کیا جو کمال توجہ کے ساتھ پیش نظر رہنے کے قابل ہے۔

۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں کے انقلاب نے حالت زیادہ نازک کر دی اس کے بعد ہی ایران میں انقلاب ہوا اور مشرق کے دیگر حصص میں اسی قسم کی علامتیں

کر رہے تھے اور جنھوں نے ہر قسم کی مغربی سیاسی اختراعات حتیٰ کہ پارلیمنٹ بھی جاری کر دی تھی سلطان عبدالحمید نے اس کو بہت جلد بدل دیا۔ روسی جنگ کے اختتام پر جو پریشانی پیدا ہوئی اُس سے نفع اُٹھا کر انھوں نے پارلیمنٹ کو منسوخ کر دیا۔ اور اپنے پیشروؤں کی طرح بالکل خودمختار مطلق العنان بن بیٹھے۔ اپنی خودمختارانہ قوت کو مضبوط کرنے کے بعد عبدالحمید نے اپنی خاص حکمت عملی کو ترقی دینا شروع کی جس میں شروع سے نمایاں بین الاسلامی میلان[1] تھا۔ اپنے متقدمین کے برخلاف عبدالحمید نے ارادہ کیا کہ اپنے عہدۂ خلافت کو دوررس سیاسی اغراض کے لیئے استعمال کریں۔ اسلامی دنیا میں اپنی روحانی سیادت بمقابلہ ترکی سلطنت کی سیاسی سیادت کے زیادہ زور دیکر انھوں نے یہ کوشش کی کہ تمام مسلمانوں کی عملی امداد حاصل کریں اور اس امداد سے ان یورپی طاقتوں کو خایف کریں جو سلطنت عثمانیہ کے خلاف تعدی کرنے کی تدبیریں کر رہی تھیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں عبدالحمید نے اتحاد بین الاسلامی تبلیغ کا نہایت اچھا نظام قایم کر لیا جو خفیہ اور پیچ در پیچ طور سے کام کرنے لگا۔ قسطنطنیہ جمال الدین کے قماش کے پرجوش اور مغرب کے مخالف شوریدہ سر انگیزوں کا مرکز بن گیا۔ اور وہیں سے منتخب جاسوسوں کے انبوہ روانہ ہوئے اور اسلام کے دور دراز ممالک میں خلیفہ کا پیام امید اور کافروں کی حکومت کے خطرہ سے آئندہ نجات کا مژدہ لیگئے۔

تقریباً تیس سال تک عبدالحمید کی تبلیغ اتحاد بین الاسلامی بلا روک ٹوک کے

---

[1] عبدالحمید کی اتحاد بین الاسلامی تجاویز کو سب سے پہلے فرانسیسی ماہر سیاسیات ڈیبل شارمس نے ۱۸۸۰ء میں بالمشافہ مشاہدہ کیا اور اس کی تنبیہات اُس کی کتاب مستقبل ترکی اور اتحاد بین الاسلامی مطبوعہ پیرس ۱۸۸۳ء میں شایع ہوئیں ۱۲ مصنف

ہوسکتی تھی۔

نتیجہ بہت جلد ظہور میں آیا طرابلس میں جہاں ترک اور عرب ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے دونوں قومیں بین الاسلامی جوش میں دفعتاً متحد ہوگئیں اور اطالوی حملہ آوروں کو اس غضب کے جوش و غصہ سے مقابلہ کرنا پڑا جس سے اسلام نہایت خاندماں ہوا اور مغربی مصر میں سخت اضطراب پھیل گیا۔ گیبرئل ہانوتو سابق فرانسیسی وزیر خارجہ نے خود ہی یہ سوال کیا "بحر محفوظ طرابلس اطالویوں کے لیے لانہ زنبور کیسے بن گیا" اور خود ہی جواب دیا ہے "اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے معاملہ کو صرف ترکی ہی سے تعلق نہیں ہے بلکہ اسلام سے ہے۔ اٹلی نے حرکت پیدا کردی ہے جس کا نتیجہ خود اس کے لیے اور ہم سب کے لیے بہت بُرا ہے"۔ انگریزوں اور روسیوں نے مل کر اہل ایران کی قسمت کا جو فیصلہ کیا اس پر کل بلادِ اسلام نے نہایت غضبناک[۲] نکتہ چینی کی اور فرانسیسیوں کے ہاتھوں جو مراکش کی آزادی کا خاتمہ ہوا اس پر نہایت غم و غصہ کا اظہار کیا گیا۔

جنگ بلقان کے آغاز سے مسلمانوں کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی۔ چین سے لیکر کانگو تک دیندار مسلمان دوردراز بلقان میں صفوفِ جنگ کی نقل[۱] و حرکت پر دم بخود ہو کر نظر جمائے ہوئے تھے اور جب ترکی مصائب کی خبریں آئیں تو اسلامی غم و غصہ کی صدا انتہائی شدت کے ساتھ بلند ہوئی۔ ایک سربرآوردہ

---

[۱] جیبرئل ہانوتو کا مضمون "بحیرہ روم کی پیچیدگیاں اور اسلام"، جو ۱۰ اپریل ۱۹۱۲ء کو ریویو ہیبدومیڈیر میں شایع ہوا۔ مصنف

[۲] ملاحظہ ہو مضمون "فارس کی سیاسی حالت"، نوشتہ × جو جون ۱۹۱۲ء کو ریویو دو موند مسلمان میں شایع ہوا۔ اور بی ٹیمپل کا مضمون "سیاسیات عالم میں ایران کی جگہ"، جو ۴ مئی ۱۹۱۰ء کو سنٹرل ایشیا سوسایٹی کی کارروائی میں شایع ہوا۔ ڈبلیو ایم شوسٹر کی کتاب "اختناق ایران"، مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۲ء۔ مصنف

نمودار ہوئیں ان واقعات سے جدید قوتیں دفعتہً نمودار ہو گئیں مثلاً دستوریت۔ قوم پرستی اور نیز معاشرتی بے چینی جو اسلام میں لامعلوم طور پر پیدا ہو رہی تھیں اور جن کا پہلے اظہار نہیں کیا جاتا تھا ہم ان جدید طاقتوں پر بہ تفصیل بعد میں بحث کریں گے۔ جو امر یہاں پر قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ ان امور سے تحریک اتحاد بین الاسلامی میں کیسی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں بلا شبہ تحریک اتحاد بین الاسلامی کا راستہ بدل گیا اور تلاطم اور ذہنی پس و پیش کا دور شروع ہوا۔

لیکن یہ دور بہت مختصر تھا۔ ۱۹۱۲ء میں تحریک اتحاد بین الاسلامی نے اپنا توازن قائم کر کے پھر ترقی شروع کی اس کی وجہ مغربی صعوبات کی تجدید تھی ۱۹۱۱ء میں اطالیہ نے ترکی کے افریقی ملک محروسہ یعنی طرابلس پر نہایت بے شرمی سے حملہ کیا ۱۹۱۲ء میں مسیحی ریاستہائے بلقان نے جنگ بلقان کا آغاز کر کے ترکی پر حملہ کیا۔ اور ترکی کا یورپی صوبہ قسطنطنیہ کی دیواروں تک ہضم کر لیا جس سے ترکی سلطنت نے دست و پا اور بے اقتدار رہ گئی علاوہ بریں اس پُر آشوب زمانہ میں روس اور انگلستان نے ایرانی انقلاب کا گلا گھونٹ دیا۔ اور فرانس نے اغادیر کے معرکہ کے بعد مراکش پر پورا قبضہ کر لیا اس طریقہ پر دو سال کی قلیل مدت میں اسلامی دنیا کو دول یورپ کے ہاتھوں ایسے حملے برداشت کرنے پڑے جو نہ صرف اپنی شدت و تعدی میں عدیم المثال بلکہ مسلمانوں کی رائے میں بلا سبب اشتعال تھے۔

اس کا اسلام پر زبردست اثر پڑا۔ اسلامی دنیا کے ایک گوشے سے دوسرے گوشہ تک یاس اور غصہ کا طوفان بپا ہو گیا اور اس میں بلاشبہ تحریک اتحاد بین اسلامی کا تعلق عیاں تھا اور یہی وہ نتیجہ تھا جس کے لیے بین الاسلامی شورش انگیز پچاس برس سے سعی و تبلیغ کر رہے تھے۔ یعنی یہ احساس پیدا کرنا کہ مغرب نے اسلام کی تباہی کے لیے حرب صلیبی کا آغاز کیا ہے۔ اس سے بہتر جمال الدین کے انتباہ کی تصدیق اور کیا

کریں۔ ہمیشہ ان اوامر رسول خدا صلعم کی پابندی کی جاتی تھی اور ہمارے زمانے تک مسلمانوں کو عیسائیوں سے جو نفرت تھی وہ کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو لیکن اس تحقیر اور نفرت کے مقابلہ میں ہیچ تھی جو مشرکین یعنی براہمہ مذہب کے ہنود یا مشرق اقصےٰ کے بدھ مذہب والوں اور کنفیوشیئو[1] سے تھی۔

طرز عمل میں تبدیلی کے پہلے آثار ۱۹۰۴ء کی جنگ روس و جاپان کے دوران میں نمودار ہوئے اس وقت تک اسلام کو نصرانی مغرب سے خوف اور تنفر اتنا بڑھ گیا تھا کہ بہت سے مسلمانوں نے ایک ایشائی قوم کی یورپیوں پر فتح یابی کی نہایت جوش سے خوشی منائی باوجودیکہ فاتحین مشرک تھے۔ بہت سے متقی مسلمان ان بہادروں کو دائرہ اسلام میں لانے کا خیال پیدا ہونا یہ اتحاد بین الاسلامی کے مستحکم تبلیغی میلان کے بالکل

---

[1] کنفیوشیس۔ اس کا اصلی نام کنگفو تسزی ہے جس کو رومیوں نے کنفیوشینس کر لیا ہے ۵۵۱ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۴۷۹ء میں مرا۔ یہ صوبہ شانتونگ میں مضافات شہر شیہو میں پیدا ہوا۔ اپنی والدہ کی وفات کے بعد وہ شاہی دربار میں بمقام حنان حاضر ہوا۔ یہاں اس نے لاؤتسز کے مواعیظ سنے اور ان کو فضول پایا۔ لہذا وہ اس مسئلہ پر بطور خود سوچتا رہا کہ ایک خلیق شریف کی طرح وہ کیونکر زندگی بسر کرے ۵۰۲ق۔م میں شہر چنگتو کا مجسٹریٹ بنا دیا گیا اس کی حیرت انگیز خوبیوں اور قابلیتوں نے بڑا اثر پیدا کر لیا لیکن دشمنوں کی چالبازیوں کا شکار رہا اور چنگتو چھوڑنا پڑا۔ اس نے سیاسی نظریات کو ترک کر کے یہ کوشش کی کہ وہ بادشاہوں کو بہترین حکمران بننے کی ترغیب دے۔ اس میں بھی وہ ناکامیاب رہا اور کل ملک چین میں گھومتا رہا۔ اس کی فلسفیانہ تصانیف مفقود ہیں لیکن اس کے مریدین اور اولاد نے اس کے مقولات کو جمع کیا ہے۔ جو نصاب تعلیم میں داخل ہیں یہ چینی فلسفہ کا بانی ہے۔ اس نے چینی ادبیات اور تاریخ کی تفسیر و تدوین کی۔ شہر کیوفو کے متصل کنگ کے قبرستان میں مدفون ہے اس کے اولاد کی تعداد تقریباً پچاس ہزار بتائی جاتی ہے۔

(مترجم)

ہندوستانی مسلمان نے اپنے ہر جگہ کے ہم مذہبوں کے خیالات کی بہترین ترجمانی اس تحریر میں کی "شاہ یونان جدید حرب صلیبی کا حکم دیتا ہے لندن کے ایوان حکومت سے مسیحی جوش تعصب کو صلائے عام دی جاتی ہے اور سینٹ پٹرس برگ میں صلیب کو مسجد ایا صوفیہ کے گنبد پر نصب کرنے کی گفتگو ہوتی ہے آج اغیار کی گفتگو یہیں تک ہے کل بیت المقدس اور مسجد عمرؓ کے لیے بھی یہی مشورے ہوں گے۔ بھائیو وقت ہے کہ سب متحد الخیال ہو جاؤ اور ہر سچے مسلمان کا فرض ہے کہ خلیفہ کے جھنڈے کی طرف دوڑے اور ناموس اسلام کے تحفظ کے لیے اپنی جان کو قربان کرے[1]" ایک دوسرے مسلمان لیڈر نے برطانوی حکام کو حسب ذیل الفاظ میں مخاطب کیا "میں موجودہ حکومت سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ترکی کے ساتھ اپنا مخالفانہ رویہ بدل دے قبل اس کے کہ اس کے کروڑوں مسلمان رعایا کا غصہ بھڑک کر آگ لگا دے اور مصائب برپا کرے[2]۔"

سب سے زائد معنی خیز وہ اپیل تھی جو اس زمانہ میں مسلمانوں نے غیر مسلم ایشیائیوں سے حصول ہمدردی اور مبغوض مغرب کے خلاف استحکام کے لیے کی۔ یہ صورت جس قدر عدیم المثال تھی اسی قدر حیرت انگیز بھی تھی۔ آنحضرت صلعم چونکہ عہدنامجات جدید و قدیم کا احترام اور حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام انبیا مرسل من اللہ کا اپنے آپ کو جانشین تصور فرماتے تھے انھوں نے اپنے تابعین کو حکم دیا تھا کہ وہ نصاریٰ اور یہود یعنی اہل کتاب کا بمقابلہ دیگر غیر مسلموں کے جو مشرکین کہلاتے تھے زیادہ احترام

---

[1] اقتباس از مضمون "ترکی سانحہ اور دنیائے اسلامی"، نوشتہ اے۔ وامبیری جو جرمن ریویو جولائی ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔

[2] شاہ محمد نعمت اللہ کا مضمون "جدید ترکی واقعات اور ہندی مسلمان" جو اکتوبر ۱۹۱۳ء میں ایشیاٹک ریویو میں شائع ہوا۔

عدو کے استیصال کے لیئے استعداد کرو۔[ا]

ہر اوس شخص کے لیے جو اس سے واقف ہو کہ مسلمانوں کا مشرکوں سے قدیم طرز عمل کیا تھا یہ الفاظ نہایت حیرت انگیز ہیں۔ صاحبان بصیرت ان میں حقیقی انقلاب کی جھلک دیکھتے ہیں اور یہ خیالات ہندی مسلمانوں ہی تک محدود نہ تھے بلکہ چینی مسلمانوں میں بھی مساوی طور پر نمایاں تھے۔ چینی ترکستان کے ایک اسلامی اخبار نے مغربی تعدی کے خلاف کل چینیوں میں اتحاد اخوت کی تبلیغ کرتے ہوئے لکھا "یورپ بہت دلیر ہوگیا وہ ہمیں آزادی سے محروم کریگا۔ اگر ہم فوراً رادر مقاومت کے لیے تیار نہوں تو وہ ہمیں بالکل نیست و نابود کردیگا"[۲] چینی انقلاب کی پرآشوب ابتدائی منازل میں مسلمانوں نے اپنی متکبرانہ علحدگی کو چھوڑ کر اپنے بودھ اور کنفیشی ہمدرد ابناء وطن سے ایسا کامل تعاون عمل کیا کہ جمہوریت کے سردار ڈاکٹر سن یات سین[۳] نے بطور شکریہ کے یہ اعلان کیا

[ا] منقول از کتاب وامبیری مذکورۃ الصدر۔ مصنف

[۲] وامبیری کا مضمون "مسلمانوں اور بودھوں کے درمیان مفاہمت" جو اپریل ۱۹۱۰ء کے رسالہ نائنٹینتھ سنچوری اینڈ آفٹر میں شایع ہوا۔ مصنف

[۳] سن یات سین یا سون ین سن ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ یہ چینی مدبر ہیں۔ کچھ عرصہ تک مطب کرنے کے بعد نوجوان چینی جماعت کے ممبر اور سرگرم انقلابی ہوگئے۔ سن ۱۹۱۱ء کے انقلاب میں نمایاں حصہ لیا اور جمہوریت کی عارضی صدر منتخب ہوئے۔ سن ۱۹۱۲ء میں یوان شیہ کائی کے حق میں استعفے دیا اور بعد میں اُن کے خلاف بغاوت کی۔ سن ۱۹۱۳ء میں جاپان کو فرار ہوگئے۔ سن ۱۹۱۷ء کے مصائب میں برخاست ہوئے۔ پارلیمنٹ کے انتہا پسند فرقہ نے کنٹون میں ایک فوجی حکومت بسرکردگی ڈاکٹر سنیاتسین قایم کرکے شمالی وجنوبی حصص چین کے مابین حالت جنگ کا اعلان کیا۔ نومبر سن ۱۹۱۸ء تک یہ جنگی کارروائیاں وقتاً فوقتاً جاری رہیں حتی کہ نسو شیہ چانگ پریزیڈنٹ منتخب ہوئے۔ تب ممالک غیر کی دوستانہ صلاح پر مفاہمت ہوگئی لیکن شورش ہنوز جاری ہو (مترجم)

مطابق تھا۔ جاپان سے ارتباط پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تبلیغی اخبارات جاری کیے گئے مبلغین منتخب کیے گئے۔ اور سلطان نے ایک جنگی جہاز مع ایک اتحاد بین الاسلامی وفد کے جاپان کو روانہ کیا۔ کل دنیائے اسلام میں جاپان کی مجوزہ تبدیلی مذہب پر خوب بحث کی گئی۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں ایک مصری اخبار نے لکھا "انگلستان اپنی چھ کروڑ مسلم رعایا کی وجہ سے اس تبدیلی مذہب سے خائف ہے۔ اگر جاپان مسلمان ہو جائے تو مسلمانوں کی حکمت عملی بالکل بدل جائے گی" اسلامی دنیا کے دوسرے گوشے سے ایک چینی مسلمان شیخ نے لکھا "اگر جاپان کسی دن بڑی قوت ہونے کا اور ایشیا کو دیگر براعظموں پر بڑی آقا بنانے کا خیال رکھتا ہے تو یہ صرف مقدس مذہب اسلام اختیار کرنے سے پورا ہوگا"[۱]

بلاشبہ ان سرگرم حامیوں کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اگرچہ جاپان نے وکلاء اسلام کا شگفتہ اخلاق سے خیر مقدم کیا لیکن اُسے مسلمان ہونے کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ تاہم غیر مسلم ایشیا سے محبانہ ارتباط کا آغاز ہو گیا اور جنگ بلقان نے مسلمانوں کو اس طرف اور بھی بڑھا دیا۔ مسلمانوں کے خیالات میں تبدیلی کا اندازہ ان متعدد اپیلوں سے ہو سکتا ہے جو اس زمانہ میں ہندوستانی مسلمانوں نے ہندوؤں سے کیے۔ ذیل کے نمونہ سے جو بامعنی طور پر "پیام مشرق" کہلاتا ہے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ معروف تحریر حسب ذیل ہے "مشرق کی روح اٹھ اور مغربی تعدی کے طوفان خیز سیلاب کو روک دے۔ فرزندان ہند اپنی دانائی اور شائستگی و ثروت سے ہماری مدد کرو اپنی قوت جو ہنود کا پیدائشی حق اور ورثہ ہے ہم کو عاریت دو۔ اے ہمالیہ کی سرچیون چوٹیوں کی مخفی روحانی قوتوں اٹھو لڑائیوں کے دیوتاؤں سے دعا مانگو کہ جبر پر حق کو فتح ہو اور اپنے بے شمار دیوتاؤں سے افواج

---

[۱] منقول از مضمون نوشتہ ایف۔ فارنٹیل "جاپان اور اسلام"، جو نومبر سنہ ۱۹۱۶ء کے ریویو دو مونڈ مسلمان میں شائع ہوا۔ مصنف

[۲] فارنٹیل کا مضمون مندرجہ بالا۔ مصنف

سے نہ نکلا بجائے اس کے ترکی کے باہر با اثر مسلمانوں نے عام طور سے ترکوں کے فعل پر اظہار ناراضی اور حتی الوسع متعصب عوام کے جذبات کو روکنے کی کوشش کی۔

ان سربرآوردہ مسلمانوں کا طرزِ عمل اُن کی وسعت نگاہ کی وقعت ظاہر کرتا ہے وہ جان گئے کہ مغرب سے فیصلہ کن جنگ کے لیے نہ تو یہ موزوں وقت تھا نہ مناسب موقع۔ وہ اس وقت اس کے لیے مادی طور پر تیار نہ تھے۔ اور انھوں نے نہ تو خود آپس میں اور اپنے متوقع غیر مسلم اتحادیوں سے کوئی سمجھوتا کیا تھا سب پر طرہ یہ تھا کہ اخلاقی اقتضاء بھی مفقود تھا۔ انھیں علم تھا کہ خلیفہ کے فرمان پر "مصنوعۂ جرمنی" ثبت تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اس ہیجان کے محرک کون تھے یعنی "نوجوان ترک"، پارٹی متفرق لامذہبوں کی جماعت تھی، جن میں اکثر برائے نام بھی مسلمان نہ تھے۔ بلکہ یہودی ملاحدہ تھے۔ دوراندیش مسلمانوں کو ذرا بھی پرواہ نہ ہوئی کہ جرمنی کا آلہ کار براری بننے کے لئے اپنے آپ کو گرفتار بلا کریں۔ اور نہ دنیا پر روسٹیا کے اقتدار حاصل کرنے کی تدابیر کی حمایت کرنا چاہتے تھے کیونکہ یہ ان کے لیے محض آقاؤں کا تبادلہ ہوتا۔ یہ بدرجہا بہتر تھا کہ مغرب کو اس کی مایوسانہ لڑائیاں لڑنے دیا جائے تاکہ وہ کمزور ہو کر اپنے آئندہ کے منصوبات کو ظاہر کر دے۔ اس اثناء میں اسلام وقت گزاری کر کے مزید قوت حاصل کرے اور منتظر فردا رہے۔

ورسیلز کی صلح کانفرنس میں یورپی ارادوں کا بالکل وہی انکشاف ہوا جس کا کہ بین الاسلامی تحریک کے سرگروہ اپنے نظام عمل کی تکمیل اور اپنے متبعین کے اخلاقی استحکام کے لیے انتظار کر رہے تھے۔ ورسیلز میں دول یورپ نے غیر مبہم طور پر جتا دیا کہ وہ اپنا تسلط مشرقِ ادنیٰ اور وسطیٰ سے کسی نوع کم کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ ان خفیہ عہدناموں کی بناء پر جو دوران جنگ میں ہوئے تھے فاتح اتحادیوں نے فی الواقع عثمانی سلطنت کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ اور یہی خفیہ عہدنامجات تصفیہ ورسیلز کی سنگ بنیاد قایم کیے گئے۔ مزید براں آغاز جنگ ہی میں مصر پر برطانوی صیانت کا اعلان کیا گیا تھا اور ورسیلز کانفرنس ابھی

امن اور حریت کے مفاد میں جو امداد مسلمان ابناء وطن نے دی ہے اس کو چینی کبھی نہ بھولینگے"[1]

اس طور پر جنگ عظیم شروع ہوئی تو اسلام ہر جگہ یورپی تعدی کے خلاف کلی طور برانگیختہ تھا۔ اور اپنے استحکام سے بخوبی واقف اور یورپی اقتدار کے خلاف مجوزہ جنگ میں ایشیائی اتحادیوں کے لیے کھلم کھلا بہت ترقی کر چکا تھا۔

ان حالات میں بہ نظر اوّل یہ عجیب معلوم ہوگا کہ ۱۹۱۴ء کے اختتام پر جب جب ترک میدان میں آئے اور سلطان خلیفہ نے جہاد کے لیے باضابطہ دعوت دی تو اسلامی دنیا میں کوئی عام تلاطم نظر نہ آیا۔ بلاشبہ یہ دعوت اُس قدر ناکامیاب نہ تھی جس قدر کہ اتحادیوں کے خبر رسانوں نے یورپ کو اُس وقت اُس کی ناکامیابی کا یقین دلایا۔ واقعہ یہ ہے کہ علاًہر اسلامی ملک میں جو اتحادیوں کے تسلط میں تھے سخت مشکلات پیدا ہوئیں۔ بہت سے واقعات میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے مصر میں فتنہ اُٹھا جو محض کثیر التعداد برطانوی فوج کی بدولت دبا۔ طرابلس میں ایسی آتش بغاوت بھڑکی جس نے اطالیوں کو بالکل ساحل تک ڈھکیل دیا۔ ایران ترکی کا شریک کار ہونے سے روس و برطانیہ کی فوری مداخلت ہی کی وجہ سے باز رہا۔ اور ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر ایسی لڑائی ہوئی کہ وہاں ڈھائی لاکھ انگریزی اور ہندوستانی افواج رکھنی پڑیں۔ گورنمنٹ برطانیہ نے سرکاری طور پر اس کا اعتراف کیا ہے کہ ۱۹۱۵ء میں اتحادیو کے ایشیائی و افریقی مقبوضات طوفان خیز بغاوت سے صرف ہاتھ بھر کے فاصلہ پر تھے۔

عام بغاوت یقیناً ہو جاتی اگر اسلام کے اصحاب حل و عقد ہر جگہ اس مہتم بالشان لفظ کو اپنی زبان سے نکال دیتے جس سے ہزارہا تقدیریں وابستہ تھیں لیکن وہ لفظ منہ

---

[1] ڈاکٹر دامیری کا مضمون "مسلمانوں اور بدھوں کے درمیان مفاہمت" مذکورہ بالا۔ مصنف

دنیا بغاوت کرے گی ۱؎"

یہ الفاظ اِن واقعات کی صحیح پیشینگوئی ہیں جو اُس وقت سے دنیائے اسلام میں ظاہر ہو رہے ہیں چونکہ جدید واقعات غالباً بمقابلہ خالص اتحاد بین الاسلامی کے زیادہ تر اسلامی اقوام کی قوم پرستی کے توقعات سے وابستہ ہیں میں اُن پر تفصیلی بحث کو قوم پرستی کے باب کے لیے ملتوی کرتا ہوں۔ مگر ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں کی تحریکات قوم پرستی اتحاد بین الاسلامی چاہے ان کے اختلافات کچھ ہی کیوں نہ ہوں یورپی اقتدار کے بیرونی تعدی کے خلاف متحد ہونے کی طرف مائل ہیں اور دونوں مساوی طور پر یورپی سیاسی تسلط سے اسلام کی نجات کے آرزومند ہیں۔ ان واقعات کو ذہن نشین رکھ کر آؤ اب ہم اتحاد بین الاسلامی کی موجودہ حالت پر ایک نظر ڈالیں۔

مغربی تعدی بالخصوص گزشتہ جنگ اور موجودہ تصفیہ جات صلح اتحاد بین الاسلامی کی قوی محرک ہیں۔ مگر اتحاد بین الاسلامی کو بیرونی تعدی کے خلاف محض حفاظتی سیاسی ردعمل نہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کی ابتدا اُس عمیق جذبہ اتحاد سے ہوتی ہے جو ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے مربوط و منسلک کرتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ مسلمانوں کا یہ باہمی ربط و انسلاک ان تعلقات سے زیادہ قوی ہے جو کہ مسیحی دنیا کے افراد میں قایم ہیں۔ یہ ربط و انسلاک اصطلاحی اعتبار سے محض مذہبی ہی نہیں بلکہ معاشرتی اور تمدنی بھی ہے۔ کل اسلامی دنیا میں مقامی رسومات اور ضوابط کے عظیم اختلافات کے باوجود خاندانی اور معاشرتی عمل کے اصولی قوانین ہر جگہ ایک ہی ہیں۔ درحقیقت یہی ہیں کہ اسلام مجموعہ اعتقادات ہے بلکہ وہ معاشرت کا مکمل نظام ہے۔ وہ ایک ایسی تہذیب ہے جو خود اپنا

۱؎ نیویارک ٹائمس کو خاص تار جو روما سے ۲۸ مئی ۱۹۱۹ء کو دیا گیا۔ — مصنف

ختم نہ ہوئی تھی کہ انگلستان نے ایران سے ایک معاہدہ کا اعلان کیا جس کی رو سے یہ ملک بھی فی الواقع دوسرا برطانوی ملک محروسہ ہوگیا اگرچہ یوں موسوم نہ ہوا۔ جیسا ہم بیان کر چکے ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ مشرق ادنیٰ اور وسطے بیش از پیش یورپی سیاسی اقتدار کے ماتحت ہوگئے۔

لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی تھا۔ دوران جنگ میں اتحادی مدبرین بہانگ دہل اس امر کا بارہا اعلان کر چکے تھے کہ یہ جنگ ایک عالمگیر نظام جدیدے کے قیام کے لیے لڑی جا رہی تھی جس کی بنیاد ایسے اصولوں پر ہے جیسے چھوٹی اقوام کے حقوق اور کل اقوام کی آزادی۔ ان اعلانات کو کل مشرق نے اپنے حافظہ میں محفوظ کر لیا تھا لہذا جب مشرق نے ایسے تصفیہ صلح کو دیکھا جو ان جلیل القدر دعاوی کے بجائے شہنشاہیت کے خفیہ عہدناموں پر مبنی تھا تو وہ اخلاقی غیظ و غضب اور بیز انصاف کی توہین کے احساس سے اس قدر برافروختہ ہوا کہ اتنا کبھی ہوا ہی نہ تھا۔ خشم آلود قصد کا سیلاب اُٹھنے لگا جس نے کل مشرق کو پہلے ہی سے پرشور ہیجان میں ڈال دیا تھا۔ اور جو عظیم تر طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہوتا تھا۔ شگون ایسے بد تھے کہ ورسیلیز کی کانفرنس کے اختتام سے قبل ہی معاملات مشرق کے اکثر واقف کاروں نے نہایت خطرہ کا اظہار کیا۔ مثال کے طور پر یہاں وہ رائے پیش کی جاتی ہے جو لیونی کیٹانی ڈیوک آف سرمونیٹا اطالوی ماہر مسائل اسلامیہ نے ۱۹۱۹ء کے بہار میں "مشرق پر جنگ کے اثر" پر بحث کرتے ہوئے ظاہر کی۔ اس نے کہا "اس ہنگامے نے اسلامی اور مشرقی تہذیب کی بنیادیں متزلزل کر دی ہیں۔ کل اسلامی دنیا چین سے لیکر بحیرہ روم تک ہیجان میں ہے۔ ہر جگہ یورپیوں کے خلاف نفرت کی مخفی آگ روشن ہے۔ مراکش کے بلوے، الجزائر کے فتنے، طرابلس کی شورشیں، مصر و عربستان اور لیبیا میں نام نہاد قوم پرستوں کے مساعی سب ایک ہی عمیق احساس کے مختلف مظاہر ہیں۔ ان کی علت غائی یہ ہے کہ یورپی تمدن کے خلاف مشرقی

بہت مشتعل ہوگیا ہے حتےٰ کہ آج مغرب سے مذہبی، تمدنی و سیاسی نفرت نے وہ دماغی حالت پیدا کردی ہے جو بالیقین امن دنیا کے لیے فال بد ہے۔ ہم کو موجودہ حالت کے امکانی خطرات کو خفیف سمجھ کر خود فریبی نہ کرنا چاہیئے محض اس وجہ سے کہ ۱۴ ۱۹ء میں جرمنی کے اغوا سے نوجوان ترکوں نے جس نمایشی "جہاد" کا اعلان کیا تھا وہ کامیاب نہ ہوا یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ حقیقی جہاد بھی ناممکن ہے۔ چنانچہ ایک جرمن فوجی افسر نے جو جنگ گزشتہ میں ترکی ملازمت میں تھا نہایت آزادی سے کہا ہے "جہاد محض تماشا تھا کیونکہ یہ جہاد ہی نہ تھا"[۱]، میں بیان کرچکا ہوں کہ کس طرح اکثر مسلمان چال کو سمجھ گئے اور انھوں نے جنبش تک نہ کی۔

مگر یورپی تعدیات کا طویل سلسلہ جو موجودہ تصفیہ (صلح) پر منتہی ہوا اور جس نے دراصل کل اسلامی دنیا کو یورپ کے زیر اقتدار کردیا، مسلمانوں کے دلوں میں بتدریج ایسے مایوسانہ غصہ کی روح پیدا کرتا رہا ہے جس کے نتائج نہایت مصیبت ناک ہوں گے۔ بلا شبہ جہاد کے لیے مدتوں سے مواد جمع ہو رہا ہے۔ بیس سال سے زیادہ عرصہ ہوا کہ وامبیری نے جو اسلامی دنیا سے ایسا واقف تھا کہ بہت کم یورپی واقف ہیں، اُن خطرات سے متنبہ کیا جو شہنشاہیت کی غیر دانشمندانہ حکمت عملی سے پیدا ہو رہے ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں اس نے لکھا "امتداد زمانہ کے ساتھ عام لڑائی کا خطرہ بڑھتا جاتا ہے ہم کو یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ زمانہ نے مخالف کی قوت مقاومت کو بہت زیادہ کردیا ہے۔ اس سے میری مراد وہ استحکام کا جذبہ ہے جو اس زمانہ میں اقوام اسلامی میں نشوونما پا رہا ہے اور جو ہمارے اس عہد میں جب کہ ذرائع آمد و رفت بہت سریع ہیں ایسا ناقابل التفات نہیں ہے جیسا کہ دس یا بیس سال پیشتر تھا۔

[۱] ارنسٹ پراکوئن جو عثمانی جنرل اسٹاف کا سابق افسر اور لفٹنٹ کرنیل ہے اُس کا مضمون ۲۲ر جنوری ۱۹۲۰ء کے برلنر تیج بلاٹ میں شایع ہوا۔

فلسفہ، تمدن و فنون رکھتا ہے۔ اپنے رقیب نصرانی تہذیب کے خلاف طویل جدوجہد کی وجہ سے یہ ایک منظم ہستی ہوگیا ہے جو اپنی شخصیت سے باخبر ہے[۵۱]"

اس اسلامی تہذیب سے کل مسلمان گہری طور پر وابستہ ہیں۔ اس وسیع معنی میں اتحاد بین الاسلامی عام ہے۔ حتیٰ کہ سب سے زیادہ آزاد مشرب مسلمان بھی خواہ وہ مغربی خیالات کے کتنے ہی دلدادہ ہوں اور سیاسی اتحاد بین الاسلامی کے متعصبانہ اور بدنظمانہ پہلو سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ کرتے ہوں اسلام کے حقیقی اتحاد کے دل سے معتقد ہیں۔ چنانچہ ایک سربرآوردہ آزاد خیال ہندی مسلمان ہزہائی نس آغاخاں لکھتے ہیں "ایک سچا اور جائز اتحاد بین الاسلامی بھی ہے جس سے ہر صادق اور مومن مسلمان وابستہ ہے جو جناب رسالت مآب کی افراد امت کی اخوت روحانی اور اتحاد کا مسئلہ ہے۔ اسلام کا حقیقی روحانی و تمدنی اتحاد ہمیشہ ضرور بڑھتا رہے گا کیونکہ امت نبی کے لیے یہ حیات اور روح کی بنیاد ہے[۵۲]"

جب یہ خیالات اُن آزاد خیال مسلمانوں کے ہیں جو مغربی تہذیب سے واقف ہیں۔ اور جن میں مغربی ترقی کی قبولیت کی استعداد ہے تو اُن عوام مسلمانوں کے جو جاہل اور شورش پسند اور متعصب ہیں، کیا خیالات ہونگے۔ اُس قابل فہم خوف و نفرت کے علاوہ جو مغربی تعدی کی بدولت ہر تمام مسلمانوں میں ہے۔ مذہبی جنون بھی ہے جو یورپی سیاسی تسلط کی بدولت نہیں ہے بلکہ مذہبی تعصب اور مغربی تہذیب سے کورانہ نفرت کی بدولت[۵۳] پیدا ہوا ہے۔ لیکن مذہبی جنون بلاشبہ گزشتہ قرن کے سیاسی واقعات

---

[۵۱] سر تھیوڈور ماریسن کا مضمون "انگلستان اور اسلام" جو جولائی ۱۹۱۹ء کے رسالہ نائن ٹینتھ سنچوری اینڈ آفٹر میں شائع ہوا۔ مصنف

[۵۲] ہزہائی نس دی آغا خاں کی کتاب "ہندوستان تبدیلی کی حالت میں" صفحہ ۱۵ مطبوعہ لندن ۱۹۱۸ء۔ مصنف

[۵۳] مغربی تمدن سے اس نفرت کا حال فصل مابعد میں بیان کیا جائے گا۔ مصنف

مسلمان، ڈاکخانوں، ریلوں اور تبادلۂ خیالات کے دیگر جدید سریع ذرائع کی قدر کرتے ہیں۔ "ہر اسلامی ملک کل دیگر اسلامی ممالک سے ربط رکھتا ہے براہِ راست تو خاص طور حاجیوں، سیاحوں، اور تاجروں اور مراسلت کے ذریعے اور بالواسطہ اسلامی اخبارات و کتب و رسایل و پرچہ جات موت الیشوع اخبارات کے ذریعے سے ہیں نے قاہرہ کے اخبار بغداد و طہران و پشاور میں اور قسطنطنیہ کے اخبار بصرہ اور بمبئی میں اور کلکتہ کے اخبار مصرہ و کربلا و پورٹ سعید میں دیکھتے ہیں[۱]۔" رہے اتحاد بین الاسلامی کے پیشہ ور مبلغین، بالخصوص وہ جو مذہبی جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ہر جگہ جمع ہو کر لوگوں کے مذہبی جنون کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ یہ مبلغین، ہزارہا بھیسوں میں یعنی تاجر، واعظ طالب علم، حکیم، مزدور، گداگر، فقیر، عطائی، مسخرے، مجذوب بنکر سفر کرتے ہیں جن کا خیر مقدم مسلمین ہر جگہ کرتے ہیں۔ اور یورپی مستعمرات کے عمال کی اشتباہی تحقیقات سے پناہ دیتے ہیں"۔

مزید برآں آج دنیائے اسلام میں کثیر الاشاعت عقیدہ یہ ہے جس کو آزاد خیال اور فتنہ انگیز دونوں مانتے ہیں (اگرچہ اس عقیدہ رکھنے کے وجوہ نہایت مختلف ہیں) کہ اسلام نشاۃ ثانیہ اور جدید عظمت کے دور میں داخل ہو رہا ہے۔ سر تھیوڈور ماریسن لکھتے ہیں "کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں کہ اسلامی تہذیب مردہ یا مزید ترقی کے ناقابل ہے۔ وہ اس کے معترف ہیں کہ اس کے بُرے دن آگئے ہیں، اور اس کو ماضی کے بیجا احترام کرنے اور حمایات و بے جا تعصب اور علمی تنگ خیالی سے جو

---

[۱] بی ٹیمپل کا مضمون "سیاسیات عالم میں ایمان کی جگہ" جو مئی سنہ ۱۹۱۰ع کی سنٹرل ایشین سوسائٹی کی کارروائی میں شایع ہوا۔

[۲] ڈیل رین کی کتاب "مرابطہ و اخوان" صفحہ ۴

ہماری انیسویں صدی کی صلیبی نبرد آزماؤں کی توجہ اس اسلامی پریس کی طرف مبذول کرنا لے کار نہ ہوگا جس کی شاخیں کل ایشیاء اور افریقہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور جس کے مواعیظ بمقابلہ ہمارے اُس کے قارئین کے دل میں بہت گہرا اثر پیدا کرتے ہیں۔ ترکی، ہندوستان، ایران، ایشیاء متوسط، جاوا، مصر وا لجزائر میں دیسی پرچے اور روزنامے، میعادی اخبارات بڑا اثر ڈال رہے ہیں۔ ہر وہ بات جو یورپ اسلام کے خلاف سوچتا یا طے پاتا اس پر عمل کرتا ہے ان ممالک میں بڑی سرعت سے پھیل جاتی ہے قافلے خبروں کو وسط چین میں خط استوا تک لے جاتے ہیں۔ اور وہاں پر ان خبروں کی نہایت عمدہ طریقے سے تنقید ہوتی ہے۔ بعض چنگاریاں جو ہمارے جلسوں یا دعوتوں میں پیدا ہوتی ہیں رفتہ رفتہ خوفناک شعلے پیدا کر دیتی ہیں۔ لہذا یہ ناقابل عفو غفلت ہوگی اگر ہم اپنی آنکھیں ان خطرات سے بند کرلیں جو ظاہری سکون کی تہ میں مخفی ہیں۔ جو کچھ کریمیا کا ترجمان بین السطور کہتا ہے اس کو قسطنطنیہ کا اقدام دُہراتا ہے اور کلکتہ کا مسلم کرانیکل اُس پر تنقید کرکے اور مبالغہ کرتا ہے "بلاشبہ اس وقت اتحاد بین الاسلامی کی یہی کمزور اور منتشر ریشوں پر مشتمل ہے لیکن مغربی تعدی ان ریشوں کو بآسانی قوی اور متحد کرسکتی ہے جس کا نتیجہ ایک عام لڑائی ہو۔"[1]

دامیری کی اس تحریر کے بعد جو زمانہ گزرا اس میں حالت بہت زیادہ نازک ہو گئی ہے۔ مغربی اقتدار پر مسلمانوں کا غصہ بڑھ گیا ہے اور اس کو قوم پرستی کی توقعات سے تقویت ہو گئی ہے جن کا گزشتہ صدی میں پتہ بھی نہ تھا اور جس کے قبضہ میں نہایت کامیاب تبلیغی ذرائع ہیں مثلاً بین الاسلامی پریس جس کا دامیری نے ذکر کیا ہے حقیقتاً غیر معمولی ترقی کر گیا ہے سنہ ۱۹۰۰ء میں کل اسلامی دنیا میں دو سو سے زیادہ تبلیغی اخبارات نہ تھے سنہ ۱۹۰۶ء میں ان کی تعداد پانچ سو تھی اور سنہ ۱۹۱۲ء میں ایک ہزار سے زیادہ ہوگئی[2]

---

[1] ای دامیری کی کتاب "موجودہ اور چالیس سال قبل کی سلطنت ترکی" صفحہ ۱۷۶-۱۷۷ مطبوعہ پیرس سنہ ۱۸۹۸ء

[2] ای مرو جی ابر کی کتاب "مسلمانوں کی قوم پرستی" صفحہ ۱۰۲

صدیوں کی غیر معمولی سرگرمیوں میں اپنی قوت حیات کو ختم کر دیا؟ بالفاظ دیگر کیا وہ کھوکھلے پن میں مبتلا ہو گیا؟ اور کیا اس کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ اپنا اشاعت تہذیب کا کام دیگر اقوام کو جو کم پست و کم مریض ہیں یعنی جو اس سے کم عمر زیادہ قوی اور تندرست ان کو تفویض کرے۔ میری رائے میں موجودہ زمانہ یورپ کے اوج کمال کا پتہ دیتا ہے اور اس کی نوآبادیات کے فضول توسیع سے طاقت کا نہیں بلکہ کمزوری کا اظہار ہوتا ہے۔ اس قدر عظمت وجبروت و شوکت کے اظہار کے باوجود یورپ ہمیشہ سے زیادہ غیر متحد اور کمزور رہا۔ اور وہ اپنے مرض و تکالیف و کرب کو بمشکل چھپا سکتا ہے۔ لازمی طور پر اس کی سرنوشت عمل پذیر ہو۔" مشرق پر یورپ کے اتصال نے ہمارے لیے بہت سی خوبیاں اور بہت سی خرابیاں پیدا کر دی ہیں۔ خوبیاں تو مادی اور دماغی لحاظ سے اور خرابیاں اخلاقی اور سیاسی نقطۂ نظر سے۔ جنگ ہائے ورازسے عاجز آکر اور ایک درخشاں تہذیب سے کمزور ہو کر مسلم اقوام مجبوراً مرض میں مبتلا ہیں لیکن وہ نہ پامال ہیں نہ مردہ۔ ان اقوام نے جو توپ کے زور سے مفتوح ہوئیں اُن مظالمانہ حکومتوں کے تحت میں بھی جن کا یورپیوں نے ان کو عرصہ سے زیر فرمان بنا رکھا ہے اپنے اتحاد کو ذرا بھی نہیں کھویا" میں نے کہا ہے کہ یورپی اتصال ہمارے لیے مادی اور ذہنی دونوں نقطہ ہائے خیال سے نفع بخش ہوا ہے۔ جو کچھ مصلح مسلمان حکمران اپنی مسلمان رعایا میں زبردستی رائج کرنا چاہتے تھے آج اس کا صد گونہ احساس ہو رہا ہے گزشتہ پچیس۲۵ سال میں ہمارے علوم و ادبیات و فنون میں ایسی ترقی ہوئی ہے کہ ہم کو پوری امید ہوتی ہے کہ نصف صدی سے کم عرصہ میں ہم ان سب چیزوں میں یورپ کے برابر ہو جائیں گے۔

چودھویں صدی ہجری سے ہمارے لیے نیا دور شروع ہوتا ہے اور یہ مبارک صدی ہمارے نشأۃ ثانیہ اور عظیم مستقبل کا نشان ہو گی۔ ایک جدید نفس سب نسلوں کی مسلمان اقوام کو زندہ کر رہا ہے اور کل مسلمانوں میں احتیاج عمل اور تعلیم

اسی قسم کی ہی جیسے کہ ازمنہ مظلمہ میں یورپی خیالات میں طاری تھی، نقصان پہونچا ہی۔ لیکن ان کو یقین ہو کہ اسلام کی بھی نشاۃ ثانیہ ہوگی اور یہ کہ اسلام مغربی علوم سے وہ تقویت پا رہا ہی جو اس کی جدید سرگرمیوں میں سرعت پیدا کر دے گی اور یہ کہ اس جدید زندگی کے شواہد ہر جگہ ظاہر ہیں[1]۔

سر تھیوڈور ماریسن مسلمان آزاد خیالوں کے طرز عمل کو بیان کرتے ہیں۔ مغرب کے مخالفانہ خیال رکھنے والے حامیان اتحاد بین الاسلامی کا کیا خیال ہی؟ اس کو ایک مصری یحییٰ صدیق نے اپنی کتاب موسومہ "چودھویں صدی ہجری میں اسلامی اقوام کی بیداری[2]"، میں خوب بیان کیا ہی۔ یہ کتاب دو نوع سے دلچسپ ہی۔ کیونکہ اس کا مصنف کامل طور پر مغربی تعلیم یافتہ اور فرانس کی طولوز کی یونیورسٹی قانونی سند یافتہ ہی۔ اور مصری عدالت کا جج ہی۔ اگرچہ یحییٰ صدیق نے یہ کتاب اس ہنگامہ سے ایک قرن پہلے لکھی لیکن اس نے یورپی جنگ کے وقوع کو پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ وہ لکھتا ہی "دیکھو یہ دول عظمیٰ اپنے آپ کو خوفناک اسلحہ کے ذخائر سے تباہ کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو دھمکا رہے ہیں۔ ایسے اتحادوں کا معاہدہ کرتے ہیں جو بار بار ٹوٹتے ہیں اور جو ان مصیبت ناک تصادم کی خبر دیتی ہیں جو دنیا کو درہم برہم کر کے تباہی و انتشار و خونریزی کا منظر بنا دے گا۔ مستقبل کا علم خدا کو ہی اور اس کی مشیت کے سوا ہر شی فانی ہی"۔

یحییٰ صدیق مغربی دنیا کو پست سمجھتا ہی۔ وہ سوال کرتا ہی "کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ یورپ ہمارا روشن خیال رہنما، اپنی ارتقائی انتہا کو پہونچ گیا؟ کیا اس نے دو یا تین

---

[1] سر ٹی۔ ماریسن کی کتاب "انگلستان اور اسلام"، مذکورالصدر۔

[2] یحییٰ صدیق کی کتاب "چودھویں صدی ہجری میں اسلامی اقوام کی بیداری" مطبوعہ قاہرہ ۱۸۹۷ء۔ یہ کتاب عربی میں بھی شائع ہوئی۔

پیدا ہوئی۔ ایک فرانسیسی ماہر سیاسیات نے حال میں اپنے رفیق یورپیوں کو نصیحت کی کہ اسلام ہمارے مستعمرات کی سرحدوں کو تسلیم نہیں کرتا؟ اور اس نے تنبیہ کے لیے یہ بھی اضافہ کیا کہ اسلامی اتحاد کی بڑی تحریک جس کا آغاز جمال الافغانی نے کیا تھا جاری ہے"[۵۵]

اسلام کی مخوف روش کا اظہار اس غضب ناک شورش سے ہوتا ہے جو تجزیہ سلطنت عثمانیہ کے خلاف تین سال سے ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں میں جاری ہے۔ یہ شورش صرف ہندوستان تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ کل ممالک اسلامی میں عام ہے، اور مسٹر تھیوڈور ماریسن ذیل کے بیان میں قطعی مبالغہ سے کام نہیں لیتے "وقت آگیا ہے کہ برطانوی پبلک جو کچھ مشرق میں ہو رہا ہے اس کی اہمیت کو محسوس کرنے۔ تجزیہ ترکی پر دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک سب مسلمان غصہ سے برافروختہ ہیں۔ کابل اور قاہرہ جیسے دور دراز مرکز میں فتنوں کا برپا ہونا محض اس عام ناراضگی کی علامت ہے۔ میں تقریباً تیس سال سے مسلمانان ہند سے ارتباط رکھتا ہوں اور میں اس کو اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ برطانوی پبلک کو اس خشم آلود ناراضگی سے مطلع کر دوں جو مسلمانوں کو مجوزہ تجزیہ ترکی پر ہے۔ ورسیلز کے مدبرین نے یہ تصور کیا ہے کہ ترکی اوطان کے باہر کسی کو ترکی سے ہمدردی نہیں ہے۔ یہ سخت غلطی ہے اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ ان کو غصہ کس شدت سے آرہا ہے تو تم صرف ان مسلمانوں سے جو اس وقت لندن میں ہیں ملاقات کرلو۔ خود ہندوستان میں کل مسلمان جماعت پشاور سے لیکر راس کماری تک اس مسئلہ پر غصہ سے کف بدہاں ہیں۔ زنانوں میں مستورات اس پر آنسو بہا رہی ہیں

---

[۵۵] ایل مزینیاں کا مضمون "اسلام اور اتحادیوں کی سیاسیات" جو جون ۱۹۲۰ء کے ریویو دی سائنس پولیٹیک میں شایع ہوا۔

سرایت کر گئی ہے۔ ہم سب سیاحت و کاروبار و حصول ثروت اور مقاومت خطرات کے آرزومند ہیں۔ مشرق میں مسلمانوں میں ایک حیرت انگیز سرگرمی اور حیات ہے۔ جو ۵۰ سال قبل معدوم تھی،، آج کل مشرق میں ایک حقیقی رائے عامہ ہے۔

مصنف خاتمہ پر کہتا ہے "ہم کو استقلال سے کام لینا چاہیئے۔ ہر فرد کل کے لیئے اُمید لگائے رہو۔ اُمید! اُمید!! ہم اچھی طور پر جادۂ ترقی پر گامزن ہیں۔ اور ہم کو اس سے نفع اُٹھانا چاہیے۔ یہ یورپ کا ظلم ہی ہے جس نے ہماری قلب ماہیت کو ہوا یہ ہمارا یورپ سے مسلسل اتصال ہے جو ہمارے ارتقا کا حامی ہے اور ہمارے لشائع کو مجبوراً اسریع کر رہا ہے۔ یہ صرف تاریخ کا اعادہ ہے۔ باوجود تمام مخالفت اور مقاومت کے مشیت ایزدی پوری ہو رہی ہے .... ایشیائیوں پر یورپ کی اتالیقی روز بروز کم ہو رہی ہے۔ اور یورپیوں کے خلاف ایشیا کے دروازے بند ہو رہے ہیں۔ بالیقین ہم اپنے پیش نظر ایسے انقلاب کی جھلک دیکھ رہے ہیں جو تاریخ دنیا میں عدیم المثال ہے ایک جاںبخش دور آنے والا ہے"

اگر اس طور پر اتحاد بین الاسلامی کے حامی آغاز صدی میں خیال کر رہے تھے تو یہ ظاہر ہے کہ ان کی رائے جنگ عظیم سے صحیح اور پختہ ہو گئی ہوگی[۱]۔ اس سے مغرب کی مادی طاقت بہت گھٹ گئی اور اس کا رعب داب بھی مساوی طور پر تصفیہ صلح کی نوعیت، اور اُن نزاعات کی وجہ سے جو فاتحین میں پیدا ہو گئی، جاتا رہا۔ انگلستان و فرانس و اطالیہ اور ان کے مشرقی تابعین کی باہمی رقابتوں اور حسدوں کی وجہ سے مسلمانوں کو اُمیدافزا منصوبہ جات باندھنے کا اچھا موقع ملا۔ اور اس قدر یورپی خیالات میں الجھن

---

[۱] ایشیائی اور افریقی اقوام پر جنگ عظیم کے اثر کا مل بحث کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "گوروں کی عالمگیر اقتدار کے مقابلہ میں رنگت کا اوٹھنے والا طوفان،، مطبوعہ لندن و نیویارک سنہ ۱۹۲۰ء

اس کا مکمل نظام عمل وہی قدیم وہابی خواب یعنی کل دنیا کے مسلمانوں کو خالص مذہب اسلام میں لانا ہے۔[۵۵] سلفی تحریک کی بابت یہ ہے کہ وہ ہندوستان میں اس سے بھی زیادہ مجہول طور پر پیدا ہوئی جیسے اخوان عربستان میں، لیکن گزشتہ چند سال میں یہ عام پر دنیائے اسلام میں شایع ہو گئی ہے۔ تحریک اخوان کی طرح اس کے اغراض بھی خالص اور مذہبی جوش سے لبریز ہیں اور اس کے پیروان بالخصوص درویشوں کے سلسلوں میں پائے جاتے ہیں۔[۵۶] جب دیگر امور کے ساتھ صورت پر غور کیا جاتا ہے تو اس مشرق کے لیے شگون اچھے نہیں پائے جاتے۔

اتنا تو اسلامی تحریک کے مذہبی اور سیاسی پہلو کی بابت ہے۔ اب ہم کو اس کے تجارتی اور صنعتی پہلو پر نظر ڈالنا چاہیے جس کو اقتصادی اتحاد بین الاسلامی کہا جا سکتا ہے۔

اقتصادی اتحاد بین الاسلامی براہ راست مغربی خیالات کے سرایت کرنے کا نتیجہ ہے۔ نصف صدی قبل اقتصادی حیثیت سے دنیائے اسلام ازمنہ متوسط کی ظلمت میں گھری ہوئی تھی۔ احکام شریعت یا اسلامی قانون مذہب کے ایسے نواہی جیسے حرمت ربوا نے موجودہ طرز کی اقتصادی زندگی کو ناممکن کر دیا تھا۔ جو کچھ تھوڑی تجارت تھی وہ زیادہ تر مقامی یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی۔ مزید برآں

---

[۵۵] تحریک اخوان کے لیے ملاحظہ ہو پی۔ ڈبلیو۔ ہیرسن کا مضمون "عرب کی حالت" جو دسمبر ۱۹۳۰ء کے اٹلانٹک منتھلی میں شایع ہوا۔ ایس۔ م۔ ٹمرکا مضمون "عرب میں سیاسی اور مذہبی حالت" جو جولائی ۱۹۱۹ء کے دی مسلم ورلڈ میں شایع ہوا۔

[۵۶] سلفی تحریک کے لیے ملاحظہ ہو مضمون "وہابیت۔ اوس کا معاشرتی مستقبل اور تحریک سلفی" جو ۱۹۱۹ء کے ریویو دی موند مسلمان میں شایع ہوا۔

سوداگران جو عموماً پبلک معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے ہیں اپنی دکانیں اور کارخانہ چھوڑ کر دور خواستوں اور شکایتوں کا انتظام کر رہے ہیں۔ دیوبند اور ندوۃ العلما کے ازمنہ متوسط کے فقہا بھی جن کی موجودہ دنیا سے بے تعلقی ضرب المثل ہے تباہی اسلام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے اپنی خانقاہوں سے نکل آئے ہیں۔[1]

غالباً اس حالت کی سب سے زیادہ نازک صورت یہ ہے کہ آزاد خیال مسلمان بھی مجبوراً سیاسی اتحاد بین الاسلامی کے فتنہ انگیز اور انقلابی مسلک کے مخالف ہیں۔ لیکن یورپ کی سیاسی غلط کاریاں ان کو اتحاد بین الاسلامی اور قوم پرست جماعتوں سے کم از کم عارضی اتحاد پیدا کرنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ باوجود اس کے کہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کوئی ایسا فعل جیسا اعلان جہاد سے مشرق اور مغرب کے درمیان عمیق خندق کھود دے گا، مغربی قوت محرکہ کی رَو کو بند کر دے گا، فتنہ انگیز مذہبی جنون کی حمایت کرے گا اور غالباً اسلام کے حسب خیال اصلاح کو غیر متعین مدت کے لیے معرض التوا میں ڈال دیگا۔

غالباً یہ اسلام کے مزید سوء مزاج کی علامت ہے کہ گزشتہ چند سال میں دو جدید خالص اور پرجوش تحریکات یعنی اخوان اور سنوسیہ کی سریع اشاعت عالم شہود میں آئی تحریکات اخوان دس سال ہوئے وسط عربستان یعنی نجد میں مجہول طور سے شروع ہوئی یہ براہ راست وہابیت کی شاخ ہے جس سے یہ کسی اصول میں مختلف نہیں ہے تحریک اخوان کی ترقی ایسی سرعت سے ہوئی کہ آج وہ کل نجد پر حاوی ہے اور اس کا سرگروہ صحرائے عرب کا سب سے زبردست شیخ ابن سعود ہے۔ جو اس سعود کی اولاد میں ہے جو سو سال ہوئے وہابی تحریک کا سرگروہ تھا۔ اخوان کا مذہبی جوش غیر معمولی بتایا جاتا ہے۔ اور

---

[1] مسٹر ٹی ماریسن کی کتاب "انگلستان اور اسلام" مذکورہ بالا

اور مغربی آمدورفت اور نقل وحرکت کے ذرائع کی بدولت مسلمان سفر کر کے بیش از بیش ایک دوسرے سے باخبر رہ سکتے ہیں۔ نئی قسم کے مسلمان یعنی تھوک فروش سوداگر و دخانی جہازوں کے مالک اور کاروباری ومہاجن جتنے کہ کارخانوں کے صنعت کے مالک اور دلال زراعت سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اس نمونہ کے لوگ ہیں جن کا وجود ایک صدی یا نصف صدی قبل خیال میں بھی نہ آتا تھا۔

اور یہ نئے اشخاص ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں اخوتِ اسلامی کا رشتہ اور مغربی مقابلہ کے دباؤ دونوں سے وابستہ ہو کر اونھوں نے اپنے مساعی میں ادن سے زیادہ آسانی سے اتحادِ عمل پیدا کر لیا ہی جو سیاسیات میں سرگرم ہیں۔ یہاں آزاد خیال مؤیدین اتحاد بین الاسلامی اور قوم پرست مشترکہ اصول پر متحد ہو سکتے ہیں۔ یہاں کوئی سوال سیاسی سازشوں اور بغاوتوں یا جہادوں کا نہیں ہی۔ جن میں یورپ کی مسلح قوت کو مقابلہ کی دعوت دے کر خونخوار جبریا کورانہ ردعمل کا ڈر ہو۔ برخلاف اس کے یہاں پر ہم مذہب مسلمان صرف اقتصادی اغراض کے لیے اُن کاروباری طریقوں پر مل کر کام کرتے ہیں جن کو مغرب نہ ناجائز کر سکتا اور نہ روکنے کی جرأت کر سکتا ہی۔

اب سوال یہ ہی کہ اقتصادی اتحاد بین الاسلامی کا خاص نظامِ عمل کیا ہی؟ یہ نظامِ عمل آسانی سے بیان کیا جا سکتا ہی۔ یعنی اسلام کی دولت مسلمانوں کے لیے۔ عیسائیوں کے بجائے تجارت اور صنعت کا نفع مسلمان اُٹھائیں۔ اور مسلمانوں کے سرمایہ سے مغربی سرمایہ کو خارج کیا جائے سب سے بڑی بات یہ ہی کہ اراضی و معدنون و جنگلات و ریلوں و محصولات کے

کل مشرق کی اقتصادی زندگی مغرب کے جارحانہ مقابلہ کے وجہ سے ابتر ہو گئی تھی۔ یورپ نے اسلامی دنیا کی سیاسی فتوحات کے ساتھ ساتھ اقتصادی فتوحات بھی حاصل کیں جو زیادہ مکمل تھیں۔ مشین سے بنی ہوئی ارزاں اور بکثرت مصنوعات یورپ کا سیلاب ہر گوشہ تک پہونچ گیا۔ اور اس کے پیچھے ہی پیچھے یورپی سرمایہ نہایت دل فریبی سے اپنے آپ کو ان قرضہ جات اور مراعات کے معاوضہ میں پیش کرنے لگا جو ایک بار رل جانے پر یورپی اقتدار کے لیے میدان صاف کر دیتے ہیں۔

لیکن سیاسیات کی طرح اقتصادیات میں بھی یورپی فتح کی تکمیل نے مقاومت کو برانگیختہ کیا۔ مغربی جلب منفعت سے ناراض اور خوف زدہ ہو کر اسلام نے صاف طور سے اپنی اقتصادی کمی کو پہچان لیا۔ اور اس سے بچنے کی کوشش کی دور اندیش مسلمانوں نے موجودہ زندگی کے مطابق طرز معاشرت کی ایسی ترمیم شروع کی جس سے اسلام اقتصادی طور پر زمانہ کے ساتھ ساتھ چل سکے۔ مغربی طریقوں کو سیکھ کر نقل کیا۔ شرعی موانع سے یا تو احتراز کیا یا خاموشی سے تجاہل برتا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی اقتصادی معیار کی طرف نمایاں تدریجی ترقی ہوئی۔ بلا شبہ یہ ارتقاء ہنوز اپنی ابتدائی منازل میں ہے اور اُن ممالک میں زیادہ واضح ہو جاتی ہے جو مغربی اثرات کے زیادہ موقعہ ہیں۔ جیسے ہندوستان و مصر و الجزائر لیکن کل دنیائے اسلام میں رجحان یکساں ہے۔ اس اقتصادی تبدیلی کی تفصیلی حالت پر بحث اس فصل میں کی جائے گی جو اقتصادی انقلاب کے متعلق ہے۔ یہاں پر ہم کو جس امر سے مطلب ہے وہ اس کا اتحاد بین الاسلامی پہلو ہے۔ اور یہ پہلو بہت مضبوط ہے۔ کسی جگہ پر بھی اسلام کے خلقی استحکام کا اظہار اقتصادی میدان سے بہتر نہیں ہوتا ان مذہبی و تربیتی ورسمی روابط کے وجہ سے جو ایک مسلمان کو دوسرے سے وابستہ تہ ہیں مسلمان اسلامی دنیا کے ہر حصے میں کم و بیش آسایش سے رہ سکتے ہیں

باب سوئم

(مغرب کا اثر)

مشرق کی موجودہ تبدیلی کا سب سے بڑا محرک مغرب کا اثر ہے۔ مغربیت کا ہمہ گیر اثر نہ صرف اسلامی دنیا میں بلکہ ایشیا و افریقہ کی کل غیر مسلم اقوام میں بھی تبدیلی پیدا کر رہا ہے۱؎۔ اور صفحات مابعد میں ہم مغربی اثرات کے اُن نتائج کی جانچ کریں گے جو ہندوستان کے غیر مسلم عنصر میں پیدا ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام کے موجودہ ارتقاء کا باعث کلیتاً مغرب کا اثر ہی نہیں ہے ہم دیکھ چکے ہیں کہ گزشتہ سو سال سے اسلام خود ایسی قوتیں پیدا کر رہا ہے جو چاہے بیرونی مغربی تحریک سے کتنی ہی سریع الاثر کیوں نہ ہوگئی ہوں پھر بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل اندرونی ہیں اور جو خود بخود پیدا ہو کر پیش اور اصلی اغراض کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہیں۔ اسلامی دنیا میں آج جو کچھ ہو رہا ہے وہ محض مغرب کی نقل نہیں ہے۔ بلکہ ایک نئی ترکیب و ترتیب کی سعی یعنی مغربی اسالیب اور مشرقی اغراض میں توافق اور تعلق پیدا کرنا ہے ہمکو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ ایشیائی اقوام جو پیروانِ اسلام کا عنصر غالب ہیں افریقہ کے حبشیوں یا اسٹریلیا کے اصلی باشندوں کی طرح ابتدائی عہد کے وحشی نہیں ہیں۔ بلکہ زیادہ تر وہ اقوام ہیں جنہوں نے اپنا اصلی تمدن زمانہ بعید سے خود اپنی مساعی سے قایم کیا ہے۔ ان کے تاریخی کمالات کو

۱؎ وسیع غور کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "گوروں کے عالمگیر اقتدار کے خلاف جنگ کا آغاز [illegible]" مطبوعہ لندن و نیو یارک سنہ ۱۹۲۰ء

ان مراعات کو ختم کرکے جن کی بدولت آج بلاد اسلامی کی دولت سواحل غیر کو کھنچی جا رہی ہے اسلام کے قدرتی ذرائع کو یورپ کی گرفت سے رہائی دلائی جائے۔

یہ ہیں تمنائیں بین الاسلامی اقتصادیات کی یہ بالکل جدید ادراکات ہیں اور ان مغربی خیالات کا نتیجہ ہیں جن کے اسلامی دنیا پر اثرات کی اب میں بحث کرونگا۔[۱]

---

[۱] اقتصادی اتحاد بین الاسلامی کے عام مضمون کے لیے ملاحظہ ہو اے۔ لی شاتلی ایر کا مضمون "اسلام کی بیداری اور اوس کی اقتصادی حالت" جو جولائی ۱۹۱۰ء کی ریویو اکونومیک انٹرنیشنل میں شایع ہوا۔ نیز ملاحظہ ہو اوس کا دوسرا مضمون "مسلمانوں کی سیاسیات" جو ستمبر ۱۹۱۰ء کے ریویو دی موند مسلمان میں شایع ہوا۔ موسیو ہیکتال کا مضمون "اسلامی اخلاق" جو جولائی ۱۹۱۶ء کے ریویو پولیٹک انٹرنیشنل میں شایع ہوا۔ صلاح الدین خدابخش کی کتاب "مضامین، اسلامی اور ہندی" مطبوعہ لندن ۱۹۱۲ء

بعید ترین جنگلوں میں برطانوی حکومت کا داخل ہونا ایک غیر معمولی صورت ہے۔ یہ نظام حکومت اسکولوں، ڈاکخانوں، ریلوں، معدلت گستری، حمایت تعلیم، امداد قحط اور ہزارہا طریقوں سے کل ہندوستان میں ساری و دائر ہے لیکن اُن ممالک میں جہاں یورپی تسلط برائے نام ہے مغربیت کے بیج پہلے ہی پہونچ گئے ہیں۔ عوام کے رسوم و عادات میں نمایاں ترمیم ہو گئی ہے مغربی مادی ترقیاں و آسائشیں مثلاً مٹی کے تیل کے لیمپ اور سینے کی مشین آج لوگوں کی روزانہ زندگی کا جزو بن گئی ہیں۔ جدید اقتصادی ضروریات پیدا ہو گئی ہیں معیار زندگی بلند اور مذاق تبدیل ہو گیا ہے۔

اسی طور پر ذہنی اور روحانی میدانوں میں بھی مغربی خمیر صاف طور پر نمایاں ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسلمان آزاد خیال مصلحین پر مغربی ترقی کی روح کا کیسا گہرا اثر پڑا ہے بلاشبہ مغربیت نے اُن میدانوں میں بہت سستی سے ترقی کی ہے۔ اور مادی میدان کے مقابلہ میں اسنے بہت سخت مخالفت پیدا کر دی ہے۔ مادی اختراعات بالخصوص صنعتی ترقیاں اور سامان معیشت بمقابلہ جدید رسوم اور خیالات کے بہت جلد پھیل جاتے ہیں۔ جنسے مسلمہ عقاید اور قدیمی حمایات کو عموماً صدمہ پہونچتا ہے۔ ہر مرز بوم کے

؎۵ ان امور کے لئے ملاحظہ ہو ارمینیس وامبری کی کتاب "مشرقی ممالک میں مغربی تمدن" مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۰۶ء نیز "موجودہ اور چالیس سال قبل کی ترکی" مطبوعہ پیرس سنہ ۱۸۹۸ء۔ سی۔ ایس۔ کوپر کی کتاب "مشرق کی تجدید" مطبوعہ نیویارک سنہ ۱۹۱۴ء صلاح الدین خدا بخش کے مضامین متعلقہ ہندوستان اور اسلام" مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۲ء۔ اے۔ جے۔ براون کا مضمون "ایشیا میں اقتصادی انقلابات" جو مارچ سنہ ۱۹۰۸ء کے رسالہ دی سنچوری میں شائع ہوا۔

پیش نظر رکھکر یہ نتیجہ نکالنا ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ اس ہیجان میں جو آج اسلامی دنیا کو مشتعل کر رہا ہے ہم ایک سچی نشأۃ ثانیہ کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور جسکی حقیقت کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ ازمنہ ماضیہ میں بھی اس قسم کی تحریکات ہوچکی ہیں -

زمانہ حال میں مغرب جو اثر مشرق پر ڈال رہا ہے وہ شدت اور وسعت ہر دو کے لحاظ سے بالکل عدیم المثال ہے یونان اور روما کے اثرات کو جو زیادہ تر مقامی اور جزوی ہے اس سے کوئی نسبت نہیں ہے - دوسرا امر قابل لحاظ یہ ہے کہ مشرق پر مغرب کا موجودہ اثر بالکل ہی حد پر ہے - مشرق پر بحالت مجموعی مغربیت کا کامل اثر انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوا مگر اسوقت سے اس اثر میں یوماً فیوماً ترقی ہے - سڑکیں، ریلیں، ڈاکخانے تارگھر، کتابیں، اخبارات، نئے طریقے اور خیالات مشرق کے گوشہ گوشہ میں پہونچگئے - یا پہونچ رہے ہیں - دخانی جہاز بعید ترین سمندروں میں جاتے ہیں - تجارت مغربی صنعت کی بے شمار پیداوار کو بعید ترین اقوام میں لے جاکر پھیلا رہی ہے - وہ اقوام جو نصف صدی قبل تیس صدی قبل کی زندگی بسر کرتی تھیں آج اخبارات پڑھتی اور بجلی کی ٹرمیکاروں میں سوار ہوکر کاروبار کو جاتی ہیں - مشرقیوں کے عادات اور خیالات دونوں میں انقلابات ہورہے ہیں - اس کتاب کے باقی حصہ میں اسلامی دنیا پر مغرب کے اثر کی بابت بحث ہوگی موجودہ فصل میں تو ہم تمہیدی طور پر اس اثر کی عام حالت بیان کرتے ہیں اور فصول ما بعد میں خاص اجزا کی توضیح کیجائیگی -

مغربیت کا نفوذ بداہتًا بلاد اسلامی کے اُن حصص میں سب سے زیادہ ہے جو سب سے زیادہ مدت سے مغرب کے سیاسی تسلط میں ہیں ہندوستان کے

اپنے قدیم ماضی سے الگ ہو کر مغربیت میں غرق ہو جاتے اور فی الحقیقت کم و بیش مغربی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو اپنی مغربی ملمع کاری کی تہ میں نفرت اور بطلان فریب کو مخفی رکھتے ہیں۔[۱]

بلا شبہ مغربی تہذیب کا رواج زیادہ تر امور ظاہری ہی میں نمایاں ہے وہ ہندوستانی یا ترکی "روشن خیال" جو مغربی درسگاہوں کے سند یافتہ اور متعدد یورپی زبانوں میں روانی کے ساتھ تقریر کرنے پر قادر ہیں۔ اور نیز وہ متمول موٹر کاروں، اور گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کے مالک والیان ریاست و پاشا جو یورپ کے معدنی چشموں کے غسلگاہوں میں سالانہ علاج کو جاتے ہیں بادی النظر میں سب سے زیادہ مغربی رنگ میں ڈوبے معلوم ہوتے ہیں ایسے اشخاص یورپی ملبوس پہنتے اور یورپی غذا کھاتے اور ان مکانات میں رہتے ہیں۔ جو جزواً یا کلیتاً مغربی طرز پر آراستہ ہیں۔ اس روکار کے پیچھے اندرونی زندگی کی ہر قسم کی صورتیں بتفاوت مدارج یعنی مغربی نصب العین کی دلی سرگرمی سے لیکر شدید نفرت تک موجود ہیں۔

مغربیت کے متعلق ایسے طرز عمل کسی خاص جماعت یا مقام کے لیئے مختص نہیں ہیں بلکہ مشرق کے ہر ملک و ہر طبقہ کے افراد میں بیک وقت موجود ہیں۔ واقعہ یہ ہو کہ کل مشرق میں ایک عظیم الشان تبدیلی ہو رہی ہو جو ایسی فوری اور

---

[۱] ان مغربی تعلیم یافتہ متغیبین کی بابت ملاحظہ ہو۔ ایل۔ برتراند کی کتاب "مشرقی سراب" مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۱۰ء۔ کرومر مذکور الصدر۔ اسے میتن کی کتاب "موجودہ ہندوستان یعنی معاشرت کا مطالعہ" مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۱۸ء اسے۔ بی لی شاتلی ایر کا مضمون "اسلامی سیاسیات" جو نمبر سنہ ۱۹۱۰ء کے ریویو دو موند مسلمان میں شائع ہوا۔ (مصنف)

اشخاص نے (تمباکو) استعمال بہت جلد اختیار کر لیا اور تیل کے لیمپ نصف صدی میں ایشیا، متوسطا اور چین کے گوشوں میں پہونچ گئے - لیکن رسوات مثلاً انگریزی ملبوس اور خیالات مثلاً مغربی تعلیم" انکو بہت سی وقتوں کا مقابلہ ہوا - اور بعض وقت اتنی ترمیمات کے بعد اختیار کئے گئے کہ اُن کی اصلی روح منقلب اور منعکس ہو گئی - مغرب کی قوت اور صنعت کے تفوق کا آجکل مشرق میں ہر جگہہ عام طور پر اعتراف کیا جاتا ہے - لیکن اکثر جگہہ مغربی ترقی کی پہلی مقبولیت اور مغربی خیالات کی سرگرمی سرد ہو گئی یا اس کے بجائے اصلاً مغربی تھذیب کے روح سے مخالفانہ نفرت پیدا ہو گئی ہے[۱۵]

مغرب کے اثرات سب سے زیادہ اعلےٰ اور اوسط طبقوں بالخصوص اُس مغربی تعلیم یافتہ روشن خیال گروہ میں نمایاں ہیں جو آج ہر مشرقی ملک میں پایا جاتا ہے - اس منتخب گروہ کے اشخاص تعداد اور اقتدار میں بہت مختلف ہیں - لیکن ان سب کو مغربی خیالات پر کم و بیش دستگاہ حاصل ہے - یہ افراد مغربی تہذیب کے قبول اثر میں ایک دوسرے سے بالکل متفاوت ہیں - بعض اپنے موروثی فلسفہ حیات کے اصول کو قایم رکھکر مغربی نصب العین کے ساری وطاری ہونے فی الحقیقت کوشش کرتے ہیں اور مشرقیت کے امتزاج کو پیش نظر رکھتے ہیں بعض

سلہ ۱۵ مغرب کے ذہنی اور روحانی اثرات کی بابت ملاحظہ ہو اسپیری کی تصنیف مذکور الصدر - سر ویلنٹاین چیرول کی کتاب "ہندوستانی شورش" مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۰ع - جے - این - فاکیہر کی کتاب "ہندوستان میں موجودہ مذہبی تحریکات" مطبوعہ نیویارک سنہ ۱۹۱۵ع - ریورینڈ جے - موریسن کی کتاب "ہندوستان میں خیالات جدید یعنی معاشرتی و اقتصادی و مذہبی ترقیوں کا مطالعہ" مطبوعہ ایڈنبرا سنہ ۱۹۰۶ع - ارل آف کرومر کی کتاب "موجودہ مصر" بالخصوص جلد دویم صفحات ۲۲۸ لغایتہ ۲۴۳ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۰۸ع مصنف

"استعمال مغربی نظریات حکومت و معدلت
کا ایسے نظام معاشرتی پر جس میں شدت
سے جمود و تحجر آگیا ہو۔ اور موجودہ زمانہ کی اقتصادی
قوتوں کا عمل صنعت و تجارت کے ابتدائی
حالات پر۔ متواتر اور نامعلوم لیکن لازمی
نزاعات مابین اقوام محکوم اور ان کے اجنبی
حکمرانوں کے۔ مقامات بعیدہ کی لڑائیوں اور
نسلی نزاعات کا اثر۔ مشرق اقصیٰ میں ایک
مشرقی قوم کا عروج[۵۱]"

یہ سطور اگرچہ ہندوستان کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن آج مشرق ادنیٰ اور وسطیٰ کے دیگر حصص پر بالکل صادق آتی ہیں۔ چنانچہ ایک فرانسیسی مصنف خاص طور پر لیوانٹ[۵۲] کے متعلق لکھتا ہے "حقیقت یہ ہے کہ مشرق اور نیز مسلمانوں کے احساسات ذہنی بھی انقلابی حالت میں ہیں (گو غالباً ہماری خواہشات کے مطابق نہیں) یہ اپنے نازک دور سے گزر رہے ہیں جس میں ہر جگہ ماضی حال کے خلاف معرکہ آرا ہے۔ اور رسومات قدیم جدید اختراعات سے کمزور ہو کر ایک مخلوط اور مختل منظر پیش کرتی ہیں[۵۳]"

---

۵۱ چرول مذکور الصدر صفحات ۳۲۱ و ۳۲۲۔

۵۲ لیوانٹ کے معنی طلوع یا مشرق کے ہیں۔ بحیرہ روم کے مشرقی کنارے اور ساحل کو کہتے ہیں۔ لیوانٹ کے حلقہ کے اردگرد یونان۔ ایشیائے کوچک۔ شام اور مصر واقع ہیں (مترجم)

۵۳ برتراند مذکور الصدر صفحہ ۳۰ ملاحظہ ہو بخش مذکور الصدر فاکو ہر مذکور الصدر موبلین مذکور الصدر۔ مکرجی کی کتاب "ہندوستانی اقتصادیات کی بنیادیں" مطبوعہ لندن ۱۹۱۶ء۔ ڈی۔ ایچ۔ ووڈ ویل کا مضمون "ہندوستان میں اقتصادی تبدیلی" جو دسمبر ۱۹۱۰ء کی اکونامک جرنل میں شائع ہوا۔ (مصنف)

شدید ہی کہ مغرب کے احاطۂ علم میں آ ہی نہیں سکتی ۔ ہماری تہذیب زیادہ تر خود بخود ارتقائی طور سے ہوئی ہی۔ یعنی اس کا قدرتی نشو و نما معمولی و منطقی اور مقابلتاً تدریجی منازل سے ہوا ہی۔ برخلاف اس کے مشرق میں اجتماعی عمل تطبیق جاری ہی جو ہم کو صدیوں میں حاصل ہوا۔ اور نتیجہ یہ ہی کہ سیاسی و اقتصادی و معاشرتی و ذہنی و مذہبی اور بہت سے دیگر امور میں اتنا ارتقا نہیں ہی جتنا کہ انقلاب ہی۔ اس کا ماحصل ابتری و تذبذب و بے ہنگامی اور تناقض ہی۔ ایک ہی نسل کے افراد میں ناقابل عبور دماغی و روحانی فصل ہی۔ والدین بیٹوں کو نہیں سمجھتے۔ اور بیٹے اپنے والدین کو حقیر سمجھتے ہیں ہر جگہ "قدیم" اور "جدید" کی سخت کشمکش ہی اور یہ کشمکش بسا اوقات ایک ہی فرد کے دل و دماغ میں ہی اس کشمکش کی لامتناہی پیچیدگیوں کا جو اظہار ہندوستان میں ہوا ہی ان کی طرف سر ولینٹا چرول نے جو مختصر اشارات کیے ہیں وہ انھیں کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں۔

"امواج اور متقابل امواج اس منتشر تحریک کے،
جو ہندوستانی زندگی کے ساکن سرچشموں کو
متحرک کر رہے ہیں۔ متواتر اثر خیالات غیر کا ایک
فرسودہ و قدیم تہذیب پر کم و بیش ناکمل اشاعت
ان خیالات سے خوف و ہراس اُن لوگوں کا جن کی
قدیم عظمت معرض خطر میں ہی۔ غیر محتاط ترویج ایک
مصنوعی نصاب تعلیم کی جو کمزوری کے ساتھ روشن
خیالی پر مبنی ہی اور ہر قسم کے اخلاقی و مذہبی
اجازت سے معرا ہی شکست و ریخت عقائد
قدیمہ کی اور اس کے بعد ان کی جارحانہ تجدید

یاوسانہ طور پر بیان کرتا ہے "ہمنے ہندوستانی دماغ کی تزئین و آرایش جیسی کی ہے اس کی مثال یہ ہے کہ خوبصورت مغلیہ محلات کو ٹاٹنہم کورٹ روڈ کے شکستہ سامان سے آراستہ کیا ہے - ہم نے اس کو صرف یہی سبق نہ دیا کہ وہ اپنی تہذیب کو ذلیل سمجھکر ترک کردے بلکہ ہم نے یہہ بھی بتادیا کہ خالی جگہہ کو ایسے سامان سے پُر کرے جو آب و ہوا کو برداشت نہیں کرسکتا - ہندوستاں کی نیم یورپی اور نیم ایشیائی دماغی حالت ہولناک ہے - میں ایسے دماغوں کو آوارہ گرد کہتا ہوں - اُن کو کسی تہذیب کسی ملک اور کسی تاریخ سے تعلق نہیں ہے - یہ ایسی خواہشات جو پوری نہیں ہو سکتیں اور ایسے نصب العین جو بالکل خیالی ہیں پیدا کرتے ہیں - یہ زندگی کا بطلان کرتے ہیں - یہ اشخاص کو ان کے تربیتی ماضی کی غذا سے محروم کردیتے ہیں - اور بدل جو دیتے ہیں وہ بیکار ہے .... ہمنے مشرقی دماغ کو مغربی طمانیت اور ماحول دینے کی کوشش کی لیکن ہمکو پوری کامیابی اس میں ہوئی کہ دونوں میں ذہنی اور اخلاقی بدنظمی قایم کردی ہے[1] "

---

[1] جی ریمزے میکڈانلڈ کی کتاب "حکومت ہند" صفحات ۱۷۱ لغایتہ ۱۷۲ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۲۰ء - مغربی تمدن کی ترویج کی خرابیوں کی بابتہ ملاحظہ ہوں بحث و گرو مرو ڈاڈ ویل و مکرجی کی مذکور الصدر تصانیف - سر ڈبلیو - ایم - ریمزے کا مضمون "اناطولیہ کے ترکی کاشتکار" جو جنوری سنہ ۱۹۱۵ء کے کوارٹرلی ریویو میں شائع ہوا - ایچ - ایم - ہائنڈمین کی کتاب "ایشیاء کی بیداری" مطبوعہ نیویارک سنہ ۱۹۱۹ء ٹی - روتھسٹائن کی کتاب "بربادیٔ مصر" مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۰ء - کپتان - پی - ازان کی کتاب "الجزایر کے دیسی مسئلے کے ایک حل کی تلاش" مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۰۳ء -

اِسی کی بدولت زیادہ تر وہ غیر مانوس خصوصیات ہیں جو اکثر نام نہاد مشرقیوں سے ظاہر ہوتی ہیں یعنی ہندوستانی بابو کی نمایشی تہذیب[۵۱] " اور ترکی " آفندی " کی " بازاری شایستگی " یہ لوگ تہذیب یافتہ ہونے کے بجائے متعدی امراض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ہر عمیق تبدیلی میں ناکارہ ماحصل لازمی ہے۔ اور آج کل مشرق میں مغربی تہذیب کی اشاعت میں اچھائی اور برائی دونوں کا پہلو ہے۔ اصلاح کا عمل خواہ وہ کتنا ہی ضروری اور لازمی کیوں نہ ہو قدیم خرابیوں کو جدید قوت پہونچاتا ہے اور جدید خرابیاں جو پہلے نامعلوم تھیں ان کو داخل کرتا ہے۔ چنانچہ لارڈ کرومر کہتے ہیں۔ " یہ امر مشتبہ ہے کہ ان پست مشرقی جماعتوں میں مغربی تہذیب پھیلانے کی جو قیمت دی جاتی ہے اس کی مقدار کا اندازہ اُسی قدر ہوتا ہے جیسا کہ ہونا چاہیے مغربی تہذیب کے مادی نفع بلاشبہ بڑے ہیں۔ اور پبلک اور خانگی اخلاق پر جو اثر پڑتا ہے اس کی بابت مستقبل بالکل غیر متیقن ہے[۵۲] "

مغربی تہذیب کے اثر کی برائیاں اور خوبیاں زیادہ تر تعلیم یافتہ منتخبین کے طبقہ میں صاف طور پر نمایاں ہیں ان میں سے بعض تو مغربی روح کا بہترین اثر ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن ایک کثیر تعداد قدیم اور جدید کے درمیانی غار میں گر کر ذلت کے ساتھ تباہ ہو جاتی ہے۔ لارڈ کرومر نے اکثر " یورپی تعلیم یافتہ " مصریوں کو یوں مختص کیا ہے " کہ وہ ایک ہی وقت میں خارج از اسلام مسلم اور خالی از ہمت یورپی ہیں[۵۳] " ایک دوسرا یورپی مصنف ہندوستان میں مروجہ انگریزیت کو یوں

---

[۵۱] ڈبلیو۔ ایس۔ لِلی کی کتاب " ہندوستان اور اس کے مسایل " صفحہ ۲۴۳ مطبوعہ لندن ۱۹۱۲ء (مصنف)

[۵۲] کرومر کی تصنیف مذکورہ الصدر جلد دوم صفحہ ۲۳۱ (مصنف)

[۵۳] مذکورالصدر صفحہ ۲۲۸ (مصنف)

دیتی ہیں۔ جو کھنکھجوروں کو ان کی مونچھیں پہلے تو بڑے اخلاص سے انہیں پھیلایا جاتا ہے لیکن جب تو ہا ایک مرتبہ کمزور اقوام کے دل میں تیر جاتا ہے تو وہی کمزور بال ایک مضبوط آہنی بازو بن جاتا ہے اور اس کی بطش شدید ان اقوام کا فشار کر دیتی ہے"

میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ مغرب نے جو مشرق کو مسخر کیا وہ جائز تھا یا ناجائز اس پر کامل بحث موافق اور مخالف ہو چکی ہے اور ان صفحات کے ناظرین دونوں طرف کی اصل دلیلوں کے ذخائر سے واقف ہوں گے - ایک امر یقینی یہ ہے کہ یہ تسخیر کا عمل فی الجملہ لازمی تھا دو دنیاؤں کو ایسی مختلف سطح پر فرض کرو جیسے کہ مشرق اور مغرب انیسویں صدی کے آغاز پر تھے۔ یعنی مغرب حیات سے لبریز اور انسانی ترقی کا مقدمتہ الجیش بنا ہوا تھا اور مشرق غفلت اور پستی میں غرق تھا - لہذا نتیجہ کھلا ہوا تھا کہ اول الذکر آخر الذکر کو مغلوب کر کے چھوڑے گا -

ہماری موجودہ بحث سے جو امر متعلق ہے وہ مشرقی ممالک میں مغربی تمدن کی اشاعت عام عمل پر یورپی سیاسی تسلط کا اثر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی تہذیب کی اشاعت کو اس سیاسی تسلط سے بہت زیادہ توسیع اور ترقی ہوئی - جب کسی مشرقی ملک پر یورپی حکمراں ایک مرتبہ مسلط ہو گئے تو ان کو متعدد وجوہ سے اس ملک میں مغربی تہذیب کی اشاعت کی حمایت کرنا پڑی - محض ذاتی مفاد نے ان کو مجبور کیا کہ ملک کو پر امن اور خوش حال بنائیں - تاکہ نفع اٹھائیں اور رعایا کو اپنی حکومت سے خوش کریں - اس کے یہ معنی تھے کہ ناقابل اور خوں ریز دیسی مطلق العنانی کی بجائے جو مانع ترقی اور باعث بدنظمی تھی پائدار حکومت منتظمات اور امن قایم کریں - اور

مغربی تہذیب کی اشاعت کی یہ نمایاں خرابیاں اس شدید نفرت کا
باعث اوّل ہیں جو اکثر مشرقیوں کو بشمول بعض واقف کاران مغرب ہر اُس چیز سے
ہے جس پر مغربی ہونے کا اطلاق ہوتا ہے - ایسے اشخاص جاہل انقلاب پسندوں
اور مغربی سیاسی اقتدار کے خلاف بغاوت کرنے والوں کے کار آمد معاون
ہیں -

بلاشبہ مشرق پر مغربی اثرات کے سلسلہ میں مشرق پر مغرب کا سیاسی
اقتدار نمایاں عنصر ہے ہم یورپ کی گزشتہ صدی کی فتوحات مشرق اور ان کے وسیلے
پر تبصرہ کر چکے ہیں - اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اسلامی دنیا سیاسی اور اقتصادی
تسخیر کے دوگونہ سیلاب کے مقابلہ میں کیسی ناچار و پسپا و شکستہ پا تھی - فی الواقع
یورپ کی سرعت اور تکمیل میں اقتصادی پھیلاؤ نے غالباً اہم حصہ لیا - بلاشبہ بعض
بلاد مشرق کھلم کھلا فوجی طاقت کی ایک ضرب سے مسخر ہو گئے مثلاً الجزائر
میں فرانسیسی مہم اور ایشیائے وسطیٰ میں روسی فتوحات اور طرابلس میں اطالوی
حملہ لیکن زیادہ تر ملک گیری کا آغاز اصلاً اقتصادی عمل سے ہوا - جس کو پُرامن
مداخلت کہتے ہیں - یعنی مغربی سرمایہ سے قرضہ جات اور مراعات کی صورت میں
ایسے مشرقی ممالک پر جو اس وقت آزاد تھے مالی قابو حاصل کیا گیا - حتیٰ
کہ مغربی سیاسی تسلط کا حصول ایک ضابطہ امر واقعہ کو باضابطہ بنانا رہ گیا - یہی قصہ
مصر و مراکش و ایران کی تسخیر کا - اور سب سے زیادہ یہ ہے کہ انگلستان کی سلطنت ہند
کی ابتدا خالص تجارتی مہم یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہوئی - اکثر "پُرامن مداخلت" کی
غضب کی قوت کا پورا احساس نہیں ہوتا - صرف ایک مد یعنی ریلوں کی مراعات کو لو
ڈاکٹر [illegible]لن سیاسیات دنیا کا ذی ہوش ماہر کہتا ہے -
"آئندہ مسلط ہونے والی حکومتوں کو ریل کی آہنی سڑکیں وہی کام

واحد اقتضا وہی ہستی ہے - اور اس کے کل ارکین ایک واحد سیاسی سلسلہ کے جزو ہیں - اور اس امر کے حاصل ہو جانے سے ہم کو دنیا بھر کے لئے ایسا واحد نظام نظر آسکتا ہے جس کی امید ماضی میں خواب و خیال میں بھی نہ ہوئی ہوگی - یورپی اقوام کی شاہنشاہیت کے بغیر شمالی و جنوبی امریکہ و اسٹریلیا و جنوبی افریقہ ویران رہتے - جس میں منتشر وحشی اقوام آباد ہو - یقیناً ہم اپنے مشاہدہ کی بنا پر یہہ کہہ سکتے ہیں کہ بغیر اس کے ہندوستان اور نیز دیگر ممالک کے گروہ جن میں پرانی تہذیب موجود تھی بظاہر لا متناہی سلسلۂ جنگ اور مطلق العنان شخصی حکومت میں گرفتار رہتے جیسا کہ ان کی صدیوں کی تاریخ میں یہ متواتر طور پر ہوتا رہا تھا - اور ان حالات میں ہمارے ادراک کے بموجب نہ تو عقلی یا مساوی قانون نہ سیاسی ازادی قابل عمل متصور ہوتی ہے - بغیر اس کے دنیا کی پست حال اقوام ایک غیر مبدل ابتدائی رسومات کے قیود میں جامد ہی رہتیں - جیسا کہ ان کی حالت کل تاریخی زمانہ میں رہی ہے اگر آج مغرب سب سے زیادہ بارآور سیاسی خیالات یعنی قومیت اور حکومت خود اختیاری کے خیالات جو محض مذہبی تہذیب سے پیدا ہوئے ہیں غیر یورپی دنیا کے بہت سے حصوں میں صحیح ہیجان پیدا کرنے لگے ہیں - تو یہ یورپی شہنشاہیت کا ہی نتیجہ ہیں[1]۔

موجودہ شہنشاہیت کے اخلاقی اصول کہیں بھی اس سے بہتر منضبط نہیں ہیں جیسا کہ لارڈ کرومر کی مضمون بین ہیں - وہ لکھتا ہے - "شہنشاہی حکمت عملی بلا شبہہ

---

[1] رمزی میور کا مضمون "یورپ اور غیر یورپی دنیا" جو ۲۸ - جون ۱۹۱۷ء کو دی نیو یورپ میں شائع ہوا۔

دستکاری کی ہمت افزائی کر کے کارآمد نئی باتیں مثلاً ریلیں ڈاکخانہ جات وحفظانِ صحت اور اُن کے علاوہ بہت سی دوسری باتیں جاری کریں۔ ان مادی جدتوں کے علاوہ کل مغربی سلطنتوں نے عملی طور پر اپنے زیر فرمان اقوام کی معاشرتی و ذہنی وروحانی حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ وہ لوگ جنہوں نے اونیسویں صدی میں نوآبادیات کی سلطنتیں قایم کیں وہ ایک ایسی روح سے زندہ تھے جو اُس اگلے زمانہ کی سلطنتوں سے بہت زیادہ روشن خیال تھے۔ جبکہ اسپین و پرتگال وہالینڈ و انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدائی نوآبادیات کی سلطنتیں محض جلب منفعت کے لئے وحشیانہ اور تنگ خیال اصول پر چل رہی تھیں۔ اونیسویں صدی میں کل مغربی حکومتیں جو مشرق میں قایم تھیں کم وبیش "گورے آدمی کی ذمہ داری" کے نصب العین سے متاثر تھیں اونیسویں صدی کے کل بڑے سلطنت ساز چونکہ محض ذاتی مفاد اور ذاتی حب وطن ہی کی بنا پر کام نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ اپنا اہم فرض سمجھتے تھے کہ اپنی زیر تسلط اقوام کی حالت کو سنبھال دیں۔ لہذا وہ اپنے آپ کو مغربی تہذیب کا علمبردار سمجھکر اس کے کل فوائد کو رائج کرنے کی کوشش کرتے تھے وہ ایمانداری سے یہ یقین رکھتے تھے کہ پست حال حصص عالم کو عہد حاضرہ کے مطابق بنانے کا بہترین و سریع ترین اور غالباً واحد ذریعہ مغربی سیاسی تسلط کی توسیع ہی تھا۔

اس نقطہ خیال کو ایک بڑا نوی آزاد خیال حامی شہنشاہیت یعنی پروفیسر رمیری میور نے نہایت قابلیت سے بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "یہ مسلمہ امر ہے کہ یورپی اقوام کی شہنشاہیت ہی وہ ذریعہ تھی جس کی بدولت یورپی تہذیب کل دنیا میں ایک حد تک پھیل گئی ہے۔ حتے کہ آجکل دنیا ایک

غلطیاں کر رہا تھا تاجروں سے سامان خریدتا اور اس کی قیمت دینے سے انکار کرتا تھا۔ قرضوں کا معاہدہ کرنے کے بعد روپیہ کو بے دردی سے اڑاتا اور معاہدوں کو منسوخ کرتا تھا۔ یورپی اقوام کو پہلے اپنے یہاں دعوت دیکر پھر اُن کا اخراج یا قتل عام کرتا تھا۔

جب صورت حال یہ تھی تو واقعہ یہ ہے کہ مغربی دباؤ پڑا جیسا کہ بے پڑے بچ ہی نہ سکتا تھا۔ اور اس متواتر اور ہمہ گیر اور سخت دباؤ نے مشرقی قدامت پسندی اور کاہلی کے فصیل کو ایسا منہدم کیا کہ کسی دوسرے چیز سے ایسا ممکن نہ تھا۔ مشرق کو مجبور کیا کہ اپنے پرانی ڈگر کو چھوڑ کر خواب و خیال کے بجائے حقیقت اشیا کے اثبات کا محاسبہ ایسا ہی کرے جس طور پر اس واقعاتی دنیا میں موجود ہیں۔ فصول ما بعد میں ہم اس عمل کے متعدد نتائج پر غور کرینگے جس نے گزشتہ سو سال میں مشرق میں عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ فی الحال مشرق پر مغربی تسلط کے جدید ترین صور اور اس سے مشرق کے ردعمل پر غور کرکے عام تبصرہ کو جاری رکھینگے۔

میری رائے میں مشرقی بلاد پر مغربی تسلط کے بابتہ جو نکتہ چینی کیجاتی ہے۔ اس میں خاص غلطی یہ ہوتی ہے کہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کی شہنشاہیت کے درمیان فرق نہیں کیا جاتا۔ انیسویں صدی کی شہنشاہیت بلاشبہہ لازمی اور ظاہرا فی الجملہ نفع بخش تھی۔ بیسویں صدی کی شہنشاہیت کے بابتہ ایسی اچھی رائے قایم نہیں کی جاسکتی۔ سنہ ۱۹ء میں مشرقی اقوام بجز * ایسی متعصب اور علم و تہذیب کے مخالف نہ رہی تھیں جو اپنے جامد اور زوال پذیر تہذیب کے دائرہ کے باہر کسی چیز کو جانتے نہوں یا جاننے کی پروا نکرتے

عاقلانہ دوراندیشی سے نافذ ہونا چاہیئے۔ اقوام محکوم سے ہمارے تعلقات جن اصول حکومت کی بنا پر قایم ہوتے ہیں وہ سیاسی اور اقتصادی طور پر صحیح اور اخلاقی طور پہ قابل استدلال ہونا چاہئیں۔ فی الحقیقت یہہ شہنشاہی محراب کی درمیانی اینٹ ہے۔ شہنشاہیت کا اصل جواز ان کاموں سے ثابت ہوتا ہے جن میں شہنشاہی قوت صرف کی گئی ہے اگر ہم اپنے اختیارات کا اچھا استعمال کریں تو ہم مستقبل کا مقابلہ بلا اس خوف کے کر سکتے ہیں کہ ہم اس قہر الٰہی میں گرفتار ہوں گے جو سلطنت روما کی بدنظمی پر نازل ہوا تھا۔ اگر معاملات اسکے برخلاف ہیں تو برطانوی سلطنت کا زوال واجب ہے اور بالیقین آخر کار اس کو زوال ہوگا۔[۱]

یہ ہیں مغربی شہنشاہیت کے بنیادی اصول جو انیسویں صدی میں منکشف ہوئے۔ چاہے اس کے قسمت میں ثبات وقیام ہو یا نہ ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس یورپی سیاسی تسلط کی عظیم الشان وسعت نے ہر قسم کی مغربی اثرات کی ترویج میں بڑی حمایت کی۔ بلاشبہہ یہ استدلال صحیح ہوگا کہ اگر کسی قسم کا مغربی دباؤ نہ پڑتا تو بھی مشرق ازخود مغربی دستور اور خیالات کو اختیار کر لیتا۔ لیکن اس میں بہت زمانہ لگتا۔ اور یہہ وقت کے اہم عنصر سے ایسے استدلالات محض علمی مباحثہ رہجاتے ہیں۔ جوش حیات سے لبریز اور خواہش توسیع سے معمور۔ انیسویں صدی کے یورپ سے یہ توقع تاریخ عالم اور فطرت انسانی کے خلاف تھی کہ وہ بالارادہ اپنے عزایم کو منضبط واختراع کے سلسلوں سے دست وپا بستہ کر کے خاموش دیکھتا رہتا۔ جبکہ پست حال مشرق مغربیت کے رد وقبول کے تجربوں میں پڑا رہے

---

[۱] دی ارل آف کرومر کی کتاب "سیاسی اور ادبی مضامین" صفحہ ۵ مطبوعہ لندن ۱۹۱۳ء

لکھی تھیں، اسپر شاہد ہیں "گزشتہ چند سال میں نہایت دیندار مسیحی دول کا طرز عمل ان قزاقوں کے گروہ کے مشابہ رہا ہے جو ایک غیر مسلح اور بے کس کسانوں کی آبادی پر حملہ کرتے ہیں۔ دیگر اقوام کے حقوق کی پاسداری تو درکنار انھوں نے ان اقوام سے نہایت مکمل اور خود غرضانہ بے پروائی کا اظہار کیا ہے۔ فی الحقیقت انھوں نے اِس مقولہ کا ادعا کیا ہے کہ "جس کی لاٹھی اُسکی بھینس"، اور مسلح قوت کے مقابلہ میں اخلاقی ملحوظات کی لاچاری کا ایسا کھلم کھلا ثبوت دیا ہے کہ مشرقی فوجی فاتحین میں سے شاید ہی کوئی ان سے سبقت لے جا سکے۔

گزشتہ ربع صدی کے تاریخ کا مہتم بالشان واقعہ ایشیا کی خواب غفلت سے بیداری ہے مشرق میں دفعتاً حیات پیدا ہوئی اور اس نے مغربی ترقی کی منجدہار میں اپنے آپ کو نعورشور سے ڈالا۔ جاپان نے اس مہم کو شروع کیا۔ اور اسکی خوش قسمتی تھی کہ وہ اِس راہ پر اس وقت گامزن ہوا جبکہ یورپ کے جدید حکمت عملی کی پورے طور پر تکمیل نہ ہوی تھی۔ اور حقوق اقوام اور عہدنامجات کی حرمت کی بابت بعض متروک بضعیف العین ہنوز باقی تھے۔ انیسوی صدی کے بڑے جاپانی مدبرین نے جب جدید عہد کو شروع کیا تو یورپ نے مداخلت کرنا اپنا فرض سمجھا۔ ہمنے جاپانی نشأۃ ثانیہ کو دلچسپی اور معرفانہ نگاہوں سے دیکھا اور جاپان والوں کی اپنے مشکلات نجات کے حل کرنے میں کوئی مزاحمت نہ کی۔ اگر یہ انقلاب تیس سال بعد پیش آتا تو یہاں واقعہ کی شکل دوسری ہوتی۔ اور جدید جاپان اپنے عالم درد و کرب میں یہ دیکھتا کہ دول عظمے اس کے بستر مرض ہر طرف مسلح کھڑے اپنے آہنین پنجے قابل حصول اشیاء کے چھیننے کے لئے بڑھا رہے ہیں دوسرے مشرقی ممالک کو جنہوں نے موجودہ صدی میں اتباع جاپان کی کوشش کی واژونیِ بخت سے سابقہ پڑا۔

ہوں۔ مشرق مدرسہ جانے لگا تھا۔ اور جو کچھ اس کو یورپ سے لئے تعلیم دی تھی
اس پر عمل شروع کرنا چاہتا تھا۔ یہ ظاہر تھا کہ ان اقوام سے جن کی گزشتہ
تاریخ ان کو اکتساب کے قابل ثابت کرتی تھی۔ اور جو اب ظاہر طور پر ذہنی ترقی
کے لئے صحیح خواہش کا اظہار کر رہی تھیں، پہلے سے مختلف برتاؤ ہونا چاہئے
یا یوں کہنا چاہئے کہ مغرب کے لئے یہ مناسب تھا کہ وہ مشرق سے زیادہ
آزاد خیالی کو برتتا۔

مگر ایسی تبدیلی کوئی بھی نہ ہوئی برخلاف اس کے خود مغرب میں انیسویں
صدی کی مروجہ آزاد خیالی کے نصب العین کی بجائے سیاسی اور اقتصادی
رقابت کی وہ خونخوار روح پیدا ہو رہی تھی جس کا انجام جنگ عظیم کی صورت میں
ظاہر ہوا[۵۱]۔ یورپ مستعمرات و "حلقہ جات اثر" و مراعات اور مرجحانہ بازاروں کا
ایسا حریص یعنی بدترین معنی میں مختصراً "ایسا شہنشاہیت کا حامی" کبھی نہ ہوا تھا نتیجہ
یہ ہوا کہ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی مشرق پر مغربی دباؤ کم ہونے کی بجائے
دو چند ہو گیا اور مشرق کی بیداری سے ہمدردی کا تو کیا ذکر گزشتہ دو سو سال سے
بھی زیادہ بے رحمانہ سلوک کیا گیا۔ جس طریقہ پر ایران و ترکی جیسے مشرقی ممالک
سے جو اپنی اصلاح اور تحفظ آزادی کی کوشش کر رہے تھے، یورپ کے جدید سیاسیات
حاضرہ نے سلوک کیا ہو۔ اس سے ایک نسل قبل کے آزاد خیال حامیان شہنشاہیت
ضرور بیزار ہوتے جبکہ حاضرہ کے آزاد خیالوں کو بھی اس سے ناراضگی ضرور ہوئی
چنانچہ ایک مشہور برطانوی ماہر سیاسیات۔ سڈنی لو نے سطور ذیل جو ۱۹۱۲ء میں

۵۱۔ مغربی خیالات میں ان انقلابات پر مکمل بحث کیلئے، ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "گورونکی
عالمگیر اقتدار کے خلاف رنگ کا ابھرتا ہوا طوفان" بالخصوص فصول ششم و ہفتم۔ مصنف

خلاف مشرق کے ردعمل کی پیچیدہ فطرت کے لحاظ سے آؤ ہم اس مسئلہ کے مختلف ترکیبی اجزا کی تشریح کریں۔

گزشتہ سو سال میں مغربی تمالف کے خیالات بعض مقامات میں کم ہو رہے ہیں اور دیگر مقامات میں بڑھ رہے ہیں طبعًا مستبدین اور متعصبین نے مغربی امور سے ہمیشہ نفرت کی لیکن ان سیاسی غلط کاروں کی جماعت اقل کو چھوڑ کر دیگر مشرقی جماعتوں کا طرز عمل وقت اور موقع کے لحاظ سے بہت مختلف رہا ہے۔ آزاد خیال اشخاص نے مغربی اثرات کا خیر مقدم دل و جان سے کیا۔ تمہیدی فصل میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ آزاد خیال مصلحین نے ترقی کے مغربی تصور کا کیسا خیر مقدم کیا اور انہوں نے اس کو اپنے مجوزہ مذہبی اصلاح کے اصولوں میں سے ایک اصول قرار دیا دنیوی معاملات میں بھی آزاد خیال حضرات نے اسی روش کا اظہار کیا۔ انیسویں صدی کے تیسرے ربع میں جو آزاد خیال مدبرین ترکی سلطنت میں برسر اقتدار تھے انہوں نے سلطنت عثمانی کے اصلاح کی دل سے کوشش کی اور یہی حالت دنیائے اسلام کے دیگر حصص کی تھی۔ جنرل خیر الدین نے جو ٹیونس کی تجدید کی سعی کی وہ ایک دلچسپ مثال ہے۔ یہ شخص چرکسی نسل کا تھا۔ اور اپنے آقا "ڈے[۵۱]" کا معتمد تھا جنے اسکو وزیر

---

[۵۱] بے دراصل ترکی لفظ بیک کا مخفف ہے اور کسی شہر یا صوبہ کے ترکی گورنر کو کہتے ہیں۔ ٹیونس کی ہشتیبنی فرماں روا کو "بے" کے خطاب سے ملقب کرتے ہیں۔ ٹیونس کو باشندگان ملک ہنوز افریقیہ کہتے ہیں اس کی ابتدائی تاریخ کارتھیج سے وابستہ ہے اس کے بعد رومی صوبہ افریقہ میں شامل ہو گیا۔ پانچویں صدی میں ونڈل چھٹی صدی میں مشرقی سلطنت اور ساتویں صدی میں عربوں نے فتح کیا (بقیہ نوٹ صفحہ ۱۳۲ پر ملاحظہ ہو)

گزشتہ دس سال سے یورپ کے دفاتر امور خارجیہ پر سخت مادیت اور بین الاقوامی اخلاق کی قطعی تحقیر کی لہر دوڑ گئی ہے - یہ لہر اُن مساعی کا مصیبت ناک ردّعمل کر رہی ہے - جو وہ نظام دستوری - کی اصلاح کیلئے سر بکف ہو کر کر رہے ہیں - اِن اقوام کے یہ مساعی انہیں مشوروں پر مبنی تھیں جو مسیحی دنیا کے اگلے خیر اندیش مشیر انہیں پشت ہا پشت سے دیتے چلے آرہے ہیں -

"اب جو یہ مشورے اِن کے دلنشین ہوئے اور انہوں نے بے شمار موانع کے مقابلہ میں اصلاحی راستہ پر پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی کوشش کی تو یہ خیال ہوتا تھا کہ مغرب کی حکومتیں ان مساعی کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھینگی اور یہ کہ اگر انہوں نے کوئی امداد براہ راست نہ کی تو کم از کم انہیں مناسب آزمائش کا موقع دینگے" لیکن برخلاف اِس کے "دول عظمیٰ نے یکے بعد دیگرے مشرقی ممالک کے اندرونی مشکلات کے مواقع سے نفع اٹھا کر الحاقی دور شروع کر دیا[۱۵]"

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ یہ الحاقی دور کس قدر تیز تھا اور بقیہ مسلمان سلطنتوں کی آزادی کا خاتمہ جنگ عظیم کے ختم پر ہوگیا - ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اِس سے مسلمانوں کا خوف اور تنفر کس قدر بڑھ گیا اور مغرب سے پہلے ہی سے خوف و تنفر متعدد وجوہ سے تھا - فصل ماسبق میں ہم نے اتحاد بین الاسلامی کی ترقی کا ذکر کیا ہے - اور فصول مابعد میں ہم مشرقی قوم پرستی کی ترقی کو بیان کریں گے مگر اِن سیاسی اور مذہبی تحریکات سے مغربی تہذیب کے خلاف مشرقی ردعمل کی فہرست مکمل نہیں ہوتی - اِن کے علاوہ اور بھی اقتصادی، معاشرتی اور نسلی قسم کے ہیں - مغربی تہذیب کے

---

[۱۵] سڈنی لو کا مضمون "اخلاقِ مسیحی کی سب سے زیادہ پابند سلطنتیں" جو مارچ ۱۹۱۲ء کے فورٹ نائٹلی ریویو میں شائع ہوا - مصنف

ہوگئی ہے۔ خیر الدین نے اپنی کتاب میں اپنے ہم مذہبوں کو ماضی کی کورانہ تعریف اور اُس کے سوا دیگر امور سے متکبرانہ استغنا کو ترک کرنے اور جو کچھ بیرونی دنیا میں ہو رہا ہے اُسکو سیکھنے کی ضرورت کو دکھایا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ ''کہ موجودہ ثروت نہ تو قدرتی فواید کی وجہ سے ہے اور نہ مذہب کی ملکہ فنون اور علوم کی ترقی کی بدولت ہے جنسے دولت کی روانی میں آسانی ہوتی ہے۔ اور جن سے زراعت صنعت اور تجارت کی دوراندیشانہ متواتر سرپرستی کرکے زمین کے خزاین سے نفع اٹھانا ممکن ہو جاتا ہے یہ سب قدرتی نتایج ہیں انصاف اور آزادی کے یعنی اُن دو چیزوں کے جو یورپیوں کے طبیعت ثانی ہوگئی ہیں'' ازمنہ ماضیہ میں اسلامی دنیا عظیم الشان اور ترقی کرنے والی تھی کیونکہ وہ اسوقت آزادخیال اور ترقی کی متلاشی تھی۔ وہ تعصب اور جہالت کی وجہہ سے زوال پذیر ہوئی لیکن اس کی نشأۃ ثانیہ اپنی اوایل ایام کی تجدید سے ہوسکتی ہے۔

میں نے مشہور ترکی مثالات کے مقابلہ میں ٹیونسی خیر الدین کی مثال پر اس لئے زور دیا ہے کہ اس سے وسط انیسویں صدی کے آزادخیال مسلمانوں میں مغربی خیالات کی عام مقبولیت اور مغربی مخالفت سے آزادی کا پورا ثبوت ملتا ہے[۹۵]۔ مگر امتداد زمانہ کے ساتھ بہت سے وہ لوگ جو پہلے آزاد خیال تھے متعدد وجوہ بالخصوص یوروپی تعلّی کی وجہہ سے مغرب کے فریب سے چھوڑکر مغرب کے سب سے بڑے

---

[۹۵] اس مسئلہ پر ملاحظہ ہو اے وامبیری کی کتاب ''مشرقی ممالک میں مغربی تمدن'' مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۰۶ء۔ ڈبلیو اس بلنٹ کی کتاب ''مستقبل اسلام'' مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۸۲ء۔ نیز دو مضامین نوشتہ لیون کاہون دربارۂ ''انیسویں صدی میں اسلامی دنیا میں ذہنی اور معاشرتی ترقیاں'' جولاویز اور رامبو کی عام تاریخ جلد ۱۱ فصل ۱۵۔ اور جلد ۱۲۔ فصل ۱۴ میں شایع ہوئی ہے۔ مصنف۔

سفر کیا۔ ۱۸۶۰ء میں اسنے یورپ کا سفر کیا اور وہاں کے تمدن سے بہت متاثر ہوکر واپس آیا یورپ کی لا انتہا ہی تفوق سے متیقن ہو کر اوسنے ٹیونس میں مغربی خیال اور طریقوں کی پود لگانے کی ازحد کوشش کی۔ اسکو وہ بالکل ممکن سمجھتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ٹیونس کی نشاۃ ثانیہ بہت جلد ہوگی خیرالدین ذرا بھی مغرب سے نفرت کرنے والا نہ تھا اس نے صاف طور پر پہچان لیا کہ اگر اسلامی دنیا نے جلد اپنے گھر کو سنبھال نہ لیا تو اُسے مغربی تسلط کا بہت قریبی خطرہ ہے اسنے بالکل جا بزحب وطن کے خیال سے یہ چاہا کہ اپنے ملک کو ترقی کے راستے پر زبردستی چلائے تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوکر اپنی آزادی کو قایم رکھ سکے

خیرالدین کی رپورٹ کا "بے" پر ایسا اثر ہوا کہ اُسنے خیرالدین کو اصلاحی عہدہ جھد میں بالکل مختار کردیا۔ کچھ عرصہ تک خیرالدین نے بڑی سرگرمی دکھائی۔ اگرچہ فتنہ انگیز عمال نے اس کی سخت مخالفت کی اور اس کی ناوقت موت نے اس کام کو ختم کردیا۔ اور ٹیونس ہنوز غیر تجدید شدہ ہی تھا کہ بیس سال بعد دولت فرانس نے فتح کرلیا۔ مگر خیرالدین نے آیندہ نسلوں کے واسطے کام کیا۔ اپنے ہم وطنوں کو حقیقت حال بتانے کے لئے ایک مشہور کتاب الموسوم بہ

اقوم المسالک فی احوال الممالک شائع کی۔ اس کتاب نے کل مشرق اور بالخصوص شمالی افریقہ میں آزاد خیال اور قوم پرست دونوں پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ شمالی افریقہ میں یہ ٹیونسی اور الجزایری قوم پرستی کی مقدس کتاب

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۳۱) چودہویں تا غایت سولہویں صدی میں خود مختار ملک رہا لیکن ۱۵۳۵ء میں شارلس پنجم نے فتح کیا۔ ۱۵۷۴ء ترکوں نے تسخیر کیا سولہویں اور سترہویں صدی میں ٹیونس کے "بے" ترکی اقتدار کو تسلیم کرتے تھے ۱۸۸۱ء میں فرانسیسی ضمانت میں آگیا۔ مترجم

نہ ہونا چاہیئے ۔ ہمکو خوں ریزی اور مصائب و مظالم اور رنج کی اشاعت کرنا چاہیئے ۔ اس طریقے ہی سے ہم شاہ فرڈیننڈ کی افواج کیطرح مہذب دنیا کو پیار بن سکتے ہیں [۵۱]۔"

جنگ عظیم کو خود اکثر مسلمانوں نے مغربی تکبر اور حرص پر حق بجانب قہر الٰہی تصور کیا ۔ اور اس پر خوشیاں منائیں ۔ ایک سربرآوردہ اخبار نے جس طور سے دول یورپ کا خاکہ اُڑایا ہے اس کا نمونہ یہ ہے "وہ اپنے ممالک یا اور کہیں کے خرابیوں کو نہ دیکھینگے لیکن چھوٹی سے چھوٹی بات کیلئے ہماری سرحدوں پر مداخلت کرینگے ۔ ہر روز ہمارے حقوق اور ہماری سلطنت کے کسی حصہ کو قطع کرینگے ۔ وہ ہمارے پھڑکتے ہوئے جسموں پر عمل جراحی کرکے کوئی بڑا حصہ قطع کریں گے ۔ اور ہم اپنے دلوں میں بغاوت کے جوش کو مجبوراً ضبط کرکے اور اپنی کمزور مٹھیاں باندھے خاموش اور مغموم ہیں ۔ جب وہاں آگ لگتی ہے تو چپکے چپکے کہتے ہیں کاش یہ ایک دوسرے سے لڑ جاتے ! کاش یہ ایک دوسرے کو کھا جاتے ! ۔ اور تماشا دیکھو کہ آج وہ ایک دوسرے کو ایسا ہی کھا رہے ہیں جیسا کہ ترک چاہتے تھے [۵۲]۔"

---

[۵۱] احمد امین کی تصنیف "موجودہ ترکی کی ترقی جسکا اندازہ اسکی مطابع سے ہوتا ہے" صفحہ ۱۰۸ ۔ (یہ کولمبیا یونیورسٹی کی پی ایچ ۔ ڈی کا مضمون ہے) مطبوعہ نیویارک سنہ ۱۹۱۴ء ۔ مصنّف

[۵۲] اخبار طنین جو قسطنطنیہ سے شائع ہوتا ہے ۔ منقول از "مجموعہ ادبیات" مورخہ ۲۴ اکتوبر سنہ ۱۹۱۴ء صفحہ ۷۸۴ ۔ جنگ عظیم اول یورپ سے یہ طرز عمل صرف اسلامی اقوام تک محدود نہ تھا بلکہ ہر جگہ کے غیر یورپی اقوام کا مشترکہ طرز عمل تھا ۔ کل دنیا میں اس خیال کی تبصرہ کے لئے ملاحظہ ہو میری کتاب "گوروں کی عالمگیر اقتدار کے خلاف رنگ کا بڑھنے والا طوفان" صفحہ ۱۳ لغایتہ ۱۶ ۔ مصنّف

دشمن ہوگئے۔ اور مغربی تہذیب کی روح سے نفرت[۵۱] کرنے لگے۔

یہ مغرب کی مخالفت کا خیال لاریب موجودہ صدی کے آغاز سے بہت بڑھ گیا ہے چنانچہ ایک با اثر مسلمان نے جنگ عظیم سے کچھ پہلے لکھا "گذشتہ دس سال کے واقعات اور اسلامی دنیا کے مصائب نے اُن کے دلوں میں باہمی محبت اور وداد کے اُن خیالات کو پیدا کر دیا ہے جو اس سے قبل نامعلوم تھے اور اپنے ظالموں کے خلاف متحدہ نفرت کا طوفان سب مسلمانوں کے دلوں میں آج تلاطم پیدا کر رہا[۵۲] ہے" اکثر مسلمانوں کے دلوں میں جو سخت بغض جوش مار رہا ہے اس کا اظہار ذیل کی بے ساختہ تحریر سے ہوتا ہے جس کو ایک ترکی مصنف نے جنگ بلقان کے خاتمے پر لکھا تھا "ہمکو شکست ہوئی! بیرونی دنیا نے ہم سے مخالفت کا اظہار کیا! کیوں؟ اس لئے کہ ہم اپنے تصورات کی بموجب نیک و بد اور انسانیت اور تہذیب میں ضرورت سے زیادہ سوچ بچار کرنے والے اور شائستہ و مہذب ہو گئے ہیں۔ افواج بلغاریہ نے ہم کو سبق دیا۔ کہ ہر سپاہی کو جو دشمن کے مقابل ہو ابتدائی بربریت کی طرف عود کرنا چاہئے۔ اس کو خون کا پیاسا، بچوں، عورتوں، کمزوروں اور بوڑھوں کے قتل کرنے میں بے رحم ہونا چاہیئے۔ اور دوسروں کے مال و جان و عزت کا کوئی خیال

---

۵۱ ملاحظہ ہو وامبیری کی کتاب "انیسویں صدی کا اسلام" فصل ششم مطبوعہ لیپزگ ۱۸۷۵ء۔ مصنف

۵۲ × کا مضمون "ایران کی سیاسی حالت" جو جون ۱۹۱۲ء کی ریویو دو موند مسلمان میں شائع ہوا جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ایڈیٹر نے ہمکو یقین دلایا ہے کہ گمنام مضمون نگار ایک ممتاز مسلمان عہدہ دار ہے۔ مصنف

کھڑے ہونے کے قابلیت کے لئے عارضی طور پر ازادی کے محرومی سے راضی ہیں۔
لیکن ایسی ازاد خیال جماعت اقل ہے۔ جن کو اعلے طبقات ابن الوقت اور ملاحدہ سمجھکر نفرت کرتے ہیں ان میں اور جاہل عوام میں تیزاغار حایل ہے۔

بہ نظر اول ہمکو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ عوام فی الجملہ یورپی تسلط سے خوش ہوں گے۔ باوجودیکہ مغربی تہذیب کی ترویج سے بعض اقتصادی نقصانات ہوئے۔ لیکن عوام نے بالیقین یورپی حکومت سے بہت نفع اٹھایا پیشتر امرا اور طبقات اعلے کسانوں اور قصبات کے کاریگروں سے بے رحمی کے ساتھ طلب منفعت کرتے تھے۔ آج انکو اپنی آراضی اور ثمرات محنت کے لئے امن وامان وتحفظ حاصل ہے یہ خیال کرنا غلطی ہوگا کہ عوام میں اس کا احساس نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ یورپی حکومت کے فوائد تو جانتے ہیں۔ باینہمہ جدید حکمرانوں سے ہر چند رواداری کا برتاؤ کیا جاتا ہے اور ان کی عزت بھی کیجاتی ہے لیکن اُن سے محبت بالکل نہیں ہے۔ مزید براں جوں جوں وہ اشخاص جو قدیم حکومت سے واقف تھے مرتےجاتے ہیں اوسکی خرابیاں فراموش ہوتی جاتی ہیں۔ اور نوجوان موجودہ فوائد کو مسلم مانکر موجودہ نظام کی خرابیوں کے شاکی ہیں۔ اور ان دیسی شورش پسندوں کے باتوں پر کان دھرتے ہیں جو عظمت حریت کی مدح سرائی اور "اچھے عہد قدیم" کو مطمع نظر بناتے ہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ عام مشرقی قدیم طرز زندگی کے لئے باوجود اسکے عیوب کے ترستا ہے جبکہ وہ جدید حکومت کے فوائد سے واقف ہوکر بھی بلا وجہ قدیم کا خواہشمند ہے۔ مسلمانوں کی پرانی ضرب المثل ہے "مسلمان حاکم ہو گو وہ بے جے ستائے۔ اور کافر نہ ہو خواہ وہ میری بہبودی کے کام کرے" ہر نوآبادیات کی حکومت کو خواہ وہ کتنی ہی روشن خیال ہو اس دائمی نفرت سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے جو مسلمانوں کو عیسائی

مغربی مخالفت کے ایکے خیال محض اخبار نویسوں اور سیاست دانوں تک محدود نہیں بلکہ شہزادے سے لے کر کسانوں تک سب میں عام ہیں۔ ہر طبقہ یوروپی سیاسی تسلط سے نفرت کے لئے اپنے خاص وجوہات رکھتا ہے۔ ویسی شہزادے باوجود اس کے کہ اپنے تختوں پر قائم اور اون کے اعزاز و ذیشقے برقرار رکھے جاتے ہیں اپنی ماتحتی کے حالت اور اپنے لا انتہا اختیارات خود مختاری کے سلب ہونے سے بہت ناراض ہیں۔ ایک ہندوستانی راجہ نے نہایت رنج سے کہا "تم جانتے ہو کہ میں ریزیڈنٹ کے بلا اجازت اپنے لئے ایک تلوار یا قلم بھی بمشکل خرید سکتا ہوں" اس کا طرز عمل بالکل توفیق پاشا خدیو مصر کا سا تھا۔ جس نے برطانی مقابضت کے اوایل میں برطانوی افواج کا جائزہ لیتے ہوئے۔ اپنے وزرا میں سے ایک سے کہا "کیا تمہارے خیال میں میں اسکو پسند کرتا ہوں میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں جب کسی انگریزی پہرہ دار کو اپنی گلیوں میں دیکھتا ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ گاڑی سے کود کر اسکا گلا گھونٹ دوں[۱۵]۔"

طبقات اعلےٰ کے بھی احساسات اپنے بادشاہوں کی طرح ہیں۔ یہ اپنے سابقہ مراعات اور منصب کے کھونے کا افسوس کرتے ہیں۔ یہ بالخصوص مغربی تعلیم یافتہ روشن خیالوں پر صادق آتا ہے۔ انکا یقین ہے کہ حکومت کے سب عہدہ جات انکو ملنا چاہئیں۔ اور جو بڑی تنخواہ اور اختیارات کی جگہیں یورپیوں کے لئے محفوظ ہیں وہ انسے سخت ناراض ہیں بلاشبہہ اکثر ذیہوش آزاد خیال یورپی تسلط کے تعلیمی اثر کو اتنا زیادہ محسوس کرتے ہیں کہ اپنی تجدید کی تکمیل اور بالآخر بلا خوف انقلاب اور بدنظمی اپنے پیروں پر

---

۱۵ یہ دونوں مثالیں سی۔ ایس۔ کوپر کی کتاب "مشرق کی تجدید" مطبوعہ نیویارک سنہ ۱۹۱۴ء سے لیگئی ہیں صفحات ۳۳۹ و ۳۴۰۔ مصنف۔

اغراض سے ہمدردی رکھتے ہیں جن کی بدولت وہ خلاف ورزی کرتا ہے[۵۱]،،

اب امن و امان کو لو۔ عام مشرقی ہماری باقاعدہ اور باضابطہ زندگی کو صرف ناپسند ہی نہیں کرتا بلکہ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ چونکہ صدیوں سے بے پرواہی اور مرنجان و مرنج زندگی کے عادی ہو گئے ہیں۔ جس میں اگرچہ بہت سی بے انصافی تھی نوبہت سی طرفداری بھی تھی۔ وہ حفظان صحت اور قواعد پولس جیسے امور کو طبعاً ناپسند کرتے ہیں۔ چونکہ وہ بدلحاظانہ مفہوم میں "ذاتی آزادی" کے عادی ہو گئے ہیں۔ لہذا وہ اس آزادی کو رفاہ عام کے لئے محدود کرنا نہیں چاہتے۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنا چاہتے ہیں۔ خواہ اس کے لئے خطرہ بھی ہو۔ یعنی ایسے خطرات جو رشوت و طرفداری یا زبردستی سے ہمیشہ دور ہو جائیں۔ ایک امریکی نے جس نے فلپائن کے ایک باشندہ کی وہاں دو بار تقریر کو سنا تھا کہا "وہ کیا ہے جو تم آج نہیں کر سکتے ہو اور خود مختار ہو کر کر سکو گے"۔

"میں اگر چاہوں گا تو اپنا گھر بیچ سڑک پر بنا سکوں گا"

"لیکن فرض کرو کہ تمہارے پڑوسی نے اعتراض کیا اور انہیں مداخلت کی"؟

"میں اس سے سمجھ لوں گا"

"لیکن فرض کرو اسنے تم سے سمجھ لیا"؟

اس کے جواب پر صرف کندھے اوکسا دیئے[۵۲]۔

---

[۵۱] بی۔ ایل۔ پٹنام کی کتاب "دو یہ نالٹ کا مقابلہ"،،
صفحہ ۱۹۳۔ مطبوعہ لندن ۱۹۱۰ء۔ مصنف

[۵۲] منقول از کتاب "صلح عظیم" صفحہ ۹۷ مصنفہ ایچ ایچ پادرس مطبوعہ نیو یارک ۱۹۱۶ء مصنف

حکومت سے ہے۔ وسط ایشیا کے ایک روسی عامل نے بالعموم یورپی عمال کے خیالات کی ترجمانی اس مقولہ میں کر دی ہے۔ "دیا ایمان مسلمان گھروں کی حکومت سے خوش نہیں ہو سکتے"[۵]

مزید براں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اکثر مشرقی یورپی حکومت میں بہت نفع نہیں دیکھتے۔ اور اگر نفع کثیر کا احساس بھی کرتے ہیں تو اُن کو ان باتوں کے بدلے کم سمجھتے ہیں جو انکی نظروں میں جستوں خیز تکالیف اور بار ہیں۔ وہی باتیں جن پر ہم فخر کرتے ہیں کہ ہم نے مشرق کو عطا کی ہیں یعنی امن و امان و انصاف و سلامتی اُن کی مشرقی ہماری توقعات کے لگ بھگ بھی قدر نہیں کرتے۔ بلاشبہ وہ ان چیزوں کو پسند کرتا ہے لیکن وہ انکا حصہ کم لینا پسند کرے گا اگر وہ اسکو ملجائے جو اسکے دلپسند کو زائل دیا کرتے تھے۔ اور جو اس کے خیالات نصب العین میں شریک تھے۔ محض انصاف ہی کے عنصر کو لو۔ ایک انگریز مصنف لکھتا ہے "ایشیائی انصاف سے فی نفسہ خوش نہیں ہوتے۔ درحقیقت اس کی کم پرواہ کرتے ہیں اگر ان کو ہمدردی اس معنے میں حاصل ہو جائے جس میں کہ غلط فہمی سے اس لفظ کو وہ سمجھتے ہیں...... یہ اصلی وجہ ہے کہ کیوں ہر ایشیائی اپنے دل میں اپنی قوم کی حکومت کو وہ خراب ہی کیوں نہ ہو، اجنبیوں کی بہترین حکومت پر ترجیح دیتا ہے۔ کیونکہ جب اس کے ملک کے لوگ اس پر حکومت کرتے ہیں تو اسکو ان لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو اس کی کمزوریوں کو سمجھتے ہیں۔ اور جو خواہ نہایت وحشیانہ تعزیر ہی کیوں ندیں کم از کم اُن

---

[۵] منقول از کتاب روسی ترکستان مصنفہ اے و دلیکوف مطبوعہ پیرس ۱۹۱۴ء

ترک لوٹتے ہیں اور نہ رقیب قبایل قتل عام کرتے یا آزار پہونچاتے ہیں۔ وہ صرف
ایک باب کو دیکھتے ہیں۔ اور وہ بات یہ ہے کہ خارج از فہم امور کے لئے محصول ادا کرنے
کی ضرورت یا ہمکو کبھی اسکا احساس نہیں ہوسکتا کہ محکمۂ حفظان صحت کے اس قاعدہ
سے کہ کوڑے خانے ایک وقت مقررہ پر خالی کئے جائیں ہمارے الجزائر کے قصبات
میں کیسا غیظ و غضب پیدا ہوتا ہے۔ قاہرہ اور دیگر مقامات میں بھی میں نے خچر والوں
اور گاڑی والوں میں انگریزی پولسمین کے ضوابط کی پابندی پر ایسے ہی سرکشانہ
خیالات کو دیکھا ہے۔

"یہ ہماری جنگی اور انتظامی ضوابط ہی نہیں ہیں جن کو وہ ناقابل برداشت
سمجھتے ہیں بلکہ بحیثیت مجموعی ہمارے کل عادات مختصراً یہ کہ ہماری تہذیب کی
کے نظام ہی کو ناقابل برداشت سمجھتے ہیں بر سبیل تمثیل یافہ سے یروشلم کو جو ریل
گاڑی جاتی ہے وہ ایک اسٹیشن پر ٹھہرتی ہے جس کے قریب کسی بزرگ کا مزار ہے۔ انتظام
اوقات کے لحاظ سے گاڑی یہاں پر ایک منٹ رکتی ہے۔ مگر جونہی گاڑی وہاں پہونچی
میں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ سب مسلمان گاڑی سے اتر کر اور جانمازیں بچھا کر نہایت اطمینان
سے نماز پڑھنے لگے۔ اسٹیشن ماسٹر نے سیٹی بجائی۔ گارڈ چلایا۔ کہ وہ انکو چھوڑ
جائے گا۔ لیکن کسی نے جنبش نہ کی۔ ریلوے کے ملازمین کا ایک دستہ بلایا گیا جنہوں
نے لات و مکا و گالی کوسنا وغیرہ سے ان متقیوں کو پھر گاڑی میں بھرا۔ یہ صورت حالات
پاؤ گھنٹے تک رہی جس کی دشواری ظاہر ہے۔ ان عابدین میں سے تنومند اشخاص نے
خوب مقاومت کی۔

مثال بالا محض اتفاقی ہے جو بغیر کسی خاص غور کے انتخاب کی گئی ہے۔ جو امر یقینی
ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہنوز اسے سمجھنے سے قاصر ہیں کہ پابندی اوقات سے ہمارا کیا منشا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اکثر مشرقی باوجودیکہ مغربی خیالات و دستور سو سال سے خوب سرایت کر رہے ہیں ہنوز اپنے پرانے طریقوں کو پسند کرتے ہیں اور اُن سے ہٹنا ناگوار ہے۔ اُن کو یہ بھی احساس ہے کہ مغربی حکومت دیگر امور سے زیادہ ان کی معاشرتی نظام و قدیم طرز زندگی میں مغربی تمدن کی اشاعت کو بڑھا رہی ہے لہذا وہ مجنونانہ طرز پر اس کے خلاف ردّ عمل کرتے ہیں۔ ہر نئی بات پر جس کو مستعمرات کے عمال جاری کرتے ہیں کورانہ مخالفت پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً چیچک کے جبریہ ٹیکہ کی الجزائر کے باشندوں نے مدتوں سخت مخالفت کی۔ فرانسیسی حکام نے بتایا کہ چیچک جو اس وقت بہت زور سے پھیلی ہوئی تھی نہایت تیزی سے بند ہو رہی ہے۔ دیسیون نے جواب دیا کہ ہماری رائے میں ہمارے نامرد بنانے کی یہ عیارانہ ترکیب ہے۔ تاکہ فرانسیسی نوآبادیوں کے لئے جگہ ہو جائے۔ اسپر حکام نے مردم شماری کے اعداد کو بتایا کہ دیسی عدیم المثال طور پر بڑھ رہے ہیں۔ دیسیون نے اپنے کاندھے اوچکا دئے اور جدید کی مخالفت جاری رکھی۔

اس کل معاملہ کا ایک فرانسیسی مصنف نے جو اسلامی دنیا سے خوب واقف ہے خوب خلاصہ کیا ہے۔ لوی برتراند کہتا ہے "دراصل یہ سب اقوام چونکہ اپنی روایات و رسومات اور رمز بوم کے لحاظ سے ہمارے معاشرتی نصب العین کے مطابق زندگی بسر کرنا نہیں چاہتے لہذا وہ ہماری پولس اور ہماری حکومت کے قیود کو، مختصر یہ کہ کسی قسم کی باضابطہ گورنمنٹ کو خواہ وہ کتنی ہی منصف اور ایماندار کیوں نہ ہو برداشت کرنے سے نفرت کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ بدنظمانہ اور تکلیف دہ مظالم سے خلاصی پاکر یہ باطنی طور پر کم و بیش ہمارے اوارہ گردوں کی طرح رہجاتے ہیں اور ہمیشہ محتسب سے بچنے کی امید لگائے رہتے ہیں ہم شمالی افریقہ کے عربوں کو یہ فضول جتاتے ہیں کہ فرانس کی حفاظت کا مشکور ہونا چاہئے۔ جس کی بدولت ان کو نہ تو مطلق العنانا

دربار بھی رکھتا تھا۔ اور ہر درباری اپنے آقا کے اختیارات وتعیش، و خوشامد میں شریک تھا۔ اختیار تو موت وزیست کے تھے، اور تعیش میں حسب دلخواہ ہر عورت کی مقاربت شامل تھی۔ اور خوشامد تو جیسا میں نے بیان کیا ہے تقریبًا مذہبی عبادت تھی۔[۹۱]

لیکن یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اُن غربا کی بابت کیا ہے جنہیں ان متوہم مطلق العنانوں کا نظام لوٹتا تھا، ان سب باتوں سے اسکو کیا نفع ہے؟ اکثر حالتوں میں انکا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ لیکن فائدہ ہونے کا امکان تو تھا۔ قدیم مشرق میں حیات کے بڑی بازی تھی۔ ہر شخص کتنا ہی غریب کیوں نہو اگر کسی بڑے آدمی کو خوش کر لیتا تھا تو دفعتًا شہرت اور ثروت کو پہنچ جاتا تھا۔ اور یہی وہ بات ہے جو مشرقی طبقوں کو بہت بھاتی ہے۔ کیونکہ مشرق میں "قسمت" اور متلون المزاجی کو اس امن وامان کے مقابلہ میں جس کی مغرب میں قدر ہوتی ہے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ مشرق میں مرغوب قصص وہ ہیں جن میں فوری اور حیرت انگیز طور پر قسمت پلٹنے کا ذکر ہے۔ یعنی وزیر سے فقیر اور فقیر سے وزیر ہو جاتے ہیں۔ اور یہ سب ایک ہی رات میں ہو جاتا ہے۔ اکثر مشرقیوں کو اب تک زندگی کی بے ثباتی اور صاحب جاہ کی ہنگامی حمایت ہی میں نہ کہ ایمانداری اور باقاعدہ محنت کے یقینی انعامات میں لطف زندگی ہے۔ ان تمام امور سے مشرق کی زندگی سب کے لئے بیحد دلچسپ تھی۔ اور یہ قماربازی کا لطف ہی ہے جس کو مغربی تہذیب کی ترویج کم وبیش مٹا رہی ہے۔ چنانچہ ایک انگریز مصنف موجودہ مصر کی بابت بجا طور پر لکھتا ہے "ہماری حکومت کامل ہو مگر مشرقی اُسے غیر دلچسپ پاتا ہے۔ قدیم نظام بوسیدہ جامد تھا لیکن وہ بھڑک دار تھا۔ اس کا انقلاب ہی دلفریب تھا۔" ایک مصری نے ایک انگریزی حکومت کے حامی سے کہا "ہاں! لیکن قدیم زمانہ میں اگر کوئی فقیر جو دروازوں پر بیٹھتا تھا کسی بیگم خاتون کی نظر میں پسندیدہ معلوم ہونے لگتا تو دوسرے ہی دن بڑا آدمی ہو جاتا تھا"۔

اور یہ کہ باضابطہ ہستی کا خیال اُن کے دماغوں میں نہیں سمایا ہے"[1]

جو ہم نے اوپر لکھا ہے بلاشبہہ وہ جاہل عوام پر صادق آتا ہے - یہ دماغی میلان مشرقی اقوام کے سب طبقات میں کم و بیش مشترک ہے - صدیوں کے عادات آسانی سے نہیں بدلتے - درحقیقت یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ اعلےٰ طبقات عیر مرسہ مشرق کی تنومند ذاتی آزادی سے پورا نفع اٹھاتے تھے اور یہ کہ اسی وجہ سے اگرچہ وہ مغربی تہذیب کے اشاعت کی قدر کو خوب سمجھتے ہیں لیکن ایک طور پر انہیں کو سب سے زیادہ نقصان ہوا ہے[2]

فی الواقع سب مشرقیوں، اعلےٰ اور ادنےٰ ہر دو کے لئے "زریں عہد قدیم" یکساں طور پر دلفریب تھا اور اسکے لئے وہ نہایت رنج و غم سے تاسف کرتے ہیں - امراو پادشاہ اور درباریوں کے لئے زندگی حقیقتاً ایک مشرقی جنت تھی یہ یقینی بات ہے کہ اگر کسی وقت پر اپنے رقیب بادشاہ سے شکست کھا کر مار ڈالا جائے اور بادشاہ کو اس کے مالک کے حکم سے پھانسی دی جائے - اور درباری کسی ذرا سے شک پر گرفتار مصائب ہو - لیکن تاہم یہ اچھی اور خوب زندگی تھی ان میں سے ہر ایک اپنی مختص خصوصیات اور اپنی ابنائے وطن میں مختص شہرت رکھتا تھا اور ہر ایک کی وہ حیثیت تھی جو یورپ میں آج کوئی پیدا نہیں کر سکتا - اس حیثیت کے لحاظ سے وہ قانونی پابندی سے آزاد تھا اور اپنی مرضی کے مطابق برے اور اچھے کام کر سکتا تھا - اور ہر روز، ہر وقت اس کی ایسی خوشامد کی جاتی تھی جو ایشیاء کے لئے مختص ہے - یعنی محض اشارہ پر وہ ارادتمندانہ اطاعت جو پرستش کی مانند ہے اور اپنی ممدوح کے لئے سب سے زیادہ مدہوش کن فرحت ہے - ہر ایک اپنی تابعین کا ہیرو تھا

---

[1] برٹرانڈ کی کتاب مشرقی سراب صفحات ۱۱۲ مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۱۰ء [2] اس مسئلہ پر ملاحظہ ہو مسٹر ... کا نہایت دلچسپ مضمون موسومہ ایشیائیوں کو ایشیا کی دلفریبی جو اس کی کتاب ایشیا و یورپ کی صفحات ۱۱۰ لغایت ۱۲۸ پر درج ہے - مصنف

اتنی عزیز چیزوں کے نقصان کے خوف سے رنجیدہ و غضبناک ہو کر یہ تعجب خیز نہیں ہے کہ اکثر مشرقی قدامت پسند ماضی کو ایسا زرّیں عہد سمجھتے ہیں جو ہر اس چیز سے جو مغرب پیدا کر سکتا ہے بہت رفیع ہے۔ اور اس میں بہت سے پہلے کے آزاد خیال ہم آہنگ ہیں جو مغربی تہذیب کی شعبدہ بازی سے رہا ہو کر ردّ عمل سے ہم آغوش ہو رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہر مغربی شئے سے نفرت ہے جو بعض اوقات نہایت غلو کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لوئی برتراند کہتا ہے "قاہرہ کے مقام ایک لکچر میں جس میں میں موجود تھا لکچرار نے دعویٰ کیا کہ اس امر کو پیش نظر رکھ کر کہ از منہ متوسطہ سے لیکر سنہ ۱۷۹۳ء کے انقلاب تک جن مصلحین نے فرانس کی آزادی کے واسطے کوشش کی ہے یعنی فرقہ ایلبی جنیسس[51] پیروان والڈو[52]۔ پیروان کالوین[53] اور کمیاڈ[54] غالباً عربوں کی اولاد سے تھے۔ فرانس (۱) اپنی تہذیب و علوم (۲) نصف اپنی لغات (۳) اور اپنے باشندوں کے دماغی اور خصایصی خوبیوں کے لئے اسلام کا مرہون منت ہے۔ اسے تو یہی کہینگے کہ فرانس کا مراکش سے الحاق کلی ہوا اسی تعانہ میں پر جوش مصری قوم

---

[51] ایلبی جنیسس سنہ ۱۲۰۰ء کے قریب جنوبی فرانس کا ایک مذہبی فرقہ اس نام سے موسوم ہوا۔ مشرقی و مغربی نصرانی دنیا میں جو تحریک آئمہ مذہب کے تقدس کے خلاف شروع ہوئے اس کی شاخ یہ فرقہ بھی تھا۔ انکے صحیح عقاید معلوم نہیں ہیں لیکن یقینی بات ہے کہ یہ فرقہ کیتھولک فرقہ کے نظام اصطباغ و عشاء ربانی وغیرہ کا منکر تھا اور پادریوں کی خرابیوں کی بالاعلان مذمت کرتا تھا۔ یہ فرقہ مانی کے الحاد و مسئلہ اہرمن و یزداں سے متاثر تھا۔ انہیں سے اکثر فرقہ کتھاری سے تعلق رکھتے تھے۔ سینٹ برنارڈ اور سینٹ ڈومینیک نے ان کی اصلاح اور راہ راست پر لانے کی کوشش کی اور بالآخر تیرھویں صدی میں محکمہ احتساب نے نہایت ظلم کے ساتھ ان ملاحدہ کا استیصال کیا۔

[52] والڈو۔ پیٹر والڈو لیانس کا ایک متمول تاجر تھا جسنے سنہ ۱۱۷۰ء میں (بقیہ برصفحہ ۱۴۶ ملاحظہ ہو)

اور پر خطر ماضی کے لئے قدرتی اور لازمی افسوس ہے جبکہ انصاف کے بجائے طرفداری تھی اور زندگی کے نشیب و فراز یعنی حضرت یوسف علیہ السلام، ہارون الرشید اور اسمٰعیل[1] پاشا کے زمانہ کے مصر کے لئے افسوس ہے - ہم نے چمکیلے کپڑے پر مشکلات کا کوٹ پہنا دیا ہے[2]"

---

[1] اسمعیل پاشا ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۵ء میں وفات پائی - یہ محمد علی بانی خاندان خدیویہ کا پوتا ہے - اس کے عہد میں مصر بالکل سلطنت سے علیحدہ ہو کر آزاد ہو گیا اپنے دادا کی طرح اس نے بہت سے اندرونی اصلاحات شروع کیں سڑکیں بنائیں ریلیں نکالیں وغیرہ - اس نے سب سے بڑا کام جو کیا وہ نہر سوئز کی تعمیر تھی - لیکن اپنی اسراف اور قبل از وقت اور غیر ضروری صنعت و حرفت کے کام جاری کرنے سے مالی مشکلات میں مبتلا ہو گیا اور رعایا پر نہایت سخت محاصل قایم کر کے خود ملک مبتلائے عذاب کر دیا ان دقتوں کی وجہ سے اسے نہر کے حصص گورنمنٹ برطانیہ کے ہاتھ فروخت کرنے پڑے - ان اسرافات کی بدولت انگریزی اور فرانسیسی تسلط شروع ہوا - ۱۸۷۹ء میں سلطان ترکی کے حکم سے معزول ہوا اور اس کا لڑکا توفیق پاشا جانشین ہوا - مترجم

[2] ہیج اسپنڈر کا مضمون "انگلستان، مصر و ترکی" جو اکتوبر ۱۹۲۶ء کے کنٹمپریری ریویو میں شائع ہوا - مصنف

الحمرا[51] کے مرصع کاردالانوں میں مغربی اسلام کی تباہ شدہ سطوت پر غور کرتے ہیں[52]۔

اس زریں عہد کے درسگاہ میں فرقہ ہنود کی تعلیاں اور بھی حیرت انگیز ہیں۔ یہ ہندو مجاذیب بلند پروازی میں اپنے مسلمان بھائیوں سے کہیں بڑھے چڑھے ہیں۔ ان کا نہایت متانت سے دعویٰ ہے کہ ہندوستان کل مذاہب حقہ، فلسفہ، شائستگی، تمدن، علوم و ایجادات اور ہر شئے کی تربیت گاہ و مخزن ہے۔ اور وہ یہہ بھی کہتے ہیں کہ جب ہندوستان کا موجودہ قابل افسوس گرہن چھوٹ جائیگا (یہ گرہن بلاشبہہ بالکل انگریزی حکومت کی بدولت ہے) تو وہ پھر کل عالم کی نجات کے لئے نہایت شان سے نمودار ہوگا۔ اس پرانے مقولہ کو کہ زیر آسمان کوئی جدید شئے نہیں ہے پورے طور پر استعمال کرکے انکو ویدون اور دیگر کتب مقدسہ سے اس امر کی ناقابل تردید" شہادت "ملتی ہے" کہ قدیم ہندو رشی ہمارے کل جدید خیالات سے حتےٰ کہ طیارون اور بم کے گولے پھینکنے' اور اقوام لیگ جیسے مخترعات سے بھی واقف تھے[53]۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۴۶) یہ عربی سلطنت کا پایۂ تخت اور تیرھویں صدی میں فنون لطیفہ و تجارت کا بڑا مرکز تھا عربی سلطنت کی تباہی کے بعد صرف یہی مقام مسلمانوں کا مامن تھا لیکن اسپین والوں نے ۱۴۹۸ء میں اس کو بھی فتح کرلیا۔ اور عربوں کی ہستی کو ملک سے فنا کردیا۔ مترجم

[51] الحمرا غرناطہ کے قصر شاہی کا نام ہے اور تفصیلی حالات بلگرامی کی کتاب تمدن عرب میں درج ہیں۔ مترجم

[52] برٹرانڈ کی کتاب صفحہ ۲۰۹ و ۲۱۰۔ مصنف

[53] اہل ہنود کی اس طرز عمل پر بحث کیلئے ملاحظہ ہو ڈبلیو آرچر کی کتاب "ہندوستان اور مستقبل" مطبوعہ لندن ۱۹۱۸ء نیز گیگ اور فیرس کی کتاب "ہندوستان کی کشمکش" مطبوعہ لندن ۱۹۲۲ء نیز ملاحظہ اہل ہنود کے اسی قسم کی تصانیف یعنی ایچ جیترا کی کتاب "مذہب ہنود یعنی عالم کا نصب العین" مطبوعہ لندن ۱۹۱۱ء۔ اے کمارسوامی کی کتاب "شیوجی کا رقص" مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۸ء۔ ایم۔ این۔ چٹرجی کا مضمون "دنیا اور جنگ ثانی" جو اپریل ۱۹۱۶ء کے جرنل آف ریس ڈیولپمنٹ میں شائع ہوا۔ مصنف

پرستوں کی عادت ہو گئی ہے کہ وہ اسپین جا کر یا تو اشبیلہ[۵۵] القصر[۵۶] کے باغوں میں یا غرناطہ[۵۷] کے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۴۵) اپنے مال و اسباب کو راہ خدا میں لٹا دیا اور جگہ بجگہ فقر و افلاس میں بسر کر نیکی تبلیغ کرنے لگا اس کے متقلدین جو لیانس کے ناوار کہلاتے تھے کوئی ایلپ کی وادیوں میں منقسم ہوئے انہوں نے صرف اناجیل سے سند لی اور رومی کلیسا کی اقتدار کی تہجین کی۔ ابتدا میں انہوں نے مختص پادریوں کے نظام کے ماننے سے انکار کیا اور ہر کس و ناکس کو عشائے ربانی کی ادائیگی کی اجازت دی۔ ان کی تکفیر ہوئی اور مورد مظالم ہوئے لیکن جنوبی فرانس اور جرمنی میں یہ عقاید اشاعت پاتے رہے ڈیوک آف سیوائے پوپ اور فرانسیسیوں نے ان کی استیصال کی ہر امکانی کوشش کی۔ کچھ عرصہ کے لئے انگریزوں نے انکی مدد کی اور بالآخر ۱۸۴۸ء میں کامل مذہبی اور سیاسی حقوق مل گئے۔ مترجم

۵۳ کالوین۔ جان کالوین پروٹسٹنٹ مصلح تھا جو ۱۵۰۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۶۴ء میں مرا۔ یہ رومن کیتھولک تھا اور ۱۵۲۱ء میں اپنے وطن نوئیاں کا چیپلین مقرر ہوا اور ۱۵۲۷ء میں کیوریٹ ہو گیا۔ ایک سال بعد اسنے کلیسا کو ترک کرکے قانون پڑھنا شروع کیا۔ اسی زمانہ میں اسنے میلسیو وولر سے یونانی زبان سیکھی اور اصلاحی اصول سے واقفیت حاصل کی۔ ۱۵۳۱ء میں وہ پیرس واپس آیا۔ اور نئے مذہب کی تائید میں سینکا کی کتاب دی کلیمنشیا کی تفسیر لکھی۔ جب پروٹسٹنٹ فرقہ پر ظلم و جبر شروع ہوئے تو یہ باسل کو فرار ہو گیا اور ۱۵۳۶ء میں جنیوا میں سکونت پذیر ہو کر اپنی کتاب ایک پروٹسٹنٹ کا اقرار ایمانی شائع کی جس سے اخلاقی حالت بہت اچھی ہو گئی۔ اسکا زمانہ زیادہ تر مباحث میں گذرا۔

۵۴ کمیارڈ۔ چونکہ انکی وردی سفید قمیص تھی اسلئے اس نام سے موسوم ہوئے۔ سیوین کے کاشتکاران جو پروٹسٹنٹ تھے اور ہیوگو ناٹ کہلاتے تھے انہوں نے احکام نانٹس کی منسوخی پر بغاوت کی اور بوجہ اپنی قمیص کے اس نام سے مشہور ہوئے

۵۵ اشبیلیہ۔ جسکو انگریزی میں سیویل کہتے ہیں۔ یہ اسپین کا جنوبی صوبہ ہے اور اسمیں دریائے وادی الکبیر بہتا ہے آغاز آٹھویں صدی میں اسکو عربوں نے فتح کیا۔ اور فرڈیننڈ سوم نے ۱۲۴۸ء میں اسکو عربوں سے فتح کیا۔ مترجم

۵۶ القصر عربوں کی عہد کے شاہی محلات واقعہ اسپین ۵۷ غرناطہ اسپین کا جنوبی صوبہ (بقیہ نوٹ بر صفحہ ۱۴۷)
مترجم

احیاء مشرق کے لئے ایسا ہی ضروری ہے جیسی کہ مشرق کی موجودہ پستی کے لحاظ سے لازمی ہے لیکن یہ کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو بلاشبہ سخت اشتعال کا باعث ہے یہ یورپی ہر چیز میں گڑبڑ کرتے ہیں۔ رسومات میں ترمیم، معیار زندگی میں ترقی کرتے ہیں۔ شہروں میں علٰحدہ محلے بناتے ہیں۔ اور ان محلوں کو گویا "خارج از حدود شہر" آبادیاں سمجھتے ہیں جو مقامی قانون اور رسمی ضابطوں سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ وسط قاہرہ میں ایک انگریزی شہر تعمیر ہوتا ہے اور عربی الجزائر میں "پیرس کو چلک" ڈیبل ہے۔ اور یورپی پیرا ترکی استنبول کے مقابلہ میں گستاخانہ جلوہ افروزی کر رہا ہے۔

ہندوستان کا تو یہ حال ہے کہ اس میں جا بجا برطانوی مقبوضات قائم ہیں۔ بڑی بڑی نسبتاً نسی شہر یعنی کلکتہ، مدراس، بمبئی، یورپی شہر ہیں جو ہندوستانی زمین پر تعمیر کئے گئے ہیں۔ کل نمایاں عمارات یورپی ہیں۔ اگرچہ بعض نئی عمارات میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ "ہندی و عربی" طرز تعمیر کو اختیار کیا جائے۔ باقی تو سڑکوں کے نام بھی انگریزی ہیں۔ عموماً یہ کسی وائسرائے، گورنر یا اس سپاہی کے نام سے موسوم ہیں جنہوں نے ملک کو فتح کیا یا غدر کو فرو کیا۔ ان بہادروں کی یادگاریں ہر جگہ پر ملتی ہیں۔ دوکانیں بھی انگریزی ہیں۔ جن میں یورپی یا یوریشین معاونین انگریزی سامان کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ انگریزی گاڑیاں اور موٹریں قدیم انگلستان کی چست اور روغندار سڑکوں پر دوڑتے ہیں۔ ہر جگہ پر اس کی شہادت ملتی ہے کہ یہاں تک آب و ہوا نے اجازت دی ہے انگلستان کے حالات زندگی کو پیدا کرنے کی مبتلا کوشش کی گئی ہے۔ ہندوستانی آبادی تقریباً کل کے کل محلوں کے پس پشت ڈال دی گئی ہے۔ (اگر ان کو غرباء کے محلے نہ کہا جائے) مدراس میں ایسے حصے کو بالاعلان کالا شہر کہتے ہیں۔

ماضی کی یہ سب مبالغہ آمیز تعلیاں بیکار ثابت ہونگی۔ مغرب کی طرح مشرق بھی اپنی مختص خوبیاں رکھتا ہے۔ لیکن مشرق کے خاص عیوب بھی ہیں۔ اور یہ عیوب ہی ہیں جو گزشتہ ہزار سال سے خوبیوں پر چھا گئے ہیں۔ جنکا نتیجہ پستی و جمود و کمتری ہے۔ آج مغربی اثرات کے جاری و ساری ہونے سے مشرق کا احیا ہو رہا ہے اس کا نتیجہ یہ کبھی نہ ہوگا کہ مغربی تمدن کی تکمیل اشاعت اس مفہوم میں ہو کہ مشرق کی یکسر قلب ماہیت ہر شئے کی نقل اتار کر ہو جائے۔ مشرق ہمیشہ اصلاً بذاتہ قایم رہیگا لیکن یہ ایک جدید ہستی ہوگی جو مغربی خیالات کی صحیح طور پر سرایت کرنے کا نتیجہ ہوگی مخالفین اس عمل میں صرف تعویق پیدا کر سکتے ہیں اور اس طور پر مشرق کی پستی و کمزوری کی مدت کو دراز کر سکتے ہیں۔

بایںہمہ اگرچہ انقلاب پسندوں کا طرز عمل غیر دانشمندانہ ہے لیکن قابل فہم ہے۔ مغربی تمدن کی ترویج سے بہت سے عزیز حمایات اور عطا شدہ مفاد کو ایسا نقصان پہونچتا ہے کہ قدیم مفادوست لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہے اگر مغربی اثرات میں سب خوبیاں ہی ہوتیں۔ اور مغربی بالکل فرشتے بھی ہوتے تو بھی یہی مخالفت ہوتی لیکن فی الحقیقت مغربی تمدن کی ترویج کا تاریک پہلو بھی ہے۔ اور مغربی تمدن کے حاملین محض ایثار نفس کے روح سے زندہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے بعض اغراض بہت ہی رکیک ہیں۔ اس سے مشرقی انقلاب پسندوں کو امداد ملتی ہے اور اخلاقی ضرورت کی آڑ ملجاتی ہے۔ ہر انقلابی عمل بالخصوص اقتصادی اور معاشرتی امور کے انقلاب نہایت تکلیف دہ قسم کے ہوتے ہیں۔ ان تکالیف کے علاوہ اور بہت سے ضمنی اجزا ہیں جو نہایت اشتعال انگیز ہیں۔

ابتدا ہی سے لیجئے۔ یورپیوں کی محض موجودگی اور ان کی قوت و ترقی کا علانیہ تفوق ہی ایک مستقل سوہان روح اور ذلت ہے۔ یہ یورپیوں کی جسمانی موجودگی غالباً

میں حکمرانی ہی کرتا ہے۔ اور جب تک وہ یہاں رہے گا انصاف اور اعتدال کے ساتھ حکومت ہی کرتا رہے گا۔ اور جوں جوں مشرقی ترقی کا حامل اور آنا و خیالی سے اختیارات کو استعمال کرنے کا اہل ہوتا جائے گا اس کو اختیارات عطا کرنے کا مدبرانہ خیال رکھے گا مگر ان سب پر بھی وہ حکمران ہی رہے گا۔ جس جس جگہ مغربیوں نے اپنا سیاسی تسلط قایم کیا ہے اس کو دو ہی چارہ کار ہیں یعنی یا تو حکومت کرے یا چلا جائے مزید براں اپنی دوران حکمرانی میں مغربی کو اپنے نقطہ نظر سے حکومت کرنا ہے مقامی رسومات کا لحاظ رکھ کر بھی وہ آخر کار مغربی حکمراں کی طرح عمل کرے گا نہ کہ مشرقی حاکم کی طرح۔ لارڈ کرومر اپنے ان الفاظ میں سب مستعمرات کی حکومتوں کے دل کی بات بیان کرتا ہے "مشرقی اقوام پر حکمرانی کرنے میں اول خیال یہ ہونا چاہئے کہ اُن کی بہبودی کس چیز میں ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا لحاظ رکھا جائے کہ وہ اپنے لئے کیا اچھا تصور کرتے ہیں"[1]

یہ سب امور لازمی اور بدیہی ہیں۔ باوجود ان سب باتوں کے امر واقعہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ روشن خیال مشرقی بھی اسے تلخ مگر صحت بخش دوا سمجھتا ہے اور اکثر مشرقی اسے آپسند ریزہ اور ناقابل برداشت سمجھتے ہیں۔ اور یہ یہ ان کی خوبیاں ہی ان کی غیر سہرول عزیزی کا باعث ہیں۔ میریڈ تھ ٹاؤنسنڈ نے اس کو خوب بیان کیا ہے "ایشیا میں یورپی ایسا شخص ہے جو اپنے پڑوسی سے کھانا کھانے کے بعد ہی کام کرنے پر اصرار کرتا ہو اور جب وہ نیم بیدار ہوتا ہو تو اس سے ہوشیار ہونے کو کہتا ہو۔ اور جب وہ تفریح کرنا چاہتا ہو تو وہ جلدی کرنے کو کہتا ہو۔ وہ ایشیا میں حکمراں ہے۔ اور اسی کے مطابق اس سے محبت کیجاتی ہے۔[2]

---

[1] کرومر کے "سیاسی اور ادبی مضامین" صفحہ ۲۵ - مصنف

[2] ٹاؤنسنڈ کی کتاب "ایشیا و یورپ" صفحہ ۱۲۸ - مصنف

چند ہی امور ایسے ہیں یعنی کلب اور جمخانے جو خاص اسی غرض کے لئے بنائے گئے ہیں جن میں انگریز مرد اور عورتیں ہندوستانی متمول مرد اور عورتوں سے معاشرتی مساوات کے اصول پر ملتے ہیں ۔ لیکن ایشیائی قصبات اور ان یورپی شہروں کے درمیان جو برتر طور پر تعمیر کئے گئے ہیں بہت ہی کم نقاط اتصال ہیں ۔ پادری یا ملکی فوج کے کارکن یا استلاشی تماشائیوں سیاح بازار چلا جائے لیکن یورپی جماعت من حیث الجماعت اپنے گرد و پیش کے بہو رنے مجمع کے بابت اس سے زیادہ پرواہ نہیں کرتے جس قدر کہ ایک جزیرہ کے باشندے ان مچھلیوں کی پرواہ کرتے ہیں جو محیط سمندر میں رہتی ہیں[1]

جو بات نئے بڑے شہروں کی ہے وہی بیسیوں صوبجات کے مراکز "مقامات" اور چھاونیوں پر صادق آتی ہے گو پیمانہ کم ہو لیکن نمونہ ایک ہی ہے ۔

اس طرح مشرق میں یورپی ہر طرح بالکل اجنبی ہے جو شہروں کے قلب میں رہ کر بھی دیسی زندگی سے الگ تھلک رہتا ہے ۔ اور یورپی محض غیر مربوط اجنبی ہی نہیں ہے بلکہ وہ حکمران اجنبی بھی ہے ۔ ہمیشہ اس کا طرز عمل ایک برتر اور آقا کا سا ہے۔ یہ طرز عمل سببیت یا تکبر کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ حالت اقتضاء کے وجہ سے لازمی ہے ۔ بلاشبہ بہت سے یورپی بدخلق ہوتے ہیں ۔ لیکن اس سے حالت کی اصلی حقیقت نہیں بدلتی ۔ اور یہ اصلیت یہ ہے کہ مستقبل کچھ ہو لیکن یورپیوں نے ابتداً مشرق میں اس لئے سکونت اختیار کی کہ اس وقت مغرب مشرق سے بہت آگے تھا ۔ اور آج بھی وہ یہاں اس لئے موجود ہے کیونکہ باوجود تمام جدید انقلابات کے مشرق ہنوز مغرب سے پیچھے ہے ۔ لہٰذا یورپی آج بھی مشرق

---

[1] آرچر کی کتاب صفحہ ۱۱ و ۱۲ ۔ مصنف

مقام ہے پیروان اسلام صرف پانچواں حصہ ہیں۔ آخر بات یہ ہے کہ اگرچہ اسلام کے حدود زیادہ تر بھوری دنیا کی نسلی حدود پر منطبق ہوتی ہیں تاہم چند مقامات پر اسلامی حدود پھیلی ہوئی ہیں اور اسمیں مشرقی یورپ کی گوری اقوام اور مشرق اقصے کے اصلی زرد اور افریقہ کے سیاہ فام حبشی بھی شامل ہیں۔

ان جزوی ترمیمات کے بعد بھی "بھوری اقوام" اور "بھوری دنیا" کے مصطلحات ایسے صحیح حقایق کا اظہار نہیں کرتے جنہیں علوم اور سیاسات دونوں اصلاً صحیح تسلیم کرتے ہوں۔ بلاشبہ بھوری اقوام میں ایک اصلی تہذیب ہے۔ اگرچہ یہ تہذیب نازک اور غیر محسوس قسم کی ہے تاہم اس کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اور بعض اوقات یہ اہم طور پر ظاہر ہونے کے قابل ہے۔ اسکا نمایاں پہلو یہ ہے کہ تمام مشرق ادنے اور وسطے کی اقوام طبعی طور پر اسکا احساس کرتے ہیں کہ وہ ایشیائی بھائی ہیں۔ خواہ انکے اندرونی نزاعات کتنے ہی شدید کیوں نہوں۔ اس طبعی ایشیائی ہونیکے احساس کو مورخین نے دو ہزار سال قبل مشاہدہ کیا تھا۔ اور یہ آج بھی ایسا صحیح ہے جیسا کہ سابق میں تھا۔

انسانی تجربہ میں نوع انسان کی نسلی تقسیم سب سے زیادہ ضروری، مستقل اور لا ینفک ہے۔ یہ محض جسم انسانی کے مختلف رنگ نہیں ہیں یہ معاملات جیسے رنگ، قد، یا لون کی ساخت محض ان لازمی دماغی اور روحانی اختلافات کے ظاہری اور تمایلی علامات ہیں جو تباین طبایع اور تعصب العیز میں ظہور پذیر ہوتے اور تنوعات زندگی کے لاانتہا صورتیں متشکل ہوتی ہیں۔

ان اصولی نسلی تفریقوں میں سے ایک مشرق اور مغرب کے درمیان حایل ہے۔ عام مفہوم کے لحاظ سے مشرق ادنے و وسطے "بھوری دنیا" ہے اور یہی اس کے اور مغرب کے گوری دنیا کے درمیان مایہ الامتیاز ہے۔ فی الحقیقت نسلی اختلاط سے اسے مٹانے کی کوشش کرنا سب سے بڑی حماقت ہوگی۔ مشرق اور مغرب باہمی تبادلہ خیال و تبادلۂ علوم سے ایک دوسرے کی رفتار ترقی کو تیز کر سکتے ہیں۔ لیکن اختلاط خون سے ایک دوسرے کو

مزید براں مشرق میں یورپی نہ صرف بحیثیت حاکم اور مزاحم کے غیر ہر دل عزیز ہے بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ وہ ایک بالکل جداگانہ نسل سے ہے۔ نسل کا معاملہ بہت پیچیدہ[1] ہے لیکن اس کا اثر دور رس اور نہایت اہم ہے۔ مشرق ادنےٰ اور وسطےٰ کے اکثر اقوام جنسے ہماری موجودہ بحث متعلق ہے، جنس انسان کی اس نوع سے ہیں جو "بھورے" کہلاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ لفظ علم تشریح الاجسام انسانی کے لحاظ سے غیر صحیح ہے۔ علم تشریح الاجسام کے لحاظ سے ہم کوئی بیّن جماعت "بھورے" قسم کی جو "بھوری نسل" کہلائے ایسے نہیں قائم کر سکتے جیسا کہ یورپ کے "گورے" قسم کو "گوری نسل" اور مشرق اقصےٰ کے "زرد" منغولی قسم کو "زرد نسل" کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرق ادنےٰ اور وسطےٰ نسلی طور پر بڑی چکیاں یا بھٹیوں کا سلسلہ رہے ہیں جن میں فتوحات اور تبدیل سکونت کی وجہ سے جدید مختلف الاجسام عنصر ہمیشہ آتے رہے اور نہایت مختلف قسم کی نسلی اختلاط برابر ہوتے رہے چنانچہ آج مشرق ادنےٰ اور وسطےٰ کی اکثر اقوام زیادہ تر گوری ہیں۔ مثلاً ایرانی اور عثمانی ترک دیگر اقوام مثلاً جنوبی ہندوستان کے باشندے اور یمنی عرب زیادہ تر کالے ہیں۔ اور ہمالیہ اور ایشیائے متوسط کے اقوام زیادہ تر زرد رنگ کے ہیں پھر چونکہ بھوری نسلی ساخت کا ایسا نمونہ نہیں ہے جیسے کہ گورے اور زرد ساخت کے نمونے ہیں اسی طرح سے کوئی عام بھوری تہذیب بھی زرد اور گوری اقوام کی تہذیب کی طرح نہیں ہے۔ بھوری اقوام کا بڑا روحانی اتحاد اسلام ہے۔ لیکن ہندوستان میں جو بھوری آبادی کا خاص

---

[1] میں نے اس پہلو کی بحث اپنی کتاب "گوروں کی عالمگیر اقتدار کے خلاف رنگ کا اٹھنے والا طوفان" میں کی ہے۔ مصنف

بعد کے ان شورشوں کے مفصّل بحث فصول مابعد ہو گی۔ یہاں پر یہ بتا دینا کافی ہے کہ جنگ عظیم نے مشرق میں یورپی رعب و داب کو پارہ پارہ کر دیا۔ اور مغرب کی کمزوریوں کو مشرقیوں کے پیش نظر کر دیا۔ مشرق کے لئے یہ لڑائی بڑا نصاب تعلیم ثابت ہوئی ایک امر تو یہ ہے کہ لاکھوں مشرقی اور حبشی ایشیا و افریقہ کے دور دراز جنگلوں سے گوروں کی جنگ میں سپاہی اور مزدوروں کی حیثیت سے بھرتی کئے گئے۔ اگرچہ ان معاونین کی زیادہ تعداد تو آبادیات کے مہمات میں مصروف جنگ رہی۔ لیکن دس لاکھ سے زیادہ مشرقیوں کے قدم سرزمین یورپ میں گئے۔ یہاں انہوں نے گوروں کو مارا۔ فرنگنوں سے مسرت کی۔ گوروں کے تعیش کے لطف اٹھائے اور گوروں کی کمزوریوں کو معلوم کیا اور گھر جا کر سب قصے اپنے ملک والوں کو سنا سے[۱] ج ایشیا

(بقیہ نوٹ صفحہ) شورشیں مزید انقلابات کا پتہ دیتی ہیں۔ قابل اطمینان امر یہ ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ کو اس حالت کا کامل احساس ہے اور اس کی کوشش ہے کہ یہ منافشات بہ آسانی طے ہو جائیں جیسا کے مصنف نے فصل قوم پرستی کے آخرین پیراگراف میں اظہار کیا ہے (مترجم)

[۱] ایشیا و افریقہ پر جنگ کے اثر کی بابتہ ملاحظہ ہو اسے ڈیمانژیون کی کتاب "انحطاط یورپ" مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۲۰ء - ایچ - ایم - ہائنڈمین کی کتاب "بیداری ایشیا" مطبوعہ نیو یارک سنہ ۱۹۱۹ء - اے - ڈی موریل کی کتاب "سیاہ رنگ والوں کا بار" مطبوعہ نیو یارک سنہ ۱۹۲۰ء - الف - بی فشر کی کتاب "ہندوستان کا خاموش انقلاب"

مطبوعہ نیو یارک - مصنف

سنہ ۱۹۱۹ء -

سمجھکر تباہ کرنا شروع کیا انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ گوری نسل کے اتفاق میں ایسی اخلاقی اور سیاسی خلیج پیدا ہوگئی جو خود گوروں کی بیان کی بموجب کبھی نہ بھر سکیگی۔ مشرقیوں کے نظر میں اس جنگ کی تلافی آزادانہ نظام عمل تھا۔ جس کو اتحادی مدبرین سے اپنے پرچموں پر ثبت کیا تھا۔ لیکن جب جنگ ختم ہوئی اور اتحادیوں کو فتح حاصل ہوئے تو فوراً ہی پتہ چل گیا کہ عین اس وقت میں جبکہ اتحادی لیڈر آزادی کے دعاوی سے لبریز تقریریں کر رہے تھے تو اسی کے ساتھ وہ تجزیہ مشرق ادنے کے لئے آپس میں نہایت حریصانہ ملک گیری کی خاطر متعدد خفیہ عہدنامے طے کر رہے تھے۔ خاتمہ جنگ کی مجلس صلح میں آزادی کی تقریریں نہیں بلکہ یہی خفیہ عہدنامے تھے جن کے بنا پر مشرقی ممالک کی قسمت کا فیصلہ ہوا۔ اور جس کا نتیجہ کم از کم تحریریں تو یہ ہوا کہ کل مشرق ادنے اوسطے یورپ سیاسی تسلط کے تحت میں آگیا۔

اس پر غیظ و غضب کا سیلاب مشرق میں امڈا وہ قبل از جنگ کے احتجاجات کی طرح محض اظہار خشم و ناراضی تک ہی محدود نہ رہا۔ اس میں فوری منفاومت اور بغاوت کی آہنگ جو پہلے نہ سنائی دی تھی، موجود تھی۔ یہ باغیانہ جوش جنگجویانہ عمل کی صورت میں متبدل ہوگیا جس کے بدولت دول یورپ کو اپنے بعض انتہائی مطالبات مجبوراً کم کرنے پڑے اور دیگر مطالبہ جات میں مستقبل قریب میں یقیناً تخفیف کرنا ہوگی[۵۷]۔ جنگ کے

---

[۵۷] اس پیشگوئی کی بہترین تصدیق واقعات حاضرہ سے ہوتی ہے فرانسیسیوں کو سلیشیا سے دستبردار ہونا پڑا اور حلقہ اثر یوالیشیا (کو چک کے بعض حصص پر مشتمل تھا غائب ہو گیا اتحادیوں نے جنگ عظیم کے بعد قسطنطنیہ وغیرہ پر جو قبضہ کر رکھا تھا وہ تو صلح وران سے مٹ ہی گیا۔ مزید براں وہ سیاسی مراعات اور ترکی قوم کی تذلیل جو سالہا سال سے دول یورپ نے کر رکھی تھی وہ بھی جاتی رہی بشام و فلسطین و جزیرۃ العرب اور عراق کی (بقیہ نوٹ پر صفحہ ۲

کہ ٹھیک اسی زمانہ میں کہ مشرق اقصیٰ نے یورپی تعدی کے خلاف کامیاب مقاومت کی مشرق ادنیٰ اور وسطیٰ مغربی ظلم و تعدی کی عدیم المثال سختی کا شکار رہا۔ ہم نے اُن اسلامی دنیا کے غضب ناک احتجاجات اور غیر معمولی اخلاقی استحکام کا ذکر کیا ہے جو ان مغربی حقیقی سیاسی چالوں کے ظاہر ہونے پر ہوا۔ یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اس معاندانہ طرزِ عمل میں فی الواقع جاپان کی ہمت افزا مثال کا کہاں تک اثر تھا۔ بلاشبہ ہمارے مغرب کے عالی حامیان شہنشاہیت ۱۹۱۱ء کے درمیانی قرن میں ایک خطرناک چال چل رہے تھے۔ چنانچہ ارمینیس وامبیری نے طرابلس پر اطالوی حملے کے بعد لکھا ہے "جتنا جتنا دنیائے قدیم میں مغربی اقتدار اور اختیار قایم ہوتا جاتا ہے اُتنا ہی ایشیاء کی منفرد فرقوں میں اتحاد اور باہمی مفاد کے تعلقات مستحکم ہوتے جاتے ہیں۔ اور یورپ کے خلاف آتشِ نفرت زیادہ مشتعل ہوتی ہے کیا یہ مقتضائے عقل اور تقاضائے ضرورت ہے کہ بے موقع اشتعال اور غیر ضروری حملوں سے خصومت کے جذبات کو ترقی دی جائے۔ اور دنیائے جدید کی اوپر شش کے زمانہ کو قریب تر لایا جاوے اور تمدن جدید کے شیوع کا جو کام آج کل ایشیا میں جاری ہے اُسے قبل از وقت ختم کر دیا جاوے[۱۵]۔

جنگ عظیم نے اس نازک حالت کو نازک تر کر دیا۔ اہل مشرق نے دفعتاً دیکھا کہ اقوام یورپ جو نسلی معاملات میں اب تک ایک قسم کا اتحاد باہمی قائم کئے ہوئے تھیں ایک خونخوار اور خونریز اور مرگ و زیست کی فیصلہ کن جنگ میں مصروف اور دست بہ گریباں ہو گئے۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ انہی اقوام نے ایک دوسرے کو جانی دشمن

---

[۱۵] اے۔ وامبیری کا مضمون "مسلمانان اور یورپ کی مخاصمت" جو اپریل ۱۹۱۲ء کی رسالہ نائن ٹینتھ سینچوری اینڈ افٹر میں شائع ہوا۔ مصنف

ہوگئی ہے۔ اور بالآخر صدیوں کی خواب کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جس میں
زندہ رہنا اچھا تھا" کیونکہ تاریخ دنیا کے کتاب میں جدید فصل لکھی جا رہی تھی۔[1]

بلاشبہ جنگ روس وجاپان نے اس روح کو پیدا نہیں کیا۔ بلکہ اس
کی اصل قرون ماسبق کے مروجہ دقیق انفعالات سے پیدا ہوئی۔ جنگ روس وجاپان خود
اعتمادی کے اس دل خوش کن لہر کا جو سنہ ۱۹۰۵ء میں ایشیا و افریقہ میں پھیل گئی، بجائے
سبب ہونے کے محض محل اظہار تھا۔ لیکن وہ خیالات جو لاکھوں مشرقیوں کے
دماغوں میں لامعلوم طور پر پیدا ہو رہے تھے متشکل اور عیاں ہوگئے۔ اور یہ اس
طور پر ان قوتوں کے انضباط کے لئے جو احیاء مشرق کے لئے سرگرم عمل تھیں
ہاتھ کا اشارہ تھے۔

مزید براں اس جدید مزاج نے اُن جدید مغربی تعدیات کے سلسلے کی بابت
جو اس زمانے میں شروع ہوئیں۔ مشرقی طرز عمل پر گہرا اثر ڈالا یہ عجیب بات ہے کہ

---

[1] ریوینڈ سی۔ ایف۔ اینڈ رُوز کی کتاب "ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ" صفحہ ۴ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۲ء
مشرقی اقوام پر جنگ روس کا جو اثر ہوا اس کی حالات کے متعلق ملاحظہ ہوں اے ایم۔ لو کا مضمون "مصری قومیت" جو
اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء کے رسالہ دی قوم میں شائع ہوا۔ ایف "مانشتیل" کا مضمون "جاپان اور اسلام" جو نومبر سنہ ۱۹۰۶ء کے
ریویو دو موند مسلمان میں شائع ہوا۔ "جنگ روس وجاپان سے مشرقی مطمح
نظر پر اثر" جو فروری سنہ ۱۹۰۵ء کے امریکن ریویو آف ریویوز میں شائع ہوا
ہے۔ وامبیری کا مضمون "جاپان اور اسلامی دنیا" جو اپریل سنہ ۱۹۰۵ء
کے نائنٹینتھ سنچری اینڈ افٹر میں شائع ہوا۔ لیجیا صدیق
کی کتاب مذکورہ بالا صفحہ ۴۳۔ مصنف

کی اشاعت کس درجہ تک ہو سکتی ہے۔

ایک بات یقینی ہے یعنی مشرق میں مغربی سیاسی تسلّط کتنا ہی سخت ید اور ظاہر میں کتنا ہی پرشوکت کیوں نہ ہو مگر ایسی عمارت ہے جس کی بنیاد پانی پر ہے مغربی حکمراں ہمیشہ اجنبی غیر فرقے رہیں گے اُن سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے۔ اور غالباً احترام بھی کیا جائے لیکن محبّت کبھی نہ ہوگی۔ اور ہمیشہ اجنبی ہی متصوّر ہونگے۔ مزید براں محکوم اقوام کی تعلیمی ترقی سے مغربی حالت بالضرور زیادہ نازک ہو جائے گی جتنے کہ جس امر پر ایک پشت خاموش رہتی تھی دوسری پشت کے لوگ مخالفانہ احتجاج کرینگے فی الحقیقت یہ تو ازن ناپائدار ہے جس کا قائم رکھنا مشکل اور الٹ دینا آسان ہے۔

مشرق ادنے دو سطح پر یورپی سیاسی تسلّط کے مضمر ناپائداری کا حیرت انگیز اظہار جنگ روس وجاپان کے اخلاقی نتیجہ سے ہوا۔ اس وقت تک یورپی تعدی کے مقابلہ میں مشرق ایسا لاچار تھا کہ اکثر مشرقی، مغربی اقتدار کو تقدیر امر خیال کرتے تھے۔ لیکن ایک ایشیائی قوم نے جو ایک اوّل درجہ کے یورپی سلطنت پر فتح پائی تو یہ طلسم باطل ہوگیا کل ایشیا اور افریقہ ایسے نشہ میں سرشار ہو گئے جسکا اندازہ بھی ہم بمشکل کرسکتے ہیں ایک اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا پادری جو اُس ماننے میں شمالی ہند میں تھا جاپانی فتح کے اثر کو یوں بیان کرتا ہے وہ شمالی ہند میں جوش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ حتےٰ کہ دور دراز دیہاتی بھی جب رات کو حلقہ میں بیٹھکر حقّہ پیتے تھے تو جاپان کے کامیابیوں کا تذکرہ کرتے تھے۔ ایک معمر آدمی نے مجھ سے کہا غدر سے لے کر اسوقت تک ایسی بات کوئی نہیں ہوئی تھی ایک مغربی تجربہ کار نذر کی قونسل نے مجھ سے کہا کہ اندرونی ملک میں ہر جگہ اہل اس خبر سے شادماں پاؤگے ایشیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک ترک

صرف نقصان پہونچا سکتے ہیں جسمانی طور پر متحد کرنا سب سے بڑی مصیبت ہوگی - مشرق اور مغرب دونوں نے ماضی میں ترقی کے لئے بہت کچھ کیا ہے اور مستقبل کے لئے اولسنے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں - لیکن جو کچھ بھی حصصاً قابل قدر خدمت کر سکتے ہیں وہ اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ یہ دونوں فی نفسہ اپنی اصلیت پر قائم رہیں اختلاط نسل سے ان کی نسلی سطح خراب ہوگی - جس کا نتیجہ ہولناک دوغلہ پن ہوگا اور جس سے صرف انحطاط اور تنزل ہی پیدا ہوگا -

مشرق اور مغرب دونوں کو اس کی صحت تسلیم ہے - اس کا اظہار وہ اپنی اس مشترکہ حقارت سے کرتے ہیں جو انھیں "یوریشیونوں" یعنی دونوں نسلوں کے نتیجۂ اتحاد "دوغلوں" سے ہے - چنانچہ سیر ہٹائنہ ٹاؤنسینڈ نے خوب کہا ہے - بھورے اور گورے آدمی فصل بے پایاں ہے اور ہر زمانہ میں رہا ہے اور آج بھی ہر جگہ موجود ہے - جب کوئی بھورا آدمی گوری عورت سے اور گورا آدمی بھوری عورت سے شادی کرتا ہے تو اس کے دل میں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ وہ کسی بعید از فہم اور لازمی حکم کے خلاف ورزی کر رہا ہے -[۵۱]

مغرب اور مشرق کے درمیان جو سیاسی و اقتصادی و معاشرتی و نسلی اختلافات ہیں اُن کے مندرجہ بالا خلاصہ سے ہمیں کافی اندازہ ان بے شمار متضاد نکات کا ہو جاتا ہے جو دونوں دنیاؤں کے تعلقات کو پیچیدہ کرتے اور مغربی تمدن کی اشاعت میں سدّ راہ ہیں - مغربی تمدن کی اشاعت یقینی طور پر رائج ہو رہی ہے اور فصول ما بعد میں ہم اس پر نظر ڈالیں گے کہ اس کی وسعت کتنی عظیم ہے لیکن جن اجزا پر ہم بحث کر چکے ہیں اُن سے ردعمل کی امکانات کا اظہار ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تمدن

---

[۵۱] ٹاؤنسینڈ کا صفحہ ۹۷ - مصنف

فصل چہارم

سیاسی تبدیلی

مشرق کا خاص نقص اس کی پر عیب سیاسی روایت رہی ہے۔ اوائل ایام ہی سے مشرق میں سلطنت کی خاص صورت خود مختاری یعنی ایک مطلق العنان بادشاہ کی شخصی حکومت رہی ہے۔ رعایا اس کی غلام اور جن کے جان و مال بلکہ لوگوں کا قیام و بقا اس کی خوشی اور مرضی پر منحصر ہے۔ مشرقی خود مختاری کی صرف ایک باثر روک مذہب رہا ہے۔ بعض ناقدین "رسوم" کا اضافہ کر سکتے ہیں لیکن نتیجہ ایک ہی ہے۔ کیونکہ مشرق میں رسم و رواج ہمیشہ مذہبی شان پیدا کر لیتے ہیں۔ بلاشبہ مذہب کی عبا مقدس علماء کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے۔ جو من حیث الجماعت ایک واجب الاحترام گروہ ہے۔ ان مستثنیات کے سوا مشرقی مطلق العنانی قیود و حدود سے عموماً آزاد رہی اور مطلق العنان حاکم جب تک کہ وہ دین اور علماء کا احترام کرتا رہے جب دلخواہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ آغاز تاریخ ہی میں ہمیں فرعون کی مثال نظر آتی ہے کہ اس نے اپنی قبر کا عظیم الجثہ اہرام تعمیر کرنے کے خیال کی تکمیل کے لئے کل مصر کی دولت کو صرف کر ڈالا اور کل مشرقی سیاسی تاریخ میں اس مہلک سیاسی سادگی کا اعادہ رہا ہے۔

اب متعدد انسانی تجربات سے یہ ناقابل تردید طور پر ثابت ہو گیا کہ شخصی سلطنت فی الجملہ بدترین طرز حکومت ہے۔ بلاشبہ قصص میں "فیاض مطلق العنان" یعنی "اپنی رعایا کا باپ" ایسا مذکور ہے جس کے گرد و پیش عاقل و شہیر رہتے تھے اور جو ایک اشارہ یا ایک جنبش قلم سے خرابیوں کا استیصال کر دیتا تھا۔ یہ باتیں قصوں اور کہانیوں کے لئے نہایت موزوں ہیں لیکن واقعی زندگی میں "فیاض مطلق العنان" بہت کم ہوتا ہے اور شاذ و نادر ہی ان صفات سے متصف اس کا جانشین ہوتا ہے۔ عمداً آرہا ہے۔

اور افریقہ یورپ سے ایسے واقف ہیں کہ پہلے کبھی نہ تھے۔ اور ہم کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے علم سے پورا فائدہ اٹھائیں گے۔ اس حالت کا نازک ترین پہلو یہ ہے کہ مشرق کو اس امر کا احساس ہے کہ ورسیلیز کی وہ "مشہور صلح" جس کا منشا امن یورپ ہے کوئی صلح نہیں ہے۔ بلکہ ایک غیر مستحکم اور غیر مدبرانہ لغویت ہے جس نے زمہائے کہن کو غیر مندمل رکھا اور جدید چرکے بھی لگا دئے۔ آج یورپ ضعیف اور مریض پڑا ہوا ہے اور اس کی بد ولت افریقہ اور ایشیا کو غیر دانشمندانہ خیالات اور جبر یہ عمل کی ترغیب ہوتی ہے۔

آج تو یہ حالت ہی کہ مشرق جو قدیم اور جدید کے نزاعات میں منقسم ہے وہ اس یورپ کے مقابل ہے جو نا اتفاقیوں سے پاش پاش اور اپنی حماقتوں میں مبتلا ہے غالباً اس سے قبل کبھی بھی دونوں دنیاؤں کے باہمی تعلقات میں ایسے بے شمار اور فتنہ انگیز امکانات کا موقع نہ تھا۔ یہاں پر غایں لحاظ امر یہ ہے کہ یہ اجنبی جدید مشرق جو ہمارے مقابل ہے زیادہ تر ان مغربی اثرات کا نتیجہ ہے جو گزشتہ سو سال سے عدیم المثال طور پر مشرق میں اپنا عمل کر رہے ہیں۔ اب ہم اس عمل کے خاص پہلوؤں کی طرف متوجہ ہونا چاہتے ہیں +

کا عموماً تصور کرتے ہیں لیکن یہ سلاطین مشرقی مفہوم کے مطابق مطلق العنان نہ تھے۔ فریڈرک ہی کی مثال لو۔ وہ مطلق العنان سمجھا جاتا تھا لیکن اس کی رعایا اس کی غلام نہ تھی۔ ان متکبر پروشی منصبداران اور باضابطہ اہل دفاتر اور ضدی قصبائیوں اور یہی کاشتکاروں میں سے ہر ایک کو ذاتی وجاہت اور آئینی مرتبت کا احساس تھا۔ ان لوگوں نے جو فریڈرک کی اطاعت بے چون وچرا کی وہ محض اسکے بادشاہ ہونے کی بنا پر نہ تھی بلکہ اسوجہ سے بھی تھی کہ وہ جانتے تھے کہ فریڈرک پروشیا بھر میں امور سلطنت کے مشاغل میں سب سے زیادہ محنتی اور ان تھک تھا۔ اگر فریڈرک دفعتاً کاہل اور عیاش ومتوہم وظالم ہوجاتا تو اس کے "مطیع" اہل پروشیا اس کو بتا دیتے کہ اس کے اختیارات کی بھی حد ہے۔

مشرق میں حالت بالکل متضاد ہے۔ مشرق کا ہر شخص ایک ایسے قاعدہ کو بسر وچشم تسلیم کرتا ہے جو یورپی آئین میں معدوم ہے۔ "تو اس شخص کی جس کو خدا نے بطور تیرے بادشاہ کے تجھ پر مسلط کیا ہے عزت اور پرستش کرے گا۔ اگر وہ تیری پرورش کرے تو تو اس کو پیار کرے گا اور اگر وہ تجھکو لوٹے اور ستائے تو بھی تو اس کو عزیز رکھے گا۔ کیونکہ تو اس کا غلام اور اس کی ملکیت ہے۔"[۱] اگر کوئی مشرقی سلطان یا سلطنت کو وزیر اعظم کے دوش پر ڈالکر حرم میں بند ہو جائے اس وقت سے اس وزیر کو غیر محدود اختیار ملجاتے ہیں۔ اور ہر شخص کی جان اس کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن شام کو کسی رقاصہ کے جنبش لب پہ بادشاہ اپنے حرم سے کسی حبشی "بے زبان" کو معکن کے وزیر کے محل کی طرف بھیجدے تو وزیر اس حبشی بے زبان کو دیکھکر بے چون وچرا اپنا خلعت اتار کر اپنی گردن پھندے کے لئے برہنہ کردے گا۔ یہ ہے اصلی مطلق العنانی! وہ مطلق العنانی جس سے مشرق کو سابقہ پڑا ہے۔

یہ ہے مشرقی سیاسی روایت! اور بالیقین یہ امر بدیہی ہے کہ ان روایات کے تحت باضابطہ حکومت اور مسلسل ترقی ممکن ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرق کی تاریخ زیادہ تر فوری عروج اور اتنے ہی فوری زوال کی داستان ہے۔ ایک طاقتور اور قابل آدمی بدنظمی اور انحطاط کے زمانہ

[۱] سرٹی مارسن کی کتاب "ہندوستانی شہنشاہیت" صفحہ ۳۴ مطبوعہ لندن ۱۸۹۹ء۔

باپ کا لڑکا نمائش پسند اور پوتہ بدمزاج ہوتا ہے۔ جو رعایا کو تباہ کر ڈالتے ہیں۔ قابل افسوس تثلیث یعنی داؤد و سلیمان و رحبعام کی مثال نہایت تواتر سے صفحات تاریخ میں ظاہر ہوئی۔

مزید براں فیاض مطلق العنان کی بھی ایک حد ہے۔ کل مطلق العنانیوں کی حکومت میں دقت یہ ہے کہ ان کی حکومت بالکل شخصی ہے ہر بات کا انجام کار بادشاہ کی ذاتی مرضی پر منحصر ہے۔ کوئی امر معین اور یقینی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ رات گزرنے پر فیاض مطلق العنان خود ہی اپنی فیاضی کو ترک کردے اور ایک سلطنت کی قسمت شاہ کے کسی عورت سے عشق یا سوء ہضم کے تکلیف سے معرض خطر میں آجائے

ہم مغربی فی الواقعہ خالص مشرقی رنگ کی مطلق العنانی سے کبھی حتیٰ کہ رومی سلطنت کے ایام میں بھی واقف ہی نہیں ہوئے۔ دراصل ہمکو یہ اندازہ بھی نہیں ہوسکتا کہ اس کا کیا مطلب ہے جب ہم کسی خیر اندیش مطلق العنان کا ذکر کرتے ہیں تو اٹھارویں صدی کے فریڈرک اعظم[1] جیسے "روشن خیال"

---

[1] فریڈرک اعظم یا فریڈرک دوئم شاہ پروشیا ۱۷۱۲ء لغایت ۱۷۸۶ء جنگہائے پولینڈ میں شریک رہا ۱۷۳۵ء لغایت ۱۷۴۰ء میں زیادہ تر ادبیات کیطرف متوجہ رہا اور ۱۷۴۰ء میں تخت نشین ہوا۔ بوقت جلوس اس کے ملک میں نہایت اچھا انتظام و عمدہ لشکر اور خزانہ معمور تھا طرز سلطنت شخصی تھا۔ اس نے اپنے باپ فریڈرک اول کے کام میں ترقی کرکے پروشیا کو دول یوروپ میں ممتاز بنا دیا ۱۷۴۰ء-۴۲ء میں سلیشیا پر قابض ہوا اور ۱۷۵۶ء میں برطانیہ عظمیٰ کا حلیف ہوا۔ اسی سنہ میں اس نے سیکسنی پر حملہ کر دیا اور سات سال تک روس و آسٹریا اور فرانس سے لڑتا رہا۔ فرانس کی نامداری اور ملکہ روس کی وفات کی وجہ سے اپنے ممالک مفتوحہ پر قابض رہا اور ۱۷۶۳ء میں صلح ہوگئی ۱۷۷۲ء میں پولینڈ کے پروشیا اور کچھ پولینڈ کا حصہ حاصل کیا ۱۷۸۵ء میں بادشاہوں کی ایک لیگ قائم کی یہ بادشاہ موقع کا منتظر، حکیم، مطلق العنانی پر بڑا مدبر، خشک مزاج، خود غرض، جفاکش اور متحمل مزاج تھا۔ اگرچہ اس نے اپنی ملک کو ریاست ہائے جرمنی میں سب سے ممتاز بنا دیا۔ لیکن اوس نے پروشی حکمت عملی پر یورپ کا ایسا نقش چھوڑا جس کی انتہا جنگ عظیم میں ہوئی۔

(مترجم)

سیاسی اثرات کے انفصال سے ہوئی ہے یہ اثرات بعض وقت خاص مشرقی ممالک سے اور بعض نوبت مغرب کی بدولت پیدا ہوئے۔ کل مشرق اس مسلسل مطلق العنانی کے تحت نہیں رہا ہے۔ جابجا ایسی اقوام بھی آباد ہیں زیادہ تر کوہستانی یا مویشی چرانے والے جو شخصی حکومت سے نفرت کرتی تھیں قوم عرب ہمیشہ سے اسی قسم کی رہی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح سے عربوں نے نور اسلام سے منور ہو کر ایک عظیم خلافت قائم کی جو اول میں خدائی جمہوریت تھی۔ بلاشبہ ہم اس کا بھی تبصرہ کر چکے ہیں کہ شخصی سلطنت کے قدیم تر روایات نے کیونکر اسلامی دنیا کے بڑے حصہ پر اپنا سکہ جما لیا اور کس طرح جمہوری خلافت شخصی سلطنت میں مبدل ہوگئی۔ اور کس طرح سے آزادی پسند عرب رنج و غصہ میں اپنے صحرا دلیا کو واپس آئے۔ سیاسی آزادی بھی مذہبی آزادی کی طرح برباد ہو کر تقریباً فراموش ہو گئی۔ میں نے تقریباً کہا ہے۔ کلیتاً نہیں کہا۔ اسوجہ سے کہ اصلی خلافت کی یاد لوگوں کے گوشہ ہائے دماغ میں حنزلہ کی طرح باقی رہی اور مساعدت زمانہ کے ساتھ پھر عود کرنے کو مستعد تھی۔ ان تمام حالات کے باوجود آج بھی آزاد عربستان موجود تھا جس کا ہر آدمی سرتاپا اسلحہ سے مسلح تھا آمدورفت حریت کو قائم رکھنے کے ساتھ اسلام بھی موجود تھا۔ کوئی درباری فقیہ ایسی حدیث جیسے "کل عربی حق" اور "کل مومن حق" کی تعبیر کر کے ان کے اثر کو زائل نہ کر سکا نہ کوئی درباری مورخ تاریخ اسلام سے اس کے ابتدائی عہد یعنی "وقت سعادت" کے واقعات کو مٹا سکا۔ بدترین زمانہ میں بھی وہ مسلمان جو آزادانہ میلان رکھتے تھے خلیفہ اول کے اس خطبہ کو جو انھوں نے اپنے انتخاب کے بعد دیا تھا بہت دلچسپی سے پڑھتے ہوں گے۔ انھوں نے فرمایا: "اے قوم تم نے مجھکو جو تم میں سب سے زیادہ ناقابل ہے۔ اپنا خلیفہ منتخب کیا ہے۔ جب تک میں انصاف پر عمل کروں میری مدد کرو اگر اس کے خلاف کروں تو مجھکو نصیحت کرو اور انجام دہی فرائض کی یاد دلاؤ۔ چونکہ میں کمزور کا حامی ہوں میری اسوقت تک اطاعت کرو جب تک کہ میں شریعت کا اتباع کروں اور اگر تم یہ دیکھو کہ میں ذرہ بھر بھی شریعت سے انحراف کرتا ہوں تو میری اطاعت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔[۱]

بن صاحب اختیار بن جاتا ہے اس کے لئے طاقت ور اور قابل ہوتا اس لئے ضروری ہے کیونکہ ان صفات کے بغیر وہ ان اشخاص پر جو ایسی ہی طبیعت کے ہیں اور مطاوبہ انعام کے لئے کوشاں ہیں سبقت نہ لیجا سکے گا۔ اس کی قابلیت اور جوش حیرت انگیز نتائج پیدا کرتی ہے۔ وہ کام لینے کا درست اور سریع طریقہ جانتا ہے۔ اس کے عزم اور عمل سے وہ قوت محرکہ پیدا ہوتی ہے جو اس کے ماتحتوں کو کافی قابلیت سے کام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ نالائق اور بے ایمان کی سزا ایسی سختی سے دیجاتی ہے جیسی کہ ایرانی شاہ نے ایک ظالم صوبہ دار کی کھال زندہ کھنچواکر منصب کی کرسی کو منڈھوا دیا۔ اور جدید گورنر نے اس پر بیٹھکر عدالت گستری کی۔

جب تک آقا زندہ ہے کام ٹھیک چلتا ہے لیکن جب وہ مرا تو اس کا لڑکا جانشین ہوا اگر یہ بھی فرض کر لیا جاوے کہ اس لڑکے کو اکثر باپ کی قابلیتیں ورثہ میں پہنچیں تاہم اس کی تربیت بدتر ہوئی۔ اس کی پرورش ایسے خوشامدی غلاموں اور چالباز عورتوں میں ہوئی۔ اس کو اپنے غرور اور خواہشات کو پورے طور پر ضبط کرنے کی عادت نہیں ہوئی نتیجہ یہ ہے کہ وہ جوان ہوکر شاہانہ ظالم اور غالباً قبل از وقت سیاہ کار ہو جاتا ہے۔ ایسا آدمی لازمی طور پر باپ کی طرح نگرانی نہیں کرسکتا جیسے ہی کہ آقا کی نظر چوکی معاملات درہم برہم ہوئے۔ اس کے خلاف کیسے بچ سکتا تھا؟ اس کے باپ نے ایسا کوئی نظام حکومت قائم نہیں کیا جس میں امور سلطنت مغرب کی طرح خود بخود ہی سرانجام پاتے۔ اس کے افسران یا تو خوف یا ذاتی وفاداری سے کام کرتے تھے۔ ان کو نہ تو وطن کی ہمدردی کی وجہ سے فرائض کا خیال اور نہ غیر شخصی روایات منصبی کا لحاظ تھا۔ پوتے کے عہد میں معاملات بد سے بدتر ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے ناقابل ہاتھوں سے زمام اختیار نکلکر بہت سی مقامی خود سر عاملوں پر منقسم ہو جاتے ہیں۔ اور اگر بالفرض برباد شدہ سلطنت پر کسی غیر ملکی فاتح نے حملہ نہ کرد یا تو ان میں سے قوی ترین عامل صاحب اختیار ہو جاتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان ور جہام کا پورانا دور ختم ہوکر جدید دور شروع ہوتا ہے۔ اور اس دور کا بھی وہی انجام ہوتا ہے۔ یہ ہے مشرق کی تاریخ سیاسی کا لب لباب مگر اس میں ترمیم پارہ کا وسطی نیابادہ آزاد

خلاصہ کیا ہے۔ "اسلام یا اس کی تعلیم مغربی ایشیا کی بربادی کا باعث نہیں ہے اور نہ اس سے موجودہ افسوسناک صورت حال پیدا ہوئی ہے بلکہ یہ اُن مسلمان بادشاہوں کے ظلم کی بدولت ہے جنھوں نے دیدہ و دانستہ تعلیم رسول اللہ صلعم کو بدل کر قرآن مجید میں تلاش کر کے اپنی شخصی سلطنت کے موافق اصول دریافت کئے۔ انھوں نے امور مذہبی میں ذرا بھی شک وشبہ کی گنجایش نہ چھوڑی اور انھوں نے نہایت کامیابی سے کلّی آزادانہ اصول کی تحریف وتخریب کر کے مسلمانوں کے نشأۃ ثانیہ کے طلوع کو روک دیا۔"[1]

تمہیدی باب میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اٹھارویں صدی میں شرقی اطلاق العنانی کیونکر بدترین حالت کو پہونچی۔ اور مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ محض مذہب کی خالص اصلاح نہ تھی بلکہ جزءاً ان بدکار اور قابل نفریں ظالموں کے خلاف جو اسلامی دنیا میں بر سر طور پر حکمراں تھے۔ ایک سیاسی احتجاج بھی تھی۔ اس اندرونی سیاسی حریت کی تحریک کا تقاطع ایک دوسری لہر سے ہوا جو مغرب سے آئی۔ اسلامی دنیا کی واجب الرحم تباہ حالی و بے دست وپائی کا مقابلہ یورپ کی مرفہ الحالی اور زورمندی سے کر کے دور اندیش مسلمان اپنی کمی کو محسوس کرنے لگے اور لازمی طور پر اس نتیجہ پر پہونچے کہ ان کی موجودہ تکالیف زیادہ تر ان کے منحوس طرز حکومت کی بدولت ہیں بلاشبہ بعض مسلمان حکمرانوں کو بھی اس کا یہ احساس ہوا کہ اگر ملک کو تباہی سے بچانا ہے تو کچھ مغربی سیاسی طریقوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ اس نئی قسم کے شرقی سلاطین میں سے سب سے زیادہ معروف مثال سلطان محمود ثانی والی ترکی اور محمد علی خدیو مصر کی ہے۔ یہ دونوں انیسویں صدی کے آغاز میں علی التحتیا

نوٹ صفحہ ۱۶۶ سطر ۱ اسے۔ انچ لائبیر کا مضمون "ترکی پارلیمنٹ جو ۱۹۱۰ء کی امریکہ کی پولیٹیکل سائنس ایسوسی ایشن کی کارروائی کی جلد ہفتم صفحہ ۷۶ پر شایع ہوا۔

[1] اے وامبیری کی کتاب متذکرہ بالا صفحہ ۳۰۷

مختصر یہ ہے کہ تاویلات مابعد اس واقعہ کو محو کرتے ہیں کامیاب نہ ہوئیں کہ ابتدا اسلام ایک آزادی پسند قوم کا بڑا اظہار خیال تھا جس کے مذہب میں بھی بہت سے حریت کے میدان ہونا ضروری ہیں شریعت یعنی قانون دینی بھی بقول پروفیسر لائبر کے اصلاً جمہوری ہے اور اس کا منشا مطلق العنانی کے خلاف ہے" اس معاملہ کا وامبیری نے اپنی تحریر میں خوب

یہ خطبہ خلیفہ اول کا اصل عربی میں علامہ سیوطی کی تاریخ الخلفاء سے نقل کیا جاتا ہے صفحہ ۱۰ مطبوعہ فخر المطابع لکھنؤ ۱۳۰۷ھ

فبايع الناس ابابكر بيعة العامة بعد بيعة السقيفة ثم تكلم ابوبكر فحمد الله واثنى عليه ثم قال اما بعد ايها الناس فاني قد وليت عليكم ولست بخيركم فان احسنت فاعينوني وان اسأت فقوموني۔ الصدق امانة والكذب خيانة۔ والضعيف فيكم قوي عندي حتى اريح عليه حقه ان شاء الله والقوي فيكم ضعيف حتى آخذ الحق منه ان شاء الله۔ لا يدع قوم الجهاد في سبيل الله الا ضربهم الله بالذل ولا تشيع الفاحشة في قوم قط الا عمهم الله بالبلاء۔ اطيعوني ما اطعت الله ورسوله فاذا عصيت الله ورسوله فلا طاعة لي عليكم۔ قوموا الى صلاتكم يرحمكم الله۔

بیعت بنی شقیفہ کے بعد لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بیعت عام کی اس کے بعد ابوبکرؓ نے خدا کی حمد ثنا کے بعد کہا اے لوگو میں تم پر والی بنایا گیا ہوں درانحالیکہ میں تم سے افضل نہیں ہوں۔ اگر میں عمل صالح کروں تو میری مدد کرو اور اگر غلطی کروں تو مجھکو بتاؤ سچ امانت ہے۔ اور جھوٹ خیانت۔ تم میں سے جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے۔ جبتک کہ میں انشاء اللہ اس کا حق نہ دلا دوں اور تم میں سے جو قوی ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے جبتک میں اس سے حق نہ ادا کراؤں۔ جب کوئی قوم جہاد فی سبیل اللہ کو ترک کرتی ہے تو اس کو خدا ذلیل کر دیتا ہے اور جس قوم میں بدکاری پھیلتی ہے تو خدا تعالیٰ اسکو ضرور بلا میں مبتلا کرتا ہے جبتک میں اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کروں تم اتباع کرو اور جب میں خدا اور اس کے رسول سے خلاف کروں تمکو میرا اتباع نہ کرنا چاہیے۔ نماز کے لئے اٹھو اللہ تم پر رحم کرے۔ مترجم

نے ایک کمزور سلطان سے پارلیمنٹ کی منظوری حاصل کرلی)

مسلمانوں کی سیاسی حریت کی ان کامیابیوں کے بعد ردعمل کا دور آیا۔ مسلمان سلاطین اپنی رعیت کے روز افزوں سیاسی شورشوں سے بے حد مرعوب ہو کر اپنے شخصی اختیارات قائم رکھنے پر تلے ہوئے تھے۔ جدید سلطان ترکی یعنی سلطان عبدالحمید نے فوراً پارلیمنٹ کو بند کر دیا اور احرار پر وحشیانہ مظالم کئے۔ اور نہایت سخت مطلق العنانی کو قائم کیا۔ شاہ ایران نے بھی اسی ہی سختی سے نوزائیدہ تحریک آزادی کا انسداد کیا۔ اور مصر میں خدیو اسمٰعیل کی مسرفانہ حکومت نے یورپی مداخلت اور برطانوی حکومت کی اقامت کو برانگیختہ کر کے کل ملکی سیاسی زندگی کا خاتمہ کر دیا چونکہ نوجوان ترکوں کے سنہ ۱۹۰۸ء والے انقلاب کے زمانہ تک ان اسلامی ممالک میں جو خود مختار تھے آزادانہ شورشوں کے بہت کم آثار نمایاں تھے۔ تاہم شورش موجود تھی۔ اگرچہ خفیہ عمل کر رہی تھی صدہا نوجوان محبان وطن حصول تعلیم اور اپنی آزاد خیالی کی اشاعت کے لئے دیار غیر کو چلے گئے اور سوئٹزرلینڈ جیسے امن سے ان "نوجوان ترکوں" اور "نوجوان ایرانیوں" وغیرہم نے اعلانات شائع اور انقلابی مضامین طبع کئے جو ان کے وطنوں میں خفیہ طور پر اشاعت پاتے تھے اور جنہیں ان کے مظلوم بھائی نہایت شوق سے پڑھتے تھے[1]

امتداد زمانہ کے ساتھ حریت کی آواز رفتہ رفتہ بلند ہونے لگی۔ اسی زمانہ میں ایک نوجوان ترک شاعر نے کہا "یورپی تمدن آپ جس کی ہم جنبیت ثمرات علوم و فنون معترف ہیں وہ محض آزادی کا نتیجہ ہے۔ ہر شے اپنا نور آزادی کے کوکب درخشاں سے اخذ کرتی ہے بلا آزادی کے

---

[1] انیسویں صدی میں ان تحریکات آزاد خیالی کا اچھا حال وامبیری کے مضمون "ایشیائی مسلمانوں میں تحریک آزادی" جو اکتوبر سنہ ۱۸۹۳ء کے جرمن ریویو میں شائع ہوا۔ وامبیری کے خیالات کا خلاصہ اوس کی کتاب "مشرقی ممالک میں مغربی تمدن" بالخصوص فصل پنجم میں ہے۔ نیز ملاحظہ ہو لیون کاہون کا مضمون متذکرہ بالا جو لاویس اور رامبو کی تاریخ عام جلد ۱۱ و ۱۲ میں شائع ہوا۔ مصنف

ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ مصلح سلاطین میں سے کسی کو اس کا ذرا بھی خیال نہ تھا کہ وہ اپنی رعایا
کو دستوری حریت دیں یا اپنے اختیارات کو محدود کریں وہ خود مختار رہنا چاہتے تھے خود مختاری
کا مفہوم بجائے خالص مشرقی مطلق العنانی کے مغربی روشن خیال با اختیاری تھا۔ وہ جس چیز
کے خواہاں تھے وہ اعلیٰ نظامات سلطنت یعنی فوجی ملازمت ملکی و دیوانی وغیرہ کے نظامات
جو پوری طور پر قابلیت سے کام کریں اور محض بہادر دل مجمع ایسے افراد کا نمونہ جنکو کام کرانے
کے لئے روز روز سلطان کو ہانکنا اور سزا دینا پڑے۔ محمود ثانی و محمد علی اور ایکے مشیران
نے اس جدید پالسی میں سرگرمی دکھائی لیکن ان بالائی اصلاحات کا نتیجہ فی الجملہ مایوس کن
ہوا۔ بادشاہوں نے بارکیں اور دفاتر یورپی نمونے کے بنائے اور ان میں انگریزی لباس
پہنے ہوئے سپاہی اور اہل دفاتر بٹھا دئے۔ لیکن وہ پورے نتائج نہ حاصل کر سکے۔ ان
"مغربی نمونے" کے عمال میں سے اکثر بالکل مغرب سے ناواقف تھے۔ اور اس لئے مغربی طرز
پر کام انجام نہ دے سکتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کا کام میں جی ہی نہ لگتا تھا۔ چونکہ ان کو
ان نظامات اور خیالات سے جو ان کے فہم سے باہر تھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انھوں نے
اصلاح کے کام کو بادل ناخواستہ اور باطنی نفرت کے ساتھ کیا۔ اور وہ اس کو محض حکم
سلطانی کی کورانہ متابعت میں کر رہے تھے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ فوجی شعبہ جات میں
کچھ جدید قابلیت پیدا ہوگئی لیکن ملازمت ہائے ملکی نے کوئی ترقی نہ کی اور ان میں بہت
سی مغرب کی دفتری خرابیاں تو آگئیں لیکن محاسن سے محرومی رہی۔

اس اثناء میں مختلف قسم کے مصلحین پیدا ہوگئے جو مغرب کی ایسی اختراعات کا مطالبہ
کرتے تھے جیسے دستوریت و پارلیمنٹ اور موجودہ سیاسی زندگی کے دیگر صور۔ ان مصلحین
کی تعداد میں یوماً فیوماً اس گروہ کے افراد سے ترقی ہوتی گئی جو کثیر الشیوع کتب و رسائل جرائد
اور مغربی نمونے کے مدارس کے ذریعہ یورپی خیالات سے واقف ہوگئے تھے انیسویں صدی
کے ربع ثالث میں ترکی میں اصلی سیاسی فرقوں کی ابتداء ہونے لگی ۱۸۶۵ء میں لبرل پارٹی

مطلق العنانی کے خلاف اصلی حریت کی تحریکات اٹھ سکتی تھیں لیکن ان ممالک میں جو دول یورپ کے زیر فرمان تھے۔ مثلاً ہندوستان و مصر و الجزائر باشندوں کی زندگی سطح اتنی رفیع ہو گئی تھی کہ آزادانہ سیاسی توقعات اور نیز حکومت غیر سے نفرت محض بھی پیدا ہو جس کا احساس وحشیوں اور متمدن اقوام ہر دو کو ہوتا ہے

ان آزادانہ توقعات میں ان تحریکات سے اشتعال پیدا ہو گیا جو ترکی اور ایران میں دیسی حکومتوں کے خلاف شروع ہوئیں مگران دونوں انواع کی قسموں میں بیّن فرق ہے۔ ترکی اور ایرانی شورشیں اصلاً آزادانہ اصلاحی تحریکات تھیں بخلاف اس کے ہندی و مصری و الجزائری اور اس قسم کی دیگر تحریکات دراصل خالصاً تحریکات آزادی نہ تھیں اور ان کا کوئی نظام عمل منضبط نہ تھا کہ اگر یہ آزادی مل بھی جاوے تو اس کا استعمال کیونکر کیا جائے گا۔ آخرالذکر بجائے آزادانہ اصلاحی تحریک کے قوم پرستی کی تحریکات ہیں۔ اس موقع پر اور اس اعتبار سے ان کا تذکرہ ان فصول میں کیا جاویگا جو قوم پرستی سے مخصوص ہیں۔ اس موقع پر جو امر ملحوظ خاطر رہنا چاہیے وہ یہ ہے کہ دراصل یہ حکومت غیر کے خلاف اور ان اشخاص کا اجتماع ہے جو نہایت متضاد سیاسی خیالات رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان قوم پرستوں کے اجتماع میں نہ صرف اصلاً آزاد خیال اشخاص ہیں بلکہ اس میں خود مطلق تفرقہ پرداز واعظین اور برہنہ شمشیر انقلاب پسند بھی ہیں۔ جو اپنی خلاصی یافتہ ممالک میں بدترین مطلق العنانی قایم کرنا پسند کریں گے۔ بلاشبہ سب قوم پرست جماعتیں آزادی اور "حریت" کے معروف نعروں کو استعمال کرتی ہیں بایں ہمہ ان میں سے اکثر کا یہ منشا رہے کہ اغیار کی اتالیقی سے آزادی اور خلاصی یا بالفاظ دیگر خود مختاری ملجائے ہمیں ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وطن پرستی کو آزاد خیالی سے کوئی لازمی ربط نہیں ہے۔ اسپین کے کاشتکاروں نے جب نپولین کی افواج کا مقابلہ کیا تو آزادی کے نعرے لگائے اور اپنے قابل نفرت ظالم بادشاہ کا نہایت جنونانہ سرگرمی سے خیر مقدم کیا۔ اور اس کی مطلق العنانی کی عظمت کا استقبال "زندہ باد سلاسل" کے نعروں نے کیا۔

کوئی قوم نہ با اختیار ہوسکتی ہے اور نہ مرفہ الحال۔ بلا آزادی کے مسرت واطمینان نہیں۔ بلا مسرت و اطمینان کے زندگی حقیقی زندگی، دوامی زندگی ناممکن ہے۔ آزادی کی نور رخشاں کے لئے دائمی تعریف و تبریک ہو"۔[1] انیسویں صدی کے اختتام پر یورپی مبصرین نے شخصی استبداد کی پرسکون سطح کی تہ میں حریت کے ہیجانی عمل کو محسوس کیا چنانچہ ارمینیس وامبیری جب ۱۸۹۶ء میں دربار قسطنطنیہ میں گیا تو یہ دیکھکر اس کی حیرت کی انتہا نہ تھی کہ اس زمانہ سے لیکر جبکہ چالیس سال قبل وہ پہلے پہل قسطنطنیہ آیا تھا آزادی میں کس درجہ ترقی ہوگئی تھی۔ باوجودیکہ اس زمانہ میں قسطنطنیہ میں حمیدی مطلق العنانی کا شش و پنج دور تھا۔ وامبیری نے لکھا "شخصی سلطنت سے ترکوں کو جو قدیمی لگاؤ تھا وہ ختم ہوگیا۔ ہم یورپ میں نوجوان ترکوں کی جماعت کا ذکر بہت سنتے ہیں۔ ہم دستوری تحریکات و سیاسی جلاوطنان اور انقلابی رسالوں کا بھی حال سنتے ہیں لیکن وہ چیز جسکا ہم اندازہ نہیں کرسکتے وہ ہیجان ہے۔ جو مختلف معاشرتی طبقات میں پیدا ہورہا ہے۔ اور جس سے یقین واثق ہوتا ہے کہ ترک ترقی کر رہے ہیں۔ اور اب مطلق العنان کو زہ گر کے ہاتھ میں محض گندھی ہوئی مٹی نہیں ہے۔ لہذا ترکی میں نوجوان ترکوں کی جماعت کا سوال ہی نہیں ہے کیونکہ ہر مہذب عثمانی اس جماعت میں شریک ہے"۔[2]

اس سلسلہ میں ہمیں ان شورشوں کے کشو و نما کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو ان بلاد مشرق میں جو یورپی سیاسی تسلط میں تھے سرعت سے ترقی کر رہی تھی۔ انیسویں صدی کے ختم پر صرف چار بڑی اسلامی سلطنتوں یعنی ترکی و ایران مراکش، افغانستان کی ایسی حالت رہ گئی جس کی نسبت کہا جاسکے کہ یورپی تسلط سے آزاد ہیں۔ چونکہ افغانستان و مراکش اتنے پیچھے تھے کہ وہ مشکل سے متمدن ممالک کہلائے جاسکتے ہیں۔ اس لئے صرف ترکی و ایران ہی میں ویسی

---

[1] وامبیری کی تصنیف مذکورالصدر صفحہ ۳۴۳ مصنف

[2] وامبیری کی کتاب "موجودہ اور چالیس سال قبل کی ترکی" مطبوعہ پیرس ۱۸۹۸ء مصنف

کے اظہار و بیان ہی پر اکتفا کروں گا۔ مگر ان متضاد نقاط نظر کے بیان کرنے سے پہلے میں اس امتیاز کی طرف توجہ دلاؤں گا جو مسلم اقوام اور ہندوستان کے غیر مسلم ہنود کے درمیان ملحوظ خاطر رہنا چاہئیے ہر جگہ کے مسلمانوں کے پیش نظر دو چیزیں ہیں۔ عرب جمہوریت کی سیاسی مثال۔ اور ایسے مذہب کی تعلیم جس میں وسیع الخیالی کے رجحانات بہت زیادہ ہیں خواہ یہ رجحانات اس مذہب کے متبعین کے باہم ہی کیوں نہ ہوں۔ ہنود کے پیش نظر نہ ایسی مثال ہے نہ ایسی تعلیم مذہب۔ ان کی سیاسی روایت تو عملاً مشرقی تجبر و تشدد کا سلسلہ ہے جس کے مصائب سے کبھی نجات ہی نہ ملی مستثنیات محض یہ ہیں کہ اوائل ایام میں چند ابتدائی خود اختیاری حکومت کی جماعتیں تھیں جن کا دائرہ اثر کبھی وسیع نہ ہوا اور جو بہت جلد فنا ہو گئیں مذہب براہمہ یعنی ہندو مذہب غالباً سب سے زیادہ تنگ نظر اعتقادات کا مجموعہ ہے جو بنی نوع انسان پر مسلط ہوا کیونکہ یہ جماعت کو ایسے لاانتہا غیر متبدل ذاتوں میں منقسم کرتا ہے جن کے درمیان کوئی باہمی ربط ممکن ہی نہیں۔ ہر ذات اپنے سے کمتر کو ناپاک واچھوت اور جانوروں کے برابر سمجھتی ہے بہ ظاہر ہے کہ ایسے موانع کی موجودگی سے مسلمانوں کے مقابلہ میں ہنود کے لئے حقیقی سیلف گورنمنٹ کا قایم کرنا زیادہ دشوار ہوگا۔ ناظرین کو یہ امر مبحث مابعد میں پیش نظر رکھنا چاہیے۔

ہم پہلے ان اشخاص کے خیالات کو بیان کرتے ہیں جن میں یہ یقین نہیں ہے کہ مشرق ادنیٰ و وسطیٰ کی اقوام فی الحال یا مستقبل قریب میں مغربی مفہوم کے مطابق حقیقی سیلف گورنمنٹ کے قابل ہیں۔ اس مسئلہ کو لارڈ کرومر نے پرزور الفاظ میں خوب بیان کیا ہے۔ لارڈ کرومر کو یہ یقین تھا کہ قدیم روایات اس قدر مستحکم ہیں کہ کم از کم ہمارے زمانہ میں مشرقی ان سے سربر نہیں ہو سکتے۔ اوسکا دعویٰ ہے آغاز تاریخ ہی سے مشرقی سیاسیات ایک مہلک سادگی کا شکار ہیں ہم کو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نکرنا چاہیے کہ مطلق العنانی کی حکومت کا تباہ کن سادہ تصور منضبط آزادی کے پیچیدہ ترین تخیل سے باسانی بدل جائیگا یہ انقلاب اگر کبھی وقوع پذیر بھی ہوا تو وہ نسلوں کا نہیں بلکہ صدیوں کا کام ہوگا۔ لہذا ہمارا فرض اولین یہ ہے کہ ہم ابسط لغۃ رائج نکریں جن کی بدولت دسیوں کی جماعت اقل کو آزاد نظامات کے پردے میں اپنے ہموطنوں پر غیر عادلانہ حکومت کرنے کا موقعہ ملے۔ ہم کو

مطلق العنانی کے ردِ عمل کا دور جس میں انیسویں صدی کے آخر ربع میں ترکی اور ایران مبتلا تھے سنہ ۱۹۰۸ء میں دفعتاً ختم ہو گیا۔ اس سنہ میں دونوں ممالک بغاوت کی آگ سے مشتعل ہو گئے ترکوں نے ظالم سلطان عبد الحمید کو معزول کیا۔ اور ایرانی اپنے بدکار فرمانروا محمد علی شاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ محمد علی شاہ غالباً سب سے زیادہ کج رائی بزدل و پرعیب عفریت تھا جس نے بہت سی نسلوں کے بعد تخت ایران کو نجس کیا۔[سلہ] ان انقلابات نے آزادی کی ان قوموں کو جو پچھلی نسلوں کے ظلم و عدوان کی وجہ سے آہستہ آہستہ نشو و نما پا رہی تھیں اور اب تک مقید تھیں دفعتاً آزاد کر دیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی اور ایران دونوں میں دستوریت و پارلیمنٹ اور مغرب کے دیگر سیاسی نظامات کے شگوفے کھلے۔

معمولی حالات میں یہ چلو نہیں کیسا کام کرتیں؟ اس پر رائے زنی بے سود ہے کیونکہ ان کے لئے زمانہ نہایت نا مساعد تھا۔ ترکوں اور ایرانیوں کی بدقسمتی تھی کہ انھوں نے بنا ڈالیں اس وقت کہیں جبکہ دنیا اس مرض میں مبتلا ہو رہی تھی جس کا انجام جنگ عظیم میں ہوا۔ نہ ترکی کو سیاسی اصلاح حال پر عمل پیرا ہونے کا موقع ملا اور نہ ایران کو۔ گرسنہ چشم مغربی وزارت خانوں نے ہر غلطی کو دیکھا اور عین اس حالت کمزوری میں جو انقلاب کی وجہ سے لازمی تھی جھپٹ کر دبا لیا اور ان ممالک کو تباہ کر دیا۔ مغربی تعدی اور مداخلت کا جو عمل چند سال پہلے شروع ہوا تھا جنگ عظیم نے اس کی تکمیل کر دی۔

چونکہ مواد واقعات حقیقتاً بالکل معدوم ہے۔ لہذا اس متنازعہ مسئلہ پر بحث کرنا کہ آیا مشرق نے اد واقعے کی اقوام سیلف گورنمنٹ یعنی باضابطہ دستوری سیاسی زندگی کے قیام و بقا کے قابل ہیں یا نہیں؟ زیادہ تر ایک علمی مباحثہ رہ جاتا ہے۔ اس مسئلہ میں سخت اختلاف آرا رہے ہیں خود اس مسئلہ پر کوئی رائے قایم نہ کر سکا لہذا بجائے عام نتائج مستنبط کرنے کی کوشش کی ہیں صرف دلائل مختلف

سلہ ڈبلیو مارگن شوسٹر کی کتاب "اختناق ایران" صفحہ ۲۱ مطبوعہ نیویارک سنہ ۱۹۱۲ء مصنف

اسی لہجہ میں تجربہ کار برطانوی ماہر سیاسیات ڈاکٹر ڈلن نے ترکی و ایرانی انقلابات کے
جو مضامین لکھے ہیں ان میں ان انقلابات کی کامیابی سے ناامیدی ظاہر کی ہے اور اس "مرد بے یقین
کا کہ دستوری حکومت میں روحانی خوبیاں ہیں" مذاق اڑایا ہے۔ چنانچہ وہ آگے کہتا ہے کوئی نظام
جو بنی نوع انسان نے مرتب کیا ہوا اور کوئی کاغذ جو کسی کارخانے میں بنایا گیا ہو اور جس پر یہ
نظام قلمبند ہوا ہو یہ طاقت نہیں رکھتا کہ قومی خصائص کی اصلیت کو مٹا دے۔ گرما گرم فقرے اور
فصیح تقریریں ہر چند لوگوں کو ان کے قلب ہیئت کا یقین دلا دیں لیکن واقعات اس سے نہیں
تبدیل ہو سکتے۔ واقعات سے یہ پتا لگتا ہے کہ ایران نو سیلف گورنمنٹ کی اہلیت بھی نہیں رکھتا
ڈاکٹر ڈلن یہ بھی کہتا ہے "دراصل صرف اشخاص اور اشیاء کے نام تبدیل ہوئے ہیں آدمی مریں
یا جئیں لیکن بد نظمی کا دور ہمیشہ قایم رہتا ہے۔ نئی حکومت کو مالی امداد دینا ناممکن ہے کیوں کہ
ممالک غیر کے سرمایہ دار اپنے روپیہ اس لئے نہ دیں گے کہ اس کو غارت گر اور غیر ذمہ دار شورش انگیز
جو کہ حباب کی طرح پیدا ہو کر دفعتاً غائب ہو جاتے ہیں اڑا لیں[^۱]"

فرانسیسی مستعمرات کا ایک افسر اعلیٰ اہالیان الجزائر اور فرانسیسی شمالی افریقہ کے دیگر
مسلمان باشندگان کی خصوصیات کو یوں بیان کرتا ہے "ہمارے دیسی اس کے محتاج ہیں کہ اُن پر
حکمرانی کی جائے۔ یہ ایسے بڑے بچے ہیں جو تنہا راستہ طے نہیں کر سکتے۔ ہم کو چاہیئے کہ ہم ان کی
رہنمائی بلا پس و پیش کریں۔ اور ان کی لغو و مہمل باتوں کو نہ سنیں اور چالبازوں اور مفسدوں کا
استیصال کر دیں۔ اسی کے ساتھ ہم کو ان کی حمایت اور بزرگانہ ہدایت کرنی چاہیے۔ اور خصوصیت
کے ساتھ ہم کو اپنی اخلاقی فوقیت کی مسلسل مثال سے ان پر خاص اثر پیدا کرنا چاہیے اور سب
سے بڑی بات یہ ہے کہ فرانس اور خود دیسیوں کے مفاد کے لحاظ سے ہم کو انسانی ہمدردی کے

---

[^۱]: ای۔ جے۔ ڈلن کا مضمون "ایران سیلف گورنمنٹ کے قابل نہیں ہے" جو اپریل ۱۹۱۰ء کی کنٹمپریری ریویو میں شایع ہوا۔ مصنف۔

ایسا نظام قایم کرنا چاہیئے جس کے ذریعہ سے عوام پر مسیحی اخلاق کے بموجب حکومت ہو سکے اگر یہ فرض کر لیا جاسے کہ ایک مصری پارلیمنٹ آزادی سے منتخب کیجا سے تو ظن غالب ہے کہ یہ پارلیمنٹ ایسا قانون وضع کرے گی کہ اگر بردہ فروشوں کی نہیں تو مالک غلاماں کی حفاظت ضرور منصور ہوگی اور اس کا بھی یقین نہیں ہے کہ انتخاب کنندگان راجپوتانہ اگر ان کو حسب دلخواہ عمل کا موقعہ ملے تو رسم ستی کو از سرِ نو جاری نکر دیں گے۔ حکومت کی خوبی یہ ہے کہ وہ کم و بیش قابل حصول نصب العین کو پیش کرے۔ قبل اس کے کہ اہل مشرق برطانوی نصب العین حکومت یعنی سیلف گورنمنٹ کے لگ بھگ کوئی شے حاصل کریں ان کو اپنے سیاسی خیالات کے بہت سے چولے بدلنے ہوں گے[1]" لارڈ کرومر بکمال یاس اس استدلال کو یوں ختم کرتے ہیں "غالباً یہ کبھی بھی ممکن نہ ہوگا کہ مشرقی کے گوشت خیز پوست مغربی رنگ میں کیسے رنگا جائے"[2]

---

[1] ہندوستان کی سیاسیات میں فرقہ بندی کی روح ذات و پات کی تفریق ہنوز ایسی رائج ہے کہ وسیع النظری پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اجتماع و اتفاق کے ترانے کیسے ہی بلند کیوں نہ گائیں جائیں لیکن ہر فرقہ دوسروں فرقوں کی بیخ کنی میں مصروف ہے اور اسی کو اپنی سب سے بڑی کارگذاری سمجھتا ہے۔ موجودہ سیاسیات میں حصّہ لینے والوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ان کا انتخاب محض ان کی خصوصی میلاں کی عصبیت پر منحصر ہے اور اسی لیے ڈر سے نکلنے کی کوشش کرنا لودر کنار۔ ہر موقع پر ان اختلافات کو شدید تر کیا جاتا ہے جو نام نہاد عارضی اتفاق کسی وقت قایم ہو جاتا ہے وہ محض مشترکہ نفرت یا ناراضگی پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ بنیاد تو بالکل ہی بر آب ہے اور اس سے کوئی مستقل نصب العین حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہندوستانیوں کو ہنوز کامل رواداری اور اتحاد باہمی کا سبق قرنوں میں یاد ہوگا جب تک ان کے دلوں سے فرقہ بندی اور خصوصی میلانات محو نہ ہوں گی حقیقی ترقی ناممکن۔ گاؤ کشی و محرم و رام لیلا کے فسادات اس پر شاہد ہیں۔ ہندو قوم کے دامن پر یہ کیسا بد نما دھبہ ہے کہ وہ انسان کو ایک جانور سے بدتر اور کمتر سمجھتے ہیں اسی طرح پر مسلمانوں کی ارکشی اور ضد سے ناقوس پر خفگی قابل ملامت ہے

(مترجم)

[2] گرومر کی سیاسی دلیلیں مضامین صفحہ ۲۷ لغایت ۲۸ مصنف

اور کم تنخواہوں کے عہدوں سے مطمئن نہیں رہ سکتے۔ ان لوگوں کو اس قسم کی حکومت سے جو بندشیں ان کو دیجا رہی ہے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ دراصل وہ نمائندگی کے نظامات کے خواہاں نہیں ہیں۔ جن کے ذریعہ سے وہ اپنے وطن کی حکومت میں حصہ لے سکیں۔ بلکہ جس چیز کے وہ متلاشی ہیں وہ اقتدار کی ہے۔ برہمن جن کی آبادی صرف پانچ فیصدی ہے اپنے آپ کو منجانب اللہ ملک کا حکمراں سمجھتے ہیں۔ اور دوسروں کو حق رائے دہندگی سے بھی باز رکھنا چاہتے ہیں۔[1] یعنی ہندوستان کا درمیانی طبقہ پانچار حق رائے دہندگی کے دینے میں ملک کی ۵ کروڑ رعایا کا اتنا ہی خیال کرے گا جتنا کہ اپنے کتے کا۔ یہ دولت برطانیہ ہی ہے جس نے باشندگان ملک میں مساوات حقوق اور مراعات پیدا کی۔ اور اس کو قائم رکھتی ہے۔[2]"

مغربی مبصرین کے علاوہ نیچ ذات ہندوؤں کو بھی جو مجموعی طور پر پست اقوام

---

[1] شودر۔ مصنف نے شودروں کو ملک کا درمیانی یا تاجر پیشہ طبقہ لکھا ہے یہ غلط فہمی ہے۔ گو وید میں آریوں کے تین اقسام لکھے ہیں یعنی پجاریوں اور فوجیوں کی ماتحت آریوں کا بڑا حصہ ویش کہلاتا تھا چنانچہ ژند اوستا کے اتھرون رتھیشتا و اور واستریا بلحاظ حیثیت و خدمت ویدوں کی برہمن راجن اور ویشیوں کی طبقات سے ملتی ہیں چنانچہ ژند اوستا کی مصطلحات بالا ویدوں میں ہی پائی جاتی ہیں یعنی اتھرون بمعنی پیشہ ور پجاری اور رتھن یا رتھی وید میں ملتی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آریوں میں یہ ذاتیں ہندوستانی اور ایرانی آریوں کی مفارقت سے پہلے قائم ہو چکی تھیں۔ زاں بعد ہندوستان کے اصلی باشندوں کی مفتوح ہونے سے ایک چوتھا فرقہ بالشدر پیدا ہو گیا۔ ویدوں میں اس فرقہ کے تفریق کو لفظ "ورن" سے بیان کیا گیا ہے جس کے معنی رنگ کے ہیں چونکہ یہ لوگ کالے تھے اور آریہ گورے تھے۔ لہذا رنگ حد فاصل تھا۔ مصنف نے شودروں میں ویشیوں کو بھی شامل کر کے ویشیوں کی ہستی کو فنا کر دیا ہے۔ (مترجم)

[2] ریورینڈ جے۔ پی۔ جونس کا "ہندوستان کی موجودہ حالت" جو جولائی ۱۹۱۰ء کے جنرل آف ریس ڈیولپمنٹ میں شائع ہوا۔ مصنف

سراب سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے۔"[1]

یورپی حکمرانوں کی امتحاناً عطا کردہ ابتدائی مدارج سیلف گورنمنٹ مثلاً مجلس شوریٰ کو جس طور پر مشرقیوں نے استعمال کیا ہے اس سے اکثر مبصرین بالخصوص عمال مستعمرات کو نہایت مایوسی ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے خدمات مفوضہ کو انجام دینے کی بجائے ان کو سیاسیات کا تماشہ بنانے اور مزید اختیارات کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا۔ چنانچہ لارڈ کچنر نے اپنی سنہ ۱۹۱۲ء کی رپورٹ متعلق حالات مصر میں بیان کیا "نمائندوں کی جماعتوں میں بلا اندیشہ اسی وقت ترقی ہو سکتی ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے موجودہ فرائض پورے طور پر ادا کر سکتے ہیں۔ اور اس کی قوی امید ہو کہ وہ اہم تر اور دشوار تر ذمہ داریوں کا بار بھی اپنے سر لے سکتے ہیں۔ اگر حکومت معوثین اپنی سادہ ترین صورت میں بھی ناقابل عمل ہو تو اس کی قطعی امید نہیں کہ مزید توسیع کے بعد وہ زیادہ کارآمد ہوگی کوئی حکومت ایسی لایعقل نہ ہوگی کہ چونکہ مجلس شوریٰ معقول اور قابل اطمینان طور پر اپنے فرائض انجام دینے کے ناقابل ثابت ہوئی لہذا اس کو مزید اختیارات اور اقتدار دیا جائے۔"[2]

قوم پرستی کی موجودہ شورشیں خواہ ان جاہل عوام کو برانگیختہ کرتے ہیں لیکن یہی کامیاب ہو جاتی ہیں جو اکثر روشن خیال یورپی حکومت کے مادی فوائد سے بالکل مطمئن ہیں حقیقتاً ان کا تعلق طبقہ اعلیٰ کی دلچسپیوں اور مغربی تعلیم یافتہ منتخبین سے ہے۔ چند سال ہوئے کہ اس بات کو ایک امریکی سرآوردہ پادری نے جسے ہندوستان کا عمر بھر کا تجربہ تھا خوب لکھا ہے "ہندوستان کے عوام فی الجملہ موجودہ حکومت سے بیش از بیش خوش ہیں۔ یہ زیادہ تر جماعات ہیں جو بے چینی کا اظہار کرتی ہیں۔ اگر فتنہ انگیز عوام کو نہ چھیڑیں تو باشندگان ہند سے زیادہ وفادار کوئی قوم روئے زمین پر نہ ملے گی لیکن تعلیم یافتہ طبقہ میں جدید سیاسی تمنائیں پیدا ہو گئی ہیں اور وہ اب کم ذمہ داری کے مناصب

---

[1] ای ہیرسی ابر کی کتاب "لیبلی مسئلہ" صفحہ ۲۲۰ مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۰۸ء مصنف

[2] "مصر" سنہ ۱۹۱۲ء صفحہ ۲ مصنف

بہت سے مسلمان اور نیز ہنود اس کو محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان ہنوز سیلف گورنمنٹ کے قابل نہیں ہوا ہے۔ نیز یہ کہ اگر برطانوی اقتدار فی الحال مستقبل قریب میں کم ہو جائے تو خود ہندوستان کے لئے بڑی مصیبت ہوگی۔ وفادار مسلمان جن اصول پر قوم پرستوں کی شورش کو ناپسندیدہ سمجھتے ہیں ان کو صلاح الدین خدا بخش نے واضح طور پر بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "خواہ یہ میرا رویہ صحیح ہو یا غلط لیکن میں ہمیشہ موجودہ ہندوستانی سیاسیات سے الگ رہا اور ہمیشہ سے میری رائے یہی ہے کہ ہم کو سیاسیات کی طرف کم اور معاشرتی مسائل اور ذہنی ترقی کی طرف زیادہ متوجہ ہونا چاہیے کیونکہ ہماری موجودہ حالت کے لحاظ سے یہ سیاسیات قطعاً مضر ہیں۔ میری پختہ رائے ہے کہ ہمارا مفاد اسی میں ہے کہ ہم سیاسیات سے بالکل کنارہ کش رہیں.....
یہ ان معدود چند اشخاص کا کام نہیں ہے جو مغربی تعلیم و تہذیب سے بہرہ اندوز ہیں بلکہ عوام کا کام ہے کہ وہ اپنے معاملات کو سوچیں سمجھیں، ہوشیاری سے اس میں دلچسپی لیں تعلیم یافتوں کی بہت قلیل جماعت ہی تو آخر ہندوستان کی کل آبادی نہیں ہے۔ لہذا یہ عوام ہی ہیں جن کو تعلیم و تربیت دیکر راستبازی اور خدمت عظمیٰ کی مامون سطح پر لانا چاہیے یہ منزل مقصود ہنوز بہت دور ہے۔ اور جب تک ہم اس درجہ پر نہ پہنچیں گے ہماری امیدیں خواب و خیال اور ہمارے مساعی بیکار۔ اور فریب باطل ہیں۔ تعلیم یافتہ جماعت اقل نے بھی اپنی سیاسی رضاعت کے تنگ ملبوس کو ہنوز نہیں اتارا ہے۔ اور نہ جاہ طلبی کے فریب اور حصول ثروت کی تمناؤں سے برتر ہوئے ہیں ہم کو ابھی صیانت اصول اور استقامت عمل کا درس لینا ہے جبتک ہم اپنے ملک و قوم کے مفاد کو ذاتی اغراض سے کمتر سمجھیں گے ہم کو انفرادی اور اجتماعی اخلاق کے معیار کے بلند کرنے کی امید نہیں ہو سکتی۔"

سلہ بخش کے مضامین ہندوستانی اور اسلامی صفحہ ۲۱۳ و ۲۱۴ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۲ء۔ مصنفؔ

کہلاتے ہیں یہ خوف لگا ہوا ہے کہ اگر ہندوستان برطانوی تسلط سے خلاصی پا جائے۔ تو ظالم برہمنوں کی جماعت (قبل اس سے ذاتی نفع اٹھائے گی۔ یہ اقوام ہندوستانی قوم پرستوں کی شورش کی مخالفت اس وجہ سے کرتی ہیں کہ مبادا جو امن ان کو برطانوی راج میں حاصل ہے وہ بھی نہ جاتا رہے۔ ان کا خیال ہے کہ قبل اس کے کہ ہندوستان آزادی کا یا ہوم رول کے قابل ہو پشت ہا پشت کی تعلیم اور معاشرتی اصلاح کی ضرورت ہے۔ ان لوگوں نے ایک با اقتدار جماعت "عامہ" کے نام سے قایم کی ہے جو قوم پرستوں کی مخالف اور گورنمنٹ کی وفادار ہے۔

ناسرکے نقطۂ خیال کو ان کے سرگروہ ڈاکٹر نائر نے خوب بیان کیا ہے وہ کہتا ہے "جمہوریت کا لفظ بحیثیت ایک افسوں کے ہندوستان تک پہونچ گیا ہے۔ اور عام طور پر استعمال ہوتا ہے لیکن جمہوریت کی روح ہنوز سویز کے مشرق سے آگے نہیں بڑھنے پائی ہے۔ اور نہ ایک ایسے ملک میں جہاں ذات مستقلاً اقامت گزیں ہے مشکل جگہ سکے گی۔ میں کسی خاص ذات کو نیچ ذاتوں پر ظلم کرنے کا ملزم قرار دینا نہیں چاہتا۔ اس میں سبھی اونچی ذاتیں شریک ہیں۔ برہمن کل غیر برہمنوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اور غیر برہمن اونچ ذاتیں اپنے سے کمتر ذاتوں پر ظلم کرتے ہیں۔ ہم حقیقی جمہوریت کے خواہاں ہیں نہ کہ کسی خاص طبقہ کی حکومت کے۔ گو کہ کیسے ہی شاندار الفاظ میں کیوں نہ دھوکا دیا جائے۔ علاوہ بریں اگر اس وقت ہندو دین کی حکومت قایم ہو گئی تو ہمیشہ رہے گی۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم فوری ہندو دین کی حکومت پر دیر میں حاصل ہونے والی جمہوری حکومت کو ترجیح دیں گے۔ کیونکہ ہم کو ہمدرد برطانوی دفاتر پر اُن غیر ہمدرد اونچ ذاتوں کے مقابلہ میں زیادہ اعتماد ہے جو ماضی میں ہم پر ظلم کرتے رہے ہیں۔ اور برطانوی گورنمنٹ کی عدم موجودگی میں ہم پر بے خبر ظلم کریں گے۔ ہمارا یہ طرز عمل صرف ہمارے یقین پر نہیں بلکہ خلقی خود حفاظتی کی بنیاد پر ہے۔"

سلہ ڈاکٹر ٹی۔ مادون نائر کا مضمون "ذات اور جمہوریت" جو اکتوبر ۱۹۱۷ء کی اڈنبرا ریویو میں شایع ہوا۔ مصنف

چاہیے جو زیادہ امید افزا روش اختیار کرتے ہیں۔ بعض ماہرین اسلام کے میلانات آزاد خیالی پر بڑا زور دیکر یہ کہتے ہیں۔ کہ ان میلانات کی بنیاد پر موجودہ مفہوم کے مطابق سیاسی تعمیر اٹھائی جائے۔ وامبیری کہتا ہے "اسلام اسوقت بھی دنیا میں سب سے زیادہ جمہوری مذہب ہے یعنی یہ ایسا مذہب ہے جو حریت اور مساوات کا حامی ہے۔ اگر کبھی بھی کوئی دستوری حکومت تھی تو وہ خلفاء راشدین کی تھی"[1] "مشرق ادنٰے کا ایک بڑا انگریز ماہر بیان کرتا ہے "جمہوری سلطنت کی حقیقی اور صحیح تصویر قبائل عرب ہی میں ملے گی۔ اور عرب قبایہ کا ہر فرد اس جمہوریت کے قیام کے لئے ہر وقت مسلح رہتا ہے جیسا کہ بہت سے شخصی حکومت کے خواب دیکھنے والے بہت کچھ کھو کر واقف ہو گئے ہیں"[2] ۱۹۰۸ء کے نوجوان ترکوں کے انقلاب کی بابت پروفیسر لیبی آبر لکھتا ہے "ترکی سلطنت نظامات پارلیمنٹ کے لئے ایسی غیر مستعد نہ تھی جیسا کہ اگاہ اول میں معلوم ہوتا ہے حکومت معہودہ کے لئے وہاں کچھ تو سابقہ مثال موجود تھی یاں اور دیرینہ خواہش مخفی طور پر موجود تھی ترکی کے دینی و دنیوی نظامات دونوں میں پارلیمنٹ کی مثالیں متضمن تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عقلمند ترین اصحابؓ سے مشورہ فرماتے تھے۔ علماء بھی زمانہ موجودہ تک باہم مشورہ کرتے رہے ہیں۔ قانون مقدس یعنی اسلامی شریعت اصلاً جمہوری ہے۔ نیز اور اصلاً مطلق العنانی شخصیت کے خلاف ہے۔ ہر مسلمان کو اسی اصلی قانون سمجھنے کی عادت ہو جاتی ہے جاہل سے جاہل مسلمان میں دستوریت کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے" وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ابتدائی زمانہ کے سلاطین "دیوان" یعنی افسران اعلٰی کی اجتماعی مجلس منعقد کرتے تھے، اس مجلس کے جلسے سلاطین کو اطلاع و مشورہ دینے کے لئے باقاعدہ ہوتے تھے اور زمانہ حال میں مجلس مشیران سلطنت اور مجلس وزراء

---

[1] وامبیری کی کتاب "موجودہ اور چالیس سال قبل کی ترکی" صفحہ ۵۸ مصنف

[2] جی۔ ڈبلیو۔ بری کی کتاب "اتحاد پس السلام" صفحہ ۲۰۲ و ۲۰۳ مطبوعہ لندن ۱۹۱۹ء۔ مصنف

دیسی آبادی کے بڑے حصہ کے اس قسم کے بڑے اعلانات سے وہ آزاد خیال انگریز ماہرین معاملات ہند بھی دم بخود ہو جاتے ہیں جن کو ہوم رول کی ضرورت کا اصول یقیناً ہے۔ چنانچہ ان خیالات کا ایک شخص ایڈون بوان کہتا ہے: "جب ہندوستانی قوم پرست مطالبہ آزادی کرتے ہیں تو اس کا منشا خود مختاری ہے وہ اجنبیوں سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں ہمارا جواب جیسا کہ اصلاحات میں درج ہے[1] یہ ہے "ہاں تم کو خود مختاری ملے گی لیکن ایک شرط یہ کہ تم کو جمہوریت بھی لینا ہوگی۔ جس وقت ایسی ہندوستانی قوم پیدا ہو جائے گی جو اپنے دیسی حکمرانوں پر قابو رکھ سکے ہم فوراً ہی اپنا تسلط اٹھا لیں گے۔ لیکن ہم اس اختیار کو ہندوستانی حکومت معدودین کو نہ دیں گے" یہ ان دو فریق کے درمیان میں اختلاف کی اصل جڑ ہے جن میں سے ایک فریق یہ کہتا ہے کہ ہندوستان کو فوراً سیلف گورنمنٹ مل جائے اور دوسرا کہتا ہے کہ ہندوستان صرف امتداد زمانہ سے سیلف گورنمنٹ کے قابل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سیلف گورنمنٹ سے اول الذکر کی مراد خود مختاری ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان فوراً ہی خود مختار ہو سکتا ہے اگر آج تسلط اغیار ہٹا لیا جائے تو کسی نہ کسی قسم کی دیسی سلطنت یا منتشر حکومتیں کچھ زمانہ کی گڑبڑ کے بعد ہندوستان میں پیدا ہو جائیں گی لیکن یہ جمہوری سلطنت نہ ہوگی بلکہ سب سے طاقتور یا سب سے ہوشیار اشخاص کی مطلق العنان حکومت ہوگی[2]"

اقتباسات بالا سے ان مشرقی و مغربی ناقدین کا نقطہ خیال منکشف ہو جاتا ہے جو اس کا ادعا کرتے ہیں کہ کم از کم فی الحال یا مستقبل قریب میں مشرق ادنیٰ و وسطیٰ کی اقوام ہمارے مفہوم کے مطابق سیلف گورنمنٹ کے ناقابل ہیں۔ اب ہم کو ان اشخاص کے خیالات پر غور کرنا

---

[1] یعنی مانٹیگو چیمسفورڈ کی رپورٹ جو برطانیہ نے ہندوستان کو مزید سیلف گورنمنٹ کے اختیارات عطا کئے ہیں۔

[2] ای۔ بی ۔ ان کا مضمون "ہندوستان میں اصلاحات" ۲۶ جنوری ۱۹۲۰ء کے دی نیو یورپ سے شائع ہوا ہے۔ مصنف

کیا بلکہ صدیوں کا نتیجہ ہو۔ ہمیں علم ضابطہ کی کمی کا لحاظ رکھنا چاہئے کیونکہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ مجلس فی الجملہ ایرانی قوم کے جذبات اور صحیح نصب العین اور توقعات کی نمایندگی کرتی تھی۔ اس کے ممبروں کی تعلیم اوسط درجہ سے زیادہ تھی۔ اور ان میں سے بعض نے قابل تعریف قابلیت، اخلاقی جرات و ہمت دکھائی۔ انھوں نے حب وطن کے متعلق ہر ایسی تجویز کا پر جوش خیر مقدم کیا جو ان کے سامنے پیش کی گئی۔ انھیں خود گورنمنٹ کے مالیات سے بڑی واقفیت نہ تھی لیکن موقعہ کی نزاکت کا احساس ضرور تھا۔ اور وہ ہر ایسے ممالک غیر کے مشیر پر پورا اعتماد کرنے کو مستعد اور خواہشمند تھے جو اپنے آپ کو سیاسی چالوں اور رشوت ستانی سے محفوظ رہنے اور ایرانی قوم کی بہبودی کے لئے کام کرنے کے قابل ثابت کرے۔"

"کوئی پارلیمنٹ بجا طور پر ناقابل نہیں کہی جا سکتی جبکہ ایک پوری قوم اس کی معین ہو اور وہ خود اپنے حدود سے بھی واقف ہو اور اس کے اراکین اپنی قومی منزلت اور حقوق سلطنت کے لئے بڑی قربانیاں کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔"

"اب رہے اہل ایران نوان کی بابت کوئی کلیہ بیان کرنا مشکل ہے۔ آبادی کا بڑا حصہ دہاقین اور اہل قبائل ہیں جو سخت جاہل ہیں۔ برخلاف اس کے ہزاروں ایسے ہیں جنھوں نے ممالک غیر میں تعلیم پائی ہے یا گھر پر تعلیم ختم کرنے کے بعد ممالک غیر میں سیاحت کی ہے۔ انھوں نے بالکم از کم ان کے بعض افراد نے جنھیں عوام کی مدد حاصل تھی یہ ثابت کر دیا کہ ان میں مغربی تہذیب اور نصب العین کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے باوجود بے شمار موانع کے انھوں نے شخصی حکومت کو جمہوریت میں بدل دیا۔ حالات میں اس حد تک یکسانی کر دی گئی تھی کہ ہر شخص جس میں جوہر قابلیت موجود ہو اونچے منصب تک پہونچ سکتا تھا۔ گزشتہ پانچ سال میں انھوں نے قومی حیثیت سے حصول تعلیم کی عدیم المثال سرگرمی دکھائی دستوری حکومت کے عہد میں صدہا مدارس قایم ہو گئے۔ چشم زدن میں قابل تعریف آزاد مطابع پیدا ہو گئے اور بیجوف

بھی نہیں تھی ۱۸۷۶ء کی پارلیمنٹ کی مثال بھی موجود تھی۔ اگرچہ یہ پارلیمنٹیں ناکامیاب رہیں اور ان کے بعد حمیدی مطلق العنانی کا دور رہا۔ ان قانونی مثالوں کی یاد دل سے کبھی نہ محو ہوئی ان جملہ امور سے پروفیسر لیبی ایر یہ نتیجہ نکالتا ہے "لہذا ترکی پارلیمنٹ کو بالکل جدت ہی نہ سمجھنا چاہیے بلکہ یہ نظامات معلومہ کی توسیع[1] و ترقی ہے۔"

ڈبلیو مارگن شوسٹر امریکی جسے ایرانی انقلابی گورنمنٹ نے ملک کے مالیات کے انتظام کو بلایا تھا اور جسے روسی و برطانوی دباؤ کی وجہ سے ایک سال سے کم عرصہ میں مستعفی ہونا پڑا ایرانی قوم کی سیاسی قابلیت کی بابت امید افزا خیال یوں ظاہر کرتا ہے "مجھے یقین ہے کہ تاریخ عالم میں ایسی کوئی مثال نہیں ہے کہ کسی قوم نے دفعتاً مطلق العنان بادشاہی کو دستوری یا جمہوری کی سلطنت میں تبدیل کیا ہو اور سیاسی صیانت اور ضوابط حکمرانی کے علم کا اعلیٰ معیار فوراً ہی ظاہر کیا ہو یہ نہ قیاس میں آسکتا ہے اور نہ کوئی معقول پسند اس کی امید کرسکتا ہے پہلی مجلس[2] کے ممبران کو قیام پارلیمنٹ کے پہلے ہی دن سے اپنی ہستی کے لئے لڑنا پڑا ان کو نہ قانون سازی کے کام کو سنجیدگی سے بجا لانے کا موقعہ ہی ملا اور نہ اس کی ذرا بھی امید تھی کہ جو قانون وہ بنائیں گے اوس کا نفاذ بھی ہوگا۔"

"دوسری اور آخر مجلس جس کے تقریباً کل ممبروں سے بذات خود میں واقف تھا اگر اس کا مقابلہ برطانوی پارلیمنٹ یا امریکہ کی کانگریس سے کیا جائے تو بلاشبہ ناقابل تھی یہ امر حیرت انگیز ہوتا کہ ایک ایسے ملک میں جو عرصہ دراز سے انحطاط میں مبتلا ہو ایک بالکل جدید اور غیر آزمودہ حکومت ابتدا ہی سے اپنے فرائض ان سلطنتوں ہی کی طرح بخوبی انجام دیسکے جنہیں الپشت ہا پشت

---

[1] اے۔ ایچ لائبیر کا مضمون "ترکی پارلیمنٹ" جو امریکہ کی پولیٹیکل سائنس ایسوسی ایشن کی جلد ہفتم صفحات ۶۰ – ۷۶ میں ۱۹۱۳ء میں شایع ہوا۔ مصنف

[2] ایرانی پارلیمنٹ کو مجلس کہتے ہیں۔ مصنف

قسط بندی گئی۔ یہ عملی تجربے کے کارخانے میں ہی ہوسکتا ہے کہ انتخاب کنندگان خواہ کتنے ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہوں سیلف گورنمنٹ کے فن کو سیکھ سکیں،،

،، میں اسپر زور دیتا ہوں کہ حلقہ ہائے انتخاب کو اختیارات دئے جائیں۔ عمال سلطنت[۱] جدید صاحبان اختیار کو ان کی استدعا پر ہر قسم کی مدد اور مشورہ دیں ان جدید صاحبان اختیار کے ساتھ عمال حکومت کا سلوک رضاعی ماں کا ایسا ہونا چاہیئے نہ سوتیلی ماں کا ایسا اور اگر جدید منصبداران کو ذمہ دار حکومت کا فن سیکھنا ہے تو وہ نگرانی بالادست سے بالکل آزاد رہیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو وہ اپنے آپ کو انتخاب کنندگان [۲]ــین کا ذمہ دار نہ سمجھیں گے۔ اور نہ انتخاب کنندوں کو اس کا سبق ملیگا کہ ان کی تکالیف کا علاج خود انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ اس میں مصائب تو ہونگے لیکن ان مصائب اور خود کردہ اور غالباً دیرپا مصائب ہی سے ایک قوم میں خود اپنی امداد کی لیاقت اور صحیح جماعت انتخاب کنندگان پیدا ہوسکتی ہے ،،

،، یہ خیال میرے لئے باعث فخر ہے کہ انگلستان نے ہندوستان میں امن و امان پیدا کرکے بہت نفع پہونچایا۔ اور ہندوستان کو دکھایا کہ باضابطہ حکومت کا کیا مطلب ہے۔ لیکن اس درجہ کے حصول کے بعد مجکو یہ یقین نہیں ہے کہ موجودہ نظام قومی خصایص کو بلا ضرر پہونچائے جاری رکھا جاسکتا ہے اب یہ بار امانت قسط بہ قسط انگریزی کنندوں سے ان ہندوستانی کنندوں پر اسطرح منتقل ہونا چاہیئے کہ وہ اسکے متحمل ہوسکیں اونکی قوت اور تعداد میں ترقی دینا چاہیے لیکن یہ اسیوقت ہوسکتا ہے کہ ان کو عملی ذمہ داری کے کام کرنے کا موقعہ دیا جائے۔ اور اس میں اُنکی طاقت کے موافق بتدریج ترقی کیجائے۔ یہ کسی نصاب تعلیم مدارس سے حاصل نہیں ہوسکتا گو درسی تعلیم اس عمل کے لئے لازمی ہے۔ ،،

،، وزیر ہند کے حال کے اعلان میں جو منزل مقصود معین کی گئی ہے اس تک رسائی دشوار ہوں

---

[۱] یعنی برطانوی حکومت ہند کے عمال مصنّف

[۲] یعنی مانٹیگو چیمسفورڈ کی اصلاحات مذکورۂ بالا مصنّف

اہل قلم آمادہ ہو گئے کہ وہ ہر ظلم و تعدی کا پردہ فاش کریں چاہے وہ اہل ملک کی طرف سے ہو یا اغیار کی۔ ایرانیوں کو سب سے زیادہ جدید ترین اور ترقی یافتہ اقوام کے سیاسی اخلاقی اور کاروباری قوانین کے اختیار کرنے کی فکر تھی۔ ان کے قلوب میں ایشیائی بیچینی کا وہی جوش موجزن تھا جو ہندوستان میں ساری و طاری ہے اور جس نے نوجوان ترکوں کی تحریک پیدا کی اور حال میں وہ چینی جمہوریت کے شکل میں ہویدا ہوا۔[1]"

مسٹر شوسٹر خاتمہ پر کہتے ہیں "کیپلنگ نے اشارۃً بتایا ہے کہ تم مشرق کو تیز نہیں بنا سکتے اس میں ایک تنبیہ اور سرزنش متضمن ہے۔ مغربی اشخاص اور مغربی النصب العین مشرق کو حرکت میں لا سکتے ہیں بشرطیکہ مشرقیوں کو یہ احساس ہو جائے کہ وہ جس راستہ پر چلائے جا رہے ہیں وہ عملاً انھیں کے نفع کے لئے ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اخلاقی جذبات اور قومی و ملکی مفاخرت کے احساسات مشرق میں اسی قدر مضبوط ہیں جیسا کہ مغرب میں اگرچہ اس قدر نمایاں نہیں ہے۔ جب مشرقی ایسے راستہ پر ڈالدیئے جاتے ہیں جو صرف مغرب والوں کے لئے مفید ہے۔ تو وہ قدرتی طور پر بڑا شوق نہیں دکھاتے۔[2]"

فی الحقیقت بہت سے مغربی آزاد خیالوں کو یقین واثق ہے کہ یورپی حکومت کتنی ہی رعیت پرور اور قابل کیوں نہ ہو مشرقی اقوام کو کبھی بھی حقیقی سیلف گورنمنٹ کیلئے تیار نہ کرےگی اور حقیقی سیلف گورنمنٹ کے سیکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے یعنی انھیں خود آزمائش کا موقعہ دیا جاوے۔ اس نقطہ خیال کو مشہور و معروف برطانوی ماہر سیاسیات لیونل کرٹس نے نہایت قابلیت سے بیان کیا ہے ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر کرٹس کہتے ہیں۔ کہ تعلیم اور اسی نوع کے دیگر فوائد جو ہندوستان کو برطانوی حکومت نے پہونچائے ہیں وہ خود ہندوستانیوں کو ذمہ دار حکومت کے کام کیواسطے تیار کرتے ہیں کار آمد ہونگے برخلاف اس کے تعلیم ایک خطرہ اور صریح خرابی ثابت ہوگی۔ اگر اسکے ساتھ سیاسی ذمہ داری کی ایک معین

---

[1] شوسٹر کی کتاب "اختناق فارس" مصنف

[2] مذکور الصدر مصنف

فصل پنجم

"قوم پرستی"

قوم پرستی کی روح عہد حاضرہ کے بڑے قوائے محرکہ میں سے ہے۔ یوروپ میں (جہاں یہ اولاً خود شناس بلوغ کو پہنچی) اس نے اُنیسویں صدی میں واقعات کی شکل کو بالکل بدل دیا۔ چنانچہ اس صدی کو اکثر "قوم پرستی کا عہد" کہتے ہیں۔ لیکن قومیت کا یہ احساس محض یوروپ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کے بعید ترین گوشوں تک میں پھیل گیا ہے اور بظاہر اُس کے ذریعہ سے اہم تر انقلاب ہونا مقدر ہے۔
ایسے اہم قسم کے ہیولیٰ کو تسلیم کرنے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوم پرستی کیا ہے؟ عجیب بات یہ ہے کہ اس مسئلہ پر بے انتہا بحث ہوئی ہے۔ بہت سے اصول پیش کیے گئے جن میں مختلف طور پر یہ کوشش کی گئی کہ قوم پرستی کو زبان یا تمدن۔ نسل۔ سیاسیات۔ جغرافیہ۔ معیشت یا مذہب سے تعبیر کیا جائے۔ ممکن ہے کہ یہ اور نیز دیگر امور قومی احساس کے تعمیر کے اجزاء ترکیبی یا اسباب حمایت ہوں لیکن بنتیجہ تحلیل میں قومیت اپنی اجزاء ترکیبی سے کچھ برتر اور بہتر شے ہے جو ان اجزاء ترکیبی سے ایک جدید اور وسیع تر مرکب بناتی ہے۔ باوجود اُن تمام دلائل کے جو اس کے صحیح معنوں کے متعلق پیش کیئے گئے ہیں قومیت فی نفسہ کوئی معما یا راز سربستہ نہیں ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ قومیت ایک دماغی کیفیت ہے اور بہت بڑی تعداد افراد کے اس عقیدہ کا نام ہی کہ اُن سے ایک قوم بنتی ہے؛ یہ من حیث القوم باہمی تعلق کا احساس ہے۔ یہ "قوم" جس طور سے اپنے معتقدین کے ادراک میں متصور

نے سامنے ہوگی۔ گو ہمارے سامنے مشکلات کا زمانہ ہے۔ لیکن ہندوستان میں ہمارا کام اس درجہ پر پہونچ گیا ہے جو ہماری روایات کے مطابق ہے یہ کام ایسا ہے جو ہمارے تاریخ کے اس دور کے شایاں ہے خواہ اسکی وجہ صرف یہی ہو کہ اس میں اپنا مٹانا مقصود رہے۔"

مسٹر کرٹس کے آخری الفاظ اس امر کی پیشنگوئی کر رہے ہیں جو حقیقتاً نہ صرف ہندوستان میں بلکہ مشرق کے دیگر حصص میں بھی جاری ہے۔ جنگ عظیم نے مشرقی قوم پرستوں کے توقعات کو ایسا قوی اور یورپی اقتدار و قوت کو ایسا ضعیف کر دیا ہے کہ مشرق پر یورپ کا تسلط عام طور پر کم ہو رہا ہے۔ اس کا نتیجہ برا ہو یا اچھا لیکن بظاہر یہ ناگزیر ہے۔ ایک پشت یا ایک قرن کے بعد مشرق ادنے و وسطے کا بڑا حصہ خود مختار یا بالکل آزاد ہو جائے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا آزاد شدہ اقوام اپنے مواقع کا برا استعمال کر کے شخصی حکومت یا طوائف الملوکی میں مبتلا ہوں گے یا باقاعدہ اور ترقی کن اور دستوری حکومتیں قایم کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ ہمنے اس مسئلہ کے اطراف و جوانب کے مخالف و موافق پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے اور ہم اس مسئلہ کو اس حالت میں چھوڑتے ہیں جسطرح پر آجکل یہ عملی طور پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ یعنی اس کے بعد کیا ہوگا؟

سے لیونل کرٹس کے خطوط بنام باشندگان در بارہ حکومت ذمہ دار صفحہ ۱۵۹ و ۱۶۰ مطبوعہ لندن ۱۹۱۸ء مصنف

گزشتہ جنگ قوم پرستانہ صور کے لیے بالخصوص جہاں تک اُن کا یورپ پر اطلاق ہوتا ہے ایک نہایت اچھا سبق تھی جس سے قومیت کی بابت بہت سی غلط فہمیاں رفع ہوگئیں۔ اس کی بابت سوئٹزرلینڈ کی مثال کو نقل کردینا کافی ہے۔ یہ ایسا ملک ہے جس کی ہستی ہی ایسے معیاروں کا بطلان کرتی ہے جیسے زبان۔ تمدن۔ مذہب یا جغرافیہ اور اس پر بھی اس کا قومی احساس اس ہنگامہ رستخیز کے سخت امتحان میں کامیاب ہوا۔

ان امور کا عوام کو ایسا کافی علم ہے کہ یہاں پر صرف ایک ہی بات پر زور دینا کافی ہے یعنی قومیت اور نسل میں کیا فرق ہے؟ بدقسمتی سے ان دونوں اصطلاحات کا اگر بطور مرادف کے نہیں تو نہایت لاپروائی سے استعمال کیا گیا ہے اور موجودہ تخئیل میں ہنوز اس بارہ میں بہت ابتری ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ان اصطلاحات سے بالکل مختلف امور مراد ہیں۔ قومیت ایک ذہنی ادراک یا دماغی کیفیت ہے۔ نسل ایک جسمانی واقعہ ہے جس کی صحیح تحقیق علمی آزمائش سے ہوسکتی ہے مثلاً کاسہ سر کی پیمائش۔ بالوں کی ساخت اور آنکھوں اور کھال کا رنگ۔ بہ الفاظ دیگر انسانوں کی جو کیفیت جسمانی ساخت کے لحاظ سے ہے اُسے "نسل" کہتے ہیں اور جماعت جو کچھ اپنے آپ کو سیاسی طور پر سمجھتی ہے اُسے "قومیت" کہتے ہیں۔

اسی موقع پر ہمکو ایک نہایت بعید از فہم مسئلہ سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نسل اور قوم میں نسل زیادہ اصلی اور فی الجملہ اہم تر شئے ہے۔ ہر شخص کی جبلّی قابلیت بظاہر اُس کے موروثی اوصاف پر مبنی ہے اور اُس کا ماحول کتنا ہی جوش انگیز کیوں نہ ہو لیکن اُس کی پیدائش ہی پر اس ماحول سے اُس کے تطابق عمل کے امکانی حدود مقرر ہوجاتے ہیں۔ بااین ہمہ واقعہ یہ ہے کہ عام طور پر

پہنچتی ہے وہ ایک آبادی یا جماعت ہے جو ایک حکومت کے ماتحت آپس میں مجتمع اور منضبط ہیں اور ایک جداگانہ قطعہ ارض میں ملکر رہتی ہیں۔ جب قومی نصب العین حاصل ہو جاتا ہے تو ماحصل سیاسی جماعت یا "سلطنت" کہلاتا ہے۔ ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ "سلطنت" ایک ایسے نصب العین کا مادّی اظہار ہے جو ممکن ہے پشتہا پشت سے محض ایک نیک آرزو کی حیثیت سے موجود ہو لیکن اس کی ظاہری صفات مثلاً شاہی حکومت یا ارضی سرحدیں موجود نہوں۔ بالعکس ہمکو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر سلطنت ایک قوم ہو چنانچہ ہیپس برگ[۵] خاندان کی مردہ سلطنت آسٹریا ہنگری اس پر شاہد ہے۔ یہ سلطنت متضاد قومیتوں کا اجتماع تھی جو جنگ کے تصادم سے پاش پاش ہوگئی۔

---

[۵] ہیپسبرگ یا ہیبسبرگ۔ امرا جرمنی میں سے ایک خاندان کا نام وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ۱۰۲۰ء میں جو قلعہ دریائے آر کے کنارے ہیبسبرگ کا بنا اس کے مالک تھے روڈلاف آف ہیپسبرگ ۱۲۷۳ء میں مقدس رومی شہنشاہ ہوا اور اس نے تیرھویں صدی میں آسٹریا حاصل کی۔ اس کی اولاد بھی مختلف اوقات میں شہنشاہ رہی اور ۱۴۳۸ء سے متواتر اسی خاندان میں شہنشاہ کا خطاب رہا۔ لیکن اس خاندان نے الحاق ممالک میں بڑی شہرت حاصل کی۔ چونکہ توریث میں ملک تقسیم ہو جاتا تھا لہذا کبھی کبھی یہ خاندان کمزور ہو جاتا تھا لیکن فریڈرک سوم اور میکسیملین کے عہد میں متحد ہو گیا ۱۴۷۷ء میں برگنڈی کے شمول سے یہ بڑی یوروپی سلطنت ہوگئی۔ شارل پنجم کے زمانہ میں اسپین بھی شامل سلطنت ہوگیا لیکن جب اس نے سلطنت ترک کی تو اسپین اس کے لڑکے کو اور آسٹریا اس کے بھائی فرڈیننڈ کو ملا۔ اسپین کا سلسلہ نسل ختم ہوگیا اور شاہ آسٹریا نے وراثت کا دعویٰ کیا لیکن فرانس سے جنگ ہونے کی وجہ سے اسپین کا تخت نشین خاندان بوربون سے ہوا ۱۷۴۰ء میں آسٹروی خاندان کا بھی سلسلہ ذکور ختم ہوگیا اور شارل ششم کی لڑکی میریا تھریسا وارث ہوئی اسکی شادی فرانسیس ڈیوک لورین سے ہوئی جو ۱۷۴۵ء میں شہنشاہ ہوا۔ اس وقت سے ۱۸۰۶ء تک اس خاندان میں مقدس رومی شہنشاہ رہے اور ۱۹۱۸ء تک آسٹریا کے شہنشاہ رہے۔ مترجم

ایسی منتشر اور مخلوط ہیں کہ ہر یورپی قوم ان نسلوں میں سے کم از کم دو اور بعض تینوں نسلوں سے مرکب ہیں لہذا یوروپی جنگ صحیح معنی میں نسل کی لڑائی قطعاً نہ تھی بلکہ ایک ہی خون کے رشتہ داران قریبی کی خانہ جنگی تھی۔

اگرچہ اکثر تعلیم یافتہ یوروپی یہ باتیں ۱۹۱۴ء کی جنگ سے پہلے سے جانتے تھے لیکن اس سے ذرا بھی فرق نہ پڑا۔ وجہ یہ ہے کہ اکثر یوروپی اپنے آپ کو بالکل مختلف زمرۂ نسل کا جانتے ہیں اور اپنے آپکو "ٹیوٹن"، "لاطینی" یا "سلافی"، یا "اینگلوسیکسن" نسل کا سمجھتے ہیں۔ یہ امر بالکل غیر متعلق ہے کہ ان نام نہاد "نسلوں" کا کوئی وجود ہی نہیں ہے بلکہ فی الحقیقت زبان اور تمدن

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴) (۶) حدیدیہ وسطی ۴۵۰ء لغایت ۵۰ء (۷) حدیدیہ جدیدیا ہجری قزاقوں کا زمانہ آٹھویں لغایت گیارہویں صدی۔ اس سے کوئی حقیقی تقسیم دہور مقصود نہیں ہے بلکہ انسانی تہذیب کے مختلف مدارج دکھائے گئے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ ممکن ہے کہ ایک ملک میں حجری عہد ہو اور دوسری میں یہ بھی۔

عـ۱ ٹیوٹن۔ جرمنی کے قدیم باشندے بالخصوص وہ قبیلہ جو دریائے ایلب کے شمال میں رہتا تھا اور جس نے فرانس پر حملہ کیا۔ ماریس نے ۱۰۲ء قبل مسیح میں ان کو غارت کیا۔ عہد حاضرہ کی ٹیوٹنی اقوام کے تین فرقے ہیں اول باشندگان اسکینڈے نیویا جس میں ڈنمارک۔ سویڈن۔ ناروے۔ فنلینڈ اور آئس لینڈ کے باشندے شامل ہیں دوم جرمنی اقوام یعنی خاص جرمنی۔ آسٹریا و ہالینڈ کے باشندگان اور بلجیم اور سوئٹزرلینڈ کی آبادی کا کچھ حصہ شامل ہے۔ سوم اینگلوسیکسن جس میں اہالیان برطانیہ عظمی اور اس کی مستعمرات شامل ہیں۔

عـ۲ لاطینی۔ قدیم لاطیم بالخصوص رومۃ الکبری کے باشندے جن میں وہ نسلیں بھی شامل ہیں جو بوجہ زبان۔ نسل۔ یا تمدن کی لاطینی اقوام سے وابستہ ہیں۔ عـ۳ سلافی۔ اور نسل کا ایک شعبہ ہے جن کی تعداد تقریباً ساڑھے ۱۲ کروڑ ہے انکی دو شاخیں یعنی مشرقی و مغربی ہیں۔ مشرقی شعبہ میں روسی بلغاری سرنی کروٹ۔ اور کارنتھیا اور کارینولا کے سلووں شامل ہیں مغربی شعبہ میں اہالیان پولینڈ و بوہیمیا اور موسنی وینڈ ساکنان سیکسنی و پروشیا ہیں۔

نسل کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے درانحالیکہ قومیت اُن کی روح تک کو متحرک کر دیتی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابھی نصف صدی کا ہی عرصہ ہوا ہی کہ علماء کو نسل کی اہمیت اور حقیقی فطرت کا احساس ہوا۔ جب کوئی خیال علمی طور پر مسلمہ بھی ہو جاتا ہے تب بھی اس کے قبولِ عام میں بڑا عرصہ لگتا ہے اور اُس پر عمل اُس وقت ہی ہو سکتا ہے جب وہ عام طور پر مقبول ہو جائے۔ اس زمانہ میں قومیت کا نہایت قدیم خیال عوام کے ادراک میں سرایت کر گیا ہے اور اسی وجہ سے اُس نے نمایاں نتائج پیدا کئے۔ مختصر یہ ہے کہ ہماری سیاسی زندگی میں ہنوز نسل کے مقابلہ میں قومیت کا اثر غالب ہے۔ اور عملی سیاسیات اشخاص کی اصلی ہستی کی بجائے اُن کی خیالی ہستی سے وابستہ ہیں۔

گزشتہ جنگ اُس کی نہایت موزوں مثال ہے۔ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لڑائی "نسل" کی لڑائی تھی اس خیال نے فی الحقیقت لڑائی میں بہت کچھ سختی اور تلخی پیدا کر دی لیکن صحیح نسلی نقطۂ خیال سے اُس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ ماہرین علم تشریح اجسام نے ناقابلِ تردید طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ حجریہ قدیم[1] کے پسماندگان اور چند نو وارد ایشیائیوں کے علاوہ یوروپ میں صرف تین فرقے آباد ہیں۔ (۱) گورے رنگ اور لمبے سر والی "شمالی" نسل (۲) اوسط رنگ اور گول سر والی "الپ" کی نسل اور (۳) سانولے رنگ اور لمبے سر والی "بحیرہ روم کی" نسل۔ یہ نسلیں

---

[1] آثار قدیمہ کا باقاعدہ درس و تدریس انیسویں صدی میں شروع ہوئی اور علماء اسکینڈینیویا نے انسانی ترقی کے مختلف ادوار کو منقسم کرکے یہ کوشش کی اسکو صحیح علمی درجہ تک پہنچا دیں۔ ڈنمارک کے ماہر آثار قدیمہ نے جو تقسیم کی ہے وہ حسب ذیل ہے :- (۱) حجریہ قدیم جو تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ (۲) حجریہ جدید جو ۲۰۰۰ لغایت ۱۰۰۰ قبل مسیح (۳) قدیم برنجی عہد ۱۰۰۰ لغایت ۵۰۰ قبل مسیح۔ (۴) جدید برنجی عہد ۵۰۰ قبل مسیح سے لیکر پیدائش مسیح تک (۵) حدیدیہ قدیم ۱ سنہ مسیح تا ۵۰۰ سنہ مسیح (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ)

فوراً اطمینان بخش نہ رہا بلکہ اُس کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ اور اُس میں وہ سب اشخاص شامل ہو گئے جو ایک ہی زبان و تمدن و تاریخی روایات رکھتے تھے چاہے یہ اشخاص ایک دوسرے سے کیسے ہی متبائن کیوں نہوں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے جدید مصطلحات کی ضرورت تھی۔ اس کا حل جلد مل گیا اور وہ لفظ "نسل" تھا۔ بدیں وجہ ہم کو بہت سے "نسل" سے مرکب فقرے ملتے ہیں مثلاً "اتحاد بین الایمان" "اتحاد بین السلامی" وغیرہ وغیرہ۔ فی الحقیقت یہ نسل سے بالکل تعلق نہیں رکھتے۔ ان سے صرف موجودہ مفہوم قومیت کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن یوروپی اقوام اپنے قلبی عقیدۂ قومی کے جوش میں اس کے نسلی ہونے کی تصدیق و تقریر کرتے ہیں۔ لہذا عملی سیاسیات میں یہ نسلی ہی ہیں اور جبتک قوم پرستی کی قوت محرکہ قایم ہے یہ نسلی ہی رہیں گے۔

قومیت کی یہ جدید ترقی جس کو ہم "نسلی" درجہ کہتے ہیں اولاً یوروپی تمدن کے قدیم مراکز تک محدود تھی لیکن مغربی خیالات کی اشاعت کے ساتھ یہ غیر متوقع مقامات میں رونما ہوئی مثلاً بلقان میں اس کی رسائی نے وہ مجنونانہ تبلیغیں جو "اتحاد بین الیونانی" اور "اتحاد بین السروی" نہایت سرعت سے پیدا کر دیں جس نے اس بدقسمت ملک کو پہلے توخرس کی آرام گاہ اور بعد میں شیاطین کا دارالشوریٰ بنا دیا۔

اسی اثنار میں اُنیسویں صدی کے آخر قرون میں قومیت کی ابتدائی صورت ایشیا میں جا پہنچی۔ "نوجوان ترکوں" اور "نوجوان مصریوں" کی تحریکات اور الجزائر و ایران و ہندوستان جیسے دور افتادہ ممالک میں قوم پرستی کی تحریک کا ہونا اس کی نمایاں علامتیں تھیں کہ ایشیا بھی قوم پرستی کی ابتدائی کیفیت میں مبتلا ہے۔ مزید برآں بیسویں صدی کی ابتدائی سنین میں متعدد آثار سے

کی تاریخی امتیازات ہیں جو صحیح سلسلۂ نسل کا خوب انقطاع کرتے ہیں - ہمارے یوروپ والے ذہنی طور پر اس کو سمجھتے ہوں لیکن جبتک یہ محض ذہنی جدت رہے گی اس کا کوئی نمایاں اثر عمل پر نہ پڑے گا اپنے دل میں ہر شخص اپنے آپکو لاطینی سلافی ٹیوٹنی یا اینگلو سیکسن ہی سمجھے گا۔ کوئی شخص اپنے خون کی نسل کے لیے جنبش بھی نہ کرے گا لیکن اپنی مفروضہ نسل کے لیے جان دینے کو آمادہ ہو جائے گا۔ لمبے سر والے "شمالی" یا گول سر والے "باشندگان الپ" کے لیے کوئی ہاتھ ہلانا یا کوڑی خرچ کرنا نہیں چاہتا لیکن "ٹیوٹن" اور "سلافی" کامیابی کے لیے جان و مال قربان کرنے کو تیار ہیں - بہ الفاظ دیگر اس سے یہ مراد ہے کہ یہ بیکار ہے کہ درحقیقت ہم کیا ہیں اصل چیز یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں -

موجودہ زمانہ کے یوروپ میں خیالی نسل کی یہ با اقتداری اور غوغی نسل کی یہ لاچاری نظر اول میں حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے متعدد اسباب ہیں قومیت موجودہ یوروپ کی بڑی قوت محرکہ ہی نہیں ہے بلکہ اس نے نوزائیدہ نسلی ادراک کو بھی مسخر کر کے اپنی اغراض کے مطابق بنا لیا ہے - زمانہ حال تک "قومیت" ایک نمایاں ذہنی ادراک تھا جس سے تمدن و زبان و تاریخی ماضی کی تقریباً مطابقت مراد تھی - یہ یوروپی تنگ خیالی کا منطقی نتیجہ تھی - بلاشبہ یہ مزید تنگ نظری سے پیدا ہوئی جو ازمنہ مظلمہ میں ارضی و جنگی و زبانی وفاداری تک محدود تھی - لیکن انیسویں صدی کے اول حصہ میں یہ دائرہ خیال وسعت پا کر براعظم یوروپ بلکہ دنیا کے آفاق تک محیط ہو گیا - نتیجہ یہ ہوا کہ قومیت کا ابتدائی تصو

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵) ؎ اینگلو سیکسن کا ان ٹیوٹنی اقوام پر اطلاق ہوتا ہے جنہوں نے برطانیہ عظمیٰ کو فتح کیا - مصنف

جس کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ اُن میں ایسی روح موجود تھی جسے کسی حد تک
قوم پرستی کی صحیح روح کہا جا سکتا ہے - یہ قوم ایرانیوں کی تھی جن میں اپنے مرتفع ملک
ایران کے ساتھ روایتی جذبۂ محبت موجود تھا - اسلامی دنیا کی مختلف اقوام میں
زیادہ سے زیادہ ابتدائی اور غیر مستقل قومی بیداری یعنی ایک مجہول اور غیر
متحرک اتحادی روح موجود تھی جس میں شاید ترقی کی اہلیت ہو لیکن اس کا
ابھی تک شاید بیرونی اشخاص کو علم اور یقیناً خود اُن کو احساس بھی نہ تھا -

مزید براں اسلام خود چند لحاظ سے قومیت کا مخالف تھا - کلُ مومنٍ اخوۃ
کا اسلامی مسئلہ اور امامت یا عام خدائی جمہوریت کا اسلامی سیاسی نصب العین
خالص قومی احاد کی شہنشاہی کی استقامت کا قدرتی طور پر سدّراہ ہوا - اس کی مثال
بالکل ایسی ہے جیسی کہ یورپ کے نشأۃ ثانیہ کی نوزائیدہ اقوام کا تصادم از منہ
متوسط کے نصب العین عالمگیر پاپائیت اور مقدس رومی سلطنت "سے ہوا تھا -

ایسے ناموافق ماحول کے ہوتے ہوئے یہ تعجب انگیز نہیں معلوم ہوتا کہ انیسویں
صدی کے پہلے نصف حصہ میں مسلمانوں میں میلان قوم پرستی مجہول اور منتشر
طور پر پیدا ہوا - لیکن اسی صدی کے دوسرے نصف حصہ تک مغربی مفہوم کے
مطابق "قومیت" کا صریح ادراک نہ ہو سکا - سید جمال الدین الافغانی کی تعلیم
میں کھلے ہوئے قومی میلانات پائے جاتے ہیں - (اور یہی شخص اسلامی قومیت اور
اتحاد بین الاسلامی کا سلسلہ ربط ہے) اور انیسویں صدی کے وسط میں جو ترکی
مصلحین پیدا ہوئے ان پر قومیت کا ایسا ہی صریح اثر تھا جیسا کہ دیگر مغربی خیالات
کا - فی الحقیقت ترکی ہی ایسا ملک تھا جس میں سب سے پہلے قوم پرستی کا صحیح
احساس پیدا ہوا - ترکی قوم پرستوں نے اُس قدیم خلوص سے جو ترکوں کو اپنے خاندان
سے اور اُس افتخار قومی سے جو اُن کو متعدد عیسائی اور مسلمان محکوم اقوام پر حکمراں ہونے

یہ معلوم ہوا کہ بلقان کی طرح ایشیا میں بھی قوم پرستی کا دوسرا یا "نسلی" درجہ شروع ہوگیا۔ ان سنین میں بعید الاشاعت "جامعی" تحریکات پوری طور پر ہویدا ہونے لگیں مثلاً اتحاد بین التورانی و اتحاد بین العرب اور سب سے زیادہ حیرت انگیز معمہ یعنی اتحاد بین الاسلامی کی تحریکات پیدا ہوئیں۔

اوّل

اب ہم مشرق ادنیٰ و وسطیٰ میں قوم پرستی کے ظہور اور ترقی پر تبصرہ کرینگے۔ قوم پرستی کی تحریک نے اسلامی دنیا میں باستثنار ہندوستان جو کچھ نشو و نما اس وقت تک حاصل کیا ہے اس کے بیان کے لیے موجودہ فصل کو وقف کرتے ہیں۔ ہندوستان کے لیے جداگانہ بحث کی ضرورت ہے کیونکہ وہاں قوم پرستی کی سرگرمیاں زیادہ تر غیر مسلم ہندو عنصر کا کام ہے۔ ہندوستانی قوم پرستی ایسے طریقے پر جاری ہو رہی ہے جو اسلام کے طریقے سے بالکل مختلف ہے اور لہذا اس پر فصل مابعد میں بحث کی جائے گی۔

قبل اس کے کہ اسلامی دنیا میں اُنیسویں صدی کا مغربی تصادم شروع ہوا اسلامی دنیا خود شناس قوم پرستی سے قطعاً معرا تھی۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں مقامی اور قبائلی وابستگی ضرور تھی نیز خاندانی احساس بھی موجود تھا جس کی مثال ترکوں کی وہ وفاداری ہے جو اُنہیں اپنی بادشاہوں یعنی سلاطین آل عثمان کے ساتھ تھی۔ اس کے ساتھ ہی نسلی افتخار کا بین ظہور بھی تھا جیسے کہ عربوں کا یہ تیقن کہ وہ "برگزیدہ قوم" ہیں۔ لاریب کہ یہ قوم پرستی کے زبردست عناصر تھے مگر ہنوز منتشر اور بے ربط تھے اور ہنوز خود شناس قومیت کی جدید رنگ میں رنگے نہ گئے تھے۔ اسلامی اقوام میں صرف ایک ہی قوم ایسی تھی

کے اشخاص سمجھنے لگے۔ اور وہ مسلمہ ذریعۂ ادائے خیال اور طرز تحریر بن گئی۔[۵]

بلاشبہ ترکی قوم پرستی کی خاص محرک مغربی سیاسی تقدی ہی تھی۔ عوام کو جس قدر وطن کی محبت اور اُس کے مستقبل سے توقعات پیدا ہوئیں اُسی قدر ترکی ممالک پر یوروپی حملوں نے اُن کو اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے جو معرض خطر میں تھی آمادہ کر دیا۔ قوم پرستوں کا نصب العین "عثمانیت" یعنی ایک ایسی حقیقی "قوم" کو متحد کرنا تھا جس میں تمام باشندگان بلالحاظ نسل و مذہب "عثمانی" ہوں ترکی زبان بولیں اور عثمانی حب وطن کی روح سے زندہ ہوں۔ مگر اس کا تصادم اُس رقیب اور دیرینہ ترقومیت سے ہوا جو سلطنت کے عیسائی اقوام میں پیدا ہو چکی تھی۔ اسی زمانہ میں جو جدید عرب قوم پرستی متشکل ہو رہی تھی اُس کا تصادم نا قابل ذکر ہے ترکی قوم پرستی کی تحریک کو سلطان عبدالحمید نے نظر عتاب سے دیکھا۔ سلطان موصوف کو کل قومی تحریکات سے طبعاً نفرت تھی کیونکہ اُن سے اُن کے اختیارات محدود ہوئے جاتے تھے اور اتحاد بین الاسلامی کی اُس عام تحریک کی مخالفت لازم آتی تھی جس پر اُن کی حکمت عملی مبنی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ترکی قوم پرست بھی جو کامل وفاداری کا اعلان کرتے تھے مشتبہ سمجھے گئے اور حریت پسند اشخاص پر یہاں تک جبر و ظلم ہوئے کہ وہ بالآخر ترک وطن پر مجبور ہوئے۔

مگر ۱۹۰۸ء کے انقلاب نے قوم پرستی کو برسر اقتدار کر دیا نوجوان ترکوں میں دیگر امور کی بابت کتنا ہی تخالف کیوں نہ ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ سب سرگرم قوم پرست

---

[۵] ترکی قوم پرستی کی ان ابتدائی منازل کے لیے ملاحظہ ہو وامبیری کی کتاب "موجودہ اور چالیس سال قبل کی ترکی" اور نیز اُس کی کتاب "مشرقی ممالک میں مغربی تمدن"۔ نیز لادیز اور راموس میں لیون کاہون کے مضامین متذکرہ بالا۔ اور ایل روزو کی کتاب "عثمانی مساعی" مطبوعہ پیرس ۱۹۰۷ء۔ مصنف

کی بنیاد پر حاصل تھا فائدہ اٹھا کر قوم پرستی کی تحریک کو نہایت سُرعت سے دی۔

یورپ کی طرح ترکی میں بھی قوم پرستی کی تحریک تاریخی روایات کی اور زبان کی صفائی سے شروع ہوئی نصف صدی قبل عثمانی ترک اپنی اصل اور سے بالکل نابلد تھے۔ اُن کو اپنے اجداد کے جنگی کارنامے اور اپنی سلطنت کے انگیز واقعات محض قصص اور خواب و خیال کی طرح یاد تھے۔ اور وہ قومی تاریخ پڑھنے سے بالکل غافل تھے۔ دولت عثمانیہ کی فتوحات کے واقعات جو دنیا کے براعظموں سے تعلق رکھتے تھے عوام کے لیے ایسے دلچسپ نہ تھے جیسے کہ مذہبی یا آنحضرت صلعم کے حیات کا تذکرہ اور ابتدائی اسلام کے حالات۔ پیشوایان قوم نے اپنے ہموطنوں کو اُن کی تاریخی عظمت بتا کر گزشتہ پر افتخار اور آیندہ کے لیے سکھایا۔

یہی حال ترکی زبان کا ہوا۔ ابتدائی قوم پرستوں کو اس کے دو مختلف شعبے ایک طرف تو "سرکاری" ترکی زبان تھی جو عربی اور فارسی کے فصیح اور بلیغ فقرات سے بری طرح مخلوط تھی۔ یہ غیر معمولی معجون مرکب اور ادق طرز عوام کی فہم سے بالاتر تھی۔ عوا میں عام ترکی زبان مروج تھی جس میں ابتدائی اور محدود محاورات تھے اور مقامی بو چال کے لحاظ سے اُس کی مختلف شاخیں تھیں۔ تعلیم یافتہ اشخاص اُس کو دہقانی اور غیر سمجھ کر حقیر جانتے تھے قوم پرستوں نے اس سب کو بدل دیا۔ جو شیلی قوم پرستوں نے جو مغر اصول قواعد اور علم اللغات سے واقف تھے ترکی زبان کی سادگی اور جامعیت کا احساس کر کے مغربی مفہوم کے مطابق اصلی ترکی زبان کی تدوین شروع کی۔ اُن کو اسمیں ایسی کامل کامیابی ہوئی کہ ایک ہی پشت میں ایک سادہ اور معنی خیز ترکی زبان عا وجود میں آگئی جس کو نامہ نگاروں اور ادیبوں نے بے اثر طور پر استعمال کیا اور ہر طبقہ

ایسے مختلف تھے کہ اُن میں ارتباط ناممکن تھا۔ عربوں اور ترکوں کی ناموافقت کا ایک فرانسیسی مصنف نے خوب خلاصہ کیا ہے۔ ڈاکٹر بیرارڈ کہتا ہے "یہ دو نژاد ہیں اور یہ دو قومیں ایسی ہیں۔ ترک خواہ وہ ادرنہ کا ہو یا عدالیہ کا۔ روم کے عرض البلد میں رہتا ہو یا الجزائر کے عرض البلد میں آخر شمالی اور انتہائی شمالی ہی ہے۔ اور عرب ہر مرز بوم میں جنوبی اور انتہائی جنوبی ہے۔ عرب کی چستی و تیزی و تخئیل فنون لطیفہ کا مذاق۔ صحیح وجمہوری میلانات اور فتنہ انگیز تشخص کے مقابلہ میں ترک اپنی سستی و سنجیدگی اور حسیات انضباط و انتظام کا احساس اور پیدائیشی حربیت کا اظہار کرتا ہے۔ ترکی آقا ہمیشہ سے "جدت طراز دہقان" سے نفرت کرتا ہے جس کی وضع و حرکات و سکنات اور بیقاعدگی سے ترک کو سخت صدمہ ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے عربوں کی نظر میں ترک محض ایک احمق۔ اُس کی طمانیت وخاموشی محض حماقت وجہالت۔ اُس کا احترام قانون محض غلامانہ انقیاد اور اُس کا مادی خوشحالی کا شوق محض بہیمیت ہے۔ فنون لطیفہ میں ترکوں کی ناقابلیت کا عرب بڑا مذاق اُڑاتے ہیں۔ چینیوں اور ایرانیوں اور عربوں اور یونانیوں سے درس لینے پر بھی ترک عربوں کی نظر میں بارک اور کھلیان کا احمق ہی دکھائی دیتا ہے[۱]۔

اس پر طرہ یہ ہے کہ عرب ترکوں کو مذہب اسلام کا مخرب سمجھتے ہیں اور ہمکو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ ترکی کی عرب رعایا نے ہمیشہ باغیانہ شورش کی علامات ظاہر کیں۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ وہابی تحریک خاص طور پر مقامات مقدسہ پر ترکی تفوق کے خلاف تھی۔ باوجودیکہ وہابیوں کو شکست ہوئی لیکن عرب شورش باقی رہی۔ سنہ ۱۸۲۰ء کے قریب جرمن متفحص برکھارڈٹ نے عربستان کی بابت لکھا تھا "عجب

---

[۱] بیرارڈ کی کتاب "سلطان واسلام اور دول عظمی" صفحہ ۱۶ مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۰۷ء۔ مصنف

تھے - فی الواقع اُن کا جوش قومیت ہی اُن کے مصائب مابعد کا باعث اول تھا۔ نوجوان ترکوں نے مجنونانہ جوش سے کل ملک کو "عثمانی" بنانے کی کوشش کی۔ اس سے دیگر اقوام ناراض ہوکر انقلاب کے مخالف ہوگئیں اور ۱۹۱۲ء میں عیسائی بلقانی ریاستوں کو تباہ حال ترکی پر حملہ کرنیکا موقع مل گیا۔

نفس الامر یہ ہے کہ ترکی قوم پرستی ایسی روش پر ترقی کر رہی تھی جس کا صرف یہی نتیجہ ہوسکتا تھا کہ ایک طرف ترکی اور دوسری طرف غیر ترکی (جس میں خواہ مسلمان ہوں خواہ عیسائی) جماعات میں مخالفت بڑھی۔ ترکی قوم پرستی فی الواقع اس وقت "دوسری" یعنی "نسلی" منزل پر پہنچ گئی تھی۔ ترکی قوم پرستی نے "عثمانیت" کی محدود ارضی خیال کی حدود سے گزر کر اُن دور اُفتادہ اور نسلی تصورات کو قبول کر لیا تھا جو "اتحاد بین الاتراک" اور "اتحاد بین التورانی" کہلاتے ہیں۔ ہم ان وسیع ترقیوں پر اسی باب میں بعد کو غور کرینگے۔ اس سے قبل ہمیں دنیائے اسلام کے دیگر حصص کی قومیت کی "پہلی منزل" کے آغاز پر تنقید کرنا چاہیے۔

عثمانی ترکوں میں قوم پرستی کی علامات ظاہر ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد اسی قسم کے آثار عربوں میں بھی نمودار ہونے لگے جیسا کہ ہر خود شناس قومی تحریک میں ہوتا ہے یہ تحریک بھی زیادہ تر کسی دوسری جماعت کے خلاف احتجاج تھی۔ عربوں کی تحریک میں یہ احتجاج قدرتی طور پر اُن کے ترکی حکمرانوں کے خلاف تھا۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عرب کے ریگستان یعنی نجد نے کس طرح اپنی آزادی کو ہمیشہ قائم رکھا اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ وہ عرب ممالک یعنی شام و عراق و حجاز جو ترکی حکومت کے تحت میں تھے اس امر سے کیسے متنفر تھے کہ اسلام کی "برگزیدہ قوم" ایک ایسی قوم کے ماتحت ہوں جو عربوں کی نظر میں نو دولت وحشی تھے۔ باوجودیکہ ترک ہزار سال سے صاحب اقتدار تھے لیکن یہ دونوں اتفاق سے نہ رہ سکیں۔ اُن کی نسلی طبائع

باختیار غالباً شریف مکہ[۱] ہو۔ دراصل اس کا منشا یہ تھا کہ مغربی قوم پرستی کو ایک

---

[۱] اس عرب آرزومندی کی تعبیر و تکمیل جنگ عظیم میں ہو گئی۔ عرب صوبوں نے ترکی طوق غلامی کو اُتار ڈالا اور عرب ممالک کے حصے بخرے بھی ہو گئے لیکن اس سوال کا جواب ابھی تک اثبات میں نہیں دیا جا سکتا کہ کیا اُن کو اپنے نصب العین کے حصول میں کامیابی ہوئی۔ اس ناکامیابی کی وجہ پر غور کرنا اور اُس کی اصلیت کو دریافت کرنا ہی موجودہ مشرق کی نجات کی کلید ہے۔ یہی وہ سحر طلسم یا اسم اعظم ہے جس سے ہماری آیندہ بہبودی و فلاح وابستہ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ترک ہی عربوں کی فاتح اور بالآخر حکمراں ہوئے ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد عربوں نے جو ترکوں کو قیام دستوریت میں امداد دی اُس کا یہ صلہ نہ تھا کہ اُن کو آزادی ہی سے محروم نہ رکھا بلکہ پارلیمنٹ میں اُن کے نمایندوں کی تعداد بھی گھٹا دی تاکہ وہ کبھی بھی بااثر ہو کر اپنی آرزو کو پیمانہ کر سکیں۔ علاوہ ازیں آزادی بذات خود ایسی دلفریب شے ہے جس کے حصول کے لیے عرب جیسی قوم جس کی روایات روح حریت سے مالا مال اور جس کا ماضی عظمت و جبروت و تہذیب کی بہترین مثال ہے جو کچھ کرے کم ہے۔ پھر دربار رسالت سے خلیفہ کے لیے قریبی ہونے کی تخصیص یہ ایسے امور تھے جن سے عربوں میں لازمی طور پر حریت کی خواہش پیدا ہوتی۔ لیکن آرزو اور اُس کے حصول میں بڑا فرق ہے ؎

جب کرے قصد کسی کام کا کوئی انساں   پہلے سوچے کہ وہ اُس کام کے ہے بھی شایاں

عہد حاضرہ میں مغربی جوع الارض کی وجہ سے سب سے مقدم یہ امر ہے کہ آیا بعد حصول آزادی ہم اُس کو یورپی دول کے مقابلہ میں قایم رکھ سکتے ہیں آیا ہم میں حکومت خود اختیاری کی صلاحیت اور اہلیت بھی پیدا ہوئی یا نہیں مثلاً کسی مشرقی ملک کو محض اپنے تحفظ کے لیے جو صرف کثیر سامان حرب و جہازوں وغیرہ پر کرنا پڑیگا اُس کے لیے ضروری ہے کہ ملک کی اقتصادی حالت کو ایسا رفیع کیا جائے کہ وہ ان مصارف کا متحمل ہو سکے اس میں ملک کے قدرتی ذرائع صنعت و حرفت و تجارت و تعلیم وغیرہ میں ترقی مشتمل ہے۔ عربوں نے اس طرف توجہ نہ کی اور محض آزادی کے دلدادہ ہو کر دوسروں کے آلہ کار بن گئی نتیجہ یہ ہو کہ وہ (بقیہ نوٹ بصفحہ آیندہ)

حجاز میں ترکی اقتدار کا زوال ہوگا تو عرب اپنی محکومیت کا بدلہ لیں گے۔"[1] تقریباً بیس سال بعد شریف مکہ نے ایک فرانسیسی سیاح سے کہا "ہمیں جو رسول خدا صلعم کی اولاد ہیں اپنے سروں کو کمبخت پاشاؤں کے سامنے جھکانا پڑتا ہے۔ ان پاشاؤں میں سے اکثر پہلے عیسائی غلام تھے جنہوں نے نہایت شرمناک طریقوں سے عروج پایا ہی"[2] اُنیسویں صدی میں یورپ میں ترکی کو جو شکست ہوئی اُس کے بعد عرب صوبوں میں لازمی طور پر مخویانہ ہنگامہ ہوا۔

اُنیسویں صدی کے وسط تک یہ مخویانہ شورشیں مذہبی یا قبائلی یا مقامی احساسات کے منتشر اور بے ربط ہنگامے تھے جن میں کوئی صحیح "قوم پرستانہ" نظام عمل یا نصب العین نہ تھا۔ لیکن ۱۸۶۰ء کے قریب ایک حقیقی قوم پرستی کی شورش اُٹھی۔ اس شورش کی پیدائش شام میں ہوئی۔ یہ امر بالکل ہی امید کے موافق تھا کیونکہ ترکی کے عرب ممالک کا شام ہی ایسا حصہ تھا جو مغربی اثرات سے مستفیض تھا۔ یہ پہلی قومی عرب تحریک کچھ اہم نہ تھی۔ چونکہ اس کے کارکن شور مچانے والے فتنہ انگیز اور ناقابل اشخاص تھے لہذا ترکی حکومت نے اس کو بآسانی فرو کردیا۔

۱۸۷۷ء کی تباہ کن روسی جنگ نے ان سُلگتی ہوئی چنگاریوں کو پھر مشتعل کردیا۔ چند سال تک ترکی کے عرب صوبے سخت فتنہ و فساد میں مبتلا رہے۔ قوم پرستوں نے علانیہ طور پر کہا کہ ترکی کے طوق غلامی کو اُتار ڈالا جائے اور عرب ممالک کو ایسی جماعت میں منسلک کیا جائے جس کا سرگروہ ایک مذہبی

---

[1] ہیرارڈ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۹ پر نقل کیا ہے۔ مصنف

[2] ہیرارڈ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰ پر نقل کیا ہے۔ مصنف

قابو حاصل ہو گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب بغاوت کی کامیابی کا امکان بہت بعید ہو گیا۔
مزید برآں سلطان عبدالحمید کے تبلیغ اتحاد بین الاسلامی کا خاص منشاء یہ تھا کہ مسیحی مغرب کے خلاف عرب اور ترکوں کے درمیان اسلامی استحکام کا خیال پیدا کیا جائے۔ ان مساعی میں ایک درجہ تک کامیابی ہوئی۔ مشرق ادنےٰ میں ہر مغربی تعدی سے عرب اور ترکوں کو یہ سبق ملتا تھا کہ وہ عام دشمن کے مقابلہ کے لیے اپنے خانگی نزاعات کو فراموش یا کم از کم ملتوی کر دیں۔

سلطان عبدالحمید کو اگرچہ اپنی مساعی میں جزوی کامیابی ہوئی لیکن عرب رعایا کا بڑا حصہ ناراض رہا اور انیسویں صدی کے اختتام پر عرب قوم پرستی کی شورش از سر نو پیدا ہوئی۔ ترکی عمال کی بے رحمانہ جبر و تشدد کی وجہ سے غیر مطمئن عرب قوم پرست جو اکثر شامی تھے ترک وطن کر گئے۔ ان جلاوطنوں نے مصر جیسے قریب مقام (جو اب برطانوی مقابضت میں تھا) اور مغربی یوروپ میں جمع ہو کر ایک انقلابی تبلیغ کا نظام قایم کیا۔ اُن کی باضابطہ تنظیم ۱۸۹۵ء سے شروع ہوتی ہے جبکہ "عربی قومی جماعت" پیرس میں قائم کی گئی۔ ایک عرصہ تک اُن کی تبلیغ غیر معروف طور پر جاری لیکن بظاہر معقول اثر پیدا کرتی رہی کیونکہ ۱۹۰۵ء میں صوبجات حجاز و یمن میں بغاوت ہوئی۔ یہ بغاوت ترکی حکومت کی بہترین مساعی کے باوجود کلیتاً فرو نہ ہوئی بلکہ سال بسال جاری رہی جس سے ترکی خزانہ اور افواج پر بڑا بار پڑا اور اسی کی بدولت ۱۲-۱۹۱۱ء میں طرابلس اور بلقان کے مصائب رونما ہوئے۔

۱۹۰۵ء کی عرب بغاوت سے "مسئلہ عرب پر" کل دنیا کی نظریں پڑنے لگیں

بقیہ نوٹ صفحہ (۱۶) کوشش کرنا چاہیئے تاکہ ہم قعر مذلت سے نکل کر اس درجہ پر فائز ہوں جس کیلئے خلق ہوئے ہیں۔ مترجم

خدائی جمہوریت کے قدیم عرب نصب العین کے مطابق بنایا جاوے جس کی تکمیل
پکی خلافت اور نجد کی وہابی حکومت کی صورت میں پہلے ہی ہو چکی تھی۔

عرب قوم پرستی کی یہ دوسری شورش بھی دیرپا نہ تھی۔ اس وقت ترکی
میں سلطان عبدالحمید حکمران تھے اور عبدالحمید کے اتحاد بین الاسلامی کی حکمت عملی کا مقصد
یہ تھا کہ عرب رعایا سے اچھے تعلقات پیدا کئے جائیں۔ لہذا عربوں کا قسطنطنیہ میں
خیر مقدم کیا گیا اور عرب شیوخ و مشاہیر مورد عنایت ہوئے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ
سلطنت کے عرب صوبوں میں امن و امان پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی زمانے
میں شام اور حجاز میں فوجی ریل کی تعمیر سے ترکی حکومت کو اپنے عرب ممالک پر بیش از بیش

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۰۱) حصہ عرب یعنی حجاز جس پر عربی حکومت کے قیام پر شادیانے بج رہے ہیں جن مصائب میں گرفتار ہے وہ اظہر من الشمس ہے اس کے ذرائع آمدنی اسقدر کم ہیں کہ وہ نہ تو موجودہ مفہوم کے مطابق کوئی آزاد سلطنت قائم کرسکتا ہے اور نہ امن و امان۔ گویہ نکبت و فلاکت ہی موجودہ آزادی کا سبب اول ہے اگر حجاز بھی شام کی طرح زرخیز ہوتا تو اس میں بھی جنرل گورو کی "زبردست تدابیر" رائج ہوتیں۔ حجاز کی موجودہ آزادی بالکل موہوم ہے اور اس کو سلطان مسقط و عمان کی طرح ایک محافظ کی ضرورت ہے۔ حجاز میں تو یہ نام نہاد آزادی ہی ہے لیکن شام کی حالت تو بالکل ہی خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہے نہ اس کو آزادی نصیب ہوئی اور نہ امن۔ یہ سب کچھ محض مغربی قوم پرستی کے نصب العین کی متابعت کی وجہ سے ہے اس امر میں مغربی فلسفہ نہایت متضاد ہے ایک طرف تو میکیاول کے فلسفہ اور اس کی کتاب بنام خسروان کو پیش کرکے اخوت اسلامی یا اتحاد بین الاسلامی کا مذاق اڑایا جاتا ہے اسی کے بخلاف شہنشاہیت ... اس کا جدید فلسفہ پیدا کیا جاتا ہے اور اقوام محکوم کو اخوت عام کا دلدادہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے ... نانوں کو ان ارضی اور معیادی اخوتوں سے برتر رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے ہمارا نصب العین ہماری اخوت مکان اور زمان سے اعلیٰ ہے اور اسی کی تکمیل کی (بقیہ نوٹ بصفحہ آیندہ)

ہم کیسے نکبت وجہالت میں مبتلا ہیں۔ ہمارا ملک جو روے زمین کا بہترین اور زرخیز ترین حصّہ ہے آج بالکل بیابان ویرانہ ہے ۔ جب ہم آزاد تھے تو ہم نے دنیا کو سوال میں فتح کر لیا۔ ہم نے ہر جگہ علوم وفنون وادب کی اشاعت کی۔ اور صدیوں تک ہم ہی دنیا کے امام تمدن رہے لیکن جب سے ارطغرل[۱] کی ذریت نے خلافت اسلامیہ کو غصب کیا اُنھوں نے ہمیں لوٹنے کے لیے ایسا حقیر وحشی بنایا ہے کہ ہم دنیا کی مفلس ترین قوم ہو گئے"[۲] ۔ ازاں بعد عرب آزادی کا اعلان ہی۔

بلاشبہ "نوجوان عرب" اس وقت آزاد نہ ہوا۔ بغاوت محض مقامی رہی اور ترکی نے اکثر ولایات عرب پر اپنا تسلط قایم رکھا۔ تاہم شورش برابر جاری رہی۔ سلطان عبدالحمید کے آخر عہد میں اُن کی عرب ولایات میں ایک قسم کا ناپایدار توازن تھا یعنی قوم پرستی کے مغویانہ خیالات ایکطرف اور اتحاد بین الاسلامی اور یوروپی مخالفت کے جذبات دوسری طرف عمل پیرا تھے۔

شنہ ۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں کے انقلاب نے ان حالات میں جدید نوعیت

---

[۱] سلطنت عثمانی کا نیم فرضی بانی (مصنف) صاحب تاریخ الدہور اس کو ارطغل لکھتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے بلکہ ارطغرل صحیح ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ارطغرل کا باپ سلیمان نواح خوارزم سے علاءالدین سلجوقی کی خدمت میں سنہ ۱۳۱ھ میں آیا اور بحیرہ خزر کے قریب ینرہ کا حاکم ہوا۔ اُس کی وفات کے بعد اُس کا لڑکا ارطغرل سرغونیہ میں آیا اور ۵۲ سال تک وہاں امیر رہا سنہ ۱۲۹۶ء میں فوت ہوا۔ اُس کا لڑکا عثمان خاں غازی دولت عثمانیہ کا بانی ہے (مترجم)

[۲] ان دونوں تحریرات کا کل اصل مضمون بآسانی ای جنگ کی کتاب "عرب بغاوت کے خلاف ترکی یعنی عالم فردا کا خطرہ" کے صفحہ ۲۳ تا ۲۵ پر مل سکتا ہے (مطبوعہ پیرس سنہ ۱۹۰۶ء) مصنف

اور جلا وطن قوم پرستوں نے اپنی مساعی کو وطن اور مغرب میں دوبالا کر کے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ "نوجوان عرب" کی شکایات اور توقعات سے یورپ بخوبی واقف ہوگیا بالخصوص ایک عرب قوم پرست لیڈر نے ایک کتاب الموسوم بہ عرب قوم کی بیداری[1] نہایت خوبی سے لکھی جس نے خاص جوش پیدا کر دیا۔ عرب قوم پرستوں کے مقاصد بالوضاحت اُس اعلان میں درج ہیں جو عربی قومی جماعت نے دول عظمیٰ کو مخاطب کر کے ۱۹۰۵ء میں شائع کیا۔ اس اعلان میں تحریر ہے "ترکی میں یا امن انقلاب بہت جلد ہونے والا ہے۔ اہل عرب جن کو ترکوں نے غیر ضروری مسائل دین اور معاملات رسوم پر متفرق کر کر نشانہ ظلم بنا یا ہے اپنی قومی اور تاریخی اور نسلی یکجہتی سے واقف ہوگئے ہیں اور بوسیدہ عثمانی تنہ سے جدا ہوکر خود اپنی آزاد سلطنت قایم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جدید عرب سلطنت اپنی قدرتی حدود میں یعنی دجلہ و فرات کی وادیوں سے لیکر ابنا رسویز تک اور بحیرہ روم سے لیکر بحیرہ عمان تک وسعت پذیر ہوگی اور اس پر ایک عربی سلطان کی آزاد اور دستوری حکمرانی ہوگی۔ موجودہ ولایت حجاز و علاقہ مدینہ طیبہ ایک آزاد سلطنت ہوگی جس کا حکمران کل مسلمانوں کا مذہبی خلیفہ بھی ہوگا۔ اس طور سے ایک بڑا عقدہ یعنی اسلام میں مذہبی اور ملکی اختیارات کی علیحدگی کا مسئلہ حل ہو جائیگا جس سے سب کا نفع متصور ہے۔"

اس جماعت نے اپنے ہم قوم عربوں کے لیے حسب ذیل اعلان شائع کیا "عزیز ہموطنو! ہم سب اس سے بخوبی واقف ہیں کہ عرب کے باشندے کا با عظمت اور معروف لقب فی زماننا کل اجانب خصوصاً ترکوں کی زبانوں پر کیسا ذلیل اور حقیر ہوگیا ہے۔ ہم سب دیکھتے ہیں کہ ان الشیاء متوسط سے آنے والے بربریوں کے جبر و ظلم سے

---

[1] مصنفہ نجیب آزوری مطبوعہ پیرس ۱۹۰۵ء مصنف

کے جوش سے اُبل رہے تھے[۱]۔ ترکی حکام نے ہر امکانی فتنہ کے خلاف سخت تدابیر اختیار کیں اور کل سربرآوردہ قوم پرستوں کو جن پر دسترس ہوئی قید کیا یا پھانسیاں دیں۔ اعلان جہاد پر عرب رائے عامہ کا ایک حصہ بالخصوص فتح مصر کی امید سے ترکوں کا حامی ہوگیا۔ مگر جب دوران جنگ بڑھنے لگا تو اسباب شورش پھر رونما ہونے لگے ۱۹۱۶ء میں شریف مکہ کی بغاوت نے ترکی حکومت کے زوال کا نشان دیا۔ سلطنت ترکی کے کُل عرب عناصر نے اس بغاوت کی عملاً یا دیگر طور پر مدد کی جس کی سلطنت برطانیہ نہایت فیاضی سے حمایت کر رہی تھی۔ عرب اُن وعدوں سے جوش میں آکر جو اتحادیوں نے اُنھیں قومی آزادی دلوانے کے متعلق بڑی شد و مد سے کیے تھے ترکی سے خوب لڑے اور ۱۹۱۸ء کی خزاں میں جو عثمانی فوجی قوت شکست ہوئی اُس کا خاص باعث تھے[۲]۔

قبل اس کے کہ ہم اُن واقعات پر بحث کریں جو سابق عثمانی سلطنت کے عرب صوبجات میں ۱۹۱۸ء سے پیش آئے ہیں ہم شمالی افریقہ کے مستعرب ممالک کی رجو

---

[۱] جنگ عظیم کے عین آغاز سے پہلے جو عرب معاملات کی حالت تھی اُس کی اچھی تفصیل مسلمان ماہر سیاسیات" اپنے مضمون "عرب دنیا میں موجودہ سیاسی معاملات" میں دی ہے جو دسمبر ۱۹۱۳ء کے ریویو دو موند مسلمان میں شامل ہوا۔ نیز ملاحظہ ہو جی۔ ڈبلیو۔ بری کی کتاب "ناشاد عرب یا یمن میں ترک" مطبوعہ لندن ۱۹۱۵ء

[۲] دوران جنگ میں عرب معاملات کی بابت ملاحظہ ہو ای۔ جنگ کا مضمون "عرب آزادی اور واقعی بغاوت" جو یکم اگست ۱۹۱۶ء کے دی ریویو میں شائع ہوا۔ آئی۔ ڈی۔ لیوین کا مضمون "عربوں اور ترکوں کا تقابل" جو نومبر ۱۹۱۶ء کے امریکن ریویو آف ریویوز میں شائع ہوا۔ اے مینوزیل کی کتاب "ہمعصر عربستان کی تاریخ" مطبوعہ لیپزگ ۱۹۰۲ء۔ جی ڈبلیو۔ بری کی کتاب "اتحاد بین الاسلامی" مطبوعہ لندن ۱۹۱۹ء۔ ایس مانگریا کا مضمون "عرب میں سیاسی اور مذہبی حالت" جو جولائی ۱۹۱۹ء کے دی مسلم ورلڈ میں شائع ہوا۔ ایل ٹامس کا مضمون "لارنس یعنی عرب بغاوت کی روح" جو اپریل و مئی و جون ۱۹۲۰ء کے رسالہ ایشیا میں شائع ہوا۔

پیدا کردی۔ عرب صوبوں نے دیگر حصص سلطنت کی طرح مطلق العنانی کے زوال پر خوشی منائی اور آئندہ کے لیے بہت کچھ امیدیں باندھیں۔ ترکی پارلیمنٹ میں عرب صوبوں کے بہت سے نمایندے تھے اور انھوں نے یہ مطالبہ کیا کہ معاہد ریاستوں کی خود مختاری کے لیے تدابیر عمل میں لائی جائیں۔ اس کو نوجوان ترکوں نے جو "عثمانیت" پر تلے ہوئے تھے قطعی نامنظور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرب صوبجات کی آنکھیں کھل گئیں اور تجزیہ کی شورش پھر شروع ہوگئی۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ جدید آزادی کی شورش کا نظام عمل چند سال قبل کے نظام کار سے بھی بڑھا چڑھا تھا۔ ترکی کے عرب قوم پرست اس دوران میں مصری اور فرانسیسی شمالی افریقہ کے قوم پرستوں سے پورے طور پر اتحاد کر رہے تھے کیونکہ ان ممالک میں عربی زبان بولی جاتی تھی اور یہاں کے باشندے جزءاً عربی النسل تھے عرب قوم پرستی نے اب اس راز کو بہانگ دہل کہنا شروع کیا جس کی بابت پہلے سرگوشیاں ہو رہی تھیں یعنی ایک بڑی "اتحاد بین العرب" کی سلطنت کا اعلان کیا گیا جس میں کل شمالی افریقہ اور جنوبی ایشیا بحر ظلمات سے لیکر بحر ہند تک شامل ہو۔ اس طریقہ پر عرب قوم پرستی بھی ترکی قوم پرستی کی طرح "دوسری" یعنی نسلی منزل کی طرف ترقی کر رہی تھی۔

اس وسیع ترترقی پر مزید بحث کو ملتوی کر کے آؤ ہم اس محدود تر قوم پرستی کے نشو و نما کے حالات معلوم کریں جو سلطنت ترکی میں سرگرم عمل تھی۔ باوجودیکہ ۱۹۱۱ و ۱۹۱۲ کے یورپی تعدی سے اتحاد بین الاسلامی کے خیال میں پراگندگی پیدا ہوئی لیکن نوجوان ترکوں کی "عثمانیت" کی تدابیر سے قوم پرستی کے خیالات متواتر بڑھتے رہے۔ اور آزادی کی شورش فوراً بڑے شد و مد سے جاری ہوگئی۔ ۱۹۱۳ء میں عرب قوم پرستوں نے پیرس میں کانگریس کر کے انقلابی تدابیر بڑے پیمانہ پر شروع کر دیں۔ دوسری سال جنگ عظیم کے شروع ہونے کے وقت ترکی کے عرب صوبجات مغربانہ شورش

یہ عمل بالکل ہی سطحی تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی خیالات بہت کچھ سرایت کر گئے۔ محمد علی کی پالیسی کو اس کے جانشین نے جاری رکھا۔ وہ شاندار اور فضول خرچ خدیو اسمعیل جس کی یورپ سے غیر مآل اندیشانہ فریفتگی یورپی مداخلت کا باعث ہوئی اپنی "متفرنجیت" پر فخر کرتا تھا اور یورپیوں کو اپنے پاس مجتمع رکھتا تھا۔

فی الواقع مصری قوم پرستی کی پہلی تحریک خدیو اسمعیل اور اس کے درباریوں کے ضرر رساں اور تباہ کن "انگریزیت" کے خلاف احتجاج کی صورت میں نمایاں ہوئی جس طور پر خدیو اسمعیل اہل یورپ سے کثیر الرقم قرضے لیکر مصر کی آزادی کو گرو رکھ رہا تھا اور بے رحمانہ محاصل سے مصر کا خون پی رہا تھا اس سے دور اندیش مصریوں کے خوف میں روز بروز ترقی ہوتی گئی اور "حب وطن" کے مغربی ادراک سے دانستہ یا نادانستہ طور پر متاثر ہو کر ان لوگوں نے اسمعیل کی تباہ کن روش کو روکنا اور مصر کے مستقبل کو محفوظ کرنا چاہا۔ فی الواقع اُن کی مساعی صرف اُن یورپی دیسی دلیروں اور مراعات جو اشخاص کی مختلف الاقسام جماعت کے خلاف نہ تھی جو خدیو کو مزید اسراف کی طرف راغب کر رہے تھے بلکہ اُن خوشامدی ترکی و چرکسی پاشاؤں اور ارمنی اور شامی سود خواروں کے خلاف بھی تھے جو اسمعیل کی مرضی کا آلۂ تکمیل تھے۔ اس طور پر یہ بڑھنے والی تحریک اُن اجانب اور دیسیوں کے خلاف اصلاً ایک "حب الوطنی" کا احتجاج تھی جو ملک کو خطرہ میں ڈال رہے تھے۔ شورش پسندوں نے جو مقولہ اُس وقت اختیار کیا تھا اُس سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا۔ یہ مقولہ ایسا نعرہ تھا جو پہلے کبھی سننے میں نہ آیا تھا یعنی "مصر مصریوں کے لیے ہے"۔

اس ابتدائی ہیجان میں فوراً ہی جمال الدین کی شخصیت متحرک نے نئی روح پھونک دی۔ اس عظیم الشان ہستی نے ایسا زبردست اور دیرپا اثر کہیں بھی نہ پیدا

بجانب مغرب واقع ہیں) قومی تحریکوں پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم مصری تحریک ہے۔ مصری آبادی کا بڑا حصہ آج بھی فراعنہ کے عہد کی طرح قدیم "نیل" کی نسل کا ہے۔ مصری فلاحین جو سست اور با اطمینان کسان ہیں بہت سے فاتحین کے مطیع رعایا رہے ہیں۔ اگرچہ گاہے ماہے اس سکوت میں سخت غضبناک جوش سے خلل پڑا لیکن یہ جوش پھر بہت جلد سکون و سکوت پر منتج ہوا۔ وادی نیل کے ان عوام کے اوپر ایک قلیل التعداد اعلیٰ طبقہ ہے جو زمانہ حال کے مصر کے ایشیائی فاتحین یعنی عربوں۔ کردوں۔ چرکسیوں۔ البانیوں اور ترکوں کی اولاد ہیں۔ اس طبقہ اعلیٰ کے علاوہ جو برطانوی قبضہ سے پہلے کل سیاسی اقتدار کے اجارہ دار تھے بڑی یوروپی "مستعمرات" ہیں جن کے غیر معمولی حقوق ہیں۔ مزید پیچیدگی ایک کثیر التعداد دیسی عیسائیوں کی عنصر مقاومت سے پیدا ہو گئی ہے جو قبطی کہلاتے ہیں اور جنہوں نے عرب فتوحات کے وقت اسلام لانے سے انکار کیا اور جو آج تعداد میں کل آبادی کا دسواں حصہ ہیں۔

نسل و تمدن و مذہب کے ایسے اجتماع اور غیر ملکی حکومت کی امتدادی روایات کی وجہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم پرستی کی نشو و نما کے لیے مصر کی آب و ہوا بالکل ناموافق ہو گی۔ ... برخلاف اس کے مشرق ادنیٰ کے دیگر حصص کے مقابلہ میں مصر ہی میں سب سے زیادہ مغربی اثرات سرایت کر رہے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے ختم پر بوناپارٹ کے حملہ نے مصری طرز زندگی پر بڑا اثر پیدا کیا اور باوجودیکہ فرانسیسی مصر سے بہت جلد خارج کر دی گئی لیکن وادی نیل میں یوروپی اثرات نشو و نما پاتے رہے۔ محمد علی نے جو ایک قابل البانی معرکہ جو تھا اور فرانسیسی حکومت کے زوال کے بعد مصر کا مالک بن بیٹھا تھا یوروپی تدابیر کی فوقیت کو محسوس کر کے یوروپی تمدن کی اشاعت کا عمل شروع کیا۔ اگرچہ

کرنے لگے اور انیسویں صدی کی آخری قرن میں تیز نظر یورپی مبصرین کو نظر آنے لگے ۱۸۹۵ء میں جب مشہور افریقی متخصص شوئنفورتھ مصر سے گزرا تو وہ عظیم الشان روحانی انقلاب کو محسوس کر کے متحیر ہو گیا جو وادی نیل میں اُس کی سابقہ سیاحت کے بعد پیدا ہو گیا۔ اُس نے لکھا ایک حقیقی قومی خود شناسی پیدا ہونا شروع ہو گئی ہے۔ مصری ایک حقیقی قوم ہونے سے ہنوز بہت دور ہیں لیکن اس کا آغاز ہو گیا۔[1]

بیسویں صدی کے ابتدائی سنین میں جو چیز پہلے صرف اہل بصیرت کو دکھائی دیتی تھی دفعتاً اور حیرت انگیز طور پر عالم شہود میں آ گئی۔ بلاشبہ اس زندہ شدہ مصری قومیت کا ایک اعتدال پسند پہلو بھی تھا جس کے نمائندے ایسے قدامت پسند اشخاص تھے مثلاً جامعہ ازہر کے مفتی اور لارڈ کرومر کے محترم دوست محمد عبدہ۔ انھوں نے اپنے ہموطنوں کو یہ تعلیم دینے کی کوشش کی کہ جادہ روشن خیالی و ترقی ہی حصول آزادی کے لیے صراط مستقیم ہے۔ مگر اس تحریک کا زیادہ تر یہ مقصد تھا کہ برطانوی حکومت کے خلاف نہایت بے صبری اور شدت سے احتجاج کیا جاوے۔ غالباً سب سے اہم یہ بات تھی کہ سب مصری فی الحقیقت دل سے قوم پرست تھے۔ قدامت پسند اور حامیان جمہوریت دونوں مصر کو برطانوی سلطنت کا مستقل جزو خیال کرنے سے انکار کرتے تھے۔ قوم پرستوں کا یہ طرز عمل ایک مستحکم قانونی احساس پر مبنی تھا۔ کیونکہ برطانوی حکومت ناپائدار سیاسی حکمت عملی کی بنیاد پر قایم تھی۔ انگلستان نے مصر میں یورپی مالی مفاد کے خود ساختہ علم بردار کی حیثیت سے مداخلت کی تھی۔ اس کی اس حرکت سے یورپ بالخصوص

---

[1] جارج شوئنفورتھ کی کتاب "آزادی پسند اسلام کی روشنی میں مصریوں کی نشاۃ ثانیہ" مطبوعہ برلن ۱۹۲۲ء مصنف

گیا جیسا کہ مصر میں۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ وہ مصری قوم پرستی کے ہر شعبہ کا جدّاعلیٰ ہے۔ اس کے زیر اثر صرف عربی پاشا جیسے جبر پسند اور شورش انگیز ہی نہ تھے بلکہ شیخ محمد عبدہ جیسے قدامت پسند مصلحین بھی تھے جو مصر کی کمزوریوں کو محسوس کر کے مقاصد بعیدہ کے لیے ارتقائی ذرایع سے تحمّل کے ساتھ کام کرنا پسند کرتے تھے۔

کچھ عرصہ کے لیے میدان حامیان تشدد ہی کے ہاتھ رہا۔ ۱۸۸۱ء میں انقلابی شورش پسند بسرکردگی عربی پاشا رونما ہوئے۔ یہ عربی پاشا فوج کا افسر اور قابل لحاظ بات یہ ہے کہ یہ فلاحین میں سے تھا۔ اور وادی نیل کی نسل سے یہ پہلا شخص تھا جو موجودہ زمانہ میں مصر کی قسمتوں پر حکمراں ہوا۔ انقلاب پسندوں نے اپنے نعرے "مصر مصریوں کے لیے" بلند کیے اور کل اجانب کو خواہ وہ یورپی ہوں یا ایشیائی مصر سے نکال لینے کی کوشش کی۔ اس سعی میں ناکامیابی مقدر تھی۔ اسکندریہ میں یورپیوں کے قتل عام کی بدولت یورپی مداخلت فوراً شروع ہو گئی۔ ایک انگریزی فوج نے باغیوں کو تل الکبیر پر شکست فاش دی اور اس ایک لڑائی کے بعد ابتر اور دیوالیہ مصر برطانوی حکومت کے تحت میں آ گیا جس کا مجسمہ ایولین بیرنگ لارڈ کرومر تھا۔ خاندان خدیویہ قایم رکھا گیا اور دیسی طرز حکومت کا احترام کیا گیا لیکن اصلی اختیارات سب برطانوی "مشیر مالیات" کے ہاتھ میں آ گئے جو برطانوی شہنشاہی مرضی کا نمایندہ تھا۔

۲۵ سال لارڈ کرومر نے مصر پر حکومت کی اور اس قابل گورنر کی خدمات ایسی تھیں جن کی بدولت وہ دنیا کے بہترین حکمرانوں کی صف اول میں شمار کیا جائیگا۔ اس کے مضبوط ہاتھوں نے مصر کو افلاس سے کھینچکر بیحد خوشحالی میں پہنچا دیا۔ مگر اس مادی خوشحالی نے مصری قوم پرستی کو فنا نہ کیا۔ برطانوی سنگینوں کے حملہ سے منتشر ہو کر بیچینی کا بیج زرخیز نیل کی تہ بہ تہ میں جمنے لگا۔ اولاً تل الکبیر کے ہلاک کن صدمہ سے جذبات قوم پرستی تقریباً ناپید ہو گئے لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ وہ بتدریج ترقی

حب وطن ہی ہے جس سے وہ خون بنتا ہے۔ جو بہادر اقوام کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ اور یہ حب وطن ہی ہے جس سے ہر ذی روح حیات پاتا ہے"

بلاشبہ انگریزوں کی بڑی مذمت کی جاتی تھی۔ مصطفےٰ کامل کے اخبار اللواء کے ایک ایڈیٹوریل کا اقتباس ہدیہ ناظرین ہے۔ "ہم تباہ ہو گئے اور ہمارے تباہ کرنے والے انگریز ہیں۔ ہم ایک مقدس حق کا مطالبہ کرتے ہیں انگریز اُس حق کے غاصب ہیں۔ اور اسی وجہ سے ہمیں جلد یا دیر میں کامیابی کا یقین ہے۔ جب کوئی حق پر ہوتا ہے تو اس کی کامیابی کے لیے صرف وقت کا سوال ہوتا ہے"

باوجود اپنی پر جوش توقعات کے مصطفےٰ کامل کو حقایق کا احساس تھا اور وہ اسے تسلیم کرتا تھا کہ کم از کم فی الحال برطانوی اقتدار جبراً نہیں ہٹایا جاسکتا ہے لہذا اُس نے کسی ظاہری اشتداد کی کوشش نہ کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس سے خود وہ اور اُس کے متبعین تباہ ہو جائنگے۔ اوائل ۱۹۰۸ء میں اُس نے بعمر ۳۴ سال وفات پائی۔ اُس کے سربرآوردہ شاگرد فرید بے کو اُس کا خرقہ ملا۔ یہ اُس قابلیت کے نہ تھے لہذا اُنھوں نے حقیقی فصاحت کی کمی کو اپنی بدزبانی کی شدت سے پورا کیا۔ دونوں لیڈروں کا فرق اللواء کے اڈیٹوریل کے صفحات سے ظاہر ہو سکتا ہے۔ ستمبر ۱۹۰۹ء کا ایک اڈیٹوریل حسب ذیل ہے۔

"اس سرزمین کو انگریزوں نے ناپاک کر دیا اور اپنے اُن مظالم سے جو اُنھوں نے ہمارے عزیز دستور کے دبانے میں کیے متعفن کر دیا۔ اُنھوں نے ہماری زبانیں بند کر دیں ہمارے ہم قوموں کو زندہ جلایا اور ہمارے بے گناہ عزیزوں کو پھانسیاں دیں اور دیگر وحشیانہ مظالم کا ارتکاب کیا۔ جن پر قریب ہے کہ زمین متزلزل ہو آسمان پھٹے اور پہاڑ گر جائیں۔ اب ہم کو جدلیتہ پیرسے

فرانس میں بہت مخالفت پیدا ہوئی تھی۔ اور اس مخالفت کو فرو کرنے کے لیئے برطانیہ نے بار بار اس کا اعلان کیا تھا کہ مقابضت مصر محض عارضی تھی۔ واقعہ یہ ہو کہ مصری سنے چینی کو فرانس سنے ۱۹۰۴ء میں مفاہمت باہمی کی تکمیل تک زیادہ شتعل کیے رکھا۔ مصری تمناؤں سے فرانس کی یہ ہمدردی قوم پرستی کی تحریک کی ترقی میں بہت کارآمد ہوئی۔ مصر میں فرانس کی تمدنی روایات نمایاں تھیں۔ مصریوں کی نظر میں یورپی تعلیم فرانسیسی تعلیم کے مرادف تھی لہذا آنے والی نسلوں نے ہمیشہ فرانسیسی اساتذہ کے سامنے خواہ مصر میں خواہ فرانس میں زانوے ادب تہ کیا۔ ان فرانسیسی اساتذہ نے جو عموماً انگلستان کے مخالف تھے اپنے شاگردوں کے دل میں انگلستان سے نفرت اور برطانوی حکومت سے مخالفت پیدا کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

جمہوری قوم پرستوں کا سردار ایک جوان آدمی مصطفےٰ کامل تھا۔ وہ دراصل شورش انگیزوں کا شاہ تھا۔ پرجوش۔ دلکش۔ سرگرم۔ اور ایسا فصیح تھا کہ اپنے سامعین اور قارئین دونوں کو مبہوت کر دیتا تھا۔ وہ ان تھک مبلغ بھی تھا اور اخبارات اور رسائل کے ایک سلسلہ کی ایڈیٹری کرتا تھا۔ اور جب کسی رسالہ کو برطانوی عمال بند کر دیتے تھے وہ فوراً دوسرا جاری کر دیتا تھا۔ اُس کی تند لوث قوم پرستی کا اندازہ اُس کی ذیل کی تحریر سے ہو سکتا ہے۔ ۱۸۹۶ء میں اُس نے اس عنوان سے ایک مضمون لکھا "مصری مصر کے لیئے اور مصر مصریوں کے لیے ہے"۔ اگر خود اہل مصر ہی مصری تمدن کی بنیاد نہ ڈالیں گے تو یہ تمدن آئندہ قایم نہ رہے گا۔ جب تک فلاحین۔ تجار۔ اساتذہ طلاب المختصر ہر مصری فرد واحد کو یہ علم نہ ہو کہ انسان کے مقدس اور غیر محسوس حقوق ہیں اور یہ کہ وہ ایک آلہ کے طور پر مستعمل ہونے کو خلق نہیں ہوا ہے بلکہ اُسے ایک دانشمندانہ اور با عزت زندگی بسر کرنا ہے اور یہ کہ حب وطن نہایت ہی اچھا خیال ہے جو روح کو تقویت پہونچاتا ہے۔ اور یہ کہ جو قوم آزاد نہیں وہ ایسی قوم ہے جس کی کوئی ہستی ہی نہیں

وادیٔ نیل کو خالی کرے گا لہذا اُن کو زیادہ تر اپنے مساعی پر اعتماد کرنا پڑا۔

قوم پرستوں کے جذبات اور توقعات کا جب یہ عالم ہو تو مساعی صلح کی کامیابی معلوم! کیونکہ سر ایلڈن گورسٹ فروعات میں کیسا ہی صلح کن رویہ اختیار کرتے لیکن وہ اُس شی یعنی آزادی کا جس کے قوم پرست سب سے زیادہ خواہشمند تھے وعدہ نہیں کر سکتے تھے۔ انگلستان نے اس مطالبہ پر غور و خوض کرنے سے ہی انکار کیا تقریباً کل انگریزوں کو یہ یقین تھا کہ برطانوی سلطنت کے مشرقی و مغربی حصوں کے درمیان مصر و نہر سویز اہم سلسلہ تھا اور اسی وجہ سے مصر پر مستقل تسلط بالکل ضروری تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صلح کی برطانوی لبرل پالسی بالکل ناکامیاب ثابت ہوئی۔ سر ایلڈن گورسٹ نے بھی اپنی رپورٹ میں اعتراف کیا کہ مراعات محض کمزوری کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

تھوڑے ہی عرصہ میں منویانہ شورش اور اُس کا لوازمہ جبر و تشدد اتنا بڑھ گیا کہ حکومت برطانیہ کو یقین ہو گیا کہ صرف استبدادی کارروائی ہی سے حالت سنبھل سکتی ہے۔ لہذا ۱۹۱۱ء میں سر ایلڈن گورسٹ کی بجائے لارڈ کچنر مقرر ہوئے یہ تقرر قوم پرستوں کو علانیہ تنبیہ تھی کہ وہ فولادی بازو جس نے اُم درمان پر خلیفہ اور اس کی جماعت ہائے درا ویش کا استیصال کیا تھا۔ منویانہ سازشوں کا بہت جلد خاتمہ کر دے گا۔ کچنر مصر میں امن قایم کرنے کو مامور ہوا اور اُس نے بوجہ اتم اور کماحقہٗ امن قایم کیا۔ مصریوں کو صاف صاف بتا دیا گیا کہ انگلستان نہ تو وادیٔ نیل کو خالی کرنا چاہتا ہے اور نہ دیسیوں کو ایک عرصہ تک سیلف گورنمنٹ کے قابل سمجھتا ہے۔ اُن کو یہ بھی فہمایش کی گئی کہ وہ سیاسیات سے جن میں اونھیں دستگاہ نہیں ہے قطع نظر کر کے کاشتکاری میں مصروف ہوں جس کی قابلیت اُن میں موجود ہے۔ جدید قوانین نے لارڈ کچنر کو ایسے اختیار دیدیے جس سے وہ

کام لینا چاہیے - آزادی کی تلاش میں ہمکو جانیں ارزاں کر دینا چاہییں۔ اگر تم موجودہ حالت ہی میں رہو تو اس زندگی سے موت بہتر ہے"

محمد فرید کی ہر قسم کی مخالفت میں مجنونانہ بے صبری کرنے سے اہم غلطیاں واقع ہوئیں مثلاً اس نے اُن دیسی عیسائی قبطیوں کو جن کو مصطفےٰ کامل نہایت ہوشیاری سے راضی رکھتا تھا بددل کر دیا۔ ذیل کا مسلسل مقالہ جو مغربی و مشرقی خیالات کا معجون مرکب ہے اس احتجاج کا جواب ہے جو قبطیوں نے اُس کی تبلیغ کے روز افزوں اشتداد پر کیا "قبطیوں کو ٹھوکروں سے مار ڈالنا چاہیے۔ ان کے چہرے اور جسم ہنوز شیطانوں اور بندروں کے سے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ اپنے سینوں میں زہریلی روح مخفی رکھتے ہیں جنھوں نے ان کے وجود سے ڈاروں کے اس مسئلہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ انسان بندر سے پیدا ہوئے ہیں۔ تم بدکار عورتوں کے بچو! تم طشت بردارں کی اولاد! تم اوٹنگ کی دم اور بندر کی صورت! تم مُردوں کی ہڈیاں!"

قوم پرستوں کو ایسا سخت طرز عمل اختیار کرنے کی ہمت چند وجوہات سے ہوئی۔ امر اول یہ ہے کہ ۱۹۰۷ء میں لارڈ کرومر اپنے عہدہ پر و کونسل سے سبکدوش ہوئے اور اُن کے جانشین سر ایلڈن گورسٹ ہوئے۔ نئے حکمراں برطانوی لبرل پارٹی کے خیالات کے نمائندے تھے جو اُس وقت برسر اقتدار تھے اور یہ چاہتے تھے کہ لارڈ کرومر کے خود سرانہ اور بے پروایانہ طرز عمل کو ترک کر کے مصری شورش انگیزوں کو باہمی مصالحت سے رام کیا جاوے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ۱۹۰۸ء میں جو نوجوان ترکوں کو انقلاب میں کامیابی ہوئی اُس سے مصریوں کا مطالبہ حکومت خود اختیاری بہت زور پکڑ گیا۔ آخر الامر یہ کہ فرانس و انگلستان کے روز افزوں اتحاد سے یہ دیرینہ اُمید ٹوٹ گئی کہ برطانیہ بیرونی اثرات سے مجبور ہو کر اپنی سیاسی وعدہ کو وفا اور

اس سے بحث نہیں کہ گورنمنٹ کے جو اغراض و مقاصد بتائے جاتے ہیں وہ کہاں تک صحیح ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ حکومت متعلقہ اس میں ناکامیاب رہی کہ وہ اپنے آپ کو مصریوں میں ہر دلعزیز یا قابل التفات بھی ثابت کرتی برخلاف اس کے اُس نے اپنے آپ کو مشتبہ اور مصریوں کو دشمن بنا لیا ہے۔ اس مضمون میں اس امر کی بابت سخت شکوک ظاہر کیے گئے ہیں کہ لارڈ کچنر کی انسدادی تدابیر میں بے چینی کو محض ظاہری طور پر دبانے سے زیادہ بھی کچھ کامیابی ہوئی اور یہ بھی دکھایا گیا کہ سیاسی رائے کی آزادی کو قطعاً مٹا دینے کی مستقل مساعی کے باوجود آج مصر میں حمایت قومی کا خیال بیدار ہو گیا ہے۔ آزادی مطابع کو بالکل سلب کر لینے سے نہ صرف مسلمانوں کی تعداد کثیر میں اندرونی جوش پیدا ہو گیا ہے بلکہ جیسے کہ اس حرکت سے اُمید ہو سکتی تھی اُن قبطیوں میں بھی سخت منافرت پیدا ہو گئی جو اس وقت تک وفادار تھے۔ اس کی خواہ یہ وجہ ہو کہ گورنمنٹ اہل مصر کی نظر میں قابل اعتماد اور پسندیدہ ہونے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور صورت نہیں پیدا کر سکتی تھی۔ خواہ بے چینی کی ظاہری علامت کے فوری انسداد ہی سے وہ اپنے قبضہ کو محفوظ کر سکتی تھی۔ اگر صورت حال یہ ہے تو یہ انتہائی کمزوری یا قبضہ کے مسلمہ غیر محفوظی کا اعتراف ہے۔" یہ مضمون مسئلہ کے وسیع تر پیچیدگیوں کی بابت حسب ذیل تنبیہ پر ختم ہوتا ہے "مصر کی بابت اگرچہ انگریز رائے دہندگان بالکل بے پرواہ ہیں لیکن اس کو ہندوستانی مسلمان اور مغربی اور وسطی افریقہ کے کل ہماری رعایا بہت بے صبری کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ یہ اقوام بہت سخت اسلامی ہمدردی رکھتی ہیں۔ اور اس دور میں نصرانی شہنشاہیت کی جد وجہد کو حاسدانہ اشتباہ کی نظر سے دیکھتی ہیں"۔

۱۹۱۴ء میں جب مصری جذبات کی یہ حالت تھی تو لازمی تھا کہ جنگ عظیم کے چھڑنے سے شدید بے چینی پیدا ہو۔ درحقیقت مصر میں دولت انگلشیہ کی حالت بہت نازک تھی۔ فی الواقع اگرچہ انگلستان کامل طور پر مسلط تھا لیکن قانوناً مصر اس وقت

مغربانہ نظامات کا سرسری طور پر استیصال کر دیں۔ قوم پرست اخبارات تقریباً کل بند کر دیے گئے[53]۔ اور قوم پرست لیڈران کو مقید یا نظر بند یا جلا وطن کر دیا گیا۔ فی الواقع برطانوی حکومت نے اس کی سعی بلیغ کی کہ مصری معاملات سے توجہ ہٹالی جائے۔ اور برطانوی اخبارات نے بھی اس مضمون کو ناجائز قرار دے کر یہ اتحاد عمل کیا ماحصل یہ تھا کہ مصر اپنا پُر امن تھا کہ ایک قرن سے کبھی نہ ہوا تھا۔

مگر یہ سکوت سطحی تھا۔ یہ آگ تہ خاکستر ہو جانے کی وجہ سے اور بھی تیز ہو گئی جس سے مبصرین خائف ہونے لگے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں مشہور برطانوی ماہر سیاسیات سڈنی لو نے مصری معاملات کی کامل تحقیقات کرنے کے بعد لکھا "ہم مصر میں ہر دلعزیز نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض ہم سے ڈرتے ہوں اور بلاشبہ اکثر ہماری عزت کرتے ہیں لیکن اس کا مجھے یقین ہے کہ بہت کم اشخاص ہمیں پسند کرتے ہیں"[54]

اس سے بھی زیادہ صاف اظہار حال اُس مضمون میں کیا گیا تھا جو بمعنی خیز طور پر "مصر پر تاریکی" کے عنوان سے جنگ عظیم کے آغاز سے قبل شائع ہوا[55]۔ چونکہ یہ مضمون اس رسالہ میں شائع ہوا جو مشرقی مسائل کے ماہرین کے لیے نیم علمی رسالہ ہے لہذا یہ کامل توجہ کا مستحق ہے۔ اس مضمون میں تحریر تھا کہ "برطانوی اخبارات میں مصر کی اندرونی معاملات پر بالکل بحث نہ ہونا یا اُس کا ذکر تک نہ آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ صورت معاملات اچھی نہیں ہے۔ مصر کا ظاہری سکون دبی ہوئی بے چینی کا سکون ہے۔ یعنی یہ ایسا سکون ہے جو بدظنی اور بے اعتباری کی بدولت پیدا ہوا ہے۔ حال کے بعض واقعات سے مصریوں کو یقین کامل ہو گیا ہے کہ گورنمنٹ ملک کے اتفاق کلی کی تباہی کر رہی ہے۔ ...... ہم کو

---

[53] لو کی کتاب "مصر بحالت انتقال" صفحہ ۲۰۰ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۴ء۔ مصنف

[54] اپریل سنہ ۱۹۱۴ء کا "دی ایشیاٹک ریویو" مصنف

میں بھی یہی حال تھا اور مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ جو یوپی اس معروف اسلامی جامعہ کو دیکھنے جاتے تھے اُن کے کان کثیر اللغات عربی زبان کے دشنام سے بھر جاتے تھے۔"

قوم پرست جلا وطنوں نے اُن باتوں کو جو اُن کی ہم وطن مُلک میں نہ کہہ سکتے تھے نہایت زور سے ممالک غیر میں کہنا شروع کیا۔ اُن کے لیڈر محمد فرید بے نے "جدید ناجائز حکومت کی خلاف جو انگلستان نے ۱۸ر دسمبر کو قایم کی" ایک باضابطہ اعلان احتجاج جنیوا سے شایع کیا۔[۵۱] انگلستان جو یہ دعوے کرتا ہے کہ وہ حفاظت بلجیم کے لیے جرمنی سے لڑ رہا ہے اُس کو مصر کے حقوق پامال نہ کرنا چاہئیں اور نہ اوس کے متعلقہ عہد ناموں کو کاغذ کے پُرزے سمجھنا چاہئیں[۵۲]۔" یہ جلا وطن اشخاص نہایت شدومد سے جرمنوں سے مل گئے چنانچہ اس کا اندازہ قوم پرست جماعت کے سکرٹری یعنی عبدالملک ہمسہ کی ذیل کی تحریر سے ہوتا ہے جو ایک جرمنی رسالہ میں شایع ہوئی:-

"مشکل سے کوئی مصری ہوگا جو انگلستان کی شکست اور اُس کی سلطنت کی تباہی کی دعا نہ مانگتا ہو۔ جنگ کے اوائل میں جب میں مصر ہی میں تھا میں نے اس عام خیال کو بچشم خود دیکھا۔ شہروں اور دیہاتوں میں فرزانہ سے لیکر سادہ لوح کسان تک کو قیصر کی محبت اسلام اور مودت خلیفۃ المسلمین کا یقین ہے۔ اور یہ سب جرمنی کی فتح کی دعا مانگتے اور امید کرتے ہیں[۵۳]۔"

---

[۵۱] ۱۵ر جون ۱۹۱۵ء کے رسالہ ریویو دی سائنسیز پولیٹک میں بعنوان "مصر اور خیانت کا آغاز" ۔ مصنف

[۵۲] محمد فرید بے کا مضمون "مصر اور جنگ" جو مئی ۱۹۱۵ء کے رسالہ ریویو پولیٹک انٹرنیشنل میں شایع ہوا۔ مصنف

[۵۳] عبدالملک ہمسہ کا مضمون "مسئلہ مصر"، ۱۵ر نومبر ۱۹۱۶ء کے رسالہ ایشیا میں شایع ہوا۔ مصنف

بھی عثمانی سلطنت کے ماتحت تھا اور انگلستان کا قبضہ عارضی تھا۔ اب یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ترکی سلطنت انگلستان کے دشمنوں یعنی سلاطین ٹیوٹن کا ساتھ دے گی۔ اور یہ بھی معلوم تھا کہ مصریوں کو ترکوں سے ہمدردی ہے حتیٰ کہ خدیو عباس حلمی نے ترکوں سے محبانہ خیالات کو کسی طور پر پوشیدہ نہیں کیا۔ یورپی جنگ کے پہلے چند ماہ میں جبکہ ترکی ہنوز برائے نام غیر جانبدار تھا مصری دیسی اخبارات برطانوی نگرانی کی موجودگی میں بھی در پردہ مفویانہ مضامین سے بھرے ہوئے تھے اور مصری عوام الناس کے متمردانہ طرز عمل اور مصری دیسی افواج کی شورشوں نے ہوا کا رُخ صاف بتادیا انگلستان کو بہت خوف پیدا ہوگیا۔ لہذا جب نومبر ۱۹۱۴ء میں ترکی شریک جنگ ہوا تو انگلستان نے فیصلہ کن عمل کیا یعنی عباس حلمی کو معزول کرکے اُس کے چچازاد بھائی حسین کامل کو "سلطان" بنادیا اور مصر پر برطانوی صیانت اعلان کی۔

اس ضرب سے قوم پرستوں کا غیظ و غضب بڑھا چونکہ برطانیہ اور مستعمرات کی افواج کثیر سے ملک بھر دیا گیا تھا لہذا باضابطہ بغاوت جیسی کوئی حرکت ناممکن تھی۔ بایں ہمہ جابجا جبر و اشتداد کے بہت سے واقعہ رونما ہوئے جن کا انسداد صرف "حالت محاصرہ" کی سختی سے اطلاق کرنے سے ہوا۔ ان نازک ایام کی تصویر ایک فرانسیسی ناظر نے حسب ذیل الفاظ میں کھینچی ہے۔

"اعلان جہاد عیسائیوں کے خلاف اس تعصب کو مشتعل کررہا ہے جس سے ہر سچے مسلمان کا قلب متحرک ہوجاتا ہے۔ اکتوبر کے آخر ایام سے طبقہ ادنیٰ کے مسلمانوں کی آنکھوں سے ہی ہر شخص یہ معلوم کرسکتا تھا کہ اُن کو عیسائیوں کا قتل عام کرنے کی اُمید ہے۔ قاہرہ کی گلیوں میں اہل مصر یورپی آیندوروند کو گستاخ نظر سے دیکھتی تھی۔ بعض تو سلطان کے اعلان جہاد کو معلوم کرکے خوشی میں ناچنے لگے۔ جب اس کی اطلاع پولیس کو ہوتی تھی تو اُن کو قریب ترین تھانہ میں سزا بیدِ تازیانہ فوراً دی جاتی تھی۔ جامعہ ازہر

کبھی پیدا نہ ہوئی۔[1]

برابرہ کے ساتھ ہی ساتھ عرب مختلف تناسب میں ہر جگہ موجود ہیں۔ بارہ سو سال ہوئے کہ عربی فتوحات کے ساتھ ہی عربوں نے ہر جگہ نوآبادیاں قایم کیں۔ انھوں نے بربروں کو اسلام اور عربی تمدن میں داخل کیا لیکن وہ شمالی افریقہ کو اسلامی دنیا کا ایسا جزو نہ بنا سکے جیسا کہ شام یا عراق یا کمتر درجہ پر مصر کو بنا لیا تھا۔ یہ دونوں قومیں حقیقی طور پر کبھی مختلط نہ ہوئیں۔ باوجودیکہ برابرہ ہزار سال سے عربی اتالیقی میں ہیں لیکن اُن کا طرز معاشرت بالکل جدا رہا۔ انھوں نے اپنی زبان کو زیادہ تر قایم رکھا اور آپس میں شادیاں بھی بہت کم ہوئیں۔ اکثر بڑی جماعتوں میں خالص نسل کے عرب بکثرت پائے جاتے ہیں لیکن یہ آج بھی ایک طور پر اجانب میں شمار کیے جاتے ہیں۔[2]

ایسے متضاد عناصر کی موجودگی سے شمالی افریقہ کی سیاسی زندگی ہمیشہ پرشور رہی۔ سب سے زیادہ مستقل حصہ مراکش تھا لیکن یہاں بھی کوہستانی قبایل نے اصلاً کبھی بھی سلطانی اقتدار کو تسلیم نہیں کیا۔ رہے وہ حصے جن میں ممالک بربر اور الجزائر و ٹیونس و طرابلس شامل ہیں سواحلی بندرگاہ سے کچھ زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ اور اندرون ملک میں عملاً بالکل قبائلی آزادی کا دور دورہ ہے۔ اس پراگندہ شور و شغب میں فرانسیسی فتوحات کا سیلاب آیا جو ۱۸۳۰ع میں الجزایر کی فتح سے شروع ہو کر اب مراکش کی فتح پر ختم[3] ہوتا ہے۔ فرانس کی بدولت ملک میں

---

[1] تاریخ برابرہ کا اچھا خلاصہ ایچ ڈا لسچر برکی "تاریخ افریقہ کے لوہے" مطبوعہ پیرس ۱۹۱۰ع میں ہے۔ مصنف

[2] عرب اور برابرہ میں فرق کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو کیکس دی سینتا تمور کی کتاب "اعراب اور قبائل" مطبوعہ پیرس ۱۹۱۰ع اے بیل کی کتاب "ممالک بربر میں اسلام پر ایک نظر" مطبوعہ پیرس ۱۹۰۸ع۔ مصنف

[3] مختصر تاریخی حالات کے لیے ملاحظہ ہو اے۔ سی گورنج کا مضمون "شمالی افریقہ کی یوروپی فتح تا بہ جون ۱۹۱۲ع"

بلاشبہ کثیر التعداد برطانوی افواج کی موجودگی میں لیبیا کے بیانات محض ہوائی باتیں تھیں۔ نہر سویز سے ترکی کے وہ حملے جن سے اُمیدیں وابستہ تھیں پسپا کر دیئے گئے۔ اور "حالت محاصرہ" سختی سے عمل پذیر ہوئے اور مصر پر جب برطانوی افواج کا طوفان اُمنڈ آیا تھا خشمگیں خاموشی طاری ہو گئی۔ یہ سکوت اختتام جنگ تک قایم رہا۔

اس موقع پر ہم باقی شمالی افریقہ میں قوم پرستانہ اظہارات کی طرف توجہ کرنے کے لیے عود کرتے ہیں تو ہم کو مصر کی طرح یہاں ارضی حب وطن کے آثار نہیں ملتے۔ یوروپیوں کے خلاف نفرت تو بکثرت موجود ہے لیکن "حب الوطنی" کے ایسے خیالات جو موجود ہیں زیادہ تر اُن قوم پرستانہ خیالات کے شایع شدہ طرز کے ہیں جو "اتحاد بین الاسلامی کی قوم پرستی" اور "اتحاد بین العربی" کے نام سے موسوم ہیں جن پر ہم جلد بحث کرینگے۔

شمالی افریقہ میں اس محدود المفہوم قومی احساس کی فقدان کی اصلی وجہ یہ ہے کہ مصر کے علاوہ اور کوئی سرزمین ایسی نہیں ہے جو کبھی بھی ایک "حقیقی قوم" رہی ہو یا جس میں "قوم" بننے کے نمایاں آثار ظاہر ہوں۔ بحیرہ روم اور ریگستانی صحاری کے درمیان قطعہ ارض میں زیادہ تر آبادی برابرہ کی ہے جو ایک قدیم نسل کے ہیں اور ایشیائی یا حبشی ہونے کی بجائے نسلاً یورپی ہیں اور اُن لاطینی نسلوں سے جو بحیرہ روم کے دوسرے کنارے پر آباد ہیں بہت متقارب ہیں۔ برابرہ کو دیکھ کر دہقانی البانیوں کی یاد آتی ہے۔ یہ لوگ اپنی زبان اور اپنی رسوم کے بڑے پابند ہیں اور ان میں جبلی قومی احساس ہے۔ لیکن یہ لوگ نہایت پختہ اختصاص پسند ہیں اور ہمیشہ سے متعدد قبائل میں منقسم ہیں اور بعض وقت جزوی معاہدین کی حیثیت سے متحد ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان میں حقیقی قومی حب الوطنی

کی دیگر اقوام کے مقابلہ میں ایرانیوں میں سب سے زیادہ مستحکم "وطنی" احساس پایا جاتا ہے۔

اونیسویں صدی میں ایران قعر مذلت میں پھنسا تھا کہ اوس کی نمایاں کمزوری سے زار روس کی اور کچھ کمتر درجہ پر برطانیہ کی جوع الارض بھڑک اوٹھی۔ لیکن صاحب فکر ایرانیوں نے ایران کے انحطاط اور بیرونی خطرات کا اندازہ کرلیا تھا اور اصلاحی شورشوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اُن کا آغاز اوائل اونیسویں صدی میں بابی تحریک مذہبی سے ہوکر سنہ ۱۹۰۶ء کے انقلاب پر[1] ختم ہوا۔ سنہ ۱۹۰۷ء کے روسی اور انگریزی معاہدہ نے اس انقلاب کو دفعتاً رونما کردیا۔ اس معاہدہ کی رو سے انگلستان اور روس نے فی الحقیقت ایران کو آپس میں تقسیم کرلیا اور شمال میں "روسی حلقۂ اثر"، اور جنوب میں "انگریزی حلقۂ اثر"، اور درمیان میں "غیر جانبدار علاقہ"، قایم کردیئے گئے۔ لہذا اس انقلاب کا زیادہ تر یہ منشار اور مقصد تھا کہ ایرانی محبان وطن اپنا گھر درست کرکے آخر دم پر یورپی تسلط کے اس خطرے کو دفع کرنے کے لیے جان توڑ کوشش کریں جو ملک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لیکن یہ انقلاب محض یوروپی تعدی کے خلاف صدائے احتجاج نہ تھا بلکہ اس کا منشار اجنبی قاچار[2] خاندان کی

---

[1] انقلاب سے قبل اصلاحی تحریکات کا مشرح حال "×" کے مضمون "ایران کی سیاسی حالت" میں درج ہے جو جون سنہ ۱۹۱۳ء کے ریویو آف ریلیجنز مسلمان میں شایع ہوا۔ نیز ملاحظہ ہو وامبیری کی کتاب "مشرقی ممالک میں مغربی تمدن"، جنرل سر ٹی۔ ای گارڈن کا مضمون "ایران میں اصلاحی تحریک" جو ۱۳ر مارچ سنہ ۱۹۰۶ء کو سنٹرل ایشیا سوسائٹی کی کارروائی میں شایع ہوا۔ مصنف

[2] قاچار موجودہ شاہی خاندان ایران کا نام ہے۔ دولت صفویہ کے زوال کے زمانہ میں فتح علی قاچار نے طہماسپ ثانی کو پناہ دی اور شاہ کا عرصہ دراز تک معاون رہا۔ نادر شاہ نے اُسے اس خدمت کی وجہ سے قتل کرڈالا۔ نادر شاہ کے بعد جو طوائف الملوکی پھیلی اُس میں محمد حسن نے اپنے وطن استرآباد پر قبضہ کرکے علم آزادی بلند کیا اور احمد شاہ درانی کے حملوں کو کامیابی سے روکا اور بالآخر گیلان مازندران و استرآباد پر قابض ہوگیا۔ اس زمانہ میں کریم اور آزاد دو اور سربرآوردہ اشخاص تھے لہذا سہ گونہ جنگ شروع ہوئی کریم نے اولاً محمد حسن پر حملہ کیا اور شکست کھائی، دوبارہ

امن و امان تو قایم ہوا اور مادی خوشحالی پھیلی لیکن دیگر بلاد اسلامی کی طرح یہاں بھی یوروپی انالیقیت کے ان فوائد ہی کی بدولت اہل ملک میں اپنی یورپی فاتحین سے مشترکہ نفرت اور آزادی کی مشترکہ توقعات رکھنے کی وجہ سے ایک جدید قسم کا اتحاد پیدا ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گزشتہ نسل میں "نوجوان الجزایری" اور "نوجوان ٹیونسی" سیاسی جماعتیں عالم شہود میں آئیں۔ ان جماعتوں کے سرگروہ فرانس کے تعلیم یافتہ اشخاص تھے جن میں "سیلف گورنمنٹ" اور "آزادی" کے مغربی خیالات سرایت کر چکے تھے[1]۔ مگر جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے ان کا نصب العین خالص الجزائری یا ٹیونسی اقوام کا قایم کرنا نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد وسیع تر شمالی افریقہ کا اتحاد یا غالباً "اتحاد بین الاسلامی" ہے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ جماعتیں سنوسیوں اور اسی قسم کے اُن دیگر اثرات سے قریبی اتصال رکھتی ہیں جن کا ذکر اتحاد بین الاسلامی کی فصل میں ہو چکا ہے۔

عربی یا مستعرب بلاد میں حمایت قومی کی ترقی کے "ابتدائی درجہ" کا تو یہ حال ہے۔ مگر بلاد اسلام میں ایک اور اہم قوم پرستانہ خیالات کا مرکز یعنی ایران ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ فی الحقیقت ایران ایسا ملک ہے جہاں کہ عقلاً اصلی تحریک قوم پرستی کی سب سے زیادہ اُمید ہو سکتی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ مشرق ادنیٰ

بقیہ نوٹ صفحہ ماقبل۔ کے امریکن ہسٹاریکل ریویو میں شایع ہوا۔ مصنف

[1] فرانسیسی شمالی افریقہ کی ان تحریکات قوم پرستی کے لیے ملاحظہ ہو اسے سمروی ایر کی کتاب "مسلمانوں کی قوم پرستی" مطبوعہ قسطنطین۔ الجزائر ۱۹۱۳ء۔ پی۔ لاپی کی کتاب "اہل ٹیونس کا تمدن" مطبوعہ پیرس ۱۸۹۸ء پی بیلے کا مضمون "نوجوان الجزائری" جو یکم نومبر کو ریویو دی پیرس میں شایع ہوا۔ مصنف

خواہ مشرقی ہوں یا مغربی ایک ایرانی حب الوطنی کا مظاہرہ تھا۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ یہ حب الوطنی کی تحریک یوروپی شہنشاہیت کی جابرانہ مداخلت سے کیسی پامال ہوئی[1] ۱۹۱۱ء میں انگلستان اور روس نے پورا قابو حاصل کر لیا محبان وطن مجرم قرار دیے گئے اور اُن پر ظلم کیے گئے۔ اور ایران حالت یاس میں غرق خاموشی ہوگیا۔ چنانچہ ایک برطانوی اہل قلم نے اس وقت یہ تحریر کیا "ایسی شکستہ دلی و مایوسی اور نیز ایران کی موجودہ بدنظمی کے روس اور برطانیہ عظمیٰ دونوں براہ راست ذمہ دار ہیں۔ اگر کوئی روز شمار ہو تو اُن کو اس کا جواب دینا ہوگا۔ حالت میں ترقی کا ذکر کرنا محض یاوہ گوئی ہے درانحالیکہ ایران میں جو حکومت ہے وہ کابینہ ہے جو ملک کی غیر معتمد اور روس سے خائف ہے اور جس کو روس و انگلستان دونوں مالی حیثیت سے نہایت مفلس و نادار بنا کے تھوڑا تھوڑا روپیہ سخت سود پر دیتے ہیں اور اُس کو یہ بھی اجازت نہیں کہ وہ مسٹر شوسٹر جیسے ایماندار اور قابل ممالک غیر کے ماہرین ملازم رکھے۔ شاہ ہنوز کمسن نائب السلطنت غیر حاضر اور پارلیمنٹ معزول ہے اور بہترین اور دلیر ترین با ایمان محبان وطن قتل یا جلاوطن کردیے گئے۔ ایسی حالت میں سرمایہ داروں و مراعات طلبوں اور حریصان ارض

بقیہ نوٹ متعلق صفحہ ۱ ۔ ۱۸۶۲ء میں تاؤ کوانگ جسے برطانیہ کو پہلی مرتبہ جنگ کرنی پڑی ۱۸۵۰ء میں ہین لنگ تخت نشین ہوا اس کی زمانہ میں ٹائی پنگ کی بغاوت ہوئی ۱۸۵۰ء لغایتہ ۱۸۶۴ء تک جی رہا جو لاولد مرا اور اُس کا ایک چچازاد بھائی تخت نشین ہوا جس کا نام کوانگ سیو تھا اور ۱۴ نومبر ۱۹۰۸ء کو مرا ۔ دسمبر ۱۹۰۸ء میں پوائی بعمر دو سال شہنشاہ ہوا ۱۹۱۱ء میں مستعفی ہوا اور ۱۲ فروری ۱۹۱۲ء کو جمہوریت قایم ہوئی۔ مترجم

[1] ملاحظہ ہو ڈبلیو۔ ایم شوسٹر کی کتاب "اختناق ایران" مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۲ء۔ انقلاب کے

مخالفت بھی تھی جس نے عرصۂ دراز سے ایران میں بدنظمی پھیلا رکھی تھی۔ یہ شاہان قاچار ترکمانی نسل کے تھے۔ ان پر کبھی بھی ایرانی رنگ نہ چڑھا چنانچہ درباری زبان بجائے فارسی کے ترکی تھی۔ اُن کی حالت کم و بیش ایسی ہی تھی جیسے کہ چینی انقلاب سے پیشتر مانچو[۵] خاندان کی تھی۔ لہذا یہ ایرانی انقلاب اصلاً جملہ اثرات اغیار کے خلاف

بقیہ نوٹ متعلق صفحہ : ۔ کریم نے آزاد پر حملہ کیا۔ آخر الذکر نے قزوین میں محصور ہو کر کریم کو نقصانات عظیم پہونچائے۔ بالآخر کریم نے چیرہ دستی حاصل کر کے ۱۹ سال تک بحیثیت وکیل السلطنت حکومت کی۔ اُس کے بعد قاچار خاندان کے زمانہ نے مساعدت کی اور آغا محمد قاچار نے کل مدعیان سلطنت کا استیصال کیا۔ فرماں روایان قاچار حسب ذیل ہیں۔ ۱۔ آغا محمد شاہ ۲۔ فتح علی شاہ ۳۔ محمد شاہ قاچار ۴۔ ناصر الدین شاہ ۵۔ مظفر الدین شاہ ۶۔ محمد علی شاہ ۷۔ سلطان احمد شاہ قاچار موجودہ شاہ ایران۔ مترجم

۵۔ مانچو خاندان کی اصل کی بابت یہ متفقہ امر ہے کہ خاندان کن کا شعبہ ہے جو شمالی چین پر حکمراں رہا۔ یہ تاتاری الاصل ہیں۔ اس خاندان کا ابتدائی قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ تین لڑکیاں آسمان سے پیدا ہوئیں اور کوہ ابیض میں رہتی تھیں۔ ایک دن یہ تینوں بہنیں ایک جھیل میں نہا رہی تھیں اور ایک پھل چھوٹی بہن کی گود میں گرا جس نے اُسے کھا لیا وہ حاملہ ہوئی ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام آئی سین گھیور و یعنی "زریں خاندان کی اصل" رکھا گیا۔ ماں کی وفات کے بعد یہ لڑکا ایک کشتی میں سوار ہو کر دریا ہر کا میں روانہ ہو گیا حتیٰ کہ وہ ایسے مقام پر پہنچا جہاں تین قبیلے رہتے تھے۔ اور آپس میں لڑتے تھے۔ اس لڑکے کی ذاتی وجاہت اور شکل و شباہت کا قبائل کے امیروں پر ایسا اثر پڑا کہ باہمی جنگ و جدال کو فراموش کر کے اسے اپنا بادشاہ بنا لیا اور شہراو تو اس کا پایہ تخت ہوا۔ اُس وقت سے یہ خاندان ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ ۱۶۴۴ء میں خاندان منگ کا آخری فرماں روائے چین تخت نشین ہوا اور ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ اس بغاوت کے فرو کرنے کے لیے خاندان مانچو سے مدد طلب کی گئی۔ انھوں نے ایک مانچو شہزادے کو تخت نشین کر کے تا تسنگ خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس نے ۱۶۶۱ء تک سلطنت کی۔ ۱۶۶۱ء میں اُس کا بیٹا کانگی تخت نشین ہوا۔ ۱۷۳۶ء میں کین لنگ ۱۷۹۵ء میں کیا لنگ

جنگ ہائے بلقان کے اختتام تک پہنچ چکے ہیں۔ اور اسی عہد میں ترکی قوم پرستی کا دوسرا "نسلی" پہلو اوّل مرتبہ نمایاں نظر آتا ہے۔

اس زمانہ تک عثمانی ترک یہ احساس کرنے لگے کہ وہ دنیا میں یکہ و تنہا نہ تھے اور یہ کہ وہ اصلاً اُن کثیر الجماعات اقوام کا مغربی شعبہ تھے جو مشرقی یورپ اور کل ایشیاء میں بحیرۂ بالٹک سے لیکر بحر الکاہل تک اور بحر روم سے لیکر بحر شمالی تک پھیلی ہوئی تھیں جن کو ماہرین تشریح اجسام انسانی "یورال و آلٹائک" اور عرف عام میں تورانی کہتے ہیں۔ اس جماعت میں بہت سے دور افتادہ منتشر اقوام یعنی قسطنطنیہ اور اناطولیہ کے عثمانی ترک۔ ایران اور ایشیائی متوسط کے ترکمان جنوبی روس و ماورائے قفقاز کے تاتاری۔ ہنگری کے گیار[1] اور صوبجات بالٹک کے قوم فین اور سائبیریا کے اصلی باشندے اور نیز دور اُفتادہ مغل اور مانچو بھی شامل ہیں اگرچہ یہ اقوام تمدن و روایات و نیز ذاتی مشابہت میں مختلف ہیں تاہم اُن میں خاص اور نمایاں صفات مشترک ہیں۔ ان کی سب زبانیں مشابہ ہیں اور ان کی جسمانی اور دماغی ساخت سے مسلمہ قرابت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ سب اقوام اپنی بڑی جسمانی قوت اور غیر معمولی قوت تحمل کے لیے مشہور ہیں اگرچہ ان میں قوت تخیل اور فنون لطیفہ کی ایجادی احساس کی کمی پائی جاتی ہے لیکن ان میں صبر و استقلال اور تحمل کی قوت بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ مزید براں انھوں نے ہمیشہ مافوق العادت جنگی قابلیت اور اُسی کے

---

[1] گمیار یا باشندگان ہنگری فنی اور ترکی اقوام کا شعبہ ہیں جو ششہء میں کوہ یورال سے والگا کے کنارے آئے اور ایک عرصہ کے بعد اُن کو قبیلہ خزر نے نکالدیا۔ اپنی بادشاہ ارپد کی سرکردگی میں یہ قوم مستقلاً پنونیا میں آباد ہوگئی اور اب موجودہ ہنگری میں آباد ہیں ان کی خصوصیات سڈول چہرہ خوبصورت جسم۔ بال و آنکھیں سیاہ۔ گندمی رنگ میانہ قد۔ محرور المزاج اور حب الوطنی ہیں ان کی تعداد ایک کروڑ ہے۔ مترجم

کی گرگ خصال جماعت صید زبوں پر ٹوٹی پڑتی ہے جس کی مقاومت روز بروز
کمزور تر ہوتی جاتی ہے۔ اب ایران کا بچنا اعجاز ہی ہوگا۔

بلادِ اسلامی میں قوم پرستانہ تحریک کی "ابتدائی منزل" کا ہمارا
تبصرہ اس طرح پر ختم ہوتا ہے۔ ہم کو یہ بھی ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ اسی عرصہ میں ہندوستان
میں بھی قومی حمایت کی تحریک پیدا ہو رہی تھی اگرچہ یہ ایک مختص اور عجیب و غریب
دائرہ میں چل رہی ہے۔ ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مندرجہ بالا تحریکات کے سوا اسلامی
اقوام میں اور بھی چھوٹی چھوٹی حمایت قومی کی تحریکات مثلاً روسی تاتاریوں۔ چینی
مسلمانوں اور ڈچ انڈیز کے اہل جاوا میں جاری تھیں۔ ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ
یہ قومی حمایت کی تحریک کم و بیش اتحاد بین الاسلامی کے غیر قومی تحریک اور
نیز اُن "دوسری منزل" کی "نسلی" قومی تحریکات سے وابستہ ہیں جن پر ہم بہت
جلد بحث کرینگے۔

دوم

اس فصل کے شروع میں ہم لکھ چکے ہیں کہ بیسویں صدی کے ابتدائی
سنین میں ایشیا بالخصوص ترکی اور عرب اقوام میں پرستی کا دوسرا یعنی "نسلی"
درجہ رونما ہو گیا تھا۔ قوم پرستی کی اس وسیع تر درجہ نے سب سے زیادہ ترکوں
میں ترقی کی اور ان میں اس کی دو مختلف صورتیں پیدا ہو چکی تھیں جن کو ہم مصطلحات
"اتحاد بین الاتراک" اور "اتحاد بین التورانی" سے موسوم کرتے ہیں
ہم ترکی قوم پرستی کی ابتدائی صورت یعنی اُس کے محدود "عثمانی" ادراک کا ذکر ۱۳-۱۹۱۲ء کی

بقیہ صفحہ :- ابتدائی صورت کے لیے ملاحظہ ہو ای۔ جی۔ براون کی کتاب "ایران میں انقلاب" مطبوعہ لندن ۱۹۱۰ء مصنف

[1] ای۔ جی۔ براون کا مضمون "ایران کی موجودہ حالت" جو نومبر ۱۹۱۲ء کے کیمبرج ریویو میں شائع ہوا۔ مصنف

ارطغرل اور اوسکی عثمانی، چنگیز خاں[۱] اور تیمور لنگ[۲] اور اُس کی اٹل مغل قبایل۔ بابر فاتح ہند اور نیز دور افتادہ ختا کے قبلائی خاں[۳] اور نورہاچو[۴] سب ایک ہی نمونہ کے تھے تورانی سواروں کے نشان سُم تاریخ کے مسودہ پر سب سے گہرے منقوش ہیں

---

[۱] چنگیز خاں (۱۱۶۲ لغایة ۱۲۲۷ء) یہ مغل بادشاہ بڑی فاتحین میں سے ہے یہ دریائے اونوں کے قریب منغولیا میں پیدا ہوا۔ اس کا اصلی نام تموجن ہے اور ۱۱۷۵ء میں تخت نشین ہوا۔ اُس نے مغل قبائل کو متحد کرکے دو بار چین پر حملہ کیا اور ۱۲۰۸-۱۴ء میں چین کی دو سلطنتیں یعنی ہیا اور کین کو فتح کیا۔ ۱۲۱۹ء میں اُس کا سفیر مارا گیا اور اُس نے مشرق کی طرف حملہ کیا۔ اُس نے بخارا اور مرو کو لوٹا ہرات اور دیگر شہروں کو فتح کیا۔ جنوب و مشرق میں ترکوں کو پسپا کیا اور اُس کی افواج نے جنوبی روس اور شمالی ہند کو تباہ کیا چین پر تیسرے حملہ میں وہ مرا۔ مترجم

[۲] تیمور لنگ ۱۳۳۶ء لغایة ۱۴۰۵ء مشہور مشرقی فاتح جو بمقام کش پیدا ہوا اور جنگی زندگی ۱۳۵۸ء میں شروع کرکے سمرقند کا بادشاہ ہوگیا۔ اس نے بڑا حصہ ایران اور قفقاز کا فتح کیا اور ۱۳۹۸ء میں ہندستان پر حملہ کیا۔ شام میں حلب و دمشق کو تسخیر کیا۔ ۱۴۰۲ء میں سلطان بایزید کو بمقام انگورہ شکست دی جب وہ چین پر حملہ کی تیاری کر رہا تھا مر گیا۔ مترجم

[۳] قبلائی خاں ۱۲۱۶ء لغایة ۱۲۹۴ء چنگیز خاں کا پوتا اور مغلوں کا شاہ تھا ۱۲۵۹ء میں اپنے بھائی منگو خاں کا جانشین ہوا ۱۲۶۷ء میں چین پر حملہ کرکے خاندان مغلیہ قایم کیا اُس کی فتوحات میں کوچن چین تبت اور مغرب میں یورال کے پار تک تھیں۔ مگر اُس کو جاپانی مہم میں ناکامیابی ہوئی۔ مترجم

[۴] نورہاچو۔ خاندان ماچو سے سولھویں صدی میں یہ ایک چھوٹے سے قبیلہ کا سردار تھا اس نے اپنی دانشمندی اور بہادری سے اہل قبائل کو یکے بعد دیگرے مطیع بنا کر کل منچوریا پر قبضہ کر لیا اور چنگیز خاں کی طرح تیک منگ کا خطاب اختیار کیا اس خطاب کے معنی "بہادر اور مشہور" ہیں اور اپنے دوران حکومت میں "طین منگ" کا لقب اختیار کیا اس نے سلطنت چین سے آزاد ہو کر اصل خاندان ماچو کی بنیاد ڈالی جو چین پر حکمران ہوا۔ مترجم

ساتھ اقوام محکومہ پر اچھی حکمرانی کی قابل تعریف صلاحیت کا اظہار کیا ہے۔ بلاشبہ تورانی دنیا کے سب سے بڑے فاتحین میں سے ہیں مثلاً اٹیلہ[1] اور اُس کے ہنس کی افواج اور اریاد اُس کی قوم مگیار۔ اس پرنج[2] اور اوس کے بلغاری۔ الپ ارسلان[3] اور اسکی سلجوق

---

[1] اٹیلہ۔ یہ قہر خدا کہلاتا ہے اور قوم ہنس کا بادشاہ تھا۔ یہ قوم مغلوں کی شاخ تھی جس نے چوتھی صدی میں یورپ پر حملہ کیا اور رومی سلطنت کو تباہ کر کے ایک بڑی سلطنت قایم کر لی۔ اب یہ قوم یورپ سے مفقود ہو گئی ہے۔ اس کا زمانہ تقریباً ۴۰۶ء لغایۃ ۴۵۳ء ہے۔ اٹیلہ مندزوک کا لڑکا ہے اور اپنے چچا رہوا اس کے بجائے بمعیت اپنے بھائی بلیڈا کے ۴۳۴ء میں تخت نشین ہوا۔ ۴۴۴ء میں بلیڈا کو مار کے تنہا حکمراں ہوا۔ اس کی اصلی سلطنت ہنگری ٹرانسلوینیا میں تھی۔ یہ یونان۔ تھریس اور مقدونیہ پر تاخت کر کے وسطی یورپ کا مالک بن بیٹھا۔ ۴۵۱ء میں فرانس پر حملہ کیا اور رومی جنرل اٹیس سے شکست کھائی۔ دوسری سال اُس نے شمالی اطالیہ کو تباہ کر دیا اور رومۃ الکبری پر چڑھ آیا۔ یہ شہر محض پوپ کی درخواست پر بچا۔ جس دن اُس نے برگنڈی کی شہزادی ہلڈہ سے شادی کی اُسی شب میں مر گیا۔ مترجم

[2] بلغاری یہ یوگری یا فینی نسل کے ہیں اولاً ۱۲۰ء قبل مسیح ان کا ایک گروہ بسرکردگی و انڈارمینیا میں سکونت پذیر ہوا۔ اس کے بعد پانچویں صدی عیسوی میں یہ دریا ڈانیوب کے کنارے پہونچ گئے اور مشرقی سلطنت سے طرح مخالفت ڈالی۔ ۶۶۰ء میں یہ مختلف فرقوں میں منقسم ہو گئے۔ ان میں سے ایک زبردست گروہ نے بسرکردگی اسپرنج یا اسپاچ دریائے ڈانیوب کو عبور کر کے میزیا میں مقیم ہوا اور سلافی آبادی کو محکوم بنایا۔ یہ اسپرنج کیرات کا پوتا تھا جس نے اس قوم کو اواروں کی حکومت سے آزاد کیا۔ مترجم

[3] الپ ارسلان جس کے معنی بہادر شیر کے ہیں اس کا نام محمد ابن داؤد ۱۰۲۹ء لغایۃ ۱۰۷۲ء خاندان سلجوق کا دوسرا سلطان ہے اس کا دادا سلجوق تھا جو خاندان سلجوقی کا بانی ہے اس نے کل ایران کو فتح کر کے دیگر حصص ایشیا پر قبضہ کیا۔ نظام الملک اس کا وزیر تھا۔ مترجم

اجسام انسانی کے مساعی ہیں جنھوں نے اولاً توران سے اُس حجاب کو دفع کیا جس میں وہ مخفی تھا۔ اِن مساعی نے تورانی دنیا کی غیر متوقعہ وسعت کو روشن کردیا۔ اور اُس نے فوراً ہی غیر مستند اہمیت حاصل کرلی۔ وامبیری اور اُس کے رفقا کی تصانیف کل توران میں شایع ہوگئیں اور ان تصانیف کو توران کی اُن صاحب فکر اشخاص نے جو عصر جدید کے مجہول داعیات سے بیدار ہو رہے تھے نہایت شوق سے پڑھا۔ اس تورانی تحریک کی جامعیت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہو کہ یہ ترکی قسطنطنیہ اور کنارہ وگا کے تاتاری مراکز جیسے مقامات بعیدہ میں ایک ساتھ نمودار ہوئی۔ فی الواقع اگر کوئی تفاوت تھا تو صرف یہ کہ اس ہیجان نے باسفورس کے بالمقابل والگا میں اپنا عمل پہلے شروع کیا۔ یہ تاتاری نشأۃ اگرچہ غیر معروف ہو لیکن قوم پرستی کی تاریخ میں سب سے زیادہ مافوق العادت مظاہرہ ہو۔ تاتاری کسی زمانہ میں روس کے مالک تھے اور اگرچہ اُن کی زوالِ سلطنت کو ایک زمانہ ہوگیا لیکن وہ سلافی نسل کے سیل میں فنا نہ ہوئی۔ اگرچہ یہ قوم چار سو سال سے روسی حکومت کے ماتحت ہو۔ لیکن انھوں نے اپنی مذہبی و نسلی و ملی شخصیت کو سختی سے قایم رکھا ہو۔ یہ تاتاری جنکی والگا کے کنارے بالخصوص قازان میں گنجان آبادی ہو اور جو کریمیا کے بڑے حصہ پر قابض اور ماورائے قفقاز میں بڑی تعداد میں اہم جماعت اقل ہیں سلافی سلطنت میں بالکل جداگانہ "بستیوں" میں اگرچہ متفرق اور منتشر آباد ہیں لیکن غیر مرعوب ہیں۔

روسی تاتاریوں میں خود شناس قوم پرستی کی پہلی تحریک ۱۸۹۵ء میں نمودار ہوئی اور اُس وقت سے یہ تحریک تعجب انگیز سرعت سے ترقی کرتی رہی۔ ۱۹۰۵ء کے روسی انقلاب میں حکومت کی پابندیاں رفع ہونے سے باقاعدہ علمی شگفتگی شروع ہوگئی۔ کتابوں رسالوں کی کثرت متعدد اخبارات اور مستقل موقت الشیوع مطبوعات سے تاتاری نشأۃ کی زورمندی اور بارآوری کا ثبوت

توران کا ماضی مختلف نقطہائے خیال سے خواہ باعظمت خواہ منحوس تصور کیا جاوے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ ماضی نہایت پُر ولولہ ہے۔ بلاشبہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ یہ مختلف اقوام دراصل ایک ہی صحیح نسل سے ہیں یا نہیں لیکن جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اس سے عملی سیاسیات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چونکہ ان کی زبانیں ملتی جلتی اور طبائع بھی یکساں ہیں اور روح کی تڑپانے والی روایات کے ذخائر سے بہرہ اندوز ہیں لہذا اُن کا باہمی یگانگت کا خیال ہی نہایت زوردار قومی تحریک کا سنگ بنیاد ہو سکتا ہے۔

فی الحقیقت ایک نسل پہلے اس قسم کی تحریک کی کوئی علامت موجود نہ تھی۔ فینی اور ماںجو جیسے دور افتادہ قبائل ہی اپنی مشترکہ تورانی قرابت سے بالکل نابلد نہ تھے بلکہ ایسی قریبی اقوام جیسے عثمانی ترک اور وسط ایشیا کے ترکمان ایک دوسرے کو نے النفاقی اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ بلاشبہ عثمانی ترکوں میں نسلی احساس ایسا ہی مفقود تھا جیسا کہ قومی۔ ارمینس وامبیری ہم کو بتاتا ہے کہ ۱۸۵۶ء میں جب وہ پہلی مرتبہ قسطنطنیہ گیا تو لفظ ترک لوک (یعنی ترک) بہیمیت اور حماقت کا مرادف سمجھا جاتا تھا۔ اور جب لوگوں کو ترکی قبایل کی جو ایڈریا نوپل سے بحر الکاہل تک پھیلے ہوئے تھے نسلی اہمیت کی طرف توجہ دلائی جاتی تھی تو وہ یہ جواب دیتے تھے کہ تم ہم کو کرغزی اور تاتاری خانہ بدوش جہال میں تو نہیں شمار کرتے ہو۔۔۔۔۔۔ چند مستثنیات کے سوا قسطنطنیہ میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو ترکی قومیت یا زبان کے مسئلہ میں سنجیدگی سے دلچسپی رکھتا ہو۔[۵]

فی الواقع یہ ہنگری وامبیری اور فرانسیسی لیون کاہون جیسے مغربی ماہرین تشریح

---

[۵] وامبیری کی کتاب "موجودہ اور چالیس سال قبل کی ترکی"، صفحات ۱۱ و ۱۲۔ مصنف

اتحاد بین التورانی تحریکات میں روسی تاتاریوں نے نمایاں حصہ لیا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ والگا ہی کا ایک تاتاری یوسف بے اکچورہ اوگلو نامی تھا جو در اصل قسطنطنیہ کی پہلی جماعت اتحاد بین التورانی کا بانی تھا۔ اور اسی کی مشہور کتاب "تین سیاسی طریقے" ہی پر اس بحث کے متعلق مابعد کی تصانیف[1] مبنی ہیں

نوجوان ترکوں کے ۱۹۰۸ء والے انقلاب تک استنبول میں اتحاد بین التورانی کی تحریک مشتبہ تھی۔ سلطان عبدالحمید جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اتحاد بین الاسلامی کے مؤید اور جملہ تحریکات قوم پرستی کے دلی دشمن تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ حامیان اتحاد بین التورانی اگر مبتلائے عذاب نہ تھے تو ان کو سلطان نظر استحسان سے بھی نہ دیکھتے تھے۔ مگر نوجوان ترکوں کی قوم پرستی کے با اقتدار ہونے سے حالت بالکل بدل گئی۔ جدید حکومت کے عثمانی سازاعیان نے۔ اتحاد بین التورانی کے مواعیظ کو بہت شوق سے سنا اور ان میں سے اکثر اس تحریک میں شریک ہو گئے۔ یہ امر پیش نظر رکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ روسی تاتاری بدستور نمایاں حصہ لیتے رہے۔ اتحاد بین التورانی کا مبلغ اعلیٰ قابل ماہر سیاسیات احمد بے اغایف والگا کا ایک تاتاری تھا۔ اس کا اخبار الموسوم بہ "ترک اردو" (یعنی ترکی وطن) ترکی و تاتاری دنیا کے ہر حصہ میں پہونچتا تھا اور رائے عامہ کی ترقی میں بڑا اثر رکھتا تھا۔

اگرچہ احمد بے اغایف جیسے لیڈران نے کل تورانی دنیا یعنی فنلینڈ سے لیکر منچوریا تک کو ایک زبردست جماعت کے طور پر پیش نظر رکھا اور اس طرح وہ مکمل اتحاد بین التورانی کے حامی تھے لیکن ابتدا میں اُن کے عملی مساعی قریبی تعلق کے

---

[1] ان سرگرمیوں کی بابت ملاحظہ ہو "×" کا مضمون مذکورہ بالا۔ نیز احمد یمین کی کتاب "موجودہ ترکی کے مطالعہ سے اس کی ترقی کا اندازہ"، مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۴ء (مصنف)

ملتا ہے۔ روسی تاتاریوں کی معیشتی رفعت سے یہ یقین ہو گیا کہ جنگ کے مادی اسباب اُن کے پاس موجود ہیں۔ باکو کے تیل کے کروڑپتی تاتاری تاجروں نے اس موقع پر نمایاں حصہ لیا اور انھوں نے تحریک کی امداد میں نہایت فیاضی سے تھیلیوں کا مُنھ کھول دیا۔ روسی تاتاریوں نے نمایاں قابلیت کا اظہار کرکے روسی ایشیائی متوسط کے ترکمان بھائیوں کا جو قوم پرستی کے نفس سے زندہ ہو رہے تھے اعتماد حاصل کر لیا پہلے روسی دوما میں مسلمانوں کی بڑی جماعت تھی جو ایسے جوش اور قابلیت سے عمل پیرا تھے کہ روسی عوام نے سراسیمہ ہو کر گورنمنٹ کو ان پر آمادہ کیا کہ مسلمانوں کی نمائندوں کی تعداد گھٹا کر روسی پارلیمنٹ میں تاتاری اثر کم کر دیا جائے۔[1]

بلاشبہ روسی مسلمانوں نے نہایت ہوشیاری سے سلطنت روس سے سیاسی وفاداری کا اعلان کیا۔ بااینہمہ بعض پرجوش طبائع نے ترکی استنبول میں ایسا میدان عمل تلاش کرکے جس میں آزادی اور کامیابی کی زیادہ امید تھی اپنی خفیہ توقعات کا اظہار کر دیا۔ یہاں سلطنت عثمانیہ کے اندر اتحاد بین الاتراک اور

---

[1] تاتاری نشأۃ ثانیہ کے لئے ملاحظہ ہو۔ ایس بروبلیوف کا مضمون "روسی مسلمان" جو جنوری ۱۹۱۱ء کے دی مسلم ورلڈ میں شایع ہوا۔ فیورٹ کا مضمون "کریمیا کے تاتاری" جو اگست ۱۹۰۷ء کے ریویو دو موند مسلمان میں شایع ہوا۔ ایل شاتلی ایر کا مضمون "روسی مسلمان" جو دسمبر ۱۹۰۶ء کے ریویو دو موند مسلمان میں شایع ہوا۔ فان میکے کا مضمون "سلطنت روس میں ایشیائی اقوام کی بیداری" جو مارچ ۱۹۱۳ء کے جرمن ریویو میں شایع ہوا۔ آرمینیس وامبیری کی کتاب "مشرقی ممالک میں مغربی تمدن"، ایچ۔ ولیمس کا مضمون "روسی مسلمان" جو فروری ۱۹۱۴ء کے روسی ریویو میں شایع ہوا۔ "×" کا مضمون "اتحاد بین الاسلامی اور اتحاد بین الاتراک" جو مارچ ۱۹۱۳ء کے ریویو دو موند مسلمان میں شایع ہوا۔ (مصنف)

ماندہ ہوکر مدارج انحطاط کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ تورانی ہی ہیں جو اپنی جبلّی مردانگی اور تحمل و ہمت کی بدولت مغربی تہذیب کی دستبرد سے محفوظ ہیں اور مستقبل کے لیے بڑے محرک ہوں گے۔ بلاشبہ اتحاد بین التورانی کے بعض بافکر حامی تو یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ یہ اُن کی نسل کا مقدس فرض ہے کہ تازہ اور محفوظ تورانی خون کے نفوذ سے کل متنزل اور درماندہ دنیا کو از سر نو قوت پہونچائیں۔

بلاشبہ اتحاد بین التورانی کے حامیوں کو اس کا احساس ہو گیا کہ اُن کے رفیع منصوبوں کی تکمیل روسی سلطنت کی کامل تباہی پر منحصر تھی۔ بلاشبہ روسی سلطنت اپنی تاتاری و ترکمانی و کرغیزی و فنی اور اسی قبیل کی دیگر اقوام کی آبادی کی وجہ سے اتحاد بین التورانی کے مویدین کو تورانی زمین پر مختلف ضخامت کی سلافی تہ معلوم ہوتی تھی۔ لہذا روس کو وسیع "غیلاناد توران" قرار دینا بڑی بلند پروازی تھی۔ بایںہمہ اتحاد بین التورانی کے مویدین کو زبردست مغربی امداد کی اُمید تھی۔ ان کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جرمنی اور آسٹریا ہنگری بہت جلد روس سے جنگ کرنے والے تھے۔ نیز یہ بھی احساس ہوا کہ یہ ہنگامہ خواہ کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو گرانقدر امکانات پیش کرے گا۔

اتحاد بین التورانی کی ان توقعات ہی نے اس جنگ عظیم میں ترکی کو سلطنتہائے وسطی کا زیادہ تر جانب دار بنا دیا۔ بلاشبہ انور پاشا اور دیگر حکمران جماعت کے لیڈران عرصہ سے تحریک اتحاد بین التورانی کے کم و بیش حامی ہو چکے تھے۔ فی الحقیقت ترکی حکومت کی کمان میں متحد ہو چلے تھے۔ اس نے تحریکات اتحاد بین التورانی اور

لہ ملاحظہ ہو مضمون نوشتہ "مم" مذکورہ بالا اور نیز اس کا مضمون "معاصر ترکی میں سیاسیات حاضرہ" جو اسلامی دنیا کے ریویو میں دسمبر ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ مصنّف

ترکی و تاتاری اجزا یعنی ترکی آل عثمان۔ روسی تاتاری۔ وسط ایشیا اور ایران کے ترکمانوں تک محدود تھے۔ چونکہ یہ سب اقوام مسلمان بھی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس تبلیغ میں مذہبی نیز نسلی رنگ بھی تھا اور چند لحاظ سے اتحاد بین الاسلامی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بلاشبہ اس مذہبی جزو کو نظرانداز کر کے بھی ہم کہ سکتے ہیں کہ اگرچہ یہ تحریک اصولاً اتحاد بین التورانی تھی لیکن عملاً اُس وقت تک اتحاد بین الترکی سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۹۱۲ء و ۱۹۱۳ء کی بلقانی جنگ نے اتحاد بین التورانی کی تکمیل میں سرعت پیدا کر دی۔ ان لڑائیوں نے نہ صرف ترکوں کو بلقان سے نکال کر اُن کی اُمیدیں ایشیا سے وابستہ کر دیں بلکہ ہنگریوں اور بلغاریوں کے دلوں میں فاتح سرویوں سے ایسے نفرت پیدا کر دی کہ ان دونوں اقوام نے اپنی تورانی الاصل ہونے کا اعلان کیا۔ اور سرویا اور روس کے اتحاد بین السلافی کے خطرے کے مقابلہ میں اتحاد بین التورانی کی استحکام کے خیالات سے شغف[۱] ظاہر کیا۔ اتحاد بین التورانی کے صاحب فکر حامی فی الحقیقت ایسے عظیم الشان اصول قایم کر رہے تھے جو بڑی سے بڑی امیدوں کو پورا کرنے کو کافی تھے۔ تورانی نسل کی مردانگی اور جفاکشی پر زور دیکر ان اصحاب فکر نے یقین کر لیا کہ تورانی ہی آیندہ با اقتدار ہونگے۔ چونکہ یہ مغربی مسئلہ ارتقا اور تشریح الاجسام کے سرگرم متعلم تھے انھوں نے نسلی ترقی و تنزل کے خود مخصوص نظریے قایم کیے۔ اتحاد بین التورانی کی تعلیم کی رو سے جنوبی ایشیا کی تاریخی اقوام یعنی عرب۔ ایرانی اور ہندی۔ انتہائے تنزل کو پہونچ گئی ہیں۔ یوروپی اقوام کی بابت اُن کا مقولہ ہے کہ یہ اس وقت اپنے نصف النہار سے گزر کر اور موجودہ حرفتی جدوجہد کی تیسرے زانے سے

---

[۱] ہنگری اور بلغاریہ کے میلانات اتحاد بین التورانی کی بابت ملاحظہ ہو مصنف کا مضمون ''اتحاد بین التورانی''، جو فروری ۱۹۱۸ء میں امریکن پولٹیکل سائنس ریویو میں شایع ہوا۔ مصنف م

ارمنی اور گرجستانی جو اس حصۂ ملک میں قلیل التعداد اقوام تھیں ان کو خواہ مخواہ مطیع بنا یا جائے۔ ایسی متحد ترکی سلطنت جو کل بلاد اسلامی پر حکمراں ہو افغانستان اور ایران کے لیے بڑی دلفریب ہوگی۔ . . . . . دسمبر ۱۹۱۷ء میں جب عراق کے محاذ پر ترکی افواج کے ہتھیار ڈالنے کا خطرہ تھا تو خلیل پاشا نے کچھ غصہ اور کچھ مذاق میں مجھ سے کہا فرض کرو کہ ہم اس ریگستانی گڑھے کو انگریزوں کو لے لینے دیں اور ترکستان چلے جائیں وہاں میں اپنے بچے کے لیے ایک جدید سلطنت بناؤنگا' اس نے اپنے لڑکے کا بڑے فاتح اور غارت گر چنگیز خاں کے نام پر نام[1] رکھا تھا''

فی الواقع ۱۹۱۸ء کے موسم گرما میں ترکی افواج نے ماورائے قفقاز اور ایران میں بارادۂ ایشیائے متوسط تاخت کی اس کے بعد مغربی محاذ پر جرمنی کو شکست اور لڑائی ختم ہوئی۔ اور بظاہر ترکی نصیب میں تباہی معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت تو حامیان اتحاد بین التورانی بالکل بدحواس ہوگئے۔ مگر ان کی امیدیں پھر تازہ ہوگئیں جسے ہم بہت جلد بیان کرینگے۔

قبل اس کے کہ مشرق ادنیٰ کے اُن واقعات پر بحث کریں جو ۱۹۱۸ء

---

[1] عثمانی جنرل اسٹاف کے سابق سردار اٹسٹ پاراکین کا مضمون جو برلنر تاجبلاٹ میں ۲۴ جنوری ۱۹۱۹ء کو شایع ہوا۔ دوران جنگ میں ترکی حمایت قومی کی سرگرمیوں اور طرز عمل کے لیے ملاحظہ ہو "انٹیلیجنس ڈویژن" جلد ۱۱۹۹ تورانی اور جامعہ تورانی کا رسالہ "جس کو بحری معلومات کی ڈویژن کے جغرافی شعبہ نے مرتب کیا تھا مطبوعہ لندن ۱۹۱۹ء ای - ایف - بینسن کی کتاب "ہلال اور صلیب اہنی" مطبوعہ لندن ۱۹۱۸ء۔ ایم - اے - زابلیکا کی کتاب "ایشیا متوسط کے ترک مسئلہ جامعہ تورانی کی تحقیقات" مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۱۸ء ایچ مور گنتھیو کی کتاب سفیر میگزتھینز کی حکایت" مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۸ء۔ ہیری اسٹورمر کی کتاب "قسطنطنیہ میں جنگ کے دو سال" مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۷ء اور اے - مینڈلسٹام کا مضمون "ترکی جوش" جو ۲۲ اپریل ۱۹۲۰ء کو نیو یورپ میں شایع ہوا۔ مصنف

اتحاد بین الاسلامی دونوں سے ایک ساتھ کام لینا شروع کیا۔ دنیا کے کل مسلمانوں کے لیے "جہاد" کی شورش شروع کی اور تاتاری و ترکی اقوام میں اتحاد بین التورانی کی تبلیغ کو المضاعف کر دیا۔ اوایل جنگ میں جو اتحاد بین التورانی کی امنگیں تھیں ان کی بہترین توضیح ماہر سیاسیات تکین الیپ کی کتاب موسومۂ ترکی و اتحاد بین الترکی کا نصب العین" ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں شایع ہوئی۔ تکین الیپ کہتا ہے" اگر جرمنی و اسٹریا اور ترکی افواج نے روسی مطلق العنان حکومت کو پامال کر دیا تو تین چار کروڑ تورانی آزاد ہو جائیں گے۔ اس میں ایک کروڑ عثمانی ترک ملکر پانچ کروڑ نفوس کی قوم بن جائے گی۔ جو ایک بڑے تمدن کی طرف ترقی کرے گی۔ یہ تمدن غالباً جرمنی تہذیب کے مقابلہ کا ہوگا۔ اور اس میں رفیع تر صود کی اہمیت و استعداد ہوگی بعض حالتوں میں فرانسیسی اور انگریزی انحطاط یافتہ تہذیب سے برتر ہوگا۔"

۱۹۱۷ء کے آخر میں بالشویک انقلاب کے بعد سلطنت روس میں جو تباہی آئی تو اس سے حامیان اتحاد بین التورانی کی توقعات کی حد نہ رہی۔ ان لوگوں کو اپنی کامیابی کی ایسی امید واثق ہو گئی کہ انھوں نے اپنے حلیف جرمنی کا بھی منھ بنانا شروع کیا۔ اور اس طرح انھوں نے اس نفرت کا اظہار کیا جو کل یوروپی اقوام کے خلاف ہمیشہ سے ان کے دل میں چھپی تھی۔ ایک جرمنی اسٹاف کا افسر خلیل پاشا کی گفتگو کو جو محاذ عراق کے کمانڈر اور انور پاشا کے چچا ہیں یوں بیان کرتا ہے "اولاً تمام قبایل جن کی مادری زبان ترکی ہے ایک قوم بنائے جائیں۔ چونکہ قومی اصول کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ لہذا یہ ترکی عظمت و جلالت کی مد یعنی ترکستان کی فتح کی تدبیر تھی۔ یہ پہلا کام تھا۔ اس کے بعد اس مستقر سے سائبیریا کی قوم یا قوت سے جو اپنے زبان کے تعلق کی وجہ ترکی نسل کی دور افتادہ مشرقی کو شہ سمجھی جاتی تھی تعلقات پیدا کیے جائیں اس اتحاد میں قفقاز کے تاتاری قبایل کی شرکت بھی لازمی تھی جو قرابت قریبہ رکھتے تھے۔

بلاشبہ گزشتہ جنگ عظیم نے بالخصوص حجاز میں ایک آزاد سلطنت قایم کر کے جو شام اور عراق کی بھی دعویدار ہی۔ اتحاد بین العرب کو مشتعل کر دیا۔ مگر مختلف عرب اقوام فی الحال مقامی آزادی کی اُن شورشوں میں مصروف ہیں جن کا جن کا نصب العین مصر و شام و عراق و طرابلس جیسے مقامات سے برطانیہ و فرانس و اطالیہ کا تسلط ہٹانا ہی۔ اسی مصروفیت کا نتیجہ یہ ہی کہ اتحاد بین العرب کی تحریک کا وسیع تر ادراک اگرچہ حمایت قومی کا اصلی جزو ہی لیکن بالفعل وہ اُن کے نظام عمل میں مقدم جزو نہیں سمجھا جاتا۔

مزید براں جیسا اوپر بیان کیا گیا ہو اتحاد بین العرب" اتحاد بین الاسلامی" اور" بین الاسلامی حمایت قومی" کے غیر نسلی ادراک کے ساتھ مخلوط ہی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہی کہ بین الاسلامی قوم پرستی میں تناقض و تضاد ہی یہ تضادم مغربیوں کے نقطۂ نظر سے ہی لیکن یہ ضروری نہیں ہی کہ مشرقی تخئیل میں بھی ایسا ہو مشرق نے ہمارے خیالات قومیت و وطنیت کو کتنے ہی ذوق سے کیوں نہ قبول کیا ہو لیکن یہ خیالات اُن دماغوں میں پہونچے ہیں جو اسلامی اتحاد اخوت کے تصورات سے لبریز تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم نے جدید پر عجیب رنگ آمیزی کی ہی حتےٰ کہ مسلمان جب ہمارے مصطلحات "قومیت" اور "نسل" وغیرہ کو استعمال کرتے ہیں تو ان الفاظ سے اُن کا مفہوم ہمارے ادراک سے بالکل جدا ہوتا ہی۔ فی الواقع یہ

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۔ پیرس ۱۹۱۳ء۔ ایم پکتھال کا مضمون "ترکی و انگلستان اور موجودہ خدشہ" جو کیم اکتوبر ۱۹۱۳ء کے ایشیاٹک ریویو میں شایع ہوا۔ اسے سر وی ایرکی کتاب "مسلمانوں کی قوم پرستی" شیخ عبدالعزیز شاویشی کا مضمون "عربی زبان کا حلقۂ اثر" جو ستمبر ۱۹۱۶ء کے پروشین ایبؤل میں شایع ہوا۔

کے بعد وقوع پذیر ہوئے، جن پر ایک ساتھ بحث کرنے کی ضرورت ہی۔ یہ بہتر ہوگا کہ ہم اسلامی دنیا کی دیگر تحریکات حمایت قومی کی "منزل دوم" کے ابتدائی ارتقا پر غور کریں۔ ہم بیان کرچکے ہیں کہ ترکی قوم پرستی کے ہم عنان عربی حمایت قومی کی تحریک بھی "نسلی" منزل میں بتدریج ترقی کر رہی تھی۔ اور اُس کا نصب العین یہ تھا کہ "اتحاد بین العرب" کی ایک عظیم سلطنت قایم کی جائے۔ جس میں قومی اوطان یعنی جزیرہ نمائے عرب و شام و عراق کے علاوہ مصر و طرابلس و فرانسیسی شمالی افریقہ اور سوڈان کی مستعمرات بھی شامل ہوں۔

تحریک اتحاد بین العرب کی ترقی ذہنی طور پر ایسی نہیں ہوئی جیسی کہ اتحاد بین التورانی کی۔ اگرچہ اس کی عام روش ایسی مشابہ ہی کہ اس کے اصولوں پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہی۔ دونوں تحریکوں میں اہم فرق یہ ہی کہ اتحاد بین العرب کی تحریک اپنے خصایص میں زیادہ تر مذہبی اور اتحاد بین الاسلامی ہی۔ عرب اپنے آپ کو "برگزیدہ قوم" تصور کرتے ہیں۔ جو منجانب اللہ کل اسلامی دنیا کی امارت کی مستحق ہیں۔ اتحاد بین العرب کی تحریک میں اتحاد بین التورانی جیسی یکجہتی مفقود ہی اس کے دو مختلف ادراکی مراکز یعنی شام اور مصر ہیں۔ واقعہ نفس الامری یہ ہے کہ اتحاد بین العرب کی تجاویز کو مصر ہی میں بہت زیادہ ترقی دی گئی اور مصری نظام عمل کا رخ یہ ہی کہ کل عربی بولنے والے ممالک کو بسر کردگی خدیو متحد کیا جاوے۔ گو ابتدا میں غالباً برطانوی اتالیقی کے ماتحت ہو لیکن آگے چلکر برطانوی تسلط کو اتحاد بین العرب کے متحدہ عمل سے دفع کیا جاوے۔ یہ خیال کیا جاتا ہی کہ سابق خدیو عباس حلمی نے اس تحریک کی ہمت افزائی کی جسے انگریزوں نے ۱۹۱۴ء میں معزول کر دیا۔[۱]

---

[۱] اتحاد بین العرب کی ترقیوں کے لیے ملاحظہ ہو اسے میوزل کی کتاب "جمعصر عرب کی تاریخ" مطبوعہ

حق پیدائش حاصل کرے۔ بلادِ اسلامی کے ہر حصہ میں ہر مسلمان کم و بیش بے تکلف رہتا ہے۔ لہذا کوئی شخص اگر کسی خاص ملک میں موجود ہو اور وہ چاہے تو اِس موجودگی ہی سے اچھا خاصہ فرد قوم بن سکتا ہے۔ بر سبیل تمثیل "مصر مصریوں کے لئے" اس کا فی الواقع وہ منشاء نہیں ہے جو ہم سمجھتے ہیں۔ الجزائر یا دمشق کا کوئی مسلمان قاہرہ میں سکونت پذیر ہو جائے تو اس میں کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ وہ ایک مصری حامی قوم کی حیثیت سے ہر طور پر کام کرے اور مانا جاوے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں ہمیشہ سے ارضی و نیز روحانی اتحاد کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ تمام بلادِ اسلامی کے متعلق مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ دار الاسلام[1] ہیں جو ایک نوع پر کل مسلمانوں کا مشترکہ مقبوضہ ہیں اور کل مسلمانوں پر مشترکاً اُس کا تحفظ فرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی اسلامی ملک میں مداخلت غیر پر اسلامی دنیا کے دوسرے گوشہ کے مسلمان جن کو اس میں کوئی مادی نفع نہیں ہے اظہار ناراضگی کرتے ہیں۔

ان اُمور کو ذہن نشین کرنے کے بعد ہم اس امر کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں اکثر مسلمان اصحابِ فکر نے قومیت سے مغربی ادراک کو دار الاسلام

---

[1] دار الاسلام کے لفظی معنی اسلام کا گھر ہیں اور غیر مسلم ممالک بحیثیت مجموعی "دار الحرب" کہلاتے ہیں جس کے معنی جنگ کا گھر ہے۔ (مصنف) مصنف نے دار الحرب کی تشریح میں غلطی کی ہے ہر دو مصطلحات کی تعریف جیسی شامی نے لکھی ہے پیش نظر ہے۔ دار الحرب ما یحکم فیہا باحکام اہل الشرک و لا یحکم فیہا باحکام اہل الاسلام (جس میں اہل شرک کے احکام جاری ہوں اور اسلامی احکام جاری نہ ہوں) دار الاسلام ما یحکم فیہا باحکام اہل الاسلام (جس میں احکام اسلامی جاری ہوں) لو اجریت احکام المسلمین و احکام اہل الشرک لا تکون دار الحرب (جس جگہ مسلمانوں اور مشرکوں دونوں کے احکام جاری ہوں وہ دار الحرب نہیں ہے) مترجم

اختلافات تمام سیاسی تصورات میں طاری ہیں۔ بر سبیل تمثیل "سلطنت" کے لفظ کو لو۔ خالص اسلامی نمونہ کی سلطنت خالص مغربی نمونہ کی سلطنت کی طرح ایک معین اور منفرد قطعہ نہیں جس کی حدود مستقل اور جس کی سرحدوں کے اندر کامل اختیارات شاہی نافذ ہوں۔ برخلاف اس کے اسلامی سلطنت کم و بیش ایک غیر متشکل اور غیر معین مجموعہ ہے جس میں ایک مرکز یعنی مستقر حکومت ہے جس کے اختیارات بُعد مسافت سے کم ہو کر غیر متعین اور بد نظمانہ آزادی میں غائب ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ گزشتہ نصف صدی میں اکثر اسلامی سلطنتوں نے مغربی طریقوں پر اپنی تنظیم کی کوشش کی لیکن قدیم میلان کا نمونہ افغانستان میں ملتا ہے جہاں کہ ہندوستان کی شمال و مغرب کی اقوام اگرچہ برائے نام افغان ہیں عملاً بالکل آزاد ہیں جنھوں نے انگریزوں کے خلاف بطور خود جنگ کی جس سے امیر نے بے تعلقی ظاہر کی اور گورنمنٹ برطانیہ نے بھی امیر کو ان کا ذمہ دار نہ سمجھا۔[1]

یہی حالت لفظ قومیت کی ہے۔ مسلمان کی نظر میں کسی اسلامی قومیت کا فرد بننے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی شخص اس قوم میں پیدا ہو یا باضابطہ طور پر

---

[1] یہ سرحدی قبائل جو سلطنت برطانیہ سے لڑا کرتے ہیں دراصل امیر کے ماتحت نہیں ہیں۔ مصنف نے نہ معلوم کس وجہ سے یہ رائے قائم کی واقعہ یہ ہے کہ معاہدہ ۱۸۹۳ء میں بمقام کابل طے ہوا اس کی رو سے متعدد قبائل "خود مختار" تسلیم کیے گئے اور یہ دراصل سرحد افغانستان اور سرحد ہندوستان کے درمیان کی خود مختار ریاستیں ہیں۔ اس معاہدے کی رو سے کابل کی سلطنت کی حدود بالکل معین ہو گئے تھیں۔ یہ جنگ ہندی ۱۸۹۵ء میں شروع ہوئی کہ ۱۸۹۸ء میں ختم ہوئی اس معاہدہ کے بعد سے اکثر قبائل برطانوی نگرانی میں آتے جاتے ہیں لیکن ان قبائل کے فتنہ و فساد آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ مترجم

پایہ تکمیل کو نہیں پہونچے ہیں۔ تاہم یہ کل اسلامی دنیا میں روشناس ہو چکی ہے اور قوت پکڑ رہی ہے بالخصوص شمالی افریقہ اور ہندوستان جیسے ممالک میں جہاں پر کسی نہ کسی وجہ سے قومی حب وطن نے سرزمین کے لحاظ سے ترقی نہیں کی ہے۔ چنانچہ ایک فرانسیسی مصنف لکھتا ہے "اسلامی حمایت قومی کوئی منفرد یا منتشر شورش نہیں ہے یہ ایک سیل عظیم ہے جو ایشیا و ہندوستان اور افریقہ کے کل اسلامی دنیا پر موجزن ہے۔ قوم پرستی مسلمانوں کے عقائد کی ایک صورت ہے جو یوروپی تمدن کے اتصال سے کمزور ہونے کی بجائے مزید مذہبی جوش حاصل کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اپنی توسیع اور پیرو بنانے کی خواہش میں عوام کے مذہبی تعصب کو برانگیختہ اور منتخبین کے سیاسی میلان کی ہدایت اور ہر جگہ پرخطر شورش کی کاشت کر کے اپنا اتحاد قائم کرنا چاہتی ہے[۱]" ممکن ہے کہ بین الاسلامی قوم پرستی اس طرح مستقبل میں ایک جزو عظیم ہو جائے جس کا مقابلہ نہایت سنجیدگی سے کرنا ہوگا[۲]۔

---

[۱] اے سروی ایر کی کتاب "مسلمانوں کی قوم پرستی" صفحہ ۱۸ (مصنف)

[۲] اتحاد بین الاسلامی کی قوم پرستی کے لیے علاوہ سروی ایر و محمد علی مذکورہ بالا ملاحظہ ہو لے لی شاتلی ایر کی کتاب "انیسویں صدی کا اسلام" مطبوعہ پیرس ۱۸۸۸ع اسی مصنف کا مضمون "مسلمانوں کی سیاسیات" جو ستمبر ۱۹۱۰ع کے ریویو دو موند مسلمان میں شایع ہوا۔ سر تھیوڈ ور ماریسن کا مضمون "انگلستان اور اسلام" جو جولائی ۱۹۱۱ع کے رسالہ نائن ٹینتھ سنچوری اینڈ آفٹر میں شایع ہوا۔ جی موری کی کتاب "مسئلہ ایران" صفحات ۲۳ لغایت ۳۱ مطبوعہ پیرس ۱۹۱۶ع۔ ڈبلیو ای ڈی ایلن کا مضمون "موجودہ اور گزشتہ ماورائے قفقاز" جو اکتوبر ۱۹۲۰ع کے کوارٹرلی ریویو میں شایع ہوا۔

(مصنف)

کے قدیم خیال سے متحد کر کے ایک جدید ترکیب پیدا کی ہے جس کو اصطلاحاً "بین الاسلامی قوم پرستی" کہتے ہیں۔ اس طرز خیال کو ایک ہندوستانی مسلمان نے خوب بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "مغرب میں حکمرانی کا کل علم اس اصول متعارفہ پر مبنی ہے کہ انسانوں کی تقسیم اصلاً نسل اور جغرافیہ کی بنا پر ہوتی ہے لیکن یہ خیالات مشرقیوں کے لیے اصول متعارفہ سے بہت دور ہیں۔ ان کے خیال میں نوع انسانی مذہبی خیالات کے بموجب منقسم ہوتی ہے اور اس اعتبار سے قوم یا سلطنت کی بنا پر اتحاد نہیں ہے بلکہ ملت[1] کی بنا پر ہے یوروپیوں کو اس میں اپنی ازمنہ متوسط کی تصویر نظر آتی ہے۔ یہ وہ منزل ہے جو اسلام کو مغربی مفہوم کے مطابق تجدید کے درجہ تک پہونچنے کے لیے طے کرنا چاہیے تعجب ہے کہ یہ لوگ اس امر کو نہیں سمجھ سکتے کہ مذہب ایک مسلمان کی نظر میں کیا چیز ہے۔ وہ یہ فراموش کرتے ہیں کہ اسلام صرف مذہب نہیں ہے بلکہ ایک معاشرتی نظام ایک مدنی ضابطہ اور ایک قومیت ہے۔ ...... اخوۃ اسلامی کا اصول خواہ اُس کو اتحاد بین الاسلامی کہو حب وطن کے مثل ہے صرف فرق یہ ہے کہ یہ اخوت اسلامی کو قوانین اور رسوم کی مطابقت میں منتج ہوتی ہے لیکن یہ مغربی قومیت کی طرح نسل، ملک یا تاریخ کی یگانگت سے پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ ہمارے عقیدہ کے بموجب براہ راست منجانب اللہ[2] ہے"

بین الاسلامی قوم پرستی نسبتاً حال کا مظاہرہ ہے اور ہنوز اس کے اصول

---

[1] یعنی کسی خاص مذہب کی باضابطہ جماعت (مصنف)

[2] محمد علی کا مضمون "ہند میں مسلمانوں کی تحریک" جو جنوری ۱۹۱۲ء کے ریویو پولیٹکل انٹرنیشنل میں شائع ہوا۔ عہد نامجات صلح میں جو سلطنت عثمانی کا تجزیہ ہوا اُس کی خلاف احتجاج کرنے کے لیے جو وفد ۱۹۱۹ء میں مسلمانان ہند نے بھیجا وہ اُن کی سرکردگی میں تھا۔ مصنف

فی الواقع اب اتحادیوں نے اُصول حریت کے عام اعلانات اور اقوام مشرق قریب کے لیئے خود انتظامی کے اُن مواعید خاص کو پسِ پشت ڈال کر

بقیہ نوٹ صفحہ سابق ۔ ہونگے جن کو اسمبلی نامزد کرے۔ اس تعداد میں اضافہ کی گنجایش ہو اسمبلی میں اُس کے ممبران میں سے ہرایک کے زیادہ سے زیادہ تین نمائندے ہونگے۔ اسمبلی اور کونسل کے فیصلے متفق ہونگے۔ لیگ کے فرایض یہ ہیں کہ دنیا میں امن قایم رکھے فوجی سامان کی کمی کیجائے اور تعداد ایسی معین کردی جائے جو محض قومی تحفظ کے لیے کافی ہو۔ ممبران لیگ کے درمیان جو نزاعات پیدا ہوں اُس کو طے کرے یا اُن میں ثالثی کرے ایک بین الاقوامی عدالت قایم کی جاہیے۔ لیکن کونسل کسی ایسے معاملہ میں دخل نہ دے گی جو کسی ممبر کے خالص اندرونی معاملات سے تعلق رکھتا ہو۔ اگر کسی نزاع کی فریقین میں سے کوئی فریق ممبر لیگ نہیں ہو تو وہ اغراض تصفیہ نزاع کے لیے ممبر بنا لیا جائے گا۔ اگر کوئی ممبران شرائط کے خلاف جنگ شروع کرتا ہو تو دیگر ممبران اُس کا اقتصادی مقاطعہ کریں گے اور کونسل یہ سفارش کرے گی کہ ہر ممبر کس قدر افواج لیگ کے شرائط کے تحفظ کے لیے دیگا۔ بین الاقوامی دفاتر اور کمیشن لیگ کے ماتحت ہوں گے۔ لیگ کو اُن اقوام پر حکم بردار مقرر کرنے کا حق ہوگا جو خود ترقی نہیں کرسکتی ہیں۔

دوئم و سوئم۔ جرمنی کے سرحدیں اور یورپ کے ملکی شرائط۔ السیس لورین فرانس کو واپس دیا جاوے اور وریا ر کی کوئلہ کی کانیں فرانس کو دی جاویں اور اس ملک کی حکومت ایک کمیشن منجانب لیگ اقوام کرے آئندہ کے لیے انتخاب عامہ سے طے ہوگا۔ جرمنی رائن کے ۵۰ میل تک کوئی قلعہ نہ بنائے۔ علاقہ جات موری سینٹ یوپن۔ مامڈن بلجیم شلیزوگ ڈنمارک کو صوبہ پوسن اور مغربی پروشیا پولینڈ کو دی گئی ڈینزک آزاد کر دیا گیا۔ چہارم۔ جرمنی سے باہر کل مستعمرات اور حقوق سے باز دعوے اور مصر و مراکش پر برطانوی و فرانسیسی صیانت تسلیم کی جاوے۔ پنجم جرمنی صرف ایک لاکھ فوج رکھے ۶ بڑے جنگی جہاز ۶ ہلکی کروزر ۱۲ تباہ کن کشتی ۱۲ تار پیڈو کشتی۔ کوئی کشتی تہہ آب نہ رکھی جاوے۔ نہ بنائی جاوے اور نہ

سُوئم

دنیاے اسلام میں حمایت قومی کی تحریک پر ہمارا تبصرہ اِس طور پر ختم ہوتا ہو ایسے پیچیدہ توقعات کی گتھی کی موجودگی ہیں جو اس ہنگامۂ رستخیز سے اور بھی اُلجھ گئی ہو یہ اقتضاء فطرت تھا کہ جنگ عظیم کے اختتام پر مشرق نے جبینی کی جولانگاہ بن جائے۔ یہ ظاہر تھا کہ حقیقی تدبیر ہی سے کوئی تعمیری تصفیہ ہو سکتا تھا۔ بدقسمتی سے ورسیلز کی کانفرنس صلح حقیقی تدبیر سے معرّا تھی اور جو "تصفیہ" قرار پایا وہ صرف یورپ ہی میں اُمن قایم کرنے سے قاصر نہ رہا بلکہ اُس نے مشرق کے متعلق ایسا طرز عمل ظاہر کیا جو قبل از جنگ کی نئے موقع شہنشاہیت اور حریصانہ عملی سیاسیات کی رو سے زندہ تھا۔ ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہو کہ فاتح اتحادی علم النفس کی اون بڑی تبدیلیوں کو جو جنگ عظیم سے پیدا ہوئی تھیں اور نیز اس لحاظ سے جو طرز عمل اور حکمت عملی میں تبدیلی ضروری تھی اُس کو بالکل فراموش کرکے مشرق سے ایسا برتاؤ کرنے لگے گویا یہ کہ ہنگامۂ رستخیز محض ایک سرحدی تاخت اور ایشیا ایک صدی قبل کا خوابیدہ عفریت[1] تھا۔

---

[1] صلح کانفرنس کے معاہدے کے خاص خاص شرائط کا خلاصہ حسب ذیل ہو:-

اوّلاً لیگ اقوام کے شرائط میں حسب ذیل امور شامل ہیں یعنی لیگ کے فرایض کو ایک کونسل اور ایک اسمبلی انجام دیے گی۔ کونسل میں سلطنت برطانیہ و فرانس و اطالیہ و جاپان کے نمائندے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی نمائندگی کے لیے بھی جگہ رکھی گئی ہو بشرطیکہ سلطنت مذکور ان شرائط کو منظور کرے۔ علاوہ ازیں چار اُن دیگر ممالک کے نمائندے شامل

کو فاتحین میں تقسیم کرلیا گیا۔ اتحادیوں کی مزید اغراض کا اظہار اُس طرز عمل سے ہوا جو ورسیلز کی کانفرنس نے ایرانی نمائندوں کی شرکت سے انکار کرنے میں اختیار کیا حالانکہ ایران اصولاً ہنوز آزاد تھا۔ لیکن ان نمائندوں کو پیرس میں ٹھہرا رہنے دیا۔ اور برطانوی دباؤ نے شاہ کی سلطنت کو طہران میں ایک "اقرار نامہ" کی تکمیل پر مجبور کیا جس کی رو سے ایران معناً سلطنت برطانیہ کی صیانت میں آگیا۔ اب رہے مصری سو وہ تو ہمیشہ ہی سے اس صیانت کے خلاف احتجاج کر رہے تھے جس کا برطانیہ نے بطور خود ۱۹۱۴ء میں اعلان کیا۔ کانفرنس نے اُن کے نمائندوں کی طرف توجہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اُن کو یہ سمجھا دیا گیا کہ کانفرنس مصر پر برطانوی حمایت کو امر مسلمہ سمجھتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جنگ کی بدولت مشرق ادنیٰ و وسطیٰ پر یورپی اقتدار کمزور ہونے کی بجائے مستحکم تر ہو گیا۔

بقیہ متعلق صفحہ ماسبق: اور سلیشیا فرانس کی حفاظت میں رہے اور اطالیہ کے۔ سپریم کونسل امریکہ سے درخواست کرنے کر دہ ارمینیا کی حکم برداری اپنی ذمہ لے اگر اس سے انکار ہو تو مسٹر ولسن حدود کا فیصلہ کریں۔ اس کے بعد سپا کانفرنس میں جرمنی کی شرائط میں کچھ رعایت کی گئی اور ترکی کے لیے یہ تجویز ہوا کہ جو شرائط ترکی کو بھیجی گئیں اُن میں کوئی تبدیلی نہ ہو اور ترکی معاہدے پر دستخط دس روز کے اندر کر دے۔ معاہدے سیورے مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کی رو سے سلطنت ترکی یورپ سے معدوم ہو گئی اور خاص ترکی ایک چھوٹی سی ایشیائی سلطنت رہ گئی۔ آسٹریا ہنگری سے صلح ۱۰ ستمبر ۱۹۱۹ء کو ہوئی لیکن اس سے قبل ہی اس سلطنت کی مختلف اقوام منفرد ہو کر متعدد ریاستیں قائم ہو گئیں۔ زیکوسلوواک کی آزادی کو اتحادیوں نے اگست ۱۹۱۸ء میں تسلیم کیا۔ روتھینس اور سلافیوں نے بھی آزادی کا ادعا کیا اور ہنگری بھی علحدہ ہو گئی۔ ۱۲ نومبر ۱۹۱۸ء کو جرمنی اور آسٹروی جمہوریہ کا اعلان ہوا اور اسی کے مبعوثین نے ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کے معاہدہ پر دستخط کیے۔

(مترجم)

جو اُنھوں نے دوران جنگ میں کیے تھے خفیہ عہدناموں کا ایک سلسلہ پیش کیا۔ یہہ
عہدنامے اُنھیں سنین جنگ میں ہوئے تھے۔ جبکہ وہ ایسے فریب وہ تقریریں کر رہے
تھے۔ ان عہدناموں کی رو سے باشندگان ملک کی خواہشات کے خلاف سلطنت عثمانیہ

بقیہ صفحہ ماسبق ۔۔۔ سامان حرب کی درآمد و برآمد ہو۔ بقیہ کل سامان حرب اتحادیوں کو دیدیا جائے۔ ششم
شرائط دربارہ قیدیان جنگ۔ ہفتم۔ اتحادیوں نے پانچ جج شہنشاہ جرمنی کے مقدمہ کی سماعت مقرر کئے۔ ہر شخص
جس نے دوران جنگ میں جرایم کیے تھے وہ اتحادیوں کے سپرد کی جاویں۔ ہشتم تاوان۔ جرمنی نے ۲۰
ارب مارک طلائی دو سال میں ادا کرنے کا وعدہ کیا اور ایک ارب سالانہ سال تک دے گا اُس کے
بعد دو ارب چالیس کروڑ سال ادا کرے۔ اس کے معاوضہ میں جرمنی کو تجارتی جہازوں اور سعار کے کوئلے
کی کانوں اور دیگر سامان فروخت شدہ کی قیمت محسوب کی جاوے۔ بقیہ شرائط دربارہ مالیات و مسایل
اقتصادی و بنادر وغیرہ کے تھیں۔ رائن مشترکہ کمیشن کے قبضہ میں رہے اور دہر کینل کل اقوام کے لیئے
تجارتی اغراض کے لیے کھلی رہے۔ جرمن گورنمنٹ نے اس صلح کو جنوری سنہ ۱۹۲۰ء میں تصدیق کیا اور
اس کے بعد بہت سے مباحثہ اور بالآخر سان ریمو کی کانفرنس میں یہ طے ہوا کہ وادی رہور میں قیام امن
کے فرایض جرمنی کے سپرد کیے جاویں جو بغاوت فرو کرنے کے لیے اضلاع پر شرطیہ قبضہ کر سکتے تھے۔ یہ اعلان کیا
گیا کہ اتحادی جرمنی کے کسی حصہ ملک کا الحاق نہیں کرنا چاہتے ہیں یہ اعلان اس وجہ سے لازمی ہوا کہ
فرانسیسی یہ کوشش کر رہے ہیں کہ وادی رائن پر قبضہ کر لیا جاوے۔ ادائگی تاوان کے تعین کے لیئے
نمائندے بمقام سپا طلب کیے جاویں۔ چونکہ جرمنی نے صلح نامہ پر دستخط کرنے سے تین ماہ کے اندر اپنے
قرضہ جات کے تصفیہ کے لیے تجاویز پیش نہیں کیں لہذا یہ ضروری ہوا کہ یہ طے کیا جاوے ۲۸ جون سنہ ۱۹۱۹ء
کے خط میں جو شرائط تحریر تھیں اُس کی تعمیل کے لیے کیا کارروائی کی جاوے۔ شام کی حکمبرداری فرانس کو جزیرۃ
العرب کے بشمول موصل برطانیہ کو۔ اور فلسطین کی حکم برداری برطانیہ کو دی گئی اور مسٹر بالفور نے جو اعلان
یہودیوں کے متعلق کیا تھا اُس کو قائم رکھا گیا۔ جب تک ترکی صلحنامہ پر دستخط نہ کرے برطانیہ درہ دانیال کی حفاظت کرے

اس کے کم ہونے کی بجائے بڑھنے کا خوف ہے۔

اس زمانہ کی مشرقی نئے چینی کو بتفصیل بیان کرنے کے لیے خود ایک کتاب درکار ہے۔ اس وقت ہم اس پر اکتفا کرینگے کہ اس نئے چینی کے خاص مراکز پر غور کریں۔ یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ نئے چینی کل بلاد اسلام میں فرانسیسی شمالی افریقہ سے لیکر ایشیائے متوسط اور ڈچ انڈیز تک موجود ہے۔ جن مراکز کا یہاں تبصرہ کیا جائے گا وہ مصر۔ ایران۔ اور سابق سلطنت عثمانیہ کے ترکی و عربی ممالک ہیں۔ نئے چینی کے پانچویں بڑے مرکز یعنی ہندوستان پر دوسری فصل میں بحث کی جاوے گی۔

اس طوفان کا آغاز مصر میں ہوا۔ دوران جنگ میں مصر میں برطانوی افواج کا ٹڈی دل جمع تھا اور نہایت ہی سخت مارشل لا جاری تھا لہذا مصر میں سکوت رہا لیکن یہ فقدان عمل کی وجہ سے نہیں بلکہ انسدادی تشدد کی بدولت تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بیسویں صدی کے اوایل میں سب تعلیم یافتہ مصری کم و بیش حمایت قومی کے خیالات سے متاثر ہو چکے تھے۔ اگرچہ ان کا بڑا حصہ انقلابی ذرائع کی بجائے ارتقائی تدابیر کا حامی تھا۔ معتدلین کی سب سے بڑی اُمید برطانوی حکومت کی عارضی حالت تھی جب تک انگلستان نے مصر میں اپنے "عارضی قبضہ" کا اعلان بحال رکھا ہر بات ممکن تھی لیکن ۱۹۱۴ء میں جیسے ہی اعلان حمایت ہوا جس کی رو سے مصر سلطنت برطانیہ کا ایک جزو قرار پایا صورت حالات بالکل بدل گئی۔ بڑے سے بڑے معتدل قوم پرستوں تک کو یہ احساس ہوا کہ بلا ساعت اُن کے خلاف مستقبل کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اور اُن کی آخری تمناؤں کا راستہ مسدود ہو چکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اعتدال پسندوں کو بھی انتہا پسندوں میں شامل ہونا پڑا۔ اور ضرورت کے وقت اعتدال پسند بھی جبریہ عمل کے لیے انتہا پسندوں کے شریک ہونے کو تیار ہو گئے۔

لیکن اس عجیب کارروائی کا عجیب ترین پہلو ابھی باقی ہے۔ یہ خیال
ہوسکتا ہے کہ اتحادی لیڈروں نے اس کو محسوس کرلیا ہوگا کہ وہ آگ سے کھیل رہے
ہیں اور اُن کی کامیابی محض کامل رفاقت کار اور سرعت عمل پر منحصر ہے۔ لیکن حقیقت میں واقعہ
بالکل اس کے برعکس تھا۔ اتحادیوں نے پہلے تو سب اپنی چالوں کا اظہار کیا جس
سے مشرق میں طلسم فریب ٹوٹنے پر یاس اور غصہ کی لہر پھیل گئی۔ پھر غنایم پر آپس میں
لڑنے لگے۔ تقریباً دو سال تک لڑنے جھگڑنے کے بعد کہیں جا کر انگلستان و فرانس
اور اطالیہ کے درمیان تجزیہ سلطنت عثمانیہ کی بابت کوئی سطحی تصفیہ ہوسکا۔ اور اس
عرصہ میں اتحادی کل مشرق قریبہ میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں اور بدگوئیاں
کرتے رہے یہ قطعی دیوانگی تھی۔ اس سے اُن اقوام کو جو اتحادی چالبازی کا شکار ہونے
والی تھیں یہ معلوم ہوگیا کہ یوروپی اقتدار کا دارومدار نہ صرف اخلاقی "احساسات" سے
عدم توجہی بلکہ معاملہ فہمی کے فقدان پر بھی مبنی تھا۔ یہ نتیجہ ظاہر تھا کہ اقتدار کی جو عمارت
ایسی بوسیدہ بنیاد پر قایم ہوا اس کا انہدام ہی مناسب ہے۔

بہر نوع کثیر التعداد مشرقیوں نے اس حالت کو اس نظر سے دیکھا اور
اُن کی باغیانہ خیالات کو صرف اپنی قوم کی واقفیت اور مغرب کی نااتفاقی ہی سے
نہیں بلکہ اُن کے جدید معاون یعنی بالشویک روس کی ہمت افزا سرگرمی سے اشتعال
ہوا۔ روسی بالشویکوں نے مغربی تمدن کے مقابلہ کا اعلان کیا۔ اور اس نے خوف
لڑائی میں جو درپیش تھی بالشویک سرداروں نے مشرق کے ان زریں مواقع کو نہایت
ہی خطرناک مسرت سے دیکھا۔ مشرق میں بالشویک کارروائیوں پر بحث معاشرتی
شورش کی فصل میں کی جائے گی۔ اس موقع پر یہ یاد رکھنا کافی ہے کہ بالشویک
تبلیغ اس عظیم ہیجان میں بڑا عنصر ہے جو کل مشرق ادنیٰ و وسطیٰ میں پھیلا ہوا ہے یہ ہیجان
ایسا ہے کہ اس نے بعض ممالک کو بدنظمی کے کنارہ پر پہونچا دیا ہے اور مستقبل قریب میں

جو خونریزی ہوئی ہے وہ قدیم نظام کے انہدام اور جدید نظام کے قیام کے لیے کافی نہیں ہے۔"[1]

قبل اس کے کہ یہ سطور طبع ہوئیں مصر میں مشکلات رونما ہوگئیں۔ مصری وفد کے پیرس پہونچنے کے ساتھ ہی قوم پرستوں نے اپنے مطالبات کو برطانوی حکام کے سامنے پیش کیا۔ قوم پرستوں کے پروگرام میں مصر کی کامل حکومت خود اختیاری کا مطالبہ تھا اور انگلستان کو پبلک قرضہ جات اور نہر سویز پر نگرانی کا حق دیا گیا تھا۔ قوم پرستوں کی قوت کا اظہار اس امر سے ہوا کہ ان تجاویز کو مصری وزارت نے بھی تصدیق کیا جس کو خدیو مصر نے برطانوی تجویز سے مقرر کیا تھا۔ دراصل مصری وزیراعظم رشدی پاشا نے اپنے چند رفقار کے ساتھ لندن جاکر معاملہ پیش کرنے کی اجازت مانگی۔ اس سے برطانوی حکام کی حالت مصر میں نہایت نازک ہوگئی۔ لیکن انھوں نے استقلال سے کام لینے کا ارادہ کرلیا اور یہ جواب دیا کہ اب مصر برطانوی صیانت میں ہے اور سلطنت کا اصلی جزو ہے لہذا انگلستان مصر میں امن وامان اور اچھی گورنمنٹ کے قیام کی ذمہ داری کو نظرانداز نہیں کرسکتا اور مصری لیڈروں کو انگلستان جانے اور وہاں پر ایسے فضول اور ناقابل سماعت مطالبات پیش کرنے کی اجازت دینے سے کوئی مفید مطلب نہیں حاصل ہوسکتا۔

انگریزوں نے مضبوط طرز عمل اختیار کیا۔ مصری روش بھی کچھ کم مضبوط نہ تھی وزارت نے فوراً استعفار دیدیا۔ کوئی جدید وزارت نہ قایم ہوسکی اور برطانوی ہائی کمشنر جنرل البنائی کو کھلم کھلا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔ اسی اثنار میں قوم پرستوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ مصری قوم کے طرز عمل کی توضیح کے لیے عوام کی رائے کو معلوم کرینگے اگرچہ برطانوی حکام نے اس کی مخالفت کردی لیکن عوام کی رائے خلاف قانون لی گئی اور

---

[1] مصری صحیفہ ابیض یعنی مصری وفد کی صلح کانفرنس سے مراسلت کا سرکاری مجموعہ۔ مصنف

بلاشبہ انتہا پسند قوم پرستوں نے شروع ہی سے اس صیانت کے خلاف بڑی سختی سے احتجاج کیا تھا اور اختتام جنگ پر ایک وفد جس میں دونوں قسم کے قوم پرست شامل تھے وریسلز کانفرنس کے سامنے اپنی دعاوی پیش کرنے کو پیرس روانہ ہوا۔ کانفرنس نے جو مصر پر برطانوی صیانت کو تصفیہ صلح کا ایک جز قرار دے چکی تھی جب انھیں بے نیل مرام واپس کر دیا تو مصری وفد نے باضابطہ احتجاج جاری کیا اور مشکلات سے متنبہ کیا۔ اِس احتجاج کا اقتباس حسب ذیل ہے:-

"ہمنے یکے بعد دیگرے ہر در کو کھٹکھٹایا ہے لیکن ہم کو کوئی جواب نہ ملا۔ اگرچہ فاتح اقوام کے سربرآوردہ مدبرین نے اس بارہ میں صریح وعدے کیے کہ اُن کی فتح کے معنی یہ ہیں کہ حق جبر پر غالب آئے گا اور قلیل التعداد اقوام کے لیے ود خود انتظامی" کے اصول کا قیام و استحکام ہوگا لیکن مصری قوم سے اُن کی سیاسی حیثیت کی بابت صلاح لیے بغیر مصر پر برطانوی صیانت کی توثیق وریسلز اور سینٹ جرمین[1] کے عہد ناموں میں درج کر دی گئی"

ہماری قوم کے خلاف یہ جرم اور اُن دول کا یہ خلاف دیانت فعل جنھوں نے اوسی ایک عہد نامہ میں مجلس اقوام کی ترتیب کا اعلان کیا ہے اوس کی تکمیل ہونے سے قبل ہم یہ آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ مصری قوم تصفیہ پیرس کو کالعدم سمجھتی ہے۔ اگر ہماری بات نہیں سُنی جاتی تو اُس کی صرف یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ ابتک

---

[1] سینٹ ژرمین یا جرمین فرانس کا ایک شہر ہے جو پیرس سے ۱۳ میل بجانب مغرب واقع ہے ہجوم گرما میں اکثر اشخاص یہاں آتے ہیں اور اس میں جنگل اچھے ہیں ۱۹۱۹ء میں آسٹریا نے اسی مقام پر عہدنامہ صلح پر دستخط کیے۔ (مترجم)

فوجی ضروریات نے برطانیہ کو مجبور کیا تھا کہ دس لاکھ فلاحین کو مشرق ادنےٰ اور یورپ میں بیگار کرنے کے لیے جبریہ طور پر بھرتی کرے۔ علاوہ ازیں اناج و چارہ اور دیگر اشیاء کی بھی فراہمی بڑے پیمانہ پر ہوئی تھی۔ ان امور سے سخت بے چینی پیدا ہوئی اور فلاحین میں برطانوی حکومت سے صرف باطنی ناراضگی ہی نہیں بلکہ نمایاں نفرت بھی پیدا ہوئی۔ مسایل مصر کے مستند ماہرین نہایت خائف تھے۔ ان ہنگاموں کے بعد ہی معروف انجینیر سر ولیم ولکاکس نے ایک پبلک بیان میں کہا "مصر پر برطانوی مقابضت کی بنیاد یہ تھی کہ فلاحین اُس کے حامی تھے۔ جب تک لاکھوں فلاحین متفقہ طور پر حامی صیانت تھے اس کا کچھ اثر نہ تھا کہ شیوخ عمائد۔ حکمران طبقہ۔ پیشوایان مذہب خلاف ہیں یا موافق۔ بلاشبہ آج برطانیہ نے فلاحین کی دوستی اور اعتماد کو کھو دیا"۔ اور سر ویلنٹائن چرول نے لندن ٹائمس میں لکھا "مسلمہ طور پر برطانوی مقابضت کے بعد پہلی مرتبہ اس منحوس واقعہ سے ہمارا سامنا ہے کہ مصری فلاحین کی تعداد کثیر میں بے چینی اور نفرت پیدا کر دی گئی ہے درآنحالیکہ یہ فلاحین دیگر مصری طبقات کے مقابلہ میں ہمارے سب سے زیادہ مرہون منت ہیں۔ میرے خیال میں انگلستان میں بلکہ ذمہ دار حلقوں میں بھی بہت کم اشخاص کو اس کا احساس ہے کہ یہاں کی کشمکش کس خطرناک درجہ تک پہونچ گئی ہے"۔

ممالک غیر کے کل مبصرین قوم پرستوں کے جذبات سے جن میں ہر مذہب اور ملت کے لوگ متحد تھے متاثر ہوئے۔ ۱۹۱۹ء کے موسم گرما میں جو بڑے مظاہرے ہوئے اُن کی بابت ایک اطالوی ماہر سیاسیات لکھتا ہے "تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ جو علم بلند کیے گئے اُس میں ہلال اور صلیب دونوں یک جا نمایاں تھے۔ کچھ عرصہ قبل تک مسلمان و عیسائی ایک دوسرے سے ایسے جدا تھے جیسے کہ یہ دونوں یہودیوں سے۔ آج جیسا کہ ہندوستان میں

قوم پرستوں کے بیان کے مطابق اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کے مطالبات کی کثرت رائے سے تصدیق ہوگئی۔ اس سرکشانہ طرزِ عمل نے برطانیہ کو تشددی عمل پر مجبور کیا لہذا ۱۹۱۹ء کی بہار میں بہت سے قوم پرست لیڈر گرفتار کرکے مالٹا بھیج دیئے گئے۔

مصر کی طرف سے اس کا جواب ایک طوفان کی صورت میں رونما ہوا ملک کے ہر گوشہ میں آتشِ بغاوت بھڑک گئی۔ ہر جگہ ایک ہی صورت تھی۔ ریلیں اور تار باقاعدہ توڑ دیئے گئے۔ گاڑیاں روک کر لوٹ لی گئیں۔ اکا دکا برطانوی افسر اور سپاہی قتل کر دیئے گئے۔ تنہا قاہرہ میں ہزاروں گھروں کو مجمع نے لوٹ لیا۔ ریگستان سے اُن بدوی اعراب کی تعداد کثیر کے خروج نے جو غارتگری کے لیئے تُلی ہوئی تھی خطرہ کو دوبالا کر دیا۔ چند روز تک مصر طوائف الملوکی کی حالت کے قریب معلوم ہوتا تھا اور برطانوی حکومت نے پارلیمنٹ میں اعتراف کیا کہ کل مصر بغاوت کی حالت میں تھا۔

برطانوی حکام نے اس نازک حالت کا مقابلہ نہایت شد ومد اور استقلال سے کیا۔ مصر میں کثیر التعداد برطانوی فوج موجود تھی اور معتمد کالی فوجیں سوڈان سے فوراً بلائی گئیں اور باضابطہ مصری پولیس نے عام طور پر احکام کی تعمیل کی۔ چند ہفتوں کی سخت لڑائی اور شدید اتلافِ جان کے بعد مصر پر پھر تسلط ہو گیا۔

امن تو قایم ہو گیا لیکن مطلع نہایت ہی غبار آلود رہا۔ کثیر التعداد برطانوی اور سوڈانی افواج کی موجودگی ہی سے امن قایم رہا تھا۔ متواتر مارشل لا کے نفاذ سے بھی قوم پرستوں کے مظاہرے بند نہ ہوئے جن کا نتیجہ بعض وقت بلوہ لڑائی اور نقصانِ جان ہوتا تھا۔ اس موقع کی سب سے زیادہ نازک صورت یہ تھی کہ صرف طبقۂ اعلیٰ ہی کے اشخاص متحدہ طور پر قوم پرست نہ تھے بلکہ کروڑوں فلاحین بھی جو اس وقت تک خاموش تھے اُن کے حامی تھے۔ جنگ کا زمانہ فلاحین پر سخت گزرا تھا۔

بالآخر بڑھتی رہے گی،، ایک فرانسیسی خاتون نے جو عمر بھر سے مصر میں رہتی ہی لکھا۔
"اِس ملک میں جو اکثر فریق بندی اور مذہبی نزاعات میں پھنسا رہتا تھا ہم عجیب
باتیں دیکھ رہے ہیں قبطی پادری مساجد میں اور علمار کلیساؤں میں وعظ

بقیہ نوٹ صفحہ۔ موجودگی میں مذہبی جد وجہد اور امور دینیات کا چرچا لازمی ہی لہذا لابد ہے کہ
اخلاقی نتیجہ اچھا ہی ہوگا کیونکہ ہر مذہب تربیت اخلاق کی تعلیم دیتا ہی۔ دویم یہ کہ مسلمانوں
کو اپنے فراموش کردہ فرض یاد آسکتے ممکن ہی کہ جوش قومی اور ناموس دین کے لیے کچھ ہاتھ
پیر ہلاکر اپنے برادران وطن کو سچے دین فطرت کی دعوت دیں اور تبلیغ اسلام میں کامیابی
حاصل کریں۔ قابل اعتراض تو یہ امر ہی کہ مذہب کا نام رکھ کر سیاسی اغراض
حاصل کی جاتی ہیں اور سیاسی غرض بھی ایک ہی ہی یعنی مسلمانوں کی تعداد گھٹا کر
اون کی اہمیت کو مٹانا بلکہ اُن کی ہستی ہی کو فنا کر دینا۔ مسلمان بھی اسی قبیل کی
تنگ خیالی کا کافی اظہار کرتے ہیں۔ ہنود میں خود ہی کشمکش ہے آریہ نسل کے
اشخاص اصلی باشندگان ملک کو جو شودر یا اچھوت ذات کہلاتے ہیں ان حقوق
میں شریک نہیں کرنا چاہتے۔ تیسری قسم مشترکہ منافرت دراصل بنا اتحاد تھی یعنی مسلمانوں
اور ہنود دونوں کو سلطنت سے نفرت پیدا ہوئی۔ اور اوسی غیظ و غضب میں متحد ہوگئے
حصول مدعا کی ناکامیابی اور وجوہ منافرت میں کمی پیدا ہونے سے وہ اتحاد غایب ہوگیا
جب تک ہندوستان کے کل فرقے افراط و تفریط و خود غرضی اور حرص کو خیرباد نہ
کہینگے اصلی اتحاد ہرگز ہرگز قایم نہ ہوگا۔ کانگریس کے پلیٹ فارم پر اتحاد کا ریزولیوشن پاس کرنا
شی دیگر ہی لیکن نا اتفاقی کے اصلی اسباب کو معلوم کرنا اور شورش انگیزوں کو علانیہ ملعون
کرکے حقیقی اتحاد پیدا کرنا شی دیگر۔ جب تک تنگ نظری کا استیصال اور اصلی رواداری کی
روح پیدا نہ کی جاوے گی ہندوستان حصول سوراج کے قابل نہیں ہوسکتا۔ مترجم ۔ ۔ ۔ سلہ مِی میومینی کا

ہندو اور مسلمانوں[1] میں ہوا اوسی طرح مذہبی تفرقہ یہاں سے بالکل رخصت ہو گیا۔ سب مصری ایک ہی جھنڈے کے نیچے کھڑے ہیں۔ ہر شخص اپنے نقاب سکوت کے پس پردہ ایک ہی عقیدہ سے فروزاں ہی اور یقین کامل رکھتا ہی کہ اُس کی بات

---

[1] افسوس ہی کہ ہندوستان کا وہ اتحاد جو مصریوں کے لیے مثال تھا آج درہم و برہم ہو گیا۔ ہندوستان میں بھی مساجد و منادر میں بلا تفریق ملت و مذہب واعظین منبروں پر جلوہ افروز ہوئے۔ جامع مسجد دہلی کے ممبر کی جگہ پر سوامی شردھانند نے اجلاس فرما کر مسلمان اور ہنود کے مجمع کو مخاطب کیا۔ ایک مندر میں مولانا محمد علی وغیرہ کے ہند و خواتین نے چندن لگایا۔ لیکن افسوس ہی کہ وہ اتحاد اس طرح پارہ پارہ ہوا کہ اس کے احیاء کے مستقبل قریب میں کوئی اُمید نہیں ہی۔ ملتان امرتسر سہارنپور کاشگنج شاہجہاں پور آگرہ گونڈا کے فسادات اس پر شاہد ہیں۔ ظاہر ہی کہ یہ اتحاد کسی مستقل بنا پر قائم نہ تھا اور ذرا دیر میں برباد گیا۔ دیکھنا یہ ہی کہ یہ اتحاد کس بنیاد پر قائم ہوا اور نیز یہ کہ ایسی کوئی بنا بھی ہو سکتی ہی کہ یہ پھر قائم اور مستقل طور پر قائم ہو جائے۔ اتحاد کی میری عقل کی رسائی کے مطابق تین ہی اصول ہو سکتے ہیں یعنی اشتراک خیال اشتراک اغراض اور مشترک منافرت۔ قسم اول تو اس ملک کی ایک ہی ملت کے مختلف طبقات سے ایسی مفقود ہی کہ نا اتفاقی باشندگان ملک میں سب سے زیادہ نمایاں اور ہندوستان کی پھوٹ ہی مشہور ہی۔ قسم دوم کے متعلق یہ ہی کہ ہندو قوم اپنے آپ کو تنہا ہندوستانی سمجھتی ہی اور یہ خیال کرتی ہی کہ دیگر اقوام جو ملک میں آباد ہیں اُن کو ملک میں کوئی حق نہیں۔ جب ایک جماعت کا نصب العین ہی کہ ملک کے کل عہدے اور فوائد اوسی تک محدود رہوں تو اشتراک اغراض معلوم۔ ہندو قوم کے مذکورہ بالا نصب العین کی تصدیق پنڈت مدن موہن مالوی کی تقریر متعلقہ ہندوستان اور دیگر ہندو لیڈران کی تقاریر کے سلسلہ تحریک شودھی و سنگھٹن سے ہوتی ہی۔ تحریک شدھی سے مجھ کو کوئی خاص مخالفت نہیں بلکہ میں تو اُس کو دو وجوہ سے بہت ضروری اور لازمی سمجھتا ہوں۔ اول یہ کہ ہمارا موجودہ انحطاط محض پستیِ اخلاق کی وجہ سے ہی اور ایسی تحریک کی

اِس عدیم المثال حمایت قوم کے جوش سے سامنا ہونے پر جو انگریز موقع پر تھے ان کی دو رائیں تھیں۔ کچھ تو سر ولیم ولکاکس اور سر ولنٹائن چرول کی طرح یہ کہتے تھے[۵] کہ بہت زیادہ مراعات وسیع پیمانے پر ہونا چاہئیں اور بعض اہل الرائے یہ کہتے تھے کہ مراعات کا دینا کمزوری ہوگی اور اس سے مصیبت پھیلے گی چنانچہ سر ایم میکل ریتھ نے کہا "قوم پرستوں کے پنج سالہ حکومت کا نتیجہ لاعلاج بدنظمی اور ابتری ہوگی۔ اگر مصر کی قسمت میں افلاس اور بدنظمی کے اُس دلدل میں پھر پھنسنا نہیں لکھا ہو جس سے ہم نے اِس کو ۱۸۸۳ء میں نکالا اور اگر اسی عظیم تر بالشیوکی مصائب میں گرفتار ہونا نہیں جس کی علامات ظاہر ہو رہی ہیں تو برطانیہ کو اپنا تسلط کم نہ کرنا چاہیے[۶]"۔ مصر کے واقعات سے انگلستان میں بہت فکر پیدا ہوئی اور ۱۹۱۹ء کے موسم گرما میں گورنمنٹ نے مصری معاملات میں کامل تحقیقات کے لیے ایک تحقیقاتی کمیشن کی تقرری کا بسرکردگی لارڈ ملنر اعلان کیا۔

بقیہ نوٹ[۲] متعلق صفحہ ما قبل :۔ مس ایڈتھ کیول انگریزی نرس تھی جس نے لندن کے شفاخانہ میں تعلیم پائی اور بلجیم میں ملازم ہوئی اور بروسیلس کے شفاخانہ میں نرسِ اعلیٰ ہوگئی۔ جب جنگ عظیم میں جرمن قابض ہوئے تو بھی اپنا کام کرتی رہی اور اسی زمانہ میں ایک جماعت کی تنظیم کی جس کا کام یہ تھا کہ راہ گم کردہ اتحادی سپاہیوں کو ہالینڈ میں پہونچا دینے کی امداد کرتے تھے۔ اس راز کے افشا ہونے پر جرمنوں نے گرفتار کرلیا اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو سزائے موت دی یہ مس ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئی۔ مترجم

[۵] اخبار کے بیانات مذکورہ بالا میں درج ہیں۔ مصنف

[۶] سر میک الریتھ کا مضمون "مصری قوم پرستی" جو جولائی ۱۹۱۹ء کے ایڈنبرا ریویو میں شایع ہوا۔ نیز ملاحظہ ہو آنریبل ڈبلیو۔ اورمسبی گور کا مضمون "مصر کا مستقبل" جو ۸ر نومبر ۱۹۱۹ء کو نیو یورپ میں شایع ہوا۔ مصنف

کر رہے ہیں۔ شامی و مارونی[1] اور مسلمان طلبا، مصری و ترکی نسل کی خواتین ایک ہی جوش میں متحد ہیں اور سب کی یہ دلی آرزو ہے اپنے قدیم ملک میں مہر آزادی کی طلوع کی شعاعیں درخشاں دیکھیں۔ اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے میری طرح توفیق پائی سے زمانہ کا مصر دیکھا ہے گزشتہ چند سال میں وادی نیل میں تمام تبدیلیوں میں سب سے عجیب انگیز خواتین کا طرز عمل ہے۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ وہ لاپرواہ ہستی جو ہر سیاسی امر سے بالکل بے تعلق تھی گزشتہ چند ماہ کی بڑی جد و جہد کی مداح ہے مثلاً گزشتہ موسم گرما میں مظاہرہ کرنے والی عورتوں کے جلوس کو سنگین چڑھائے ہوئے برطانوی سپاہیوں نے گھیر لیا۔ ایک سپاہی نے ایک عورت کو دھکا دیا اوس نے لوٹ کر اپنے سینے کو کھول دیا اور کہا "مجھے مار ڈالو تاکہ ایک دوسری مس کیول[2] کا سانحہ ہو جائے"

بقیہ نوٹ متعلقہ صفحہ ما قبل۔ مضمون جو ۳۰ دسمبر ۱۹۱۹ء کو کوریر دیلا سیرا" میں شایع ہوا مصنف

[1] مارونی شامی قدیم زبان میں مرونوئی اور عربی میں موارین کہتے ہیں۔ قدیم مشرقی نصرانی دستور کے مطابق یہ معاشرتی اور سیاست کے لحاظ سے بالکل جدا تھے اور لیبنان اور اوس کے نواح میں آباد تھے ابتدا میں یہ موحد تھے اور ۱۱۸۲ء میں لاطینی کلیسا میں شریک ہوئے۔ یہ نام سینٹ مارون کی نسبت سے ہے جو چھٹی صدی میں شام کی خاص خانقاہ ہے یا جان مارون کے نام پر ہے جو ۴۱۰ء میں مرا اور اس نے لبنان کے مسیحیوں کو راسخ الاعتقاد بنا دیا مترجم

[2] میڈم جہان دیورے کا مضمون "مصر میں" جو ۱۵ ستمبر ۱۹۲۰ء کے رسالہ ریویو دی پیرس میں شایع ہوا۔ میڈم دیورے نے اسی قسم کے دیگر مناظر کا عجیب نقشہ کھینچا ہے۔ نیز مصری صحیفہ ایجپٹ کورہ بالا کے ملحقات ملاحظہ ہوں۔ ان ملحقات میں اکثر بیانات و تصاویر دی ہوئی ہیں جس سے برطانوی افواج کے جبر و مظالم ظاہر ہوتے ہیں۔ (مصنف)

سے ہوگئی آزمائشی تصفیہ کی شرائط حسب ذیل تھے۔

"انگلستان اپنی ضمانت کو واپس لیکر مصر کی آزادی کا اعلان کر دے۔ یہ آزادی انھیں شرایط سے مشروط تھی جن پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے کیوبا کو آزادی دی ہے۔ مصر میں کامل حکومت خود اختیاری قایم ہوجائے اور برطانوی قلعہ بند افواج اور غیر مصافی حکام واپس بلا لیے جاویں۔ لیکن مصر برطانیہ عظمے سے دایمی اتحاد کرے اور یہ عہد کرے کہ وہ کسی دوسری سلطنت سے عہد و پیمان نہ کرے۔ الا بہ استرضائے برطانیہ نیز نہر سویز اور اگر کوئی اجنبی طاقت مصر پر حملہ آور ہو تو خود مصر کی حفاظت کے لیے برطانیہ کو ایک فوجی اور بحری مقام دیا جاوے۔ سوڈان کا پریشان کن مسئلہ عارضی طور پر غیر منفصل رہے۔

ان تجاویز میں سچے تعمیری تصفیہ کے آثار ہویدا تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان پر فوراً عمل نہ کیا گیا۔ انگلستان اور مصر دونوں جگہ ان کی سخت مخالفت ہوئی۔ انگلستان میں عہدہ داروں کے مخالفانہ اثرات نے رپورٹ کو فروری ۱۹۲۱ء تک تعویق میں ڈال رکھا۔ مصر میں انتہا پسند قوم پرستوں نے زاغلول پاشا پر دغابازی کا الزام لگایا۔ اگرچہ اعتدال پسند بالکل مطمئن معلوم ہوتے تھے۔ کمیشن کی رپورٹ بالآخر جس صورت میں شایع ہوئی اُس میں یہ اعلان کیا گیا کہ مصر کو حکومت خود اختیاری دینا بلے خطری کے ساتھ ملتوی نہیں کیا جا سکتا اور نہ حمایت قومی کی روح کو معدوم کیا جا سکتا ہے کہ مخالف رعایا کی مرضی کے خلاف مصر پر حکومت کرنے کی کوشش کرنا "نہایت مشکل اور شرمناک" کام ہوگا۔ نیز یہ کہ یہ بڑی بدنصیبی ہوگی اگر تصفیہ کے موجودہ

---

۵ اس تعویق کے نامبارک پہلو کے لیے ملاحظہ ہو سر ولنٹائن چرول کا مضمون "دو مشرق میں متضاد پیر" جو یکم جولائی ۱۹۲۱ء کی نیو یورپ میں شایع ہوا۔ مصنف

یہ تقریر نہایت دانشمندانہ تھا۔ لارڈ ملنر برطانوی سیاسی زندگی کے
قابل ترین اشخاص میں سے تھے ان کو عرصہ دراز سے مسایل شہنشاہی کا [illegible]
تجربہ تھا۔ طبیعت بھی ایسی پائی تھی کہ نہ تو فضائے آزادی میں گسستہ مہار
نہ ماضی پرستی کی زنجیروں میں دست وپا بستہ۔ مختصر یہ کہ لارڈ ملنر صحیح مفہوم میں
حقایق شناس تھے اور اس کا ثبوت بہت جلد ان کے عمل سے ہو گیا۔ شروع
سنہ ۱۹۲۰ء میں لارڈ ملنر اور ان کے رفقاء کو مصر پہنچ کر نہایت مشکلات سے سابقہ پڑا۔
مصر میں یہ اعلان ہو چکا تھا کہ کمیشن کا مقاطعہ کیا جائے۔ صرف قوم پرست سیاست
دانوں ہی نے نہیں بلکہ مفتی اعظم جیسے پیشوایان مذہبی نے بھی معاملات پر اس وقت
تک بحث کرنے سے انکار کیا جب تک کہ کمشنران پہلے مصری خود مختاری سے
اتفاق رائے نہ کرلیں۔ معاملات یہیں پر ختم ہوتے معلوم ہوتے تھے مگر لارڈ ملنر نے نہایت
حزم واستقلال کا کام لیا اور بالآخر زاغلول پاشا اور دیگر ذمہ دار قوم پرست لیڈروں
سے آزاد اور بے لوث بحث ہونے لگی۔

بلاشبہ لارڈ ملنر کی مساعی کو مصر کے بعض اندرونی حالات سے مدد
ملی۔ مشرق کے دیگر حصص کی طرح مصر میں بھی سیاسی شورش کے ساتھ معاشرتی
بے چینی کے بھی علامات رونما ہو رہے تھے نئی قسم کے شورش انگیز پیدا ہو رہے
تھے جو عوام کو نہایت ہی انقلابی اصول کی تلقین کرتے تھے۔ ان نوعمر شورش انگیزوں
کی وجہ سے اصلی قوم پرست لیڈروں میں پریشانی پیدا ہو گئی جن کو یہ احساس ہوا
کہ ان کی حالت سرگروہ جماعت و نیز صاحب حیثیت اور جائداد ہونے کے لحاظ سے
معرض خطر میں ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۲۰ء کے موسم خزاں میں لارڈ ملنر اور زاغلول پاشا
ان اصولوں پر متفق ہو گئے جن کی بنا پر سچا تصفیہ ممکن ہے۔ ان اطلاعات کی بنیاد پر
جو اس زمانہ میں اخباروں کو دی گئی تھیں اور جن کی تصدیق لارڈ ملنر کی سرکاری رپورٹ

والے پروگرام میں منضبط تھے اور اس کی تصدیق اتحادیوں نے بھی کی تھی ترکوں سے اور بھی خاص قسم کے وعدے کیے گئے تھے خصوصاً وزیر اعظم لائڈ جارج نے ۵ رجنوری ۱۹۱۸ء کو کہا تھا "ہم اس لیے نہیں لڑ رہے ہیں کہ ترکوں سے اُن کا دارالسلطنت یا ایشیائے کوچک اور تھریس کی وہ زرخیز اور مشہور زمین جو باعتبار غلبۂ آبادی ترکی ہیں چھین لیں۔ بالفاظ دیگر ترکوں کو صریح الفاظ میں یہ بتا دیا گیا تھا کہ اگرچہ ان کی حکومت غیر ترکی ممالک مثلاً عرب صوبجات سے ختم ہو گئی لیکن سلطنت کے ترکی صوبجات حکومت غیر کے تحت میں نہ جائنگے بلکہ اُن میں ترکی قومی سلطنت قائم ہوگی۔ ترکوں کو اُن خفیہ معاہدوں کا کوئی علم نہ تھا جو ۱۹۱۵ء سے اتحادیوں میں ہو رہے تھے اور ان کی رو سے تقریباً کل ایشیائے کوچک اتحادیوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ان کا اظہار بعد کو ہوا۔ لہٰذا فی الحال ترک اُمیدوار رہ سکتے تھے۔

عربوں کے لیے اس سے بھی زیادہ روشن وجوہ اُمید اور باعتبار نتیجہ زیادہ تاریک پہلو موجود تھے۔ ہم ۱۹۱۶ء کی عرب بغاوت کا ذکر کر چکے ہیں جو بسرکردگی شریف مکہ حجاز سے شروع ہو کر سلطنت عثمانیہ کے کل عربی صوبجات میں پھیل گئی اور ترکی طاقت مقاومت کی بربادی کا بڑا باعث ہوئی۔ مگر یہ بغاوت فوری یا بلا سوچے سمجھے نہ ہوئی تھی۔ اس کی تدابیر نہایت ہوشیاری سے کی گئی تھیں اور یہ زیادہ تر اتحادیوں کی اعانت اور وعدوں کی بدولت عمل میں آئی۔ آغاز جنگ ہی سے عرب قوم پرست جو سلطنت عثمانیہ سے ناراض تھے مصر کی برطانوی حکام سے ربط رکھتے تھے۔ ان کا نہایت گرم خیر مقدم کیا گیا تھا اور اُن کی تجویز کی تجاویز کی ہمت افزائی کی گئی تھی کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ عربوں کی بغاوت سے برطانیہ کو ترکی علاقہ میں پیش قدمی کرنے کے علاوہ مصر اور نہر سویز کی حفاظت میں بڑی مدد ملنے والی تھی۔

موقع کو ضایع کیا جاوے۔ مگر گورنمنٹ نے پوری رپورٹ کو منظور نہیں کیا اور لارڈ ملنر نے فوراً استعفا دے دیا۔ زاغلول پاشا کی یہ حالت ہے کہ وہ اب بھی قوم پرستوں کے لیڈر ہیں مگر ان کا اقتدار بہت کم ہو گیا ہے سطور ہٰذا کی تحریر کے وقت مصر کی حالت تو یہی ہے اور سچ یہ ہے کہ یہ حالت اس قدر امید افزا نہیں ہے جیسی پچھلی سال تھی۔

اسی اثنا میں جو طوفان مصر میں اُٹھا تھا مدت سے مشرق ادنےٰ کے دیگر حصص میں پھیل گیا تھا۔ فی الواقع ۱۹۲۰ء کے ابتدائی مہینوں میں طوفان کا مرکز عثمانی سلطنت میں منتقل ہو گیا۔ اس کا الزام زیادہ تر خود اتحادیوں پر ہے۔ بلاشبہ ان پُر آشوب ممالک کی بابت کوئی تعمیری تصفیہ بہت مشکل تھا تاہم اگر اتحادیوں کی حکمت عملی انصاف اور راست بازی پر مبنی ہوتی تو تصفیہ محال ثابت نہ ہوتا۔ اختتام جنگ پر سلطنت عثمانیہ کی اکثر اقوام کو یہ اُمید تھی کہ وہ آزادانہ مقاصد جنگ جن کی تبلیغ اتحادی صاحبان اختیار وقتاً فوقتاً کرتے رہے ہیں پورے ہونگے۔ عرب عنصر کو خاص اُمید لگی تھی کیونکہ اتحادیوں نے اُن سے بہت سے وعدے کیے تھے (ان امید کو بہت جلد پس پشت ڈالدیا گیا جیسا کہ آگے بیان کیا جاوے گا) شکست خوردہ ترک بھی مستقبل سے بالکل مایوس نہ تھے اور آزادانہ برتاؤ کے اُس عام اعلان کے علاوہ جو پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ دفعات

لہ اس رپورٹ کی نامنظوری کا یہ اثر ہوا کہ مصر میں شدید بے چینی کا دور شروع ہوا اور برطانوی ہائی کمشنر نے زاغلول پاشا کو سیلان (لنکا) جلا وطن کیا۔ لیکن ہندوستانی شورش کی وجہ سے سیلان سے سیشلیز اور پھر جبل الطارق میں نظر بند رہے لیکن شورش متواتر جاری رہی اور بالآخر مصر کی کامل آزادی کا برطانیہ کو اعلان کرنا پڑا۔ اور ممالک غیر سے سفارتی تعلقات قایم کرنے کا حق بھی دینا پڑا۔ اور قانون دستور شایع کیا گیا۔ چنانچہ پارلیمنٹ بنائی جا رہی ہے۔

مصر نے شریف مکہ کے نمائندہ مقیم قاہرہ کو ایک تحریر دی جس کی رو سے برطانیہ نے یہ مشروط ذمہ داری لی کہ اگر عرب سلطان سے بغاوت کرینگے تو سلطنت عثمانی کے عربوں کی آزادی تسلیم کی جاوے گی۔ لیکن اس آزادی سے عراق کا جنوبی علاقہ جہاں کہ برطانوی مفاد مخصوص حاکمانہ اقتدار کے مقتضی ہیں اور نیز وہ رقبے جو فرانس کو نقصان پہنچائے بغیر برطانیہ کسی کو دے نہیں سکتا، مستثنیٰ رہیں گے۔ یہ آخری فقرہ بلاشبہ انگریزی تاش کا "جوکر"[1] تھا۔ مگر اس سے مقصد حاصل ہوگیا۔ عرب چونکہ خفیہ معاہدے سے ناواقف تھے اُنھوں نے یہ تصور کیا کہ یہ استثنا لبنان کے محدود ضلع سے تعلق رکھتا ہی۔ وہ خوش خوش بغاوت کی تیاری کے لیے گھر واپس آئے اور دوسرے سال بغاوت ہوگئی۔

نومبر ۱۹۱۶ء میں بغاوت شروع ہوئی۔ اگر عربوں کو یہ معلوم ہوتا کہ گزشتہ مئی میں کیا طے ہوچکا ہی تو شاید یہ بغاوت کبھی بھی شروع نہ ہوتی اُس مہینے میں انگلستان اور فرانس نے ایک دوسرے خفیہ معاہدے پر دستخط کیے جو معاہدۂ سائکس۔پیکو کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے کی رو سے ترکی عرب صوبجات کی باقاعدہ تقسیم ادن تجاویز کے مطابق ہوگئی جو سال ماقبل کے اصلی عہدنامہ مورخہ ۵ مارچ ۱۹۱۵ء میں قرارپائی تھیں۔ سائکس۔پیکو عہدنامے کی رو سے عراق کا بہت بڑا حصہ برطانیہ کے قبضہ میں اور ساحل شام صور سے لیکر اسکندریہ

---

[1] کھیلنے کے تاش میں باون پتوں کے سوا ایک تصویر ہوتی ہی جو عموماً ایک مسخرہ کی ہوتی ہی اُس کو جوکر کہتے ہیں اور تاش کے دو کھیلوں میں مستعمل ہوتا ہی اول "یوکر" جو اسٹریلیا میں رائج ہی اس میں جوکر سب سے بڑا ترپ ہوتا ہے دوسرا رنگ فلش جس کو عام طور پر رنگ فلاس کہتے ہیں اس کھیل میں جوکر ہر پتہ کا کام دیتا ہی۔ مترجم

مگر عربوں نے نہ صرف مادی مدد مانگی بلکہ یہ وعدے بھی لیے کہ ان کی بغاوت کے صلہ میں ایک عرب سلطنت بنا دی جائے جس میں عثمانی سلطنت کے سب عربی صوبجات شامل ہوں۔ یہ عرب قوم پرستوں کی توقعات کی بدقسمتی تھی کہ برطانوی اور فرانسیسی حکومتوں نے ترکی کے عرب صوبجات کی بابت اپنے منصوبے باندھ رکھے تھے۔ عرصہ دراز سے ان ممالک میں انگلستان اور فرانس کے "دائرہ ہائے اثر" تھے۔ انگریزی حلقہ جنوبی عراق میں خلیج فارس کے کنارے پر تھا اور فرانسیسی حلقہ لبنان میں تھا۔ یہ شمالی شام میں کوہستانی ضلع ہے جو بحیرہ روم کے ساحل پر واقع ہے اور اس میں موارین آباد ہیں یہ قوم رومن کیتھولک عقائد کی پابند ہے اور ان پر فرانس نے اپنی سیاسی حفاظت عرصہ دراز سے قائم کر رکھی ہے بلاشبہ یہ دونوں صوبے قانوناً بلاد ترکی میں شامل تھے اور دونوں کا رقبہ بھی تھوڑا تھا لیکن "دائرہ ہائے اثر" ربڑ کے لوچدار حلقے ہوتے ہیں کہ جب مناسب مواقع ہوں تو یہ دفعتاً غیر معمولی طور پر بڑھ جاتے ہیں۔ جنگ عظیم ایک ایسا ہی مناسب موقع تھی لہذا برطانوی اور فرانسیسی دفاتر خارجیہ نے مشورہ کرکے ۵ مارچ ۱۹۱۵ء کو ایک ایسے خفیہ عہدنامے کی تکمیل کی جس کی روسے فرانس کو شام میں اور برطانیہ کو عراق میں "امتیازی حیثیت" دی گئی تھی۔ اس وقت کوئی خاص حدود مقرر نہ ہوئے تھے لیکن ارادہ یہ تھا کہ ایسے وعدے کیے جائیں گے جن کی روسے ترکی کی عربی صوبجات انگلستان اور فرانس میں تقسیم ہو جائیں۔

اس خفیہ عہدنامے کی موجودگی سے مصر کی برطانوی حکام کو عربوں سے گفتگو کرنے میں پریشانیاں پیدا ہوئیں مگر عربی بغاوت ایک ایسا گرانقدر موقع تھی کہ اس کو کھونا خلاف عقل تھا۔ بالآخر برطانوی وکلائے ایک ایسا اصول نکالا کہ عرب سردار مطمئن ہو گئے۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو سر ہنری میکموہان گورنر جنرل

اور فراخ دلی سے وعدوں پر وعدے[۱] کیے۔ اس مذاق کی انتہا اختتام جنگ پر ہوئی جبکہ فرانسیسی اور انگریزی حکومتوں نے ذیل کا مشترکہ اعلان تمام عرب صوبوں میں شایع کیا۔

"برطانیہ اور فرانس کی غرض مشرق میں اس جنگ سے جسے جرمنی کی حرص نے دنیا پر نازل کیا ہو یہ ہے کہ اُن تمام اقوام کی نجات کو مکمل اور متیقن کر دیا جاوے جو عرصہ دراز سے ترکی شکنجۂ ظلم میں مبتلا ہیں اور اُن میں ایسی قومی حکومتیں اور نظامات قایم کیے جاویں جن کے اختیارات اونھیں کی آزاد خواہش اور قوت ارادی سے ماخوذ ہوں"

اس پُرفریب کارروائی کے عروج ہی کے بعد مآل کا ظاہر ہوا۔ جنگ ختم ہوئی دشمن کو شکست ہوئی۔ تماشہ ختم ہوا اور پردہ گرا دیا گیا۔ اس پردہ پر عربوں کو اصل حقیقت ثبت نظر آئی جس سے اُن کی آنکھیں کھل گئیں۔ فرانسیسی افواج سواحل شام پر دخل کرنے کو آئیں۔ خفیہ عہدناموں کا راز فاش ہوا۔ اور عربوں کو معلوم ہو گیا کہ اون کو کیسا دھوکا دیا گیا ہو۔ اُن کو سخت پیچ و تاب تھا۔ اگر عربوں کی دانشمند سردار آڑے نہ آتے تو غالباً فوراً ہی طوفان بپا ہو جاتا۔ ان شیوخ میں خاص طور پر قابل الذکر امیر فیصل، شریف مکہ کا لڑکا ہو۔ دوران جنگ میں اوس نے اپنے آپ کو انسانوں کا حقیقی سردار ثابت کیا اور اب مسلمہ اقتداری حیثیت حاصل کر لی تھی۔ فیصل اتحادیوں کی فوجی قوت سے آگاہ تھا اور یہ محسوس کرتا تھا کہ لڑائی بالخصوص اوس زمانے میں کیسی خطرناک ثابت ہوگی۔ عربوں کے دعاوی کی اخلاقی قوت کا احساس کرکے اُس نے اپنے ہم وطنوں سے یہ درخواست کی کہ وہ اُس کو آنے والی

---

[۱] جنرل ماڈ نے مارچ ۱۹۱۷ء میں جو جزیرۃ العرب کے عربوں سے اعلان کیا اس کی بہترین مثال ہو۔ مصنّف

تک معہ ارمینیا اور ایشیائے کوچک کے وسیع شمالی قطعات کے فرانس کے قبضے میں آیا فلسطین بین الاقوامی رہا۔ البتہ اس کا خاص بندرگاہ حیفہ برطانیہ کو ملا۔ اس میں یہ مفاہمت بھی تھی کہ فلسطین برطانوی حلقہ میں رہے گا اور بڑا اندرونی حصہ جو عراق اور شام کے درمیان واقع ہے برطانوی اور فرانسیسی دائرہ ہائے اثر کی ماتحتی میں آزاد ہوگا۔ فرانسیسی حلقہ میں باقی کل شام حلب سے لیکر دمشق تک اور انگریزی حلقہ میں عراق کا کل باقی حصہ یعنی وہ ملک جو موصل سے ملحق ہے شامل ہوگا بالفاظ دیگر وہ آزادی جس کا وعدہ سرہنری میکموہان نے عربوں سے کیا تھا ہباءً منثورا ہوگئی۔

اس پس پردہ کارروائی کی اطلاع عربوں کو کیوں دی جاتی؟ برعکس اس کے انگریزوں نے عرب قوم پرستوں کی توقعات کو مشتعل کرنے کے لیے ہر امکانی کوشش کی کیونکہ ان کے نزدیک ان کے جنگی جوش سے کام لینے کا یہی سب سے اچھا طریقہ تھا۔ گورنمنٹ برطانیہ نے عربوں کو محکمۂ علم و اطلاعات کے بہت سے منتخب افسر دیئے جن میں خاص شخص ایک کرنیل لارنس تھا۔ یہ غیر معمولی نوجوان تھا اور اس نے عرب شیوخ پر بے انتہا اثر بہت جلد پیدا کرلیا اور وہ "عربی انقلاب کی روح" کہلایا جانے لگا[1]۔ ان افسروں کو جو عربوں کے متعلق واقفیت اور اُن سے ہمدردی رکھنے کی بنا پر منتخب ہوئے تھے۔ ان خفیہ عہدناموں کا حال نہیں بتایا گیا تھا تاکہ عربی جوش کی جو ہمت افزائی کر رہے تھے اس میں عدم صداقت کی وجہ سے کمی نہ آجائے۔ اسی طور پر برطانوی جنرلوں نے اپنے اعلانات میں نہایت فیاضی

---

[1] لارنس اور اُس کی کارگزاریوں کی تفاصیل کے لئے ملاحظہ ہو ایل۔ ٹامس کا سلسلہ مضامین جو بعنوان "لارنس یعنی عربی انقلاب کی روح رواں" جو اپریل مئی۔ جون۔ جولائی سنہ ۱۹۱۹ء کے رسالہ ایشیا میں شایع ہوا۔ مصنف

فرانسیسی بے اطمینانی سے ہوا۔ سائکس پیکو معاہدے کے شایع ہوتے ہی فرانس کے اہل الرائے کا بڑا اور با اثر حصہ شور مچانے لگا کہ اُن کو فریب دیا گیا۔ پشتہا پشت سے فرانسیسی حامیان شہنشاہیت کی نظر شام[1] پر لگی ہوئی تھی اور آغاز جنگ ہی سے شہنشاہیت کے حامی اخباروں میں کل مشرق اوسطے کے الحاق کی تبلیغ کرتے رہتے تھے۔ اُن کی صدا "شام کا پورا ملک" تھی اور اس "پورے" میں صرف وہ ساحلی حصہ ہی نہ تھا جو فرانس کو سائکس پیکو معاہدے کی رو سے ملا تھا بلکہ فلسطین اور حلب و دمشق کا وسیع اندرونی حصہ بھی شامل تھا جو راست موصل کے زرخیز تیل کے چشموں تک پہونچتا ہے۔ اس کل حصے کے لیے جس کو وسعت پسند فرانسیسی حلقوں میں اکثر "لیوانت کا فرانس" کہتے ہیں۔ حامیان شہنشاہیت یہ کہتے تھے کہ اس حصہ ملک پر فرانس کو ناقابل تشریح تاریخی حقوق حاصل ہیں جن کی ابتدا حروب صلیبی بلکہ شارلمین کے زمانہ سے ہوتی ہے۔ شام "دوسرا الساس" ہے جو اپنا ہاتھ فرانس کی طرف بڑھا رہا ہے اور اُس سے دور باش نہیں کہا جاسکتا۔ اور یہ فرانس والوں کی عالمگیر حکمت عملی کا لازمی رکن تھا۔ شہنشاہیت پسندوں کی ان توقعات کی بڑی

---

[1] قبل از جنگ کی شہنشاہیت کی تبلیغ کی مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو جی۔ پوامیان کا مضمون "شام میں فرانس کا مفاد" جو یکم لغایت ۱۶ مارچ کے رسالہ کیستیان ڈپلومیٹک اے کلونیل میں شایع ہوا۔ دیگر دلچسپ واقعات میں مصنف نے وزیر اعظم پوانکارے کے اس اعلان کو نقل کیا ہے جو ۲۱ دسمبر ۱۹۱۲ء کو دارالمبعوثین میں کیا گیا۔ "مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم کو لبنان اور بالخصوص شام میں ہماری قدیمی اغراض ہیں اور ہم اُن کے احترام کرانے کے لیے مستعد ہیں" نیز ملاحظہ ہو جے۔ اُنلا کا مضمون "مسئلہ شام کے تین حل" جو ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کے رسالہ کیستیان ڈپلومیٹک اے کولونیل میں شایع ہوا۔ ایل بی فری کی کتاب "مشرق کیتھولک مسیحیوں پر فرانس کی سیاست" مطبوعہ پیرس ۱۹۱۴ء۔ مصنف

صلح کانفرنس میں عربستان کی وکالت کا موقع دیں۔ لوگوں نے اون کی بات مان لی ، عرب میں سکوت رہا اگرچہ یہ تشویش کا سکوت تھا۔

امیر فیصل نے اپنے معاملہ کی وکالت صلح کانفرنس کے روبرو نہایت فصاحت اور شان کے ساتھ کی لیکن ناکامیابی ہوئی۔ اس سے کیا ہوتا ہو کہ مجلس اقوام کی تجویز میں ایسا فیاضانہ بیان شامل ہو کہ "بعض اقوام نے جو سابق میں سلطنت ترکی کے ماتحت تھیں اُن مدارج ترقی کو طے کر لیا ہے جن کی روسے اُن کی ہستی بطور آزاد قوم کے اس شرط پر تسلیم کی جاسکتی ہو کہ ایک حکم بردار اُن کو حکمرانی میں مشورہ اور مدد اُس وقت تک دے جب تک اون میں اپنے پیروں کھڑے ہونے کی قابلیت پیدا ہوجائے"[1]، لیکن عرب تو اس سے واقف تھے کہ حکم برداری کا کیا منشا ہے۔ لائڈ جارج ایسے خوش کن فقرے کہا کریں "عربی افواج نے جو وعدے برطانیہ عظمٰی سے کیے تھے اُن کو وفا کر دیا۔ اب ہم کو اپنے وعدے پورے کرنے چاہئیں"[2]۔ عربوں نے خفیہ عہدناموں کو پڑھ لیا۔ شکاری کی نظر کے سامنے جال بچھانا بیکار ہو۔ اب یہ چال کام نہیں آئی۔ عربوں کو معلوم ہو گیا کہ تدبر ہو یا قتال اون کو اپنی ہی قوت پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

فیصل نے اب بھی صلح کا مشورہ دیا۔ غالبًا اس کی وجہ یہ تھی کہ اون کو مقابلے کے خطرات کے علاوہ یہ بھی خیال تھا کہ اتحادی آپس میں لڑ رہے تھے۔ یہ نزاعات کل مشرق قریبہ کی بابت تھے لیکن سب سے زیادہ سخت نزاع انگلستان اور فرانس کے درمیان عرب غنایم کی بابت تھا۔ اس نزاع کا آغاز خفیہ عہدناموں پر

---

[1] دفعہ ۲۲ مصنف

[2] ۱۹ ستمبر ۱۹۱۹ء کی تقریر سے منقول ہو۔ مصنف

فرانسیسی "حرص" اور "حماقت" کا طعنہ دیا اور کہا کہ اس کی بدولت انگلستان کی ساکھ پر اثر پڑتا ہے اور کل مشرق میں آگ لگ جانے کا خوف ہے۔[1] مختصر یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان جو ایک سال قبل وہی "مقدس اتحاد" کا وعدہ کرتی تھیں خوب ہی تفضیح و تفضیح ہوئی جس پر عرب اور دیگر مشرقی اقوام نے بھی خوب بغلیں بجائیں۔

زیادہ تر اس گفت و شنید کی بدولت ۱۹۱۹ء میں مشرق ادنیٰ میں کارروائیاں معرض التوا میں رہیں۔ لیکن ۱۹۲۰ء کی بہار میں اتحادیوں میں ایک حد تک مفاہمت ہو گئی سان ریمو میں اتحادی وزرا کی ملاقات کے دوران میں اس عہدنامے کے شرائط طے ہو گئے جو ترکی سے طے کرائے جائیں اور جس کی بدولت ایشیائے کوچک حلب منفعت اور اثرات کے دائروں میں تقسیم کیے گئے۔ اور صوبجات عرب حسب عہدنامہ سائکس پیکو انگلستان اور فرانس کو تفویض کیے گئے اور اس کی تلبیس کر کے مجلس اقوام کی علم برداری سے موسوم کیا گیا۔ انگلستان و فرانس اور ان کی پرستار، یونان نے عملی کارروائی کی۔ مزید برطانوی افواج فلسطین اور عراق کو اور فرانسیسی افواج شام کو بھیجی گئیں۔ ایک یونانی، انگریزی اور فرانسیسی متحدہ فوج قسطنطنیہ پر دخل کے لیے تیار کی گئی۔ اور وزیر اعظم وینزیلاس نے ایشیائے کوچک کی ضرورت کے لیے فوج دینے کا وعدہ کیا۔ اس زمانہ میں تارشکستہ صرف اطالیہ ہی تھا۔ اس نے

---

[1] شام میں فرانسیسی طرز عمل پر انگریزوں کی جلی کٹی تنقیدات کے لیے ملاحظہ ہو میکلیس علی لسن کا مضمون "ہماری حیرت انگیز مہم شام" جو ستمبر ۱۹۲۰ء میں نیشنل ریویو میں شائع ہوا۔ ڈبلیو اے ہیوم کی کا مضمون "عرب کا مقدمہ" جو ستمبر ۱۹۲۰ء میں بلقان ریویو میں شائع ہوا۔ یہ دونوں مضمون نگار عرب ممالک میں برطانوی افواج میں افسر تھے۔ نیز ملاحظہ ہو مضمون "دمشق و شیرا" جو اگست و اکتوبر ۱۹۲۰ء کے بلقان ریویو میں شائع ہوا۔ مصنف

معاونت بھی کاری حلقوں میں کی جاتی تھی۔ بر سبیل تمثیل ۱۹۱۵ء کے اوائل میں موسیو لینڈروی نے مجلس مبعوثین میں کہا تھا "فرانس کی حکمت عملی کا مجموعہ بحیرۂ روم میں ہو جس کا ایک سرا مغرب میں الجزائر و ٹیونس اور مراکش ہے اور دوسرا سرا مشرق میں شام و لبنان اور فلسطین ہونا چاہیے۔"[1]

ایسی رفیع توقعات کے بعد معاہدۂ سائکس پیکو کا جو اثر فرانسیسی حامیان شہنشاہیت پر ہوا ہوگا اوس کا اندازہ ہو سکتا ہے قدرتی طور پر اونھوں نے اپنا غصہ انگریزوں پر اوتارا۔ اون کو گول گول الفاظ میں مجرم ٹھہرایا اور مشرق کے ہر واقعہ کا الزام اُن کے سر رکھا۔ عرب قوم پرستوں کی آرزو مندیاں محض برطانوی تبلیغ کے نام سے مطعون کی گئی۔ ایک فرانسیسی مصنف نے لکھا "کسی طبیب امراض دماغی کو برطانیہ کے ان ناظمان مستعمرات و پرستاران شہنشاہیت اور مجنونوں کی دماغی حالت پر تبصرہ لکھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ شب و روز اپنے ملک کے نفع کے لیے لنڈن سے مشورہ کیے بغیر کام کرتے ہیں اور اُن کو برابر اس کی فکر ہے کہ فرانس کی فوقیت کو شام سے ایسا ہی معدوم کر دیں جیسا کہ ایک بار مصر میں کر چکے ہیں"[2] ایسے الزامات کے جواب میں انگریز مصنفین

---

[1] منقول از مضمون "شام اور فلسطین میں ہمارے حقوق" نوشتہ سینیٹر فلینڈرن جو ۵ر جون ۱۹۱۵ء کے ریویو ہبڈومدیر میں شایع ہوا۔ فرانسیسی تبلیغ شہنشاہیت کی دیگر امثلہ کے لیے مندرجہ بالا مضمون کے علاوہ ملاحظہ ہو بسی جی بسیم کی کتاب "مسئلہ لبنان" مطبوعہ پیرس ۱۹۱۵ء ایچ بودوان کا مضمون "شام یعنی سپاہی میدان جنگ" جو یکم لغایتہ ۱۶ر فروری کے ریویو موندیال میں شایع ہوا۔ کاونٹ کریسیاتی کی کتاب "فرانسیسی شام" مطبوعہ پیرس ۱۹۱۶ء۔ ایف۔ لوڈسے کا مضمون "لیوانٹ کا فرانس" جو یکم مارچ ۱۹۱۹ء ہفتہ وار ریویو میں شایع ہوا۔ مصنف

[2] بودوان مذکور الصدر۔ انگریزوں کے خلاف سخت نکتہ چینیوں کے لیے ملاحظہ لو بیٹ مذکور الصدر کا مضمون مصنف

میں یہودیوں کے خلاف جنھیں مسلمان اور عیسائی عرب دونوں اُن کے صیہونی[1] تجاویز کی وجہ سے نفرت کرتے تھے ہنگامے شروع ہوئے اور عراق میں قبائل کا منتشر بغاوتیں شروع ہوئیں۔

ان نامبارک واقعات کے پیش آنے سے "حکم برداران" نے بھی جوابی تدابیر اختیار کیں۔ فرانس نے خاص طور پر سخت کارروائی کی۔ شام اور سلیشیا میں تقریباً ایک لاکھ فرانسیسی فوج بہ ماتحتی جنرل گورو موجود تھیں جسے بہت سی مستعمرات کی لڑائیوں کا تجربہ تھا اور "زبردست تدابیر" کا اعتقاد تھا۔ ۱۵ر جولائی کو گورو نے امیر فیصل کو اعلان جنگ بھیج کر کامل اطاعت کا مطالبہ کیا۔ فیصل نے آخر وقت تک سیاست عملی سے کام لیا اور تجاویز کو تسلیم کرلیا لیکن گورو نے اس تسلیم کرنے کو بھی ایک لفظی نزاع پر نظر انداز کیا اور ساٹھ ہزار فوج سے دمشق پر حملہ کردیا۔ فیصل نے حقیقتاً مقابلہ کی کوشش نہ کی اور محض پسپائی کے حملے کیے اور ریگستان کی طرف ہٹنا شروع کیا۔ ۲۵ر جولائی کو فرانسیسی دمشق میں داخل ہوئے اور فیصل کو معزول کرکے کامل فرانسیسی حکومت قایم کردی۔ مخالفوں کو بڑی سخت سزائیں دی گئیں۔ جس طرح جرمنوں نے بلجیم میں کیا تھا اُسی طرح دمشق سے ایک کروڑ فرانک کا تاوان وصول کیا گیا۔ بہت سے قوم پرست لیڈروں کو قید یا قتل کیا گیا۔ اور جنرل

---

[1] صیحون (Zion) عبرانی لفظ جس کے معنی قلعۂ کوہ کے ہیں۔ بیت المقدس کا قلعہ اس نام سے موسوم تھا پھر کل بیت المقدس پر اطلاق ہونے لگا۔ صیحونی تحریک کا یہ منشا ہے کہ یہودی فلسطین میں واپس آکر ایک قومی سلطنت یہودیوں کی قایم کریں۔ سنہ ۱۹۲۰ء کی کانفرنس میں یہ طے ہوا تھا کہ فلسطین میں یہودیوں کی نوآبادیاں قایم کی جائیں اور یہودیوں کے لانے کا انتظام کیا جاوے اور ڈھائی کروڑ پونڈ چندہ اس کام کے لیے کیا جاوے۔

آنے والی مشکلات کو پہلے سے تاڑ لیا اور اُن میں مبتلا نہ ہونے کا تہیہ کر لیا۔ جینیوا کی
کانفرنس کے بعد وزیر اعظم نے ایک انگریز اخبار نویس سے کہا ”تم کو ایشیائے کوچک
میں جنگ کرنی ہوگی اور حکومت اطالیہ نہ تو ایک سپاہی دے گی اور نہ ایک پیسہ۔ تم نے
ترکوں کا مقدس شہر ایڈریانوپل لے لیا اور ان کی دارالسلطنت پر اغیار کا تسلط کر دیا۔
تم نے ان کا ہر بندرگاہ اور ملک کا بڑا حصہ لے لیا۔ اور پانچ ترکی نمائندے
جو تم خود منتخب کرو گے وہ اُس عہد نامے پر دستخط کر دیں گے جس کو نہ ترکی قوم منظور
کرے گی اور نہ ترکی پارلیمنٹ“

وزیر اعظم کی پیشینگوئی صحیح ثابت ہوئی۔ گزشتہ چند ماہ سے ترکی
قوم پرست جو واقعات سے کرا و نہیں کیا پیش آنے والا ہے اندرونی ایشیائے کوچک
میں اپنا مرکز مقاومت تیار کر رہے تھے۔ یہ سچ ہے کہ انور پاشا جیسے قوم پرست لیڈر
عرصہ ہوا کہ دور دراز مقامات مثل ماورائے قفقاز یا بالشویک روس میں پناہ گزیں
ہو گئے تھے مگر جدید قائدین پیدا ہو گئے جن میں خصوصیت کے ساتھ ایک نمایاں قابلیت
کا نوجوان افسر مصطفیٰ کمال نامی افسر ہے۔ مصطفیٰ کمال نے نہایت سرگرمی سے ایک
در اصل قابل تعریف فوج بنائی اور اپنے دارالسلطنت یعنی شہر انگورہ سے جو
وسط ایشیائے کوچک میں ہے اُس نے اتحادیوں کا مقابلہ کرنا شروع کیا اور اپنی
خود سری کا زور دکھانے کو اوس نے سلیشیا میں جو شام کے شمال میں ایک ساحلی ضلع
ہے فرانسیسی قلعہ بند افواج پر حملہ کر کے شدید نقصانات پہونچائے۔

عرب بھی تیاری عمل کر رہے تھے۔ مارچ میں ایک ”مجلس شامی“ دمشق
میں منعقد ہوئی جس میں بالاتفاق شام کی آزادی کا اعلان کر کے فیصل کو بادشاہ
منتخب کیا گیا۔ اس اعلان سے کل عرب صوبوں میں برقی رو دوڑ گئی۔ ساحلی علاقہ
میں جس پر فرانسیسی قابض تھے فرانسیسیوں کے خلاف بلوے شروع ہو گئے۔ فلسطین

مشتہر کی جائے گی۔ چند ہفتوں بعد ان سب شورشوں کے مراکز میں جوابی حملے کی تیاری ہوگی۔ ایشیا اور افریقہ اپنے اتحاد ایمان کو پھر مستحکم کرلیں گے۔ زیرک وکلاء ہماری غلط کاریوں کی تاریخ کو نا خواندہ اقوام کے قوی حافظہ میں منقش کردیں گے۔ بغاوت اور مذہبی جنون کے ان مبلغین میں ہر نسل ہر معاشرتی طبقہ کے لوگ شامل ہیں۔ مہذب اور تعلیم یافتہ اشخاص فقیروں اور آوارہ گردوں کے بھیس میں خبروں کو تیزی سے پہونچانے اور سخت عوض لینے کو تیار کرنے کے لیئے پھرتے ہیں۵۔"

ترکی میں واقعات بالکل اوسی طرح رونما ہوئے جیسے کہ نیٹی وزیر اعظم اطالیہ نے پیشگوئی کی تھی۔ اتحادی مالکان قسطنطنیہ نے سلطان کو ایک "خیر طلب" وزارت مقرر کرنے پر مجبور کیا۔ اس وزارت نے مصطفےٰ کمال اور اُن کے رفقاء کو برملا "باغی" قرار دیا اور اپنے انتخاب سے ایک وفد فرانس کو بمقام سیورے بھیجا۔ اُنھوں نے نہایت اطاعت شعاری سے اتحادیوں کے تیار کردہ عہدنامہ کی "نقطہ دار لکیر" پر دستخط کردیئے۔ اس طور پر اتحادیوں نے اپنا منشاء پورا کرالیا "مگر کاغذ ہی پر"، کیونکہ ہر سمجھدار شخص یہ جانتا تھا کہ کل کارروائی شدت سے مضحکہ انگیز تھی۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ یہ "خیر اندیش" حکومت سلطان سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے محرر تک ایسے ہی قوم پرست تھے جیسے کہ مصطفےٰ کمال پاشا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ اصل ترکی دارالسلطنت قسطنطنیہ نہیں ہے بلکہ انگورہ ہے اور اتحادیوں کی قوت کا اندازہ اُن کی توپوں کی زد سے ہے۔ رہا مصطفےٰ کمال پاشا کی بابت اور ان سے عہدنامہ سیورے کی بابت یہ کہا "میں دنیا کے

---

۵ بی۔جی۔ گولیس کا مضمون جو ۲۴ر اپریل سنہ ۱۹۲۰ء لوپنیاں میں شایع ہوا۔ مصنف

گورو نے یہ اعلان کیا کہ "ایک فرانسیسی یا ایک عیسائی کے قتل پر" ہوائی جہازوں سے بم کے گولے گرا کے "نہایت سخت عام بدلہ لیا جاوے گا"[1]

اس نپولینی "برق صاعقہ" کے سامنے اوس وقت تو بظاہر خوفزدہ ہو کر شام نے سر تسلیم خم کر دیا۔ عراق میں انگریز ایسے خوش قسمت نہ ثابت ہوئے چند ماہ سے جو مصائب کا طوفان کھلم کھلا جمع ہو رہا تھا اور مارچ میں برطانوی کمانڈر نے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا کہ "وہ میں ملک کی آتش فشاں امکانات سے بہت متحیر ہوں" جولائی میں کل جزیرۃ العرب میں آتش بغاوت بھڑک اٹھی اور اگرچہ ایک لاکھ برطانوی فوج موجود تھی لیکن اون کو بغاوت کے فرو کرنے میں بہت مشکل پیش آئی۔

اسی اثنا میں اتحادیوں نے عہد نامہ صلح کے مسودہ کو منظور کرانے کے لیے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ چونکہ قسطنطنیہ بالکل اتحادی بیڑوں کی زد میں تھا لہٰذا قدرتی طور پر کوئی مقابلہ نہ ہوا۔ افواج کی آمد پر تماشائیوں کے ہجوم کی خاموشی دیکھ کر بعض مبصرین میں اضطراب پیدا ہوا۔ ایک فرانسیسی اخبار نویس نے لکھا "مجمع کی خاموشی بلند احتجاجات سے زیادہ اثر آفریں تھی۔ اُن کی آنکھوں سے غضبناک نفرت کے شعلے نکل رہے تھے۔ اس خاموش۔ پامال شدہ اور مایوس قوم کے مجمع میں ہوشیار اور چالاک جاسوس گھوم رہے تھے جو اس درد بھرے قصے کو اسلام کے دور و دراز حصص میں سنائیں گے۔ چند گھنٹوں میں وہ اناطولیہ پہونچ جائیں گے اور دو دن بعد یہ خبر قونیہ۔ انگورہ اور سیواس میں پھیل جائے گی۔ تھوڑے عرصہ بعد یہ خبر بالشیویکوں کے زیر اثر ممالک میں جو قفقاز تک اور اوس کے پرے ہیں

---

[1] فرانسیسی جبر و تشدد کے حالات کے لیے ملاحظہ ہوں مذکورۂ بالا مضامین مصنف

اتحادیوں نے تین سال ہوئے معزول کیا تھا پھر بلا یا۔ اس کا منشاء یہ تھا کہ اطالیہ کی طرح یونان بھی الگ ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ شاہ قسطنطین نے ترکوں سے مخالفت فوراً بطور خود شروع کر دی لیکن یہ کارروائی ونیزیلاس کی حکومت کے طرز عمل سے جداگانہ تھی۔ اسی طرح اتحادیوں کا ہتھیار اُن کے ہی ہاتھ میں ٹوٹ گیا۔

اس عرصہ میں مصطفےٰ کمال اپنی قوت نہ صرف ایشیائے کوچک ہی میں مستحکم کر رہے تھے بلکہ اپنے حلیف بھی پیدا کر رہے تھے۔ پہلی بات تو اُنھوں نے یہ کی کہ عربوں سے تعلقات اچھے کر لیے۔ بادی النظر میں ایسے سخت دشمنوں کا دوست ہو جانا تعجب انگیز معلوم ہوتا لیکن انگریزی اور فرانسیسی تدبر نے اس اعجاز کو بھی پورا کر دیا۔ کرنل لارنس نے جس کا حال ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اُسے عربی انقلاب کی روح رواں کا خطاب مل چکا تھا ان وجوہات کی تصریح کی ہے۔ یہ کرنل پھر غیر مصافی زندگی میں آگیا تھا لہذا وہ معاملات شرق پر آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کر سکتا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اُس نے اظہار رائے نہایت صفائی سے کیا۔ اس نے برطانوی اخبارات میں جتنے مضامین شایع کیے اُن میں سے ایک میں وہ لکھتا ہے "دوران جنگ میں عربوں نے ترکوں کے خلاف جو بغاوت کی اُس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ترکی حکومت میں کوئی خاص قابل ذکر خرابی تھی بلکہ محض اس لیے کہ عرب آزادی کے خواہاں تھے۔ اُنھوں نے میدان جنگ میں اپنی جانوں کو خطرہ میں اس لیے نہیں ڈالا تھا کہ وہ آقاؤں کا تبادلہ کریں اور بجائے ترکی رعایا ہونے کے انگریزی عایا یا فرانسیسی شہری بنیں بلکہ خود اپنی سلطنت قایم کرنا چاہتے تھے" ایک عرب قوم پرست لیڈر نے ایک فرانسیسی جمہوری اخبار کے صفحات میں جو شامی

سے کے خاتمہ تک لڑونگا"

اس طرح اتحادی فی الحقیقت نہایت مشکلات میں پھنسے تھے خاصکر اس وجہ سے کہ اب "اتحادیوں" سے صرف انگلستان اور فرانس مراد تھا۔ اطالیہ علحدہ ہو چکا تھا چنانچہ نیٹی نے سان ریمو میں جتا دیا تھا کہ "اطالیہ نہ ایک سپاہی دے گا اور نہ ایک پیسہ" دو لاکھ سپاہی تو محض عربوں کو روکے ہوئے تھے اور دیگر مقامات پر بھی بہت کچھ فتنے اُٹھ رہے تھے لہٰذا فرانس اور انگلستان کے پاس اتنی فوج نہ تھی کہ مصطفےٰ کمال کو شکست دیں۔ اس کام کے لیئے فرانسیسی اسٹاف نے تین لاکھ فوج کا تخمینہ کیا تھا۔ اب اُن کے پاس ایک ہی آلہ رہ گیا تھا اور وہ "یونان" تھا۔ چنانچہ یونان کے وزیر اعظم وینزیلاس نے یہ شرط پیش کی کہ اگر یونان کو کثیر رقبہ ملک دیا جاوے تو وہ ترکوں کی عقل ٹھیک کر دے گا۔ اوس کی شرط قبول کی گئی اور ایک لاکھ یونانی افواج سمرنا میں اُتریں۔ لیکن یونانی مہم کامیاب نہ ہوئی۔ ایک لاکھ فوج بھی ایشیائے کوچک کے وسیع حدود میں پھیل کر کم ثابت ہوئی۔ مصطفےٰ کمال نے فیصلہ کن جنگ سے احتراز کیا اور یونانی افواج کو چھوٹے دستوں کے حملوں سے ویسا ہی تنگ کرنا شروع کیا جیسا کہ وہ محاذ کے دوسرے کنارے پر سلیشیا میں فرانسیسیوں کو کر رہا تھا۔ یونانی فوج "خندقوں میں" پڑ رہی اور ایسا سکوت شروع ہوا جس کے غیر معین عرصہ تک رہنے کا خوف تھا۔ اس سے جدید پیچیدگی پیدا ہوئی۔ وینزیلاس تو اتحادیوں کے نائب حکم بردار کی حیثیت سے جنگ کو طول دینے پر راضی ہو سکتا تھا لیکن یونانی فوج راضی نہ تھی۔ چونکہ ۱۹۱۲ء سے فوج کو جنگی قوت پر رکھا گیا تھا۔ یونانیوں نے نافرمانی کی۔ نومبر کے انتخابات میں اُنھوں نے وینزیلاس کو ۹۰۰۰۰ سے بمقابلہ دس ہزار رائے کے خارج کر کے شاہ قسطنطین کو جس کو

حق کی تصدیق اس وقت کرو جبکہ وقت نکل جائے اور خون کی ندیاں بہہ جائیں"!

فی الواقع ترکی و عربی اشتراک عمل کے آثار ہر جگہ نمایاں ہو گئے یقینی امر یہ ہے کہ اس اتحاد عمل کو نہ تو مصطفےٰ کمال پاشا نے علانیہ تسلیم کیا اور نہ معزول شاہ فیصل نے جو اطالیہ کو فرار ہو کر اپنی سیاسی چالوں میں مشغول رہا لیکن یہ ناقابل انکار واقعات ہیں کہ سلیشیا میں فرانسیسیوں کے خلاف عرب ترکوں کے پہلو بہ پہلو لڑتے۔ ترک و کرد شامی عربوں کے متوالی فوجوں میں شریک حال ہے اور عراق میں برطانیہ کے خلاف جو لغاوت ہوئی اس میں کمال کا ہاتھ کھلا نظر آتا تھا۔

مصطفےٰ کمال کی بیرونی حکمت عملی کا کارنامہ اس عربی اسلافت پر ختم نہیں ہوتا وہ شمال و مشرق کی طرف ماورائے قفقاز کے تاتاریوں اور ایرانی آذربائیجان کے ترکمانوں کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ اس زمانہ میں قفقاز مسلمان تاتاریوں اور ترکمانوں اور عیسائی ارمینیوں اور گرجستانیوں اور مختلف روسی جماعتوں کے مابین نزاعات کا جولانگاہ بن گیا تھا۔ اور اس بدقسمت ملک میں نہایت تیزی سے بدنظمی پھیل رہی تھی۔ تاتاری ترکمانوں میں مصطفےٰ کمال کو بہت سرگرم مقلد ملگئے کیونکہ بین التورانی تبلیغ کا کافی اثر ہو چکا تھا۔ اُن کی مساعی کو امداد تیسرے حلیف یعنی بالشویک روس سے ملی۔ جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ بالشویک حکمت عملی یہ تھی کہ کل مشرق میں دول مغرب کے خلاف فتنہ انگیزی کی کوشش کی جاوے۔ بالشویک نے

لے اخبار کریسنٹ ۱۹۲۰ء (اعلان پالیمر) مصنف

مہم کے خلاف تھا نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔ یہ لیڈر کہتا ہے :-
"انگریزوں اور فرانسیسیوں دونوں کو بخوبی معلوم ہونا چاہیے کہ عرب مشترکہ مذہب کی وجہ سے ترکوں سے متحد ہیں اور سیاسی طور پر صدیوں سے ان کے شریک حال رہے ہیں۔ لہذا وہ اپنے برادران مذہب اور رفقاء مصائب سے علیحدگی اس لیے نہیں چاہتے ہیں کہ وہ کسی یوروپی قوم کے زیر اقتدار ہوں اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ ان کی حکمرانی کی کیا صورت ہوگی..... موسیو میلران کا یہ کہنا فضول ہے وہم کو ان اقوام کی آزادی پر مداخلت کرنیکا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ اس قسم کے بیانات سے کوئی فریب میں نہیں آسکتا۔ التوا رجنگ کے دستخط مسٹر ولسن کے اعلان کردہ شرائط پر ہوئے تھے لیکن جب جرمنی اور اوس کے حلیف لاچار ہوگئے تو التواء جنگ کے شرائط اور بیز چودہ امور پامال کر دیئے گئے کامل آزادی کے وعدے جو عربوں سے متعدد موقعوں پر بکثرت کیے گئے تھے انکی عہد شکنی کا یہ نتیجہ ہوا ہو کہ عرب اور ترک ہمیشہ سے زیادہ متحد ہوگئے ہیں۔ یہ اتحاد صرف چند ماہ میں قایم ہوگیا...... یہ اغلب ہے کہ فرانس ڈیڑھ لاکھ فوج رکھکر اور اربوں روپیہ خرچ کرکے شام کے عربوں کو محکوم بنالے گا لیکن اس سے کام ختم نہیں ہوتا۔ اس ملک کا اندرونی حصہ ایک وسیع ریگستان اور اون ممالک کی سرحد پر ہے جن میں عرب و کرد و ترک آباد ہیں۔ چالیس لاکھ شامیوں سے جنگ کرکے فرانس لیوانٹ کے ڈیڑھ کروڑ عربوں کو جن میں اکثر مسلح قبائل ہیں اپنا دشمن بنالے گا۔ اس تعداد میں وہ دیگر مسلمان اقوام شامل نہیں ہیں جو اتحادیوں کے خدمات کی بدولت نہایت تیزی سے استحکام اور تنظیم حاصل کر رہی ہیں۔ اگر تم کو یہ خیال ہے کہ میں مبالغہ سے کام لے رہا ہوں تو تم خود واقعات کی تحقیقات کرلو۔ لیکن اس سے کیا فائدہ ہوگا کہ

گرمیوں میں ایک بالشویکی فوج بحیرۂ خزر کو عبور کر کے ایرانی ساحل پر اُتر آئی (؟) یہ فوج اندرون ملک میں داخل نہ ہوئی۔ اس کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ ملک اس طرح مشتعل ہو گیا کہ انگریزوں کی حالت روز بروز ناقابل برداشت ہوتی گئی۔ چند مہینوں تک اضطرابی حالت رہی۔ فی الواقع اس تحریر کے وقت بھی مطلع غبار آلود ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایران میں برطانوی قبضہ نہایت متزلزل ہو گیا ہے اور بہت جلد باستثنار جنوبی حصے کے باقی ملک چھوڑنا پڑے گا[۱]۔

سنہ ۱۹۲۰ء کی موسم خزاں کی حالت دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرق ادنےٰ میں انگلستان اور فرانس کی حالت اچھی نہ تھی اطالیہ اور یونان نے ترک رفاقت کیا۔ ترک مقابلے کے لیے تیار تھے۔ عرب لوٹ مار کر رہے تھے۔ مصری اور ایرانی تنگ کر رہے تھے اور ہر جگہ بالشویک تخریبی کارروائیوں کا ڈر تھا۔ لہذا یہ حالت خوش کن نہ تھی سلطنت کا بار بہت گراں ثابت ہو رہا تھا۔ صرف عراق میں دس کروڑ پونڈ کا صرف تھا۔ اور

---

[۱] مصنف کی یہ پیشینگوئی بالکل صحیح ہوئی سلطنت برطانیہ کو قرضہ کا معاہدہ بھی منسوخ کرنا پڑا اور کل افواج بھی ایران سے ہٹانی پڑیں جس ایرانی جندرمہ کا برطانوی افیسروں نے دوران جنگ میں نظام قایم کیا تھا اُس سے بھی بیشتر برطانوی علیحدہ ہو گئے۔ افسوس ہے کہ ایرانی قوم کو برطانیہ سے ایسا اشتباہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ہر بات پر انگریزوں کے خلاف مظاہرہ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مجتہدین کا عراق سے اخراج ہوا اور ایران میں برطانیہ کے خلاف مظاہرے ہوئے ہیں۔

(مترجم)۔

کمال کے خروج کو بڑے اطمینان سے دیکھا تھا۔ ابتدا میں بالشیوک ترکی قوم پرستوں کو بہت کم مدد دے سکتے تھے کیونکہ اون کے درمیان کوئی براہ راست سلسلہ اتصال نہ تھا۔ لیکن نومبر ۱۹۲۰ء میں جب رینگل کی سفید فوج [1] تباہ ہوئی اور ازاں بعد کل جنوبی ایشیا پر سُرخ افواج نے تاخت کی تو اسکو سے براہ قفقاز انگورہ تک سیدھا راستہ کھُل گیا۔ اس وقت مصطفےٰ کمال کو روپیہ۔ اسلحہ اور چند آدمی بھی دیئے گئے۔

مزید براں کمال اور بالشوک نے ایران میں فتنے شروع کر دیئے اس ملک کی حالت نہایت قابل افسوس ہے۔ دوران جنگ میں ایران باوجود اپنی اصطلاحی غیر جانبداری کے اچھا خاصہ میدان جنگ بن گیا تھا جس میں ایک فریق انگریز و روس اور دوسرا فریق ترک و جرمن تھے ۱۹۱۸ء میں روس کی تباہی کی وجہ سے روسی افواج ایران سے واپس بلائی گئیں انگلستان نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر اور اپنے تفوق کا سکہ جما کر اگست ۱۹۱۹ء میں شاہ کی حکومت سے مشہور معاہدہ "کا تصفیہ" کرکے اپنی حیثیت کو جا نبر بنا لیا۔ اس عہدنامہ پر اگرچہ اس کی تکمیل جائز طور پر ہوئی تھی ایرانی قوم نے نہایت اظہار غم و غصہ کیا۔ بالشیوک تبلیغ کو اچھا موقع مل گیا۔ لہذا بالشویک گورنمنٹ نے تمام اون حقوق کو جو زار کی حکومت نے ایران میں حاصل کیے تھے چھوڑ کر اپنے آپ کو مغربی شہنشاہیت کے خلاف ایرانیوں کا دوست ظاہر کیا۔ قدرتی طور پر یہ چال کارگر ہوئی۔ اور ایران جنگجویانہ شورش میں مبتلا ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء کے شروع

---

[1] اِن واقعات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کا مضمون دربارہ ایران جو جنوری ۱۹۲۰ء کے اخبار دی سنچوری میں شایع ہوا۔ مصنف

اس اثناء میں فرانس کو اس وقت تک شام میں زبردست تدابیر سے نسبتاً امن قایم رکھنے میں کامیابی ہوئی تھی۔ لیکن یہ حالت بہت غیر مستقل ہے آبادی کے سب طبقے حتیٰ کہ کیتھولک مارونی فرقہ نے بھی جو قدیم سے فرانس کے ہوا خواہوں میں ہے شورش شروع کردی ہے۔ جنرل گورو نے لیڈروں کو کورسیکا بھیجکر شورش کو فوراً دبادیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ فرانس کے سچے دوست بھی شام میں غیر مطمئن ہیں۔ اب تک ان امور سے فرانس کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

بقیہ نوٹ صفحہ ما قبل:۔ برطانیہ کے درمیان ۱۰ ر اکتوبر ۱۹۲۲ء کو ایک معاہدہ ہوا۔ شرائط حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اس معاہدہ کی مدت نفاذ ۲۰ سال ہوگی۔

(۲) شاہ عراق اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ مدت نفاذ معاہدہ ہذا میں تمام اُن اہم مسایل میں جن کا تعلق فوجی اور مالی ذمہ داریوں یا برطانوی مفاد سے ہوگا انگریزی کمشنر اعلیٰ کے مشورہ پر عمل کریں گے۔

(۳) برطانیہ وعدہ کرتا ہے کہ جونہی حدود عراق کا تصفیہ ہوکر ملک میں مستقل حکومت قایم ہو جائے گی وہ عراق کو مجلس اقوام میں شریک کیے جانے کے لیے اپنی خدمات سے حسب قرارداد عہد نامہ ہذا کام دے گا بشرطیکہ شرائط معاہدہ پر عملدرآمد ہوتا رہے۔

(۴) برطانیہ امیر فیصل کی مسلح افواج سے مدد کرے گا۔ اگر ضرورت پڑی اور فریقین میں معاہدہ ہوگیا تو عراق کی مالی امداد بھی کرے گا۔

(۵) حکومت عراق اس مالی قرضہ کو رفتہ رفتہ ادا کرسکیں گے۔

(۶) مسیحی مبلغین کے کاروبار میں عراق کے اندر روڑے نہیں اٹکائے جائینگے۔

بعد میں اس مدت بیست سالی کو معاہدہ ترکی نے چار سال کی مدت کردی گئی ہے۔

(ماخوذ از ہمدم مورخہ ۱۰ ر اکتوبر و ۸ ر نومبر ۱۹۲۲ء) مترجم

نجات کی کوئی صورت نظر آتی تھی۔

ان حالات کو دیکھ کر تعجب انگیز نہیں معلوم ہوتا کہ انگلستان اور فرانس دونوں ملکوں میں مشرق ادنیٰ کی پالیسیوں پر سخت نکتہ چینی کی گئی۔ انگلستان میں بالخصوص یہ طوفان بہت شدید سے اُٹھا۔ عراق کی پیچیدگیوں کو جرم اور غلط کاری قرار دیا گیا۔ مثلاً کرنیل لارنس نے بیان کیا "ہم مصائب سے آج بھی دور نہیں ہیں۔ ہماری حکومت سابق ترکی نظام سے بھی بدتر ہے۔ وہ مقامی جبریہ بھرتی کے چودہ ہزار سپاہی رکھتے تھے اور قیام امن کے لیے اوسطاً دو سو عربوں کو قتل کرتے تھے۔ ہم نوے ہزار فوج مع ہوائی جہازوں مسلح گاڑیوں گن بوٹوں اور مسلح ریل گاڑیوں کے رکھتے ہیں۔ اس موسم گرما میں ہم نے تقریباً دس ہزار عرب مارے[1]"۔ ان نکتہ چینیوں اور واقعات کی عام روش سے متاثر ہو کر برٹش گورنمنٹ نے اپنے طرز عمل کو بدلا اور سرپرسی کاکس کو عربوں سے معاملہ طے کرنے کے لیے بھیجا۔ سرپرسی کاکس ملنر کی قسم کے تھے اور حقائق سے خوب واقف تھے اور مشرقی معاملات کا کافی تجربہ رکھتے تھے۔ چونکہ ان کو بڑی مراعات پر بحث کرنے کا اختیار مل گیا تھا لہذا انھوں نے قوم پرست لیڈروں سے آزادی کے ساتھ ملاقات کی اور اچھا اثر ڈالا۔ اس تحریر کے وقت تک معاملات پوری طور پر طے نہیں ہوئے ہیں لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان یہ تجویز کرتا ہے کہ براہ راست تسلط کو عراق کے انتہائی جنوب میں خلیج فارس کے کنارے تک محدود کرے اور یہی ۱۹۱۴ء سے قبل کا قدیم حلقۂ اثر ہے[2]۔

---

[1] یہ بیان اخبارات میں اگست ۱۹۲۰ء میں شایع ہوا۔ مصنّف

[2] سرپرسی کاکس کے مساعی کا یہ نتیجہ ہوا کہ امیر فیصل جو عراق کے شاہ بنائے گئے تھے اُن کے اور

بلاشبہ حکومت فرانس نے جو عربوں کے لیے اس وقت تک ایسی سخت ہے ترکوں کے حق میں اپنے طرز عمل کو بدل دیا ہے۔ معاہدہ سیورے سے علحدہ ہو کر اس نے عارضی طور پر ترکی قوم پرستوں سے شرائط صلح طے کر لیے اور سلیشیا[1] کو خالی کر دینے کا در اصل اقرار کر لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فرانس اور انگلستان دونوں یہ جانتے ہیں کہ معاہدہ سیورے نا قابل عمل ہے اور کل ایشیائے کوچک کو ترکی مقبوضہ تسلیم کرنا پڑے گا۔

مصطفےٰ کمال پاشا سے گفت و شنید کرنے میں فرانس کو یہ امید ہے کہ وہ عربوں کا ساتھ چھوڑنے پر راضی ہو جائیں گے۔ لیکن یہ بات قیاس میں نہیں آتی۔ واقعات کی رفتار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی سیاسی تسلط کے خلاف مشرق ادنیٰ کی اقوام کا اتحاد روز بروز بڑھتا جائے گا۔ اس کی سب سے معروف علامت وہ اتحاد بین الاسلامی کانفرنس ہے جو ۱۹۲۱ء کے شروع میں بمقام سیورس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس نے یہ مطالبہ کیا کہ ایک مقررہ اسکیم اس غرض کے لیے تیار کی جا دے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں انتہا پر اشتراک عمل پیدا ہو جائے اور اس میں صرف راسخ الاعتقاد مسلمان علماء ہی شریک نہ ہوئے بلکہ مختلف العقائد شیوخ بھی تھے۔ مثلاً کربلا کا شیعہ امیر۔ امام یحییٰ۔ اور فرقہ زیدی کا امیر یمن۔ یہ لوگ اور ان مختلف العقائد فرقوں کے سردار ہیں جن کی اور راسخ الاعتقاد سُنیوں کے درمیان ... سے پہلے اشتراک عمل نا ممکن تھا سب سے زیادہ تعجب انگیز یہ امر ہے کہ خبار کی یہ رپورٹ ہے کہ اس کانفرنس کا صدر سنوسی جیسی عظیم ہستی تھی جس

---

[1] چنانچہ سلیشیا ترکی قبضہ میں آگیا اور فرانس نے اپنا قبضہ ہٹا لیا۔

کچھ عرصہ ہوا کہ سابق وزیر اعظم موسیو ہیٹری نے شام کے متعلق کہا "فرانس کل شام پر قابض رہے گا اور ہمیشہ رہے گا" ابھی حال میں جنرل گورو نے کہا "فرانس کو سیاسی اور اقتصادی وجوہات سے شام میں رہنا لازمی ہے اگر ہم اس ملک کو چھوڑ دیں تو سیاسی نتائج بہت ہولناک ہونگے۔ لیوانٹ اور بحیرۂ روم میں ہمارا اقتدار اور اثر غارت ہو جائے گا۔ فرانس کے اقتصادی مفاد ہم کو شام میں رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ شام اور سلیشیا پوری ترقی کرنے کے بعد اقتصادی حیثیت سے مصر کی برابر گرانقدر ہونگی۔

لیکن فرانسیسی حکومت کے استقلال کے باوجود "شام کی مہم" پر عام نکتہ چینیاں بڑھ رہی ہیں۔ یہ نکتہ چینیاں شہنشاہیت کے مخالف آزاد خیال ہی تنہا نہیں کر رہے ہیں بلکہ مسلمہ قدامت پسند حلقہ جات سے بھی ہو رہی ہیں۔ چنانچہ ایک قدامت پسند فرانسیسی سیاسی رسالہ کے ایڈیٹر نے بیان کیا ہو "عرب قوم اپنی خود مختاری کی حفاظت کے لیے فکر مند ہیں۔ اور وہ یہ نہیں چاہتے کہ عثمانی جوئے سے خلاصی پانے کے بعد ایک جدید ملک غیر کے زیر اقتدار ہیں۔ یہ کہنا کہ شام ہماری حفاظت کا طالب ہے۔ بالکل جھوٹ ہے۔ شام بالکل آزاد ہونا چاہیئے[1]" حال میں سینیٹر وکٹر برارڈ نے جو مشرقی معاملات کا مسلمہ فرانسیسی ماہر ہے سینیٹ میں ایک تقریر کی جس میں اُس نے گورنمنٹ کی شامی پالیسی پر شروع ہی سے نکتہ چینی کی۔ اور کہا کہ "آزاد شام مفاد اور عزت کا مسئلہ ہے۔"

---

[1] ہنری دی مشابون جو لا ریولو پارلیمنٹیر کا ایڈیٹر ہے۔ اس کو بکلیں ولسن نے اپنے مضمون "ہماری جیرعۂ انگیز شامی مہم" میں نقل کیا ہو جو ستمبر ۱۹۲۰ء کے نیشنل ریویو میں شایع ہوا۔ مصنف

کے ارکان ہیں جن کی بدولت سلطنت برطانیہ اون خطرات سے صاف نکل گئی جو مایوس کن معلوم ہوتے تھے۔

برخلاف اِس کے مشرق ادنے میں بدترین علامت فرانس کی مسلسل سیاسی غلط کاریاں ہیں۔ اپنی قدیم روایات میں مستغرق ہو کر فرانس کی حکمت عملی حقایق کا سامنا کرنے سے انکار کرتی ہے۔ اگر کوئی طوفان اوٹھے جس کا اوٹھنا لازمی ہے تاوقتیکہ فرانس اپنی روش نہ بدلے۔ اگر کسی مصیبت کے دن تیس یا چالیس فرانسیسی بٹالین عربوں کے غصہ کی بادسموم میں جو ریگستان سے آرہی ہو پھنس جائیں اور ایک جدید عدوا[5] میں نیست و نابود ہو جائیں تو مشرقی مسایل کے اکثر ماہرین کا یہ

بقیہ نوٹ صفحہ ماقبل پھر ۱۸۳۳ء میں ارل بنایا گیا۔ ۱۸۳۸ء میں کناڈا کا گورنر جنرل ہو کر گیا اور بوجہ مخالفت دسمبر میں واپس آیا۔ واپسی پر برطانوی شمالی امریکہ کے حالات پر مفصل رپورٹ لکھی جو حکومت مستعمرات کا سنگ بنیاد ہوئی اور بالآخر اسی بنیاد پر حکومت انتظامی و اضعان قانون کے ماتحت ہوئے۔ مترجم

[5] عدوا۔ ملک حبش کے صوبہ تیگرے کا خاص شہر ہے۔ مارچ ۱۸۹۶ء میں اس مقام پر اطالوی فوج نے جس کی تعداد تیس ہزار تھی ملک شاہ حبشہ پر حملہ کیا اور شکست فاش اٹھائی۔ تین ہزار مقتول اور دو ہزار زخمی میدان میں چھوڑے۔ شاہ حبشہ کے نقصانات تین ہزار بتائے گئے تھے اس فتح سے دول یورپ کو شاہ حبشہ کی طرف توجہ ہوئی اور متعدد سفارتیں مختلف ممالک سے آئیں۔ عدوا کی آبادی تقریباً تین ہزار ہے۔

(مصنف)

ممکن ہے کہ ایسا ہوا ہو کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سنوسی کس طریقہ سے
مغربی اقتدار کے خلاف کل اسلام کے اتحاد کلی کے کوشاں
رہے ہیں۔

یہ ہے حالت مشرق ادنےٰ کی۔ یہ حالت بہت سخت
اور پُر از مصائب ہے۔ سب سے زیادہ امید افزا علامت یہ ہے کہ
سلطنت برطانیہ موجودہ روز افزوں خطرات سے بظاہر بیدار ہو کر اپنی
روش میں ترمیم کر رہی ہے۔ لارڈ ملنر اور سر پرسی کاکس جیسے اشخاص
کے مساعی ہیں گو رانہ اثرات سے کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ پیدا
ہو جائیں لیکن کلیتاً بلا نتیجہ نہ ہونگی۔ ایسے آدمی چیتھم[1]
اور ڈرہم[2] کے سیاسی خیر زندہ ہیں۔ یہ ادن بڑی سیاسی روایات

---

[1] ولیم پٹ ارل آف چیتھم ۱۷۰۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۷۸ء میں مرا۔ اولاً فوج میں داخل ہوا۔ لیکن ۱۷۳۵ء میں پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہوا۔ دارالعوام میں والپول کی مخالفت کی۔ کچھ عرصہ تک آئرلینڈ کا نائب خزانچی اور زاں بعد پے ماسٹر جنرل رہا۔ ۱۷۵۶ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ اور پارلیمنٹ کا سرگروہ ہوگیا۔ ۱۷۶۶ء میں برخاستگی کے بعد پھر سردار حکومت مقرر ہوا۔ اس نے ہفت سالہ جنگ میں فریڈرک اعظم کی اعانت کی۔ اپنے مرنے سے قبل اوس نے گورنمنٹ کی سخت مخالفت امریکہ کے متعلق کی۔ امور خارجی میں اس نے برطانیہ کی عظمت کو پھر زندہ کر دیا اور دراصل یہی پہلا حامی شہنشاہیت ہے۔ مترجم

[2] جان جارج لیمٹن بعدہ ارل آف ڈرہم ۱۷۹۲ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۴۰ء میں مرا انگریز مدبر ہے۔ اولاً سخت آزاد خیال تھا ۱۸۳۰ء میں گرے کی وزارت میں لارڈ پرائیوی سیل مقرر ہوا۔ ریفارم بل میں بڑا حصہ لیا ۱۸۳۲ء میں روس گیا دوبارہ ۱۸۳۵ء میں گیا۔

فصل ششم

ہندوستان میں حمایت قومی

ہندوستان سرزمین عجایب ہے۔ باوجودیکہ جغرافی اعتبار سے سارا ملک ہند اصلاً ایک ہے لیکن اسے کبھی بھی حقیقی سیاسی اتحاد نصیب نہ ہوا۔ بجز اوس خارجی اتحاد کے جو حال میں برطانوی "راج" نے قایم کیا۔ باوجودیکہ ہندوستان بہت سی جنگجو قوموں کا مسکن ہے وہ اپنے حملہ آوروں کو روک نہ سکا۔ اس میں بہت سی نسلیں آباد ہیں لیکن یہ نسلیں اصلاً آپس میں کبھی جذب وضم نہ ہوئیں۔ بلکہ ہمیشہ ایک دوسرے کی دشمن اور خون وزبان وتمدن وعقائد کے امتیازات سے علحدہ علحدہ رہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ ہندوستان کی آبادی ووسعت چین یا یورپ کی برابر ہے اس میں نہ تو چین جیسی عام قومی یگانگت اور نہ یورپ جیسی خاص قومی تفریق قایم ہوسکی بلکہ وہ ڈانوا ڈول اور غیر متیقن رہا جس میں قومی یگانگت اور قومی تفریق دونوں رجحانات موجود ہیں لیکن یہ میلانات کبھی اپنے درجۂ تکمیل تک نہ پہونچے۔

ہندوستان کی تاریخ پر زیادہ ترتین بڑے حملوں کا اثر پڑا۔ اوّل آریوں کا حملہ جو سنہ ۱۵۰۰ ق م سے شروع ہوا۔ دویم مسلمانوں کا حملہ جو سنہ ۱۰۰۰ء لغایتہ سنہ ۱۷۰۰ء تک ہوا۔ اور تیسرا انگریزوں کا حملہ جو سنہ ۱۷۵۰ء سے شروع ہوکر ایک صدی بعد کامل

افسوس ناک فتوے ہوگا کہ فرانس کی حکمت عملی اسی کی مستحق تھی"۔

مشرق ادنیٰ کے مسئلہ کو اس نازک موقع پر مستقبل کے غیر معلوم حل کے لیے چھوڑ کر ہم کو مشرق وسطےٰ کے بڑے سیاسی مسئلہ یعنی ہندوستان میں قوم پرستی کی تحریک کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

بنائے کہنہ بر انگندہ شد دورِ دگر آمد

حیات تازہ می بارد بر آثارِ خرابی ہا

زیادہ ذلیل ہوکر پھڑیہ" یعنی کو ذات ہو جاتا تھا جس سے نہایت ذلیل اور ناپسندیدہ کام لیئے جاتے تھے۔ اور جسے ایسا حق بھی نہ رہتا تھا جن کا احترام شودروں تک پر واجب تھا۔ اس طور پر ہندوستان کی معاشرت ملکی قانون کے تابع نہ تھی بلکہ اوس پر کمی مذہبی قانون حاوی تھا۔ برعکس اس کے ہندوستان کے نوزائیدہ مذاہب (مذہب براہمہ) نے اخلاقی کے بجائے معاشرتی خصایص اختیار کیے۔

ان امور سے نہایت اہم نتیجے پیدا ہوئے۔ ذات کا عمل باعتبار "امتیاز رنگ" نہایت نامکمل رہا۔ باوجود ان موانع کے برہمنوں میں بھی کم وبیش دراوڑی خون مخلوط ہو گیا۔[1] لیکن معاشرتی نظام کی حیثیت سے ذات اپنے مخصوص طریقوں پر عمل کرتی رہی۔ اصلی تین ذاتیں رفتہ رفتہ تقسیم ہوکر سیکڑوں کیا ہزاروں قسم کی ماتحت ذاتوں میں منقسم ہو گئیں۔ ان ماتحت ذاتوں میں اصل النسل کی اہمیت بالکل باقی نہ رہی اور یہ بھی ایسی ہی منفرد رہیں جیسی کہ ابتدائی تین ذاتیں تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی جماعت پارہ پارہ ہوکر غیر مبدل معاشرتی افراد کی ٹولیوں میں منقسم ہو گئی جن میں اشتراک عمل حتے کہ مفاہمت بھی ناممکن ہو گئی۔ تاریخ ہند پر اس کا جو اثر پڑا وہ ظاہر ہے۔ ایک بطالوی کہتا ہے "انسانی اقسام کی اس مستقل قیام کا اثر یہ ہے کہ آبادی انتہا درجہ کی مختلف الاقسام ہے یہ امیر وغریب، شہری و دیہاتی یا مخدوم وخادم کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ اختلافات اس سے

---

[1] بعض مورخین کی رائے ہے کہ یہ اختلاط نسل تقریباً فوراً ہی ہو گیا۔ نظریہ یہ ہے کہ آریہ فاتحین جو شمالی ومغربی ممالک کے باہر سے تھے اُن کے ساتھ اُن کی ہم قوم عورتیں بہت کم تھیں لہذا انھوں نے دراوڑی نسل کی عورتوں سے شادی کی یا اُن کو بطور آشنا رکھا اور اپنی مخلوط النسل اولاد کو جائز قرار دیا۔ فاتحین کی اولاد خواہ خالص نسل کی ہوں یا مخلوط النسل کسی خاص ذات میں مل گئیں اس طور پر مزید دراوڑی خون کا اختلاط بند ہو گیا لیکن آریوں کی نسلی برتری کا خاتمہ ہو گیا۔ مصنف

فتح پر منتج ہوا۔ اور اس وقت تک قایم ہے۔

آریہ گورے رنگ کے ہیں اور مسلمہ طور پر اسی نسل سے ہیں جس سے کہ ہم خود ہیں۔ آریہ وسط ایشیا سے شمال و مغرب کے ان دروں کے راستے آئے کیونکہ ہندوستان کو ان دروں سے ہی خشکی کا راستہ ہے۔ دیگر مقامات پر ہمالیہ کی دیوار مستحکم طور پر حفاظت کرتی ہے۔ آریوں نے کالے رنگ کے دراوڑی نسل کے اصلی باشندوں کو فتح کر کے مالکوں کی حیثیت سے یہاں قیام کیا۔ لیکن یہ فتح ظاہری اور غیر مکمل تھی۔ آریوں کا بڑا حصہ شمال و مغرب میں ہی رہ گیا۔ البتہ زیادہ بہادر اشخاص اس بڑے جزیرہ نما کے باقی حصے میں جابجا منتشر ہو گئے۔ شمال میں بھی کوہستانی اور جنگل کے بڑے قطعات اصلی باشندوں کے تنہا قبضے میں رہے۔ جنوبی حصے میں تو بہت کم آریہ نسل کے اشخاص داخل ہوئے۔ لہذا ہندوستان کے بڑے حصہ میں آریہ محض حکمران طبقہ تھے جو کثیر التعداد محکوم آبادی پر مسلط ہو گئے۔ دراوڑی قوم کے سمندر میں معدوم ہو جانے کے خوف سے آریوں نے اپنی سیاسی فوقیت اور اپنی نسلی نسب لوئی قایم رکھنے کے لیے "ذاتیں" قایم کیں۔ جو اس وقت سے اب تک ہندوستان کی معاشرتی زندگی کی بنیاد ہے۔ ابتدا میں ذات محض "رنگ کے امتیاز" پر مبنی تھی لیکن اس کا نفاذ کسی قانون کی رو سے اس قدر نہیں ہوا جیسا کہ مذہب کے ذریعہ سے۔ جماعت ذاتوں میں منقسم تھی برہمن یعنی پوجاری۔ چھتری یعنی جنگجو۔ اور شودر یعنی مزدور پیشہ۔ آریوں نے پہلے دو طبقوں کو اپنے لیے مختص کر لیا۔ اور دراوڑی محکوم آبادی شودر ہوئی۔ یہ ذاتیں سخت مذہبی امتناعات سے منفصل رہیں۔ باہمی ازدواج اور خورد و نوش حتے کہ جسمانی قربت سے بھی ایسی نجاست پیدا ہوتی تھی جو بعض وقت رفع نہ ہو سکتی تھی! ان امتناعات کی خلاف ورزی کی سزا "ذات سے نکالنے کی" سخت تعزیر تھی جس کی رو سے ملزم نہ صرف ذات کے مقدس نظام میں ادنے درجہ میں گر جاتا تھا بلکہ شودروں سے بھی

ل گیا۔ اور بعد کے مسلمان سرداروں نے مشرق کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ یہانتک کہ شمالی ہند کا بڑا حصہ مسلمانوں کی حکومت میں آگیا۔ ان فاتحین کو دو نمایاں تفوق حاصل تھے۔ یہ ذلیل بت پرستوں کے خلاف مذہبًا متحد تھے اور انھوں نے بہت سے اہل ملک کو مسلمان بنالیا تھا۔ چونکہ اسلام مذہب براہمہ کے بالکل ہی متضاد تھا۔ اور اس میں فضلی مومنت اخوۃ کا اصول موجود تھا لہذا اون بہت سے نیچ ذات اور کو ذات اشخاص کے قلوب اس کی طرف لازمی طور پر مایل ہوئے جو اس تبدیل مذہب کی وجہ سے فاتح کی حیثیت حاصل کر سکتے تھے۔ آج ہندوستان میں مسلمانوں کی ۷ کروڑ یعنی آبادی کے پانچویں حصہ سے زیادہ مردم شماری ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے۔ یہ ہندوستانی مسلمان صرف افغان، ترک، عرب اور ایرانی حملہ آوروں کی اولاد نہیں ہیں بلکہ اُن لاکھوں ہندوؤں کی بھی اولاد ہیں جنھوں نے مذہب اسلام قبول کیا۔

عرصۂ دراز تک مسلمانوں کا ہندوستان پر تسلط صرف شمال ہی تک محدود تھا۔ زاں بعد سولھویں صدی کے آغاز میں بڑے ترکی مغل سردار بابر نے ہندوستان میں داخل ہو کر "سلطنت مغلیہ" کی بنیاد ڈالی۔ بابر اور اس کے جانشینوں نے جنوب میں بھی حملے کیے اور کل ہندوستان کو سیاسی طور پر ایسا متحد کر دیا کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ لیکن یہ فتح بھی سطحی تھی۔ برہمنوں نے اپنی تباہی کے خوف سے ہندو احیا کی تلقین کی۔ مغلیہ خاندان کمزور ہو گیا۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز میں مغلیہ سلطنت تباہ ہو گئی اور ہندوستان جنگجو ریاستوں کا میدان مصاف بن گیا۔ اور مسلمان و ہنود مذہب یا سیاسیات یا محض غارت گری کے لیئے باہم دگر لڑنے لگے۔

اس بدنظمی کے دور میں دولت انگلشیہ با اقتدار ہو گئی۔ شروع میں انگریز بھی اُن دیگر یورپی یعنی پرتگالی ڈچ اور فرانسیسی اقوام کی طرح تھے۔ جنھوں نے ساحل ہند پر چھوٹی چھوٹی آبادیاں قایم کی تھیں۔ جب تک مغلیہ سلطنت قایم رہی یورپینوں کو مجتمع

زیادہ گہرے ہیں۔ ایک ضلع یا قصبہ کی آبادی مختلف اقوام بلکہ مختلف انواع کا مجمع ہے جو ایک دوسرے سے نہ شادی بیاہ کرتے ہیں نہ خورد و نوش رکھتے ہیں۔ اور جو زندگی کے اہم تر معاملات میں اپنی جماعتوں کے تابع فرمان ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ذات کے تفرقے سے ہندوستان کے باشندے دو ہزار سے زیادہ انواع میں منقسم ہیں۔ جن کی زندگی کے اندرونی جسمانی ربط میں اسی قدر کم اشتراک ہے جتنا کہ چڑیا خانوں کے جانوروں میں۔[1]"

ظاہر ہے کہ ایک ایسا ملک جو معاشرت میں ایسا منفرد اور سیاسی طور پر متعدد ریاستوں میں منقسم ہو اس کو پہلے طاقتور حملہ آور کے سامنے مغلوب ہونا لازمی تھا۔ یہ حملہ آور اسلام تھا۔ مسلمانوں نے فتح ایران ہی کے بعد فوراً ہندوستان پر حملہ کیا لیکن ابتدائی حملے محض سرحدی تاخت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اُن میں کوئی دیرپا اہمیت نہ تھی۔ پہلا اصلی اسلامی حملہ محمود غزنوی سلطان افغانستان نے ۱۰۰۱ء میں کیا۔ محمود نے اسی راستے آکر جس سے قرنوں پہلے آریہ آئے تھے ہندوستان کے شمالی و مغربی حصہ کو جو پنجاب کہلاتا ہے فتح کیا۔ اس طرح اسلام کو ہندوستان میں مستحکم مستقر

---

[1] سر بمفیلڈ فلر کی کتاب "ہندوستانی زندگی اور حیات کا مطالعہ"، صفحہ ۳۰ مطبوعہ لندن ۱۹۱۰ء۔ ذات اور اس کے اثرات کی تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو ڈبلیو۔ ایس۔ آرچر کی کتاب "ہندوستان اور اس کا مستقبل" مطبوعہ لندن ۱۹۱۸ء۔ سر ویلنٹائن چرول کی کتاب "ہندوستانی شورش" مطبوعہ لندن ۱۹۱۰ء۔ ریورینڈ جے مابیسن کی کتاب "ہندوستان میں جدید خیالات یعنی معاشرتی، سیاسی، مذہبی ترقیوں کا تبصرہ" مطبوعہ ایڈنبرا ۱۹۱۰ء۔ سر ایچ رزلے کی کتاب "ہندوستان کی رعایا" مطبوعہ لندن ۱۹۰۸ء۔ نیز ملاحظہ ہو ڈاکٹر نائر سر گروہ مدراس کی تحریرات۔ اور ایس نہال سنگھ کا مضمون "ہندوستان کے اچھوت" جو مارچ ۱۹۱۳ء کے کنٹمپریری ریویو میں شائع ہوا۔ مصنف۔

کرتی تھی۔ یہ مختصر جماعت ملک کے کثیر التعداد رعایا پر حکمران ہوئی۔ یہ کھلی ہوئی "مائی باپ" حکومت تھی جو اپنی مرضی کے مطابق انتظام کرتی تھی۔ اور اپنے پیش رو مطلق العنان ایسی حکومتوں سے زیادہ رعایا کو جوابدہ نہ تھی لیکن یہ حکومت اچھی تھی۔ قابلیت، دیانت اور بجاآوری خدمات کے اعتبار سے گورنمنٹ ہند غالباً دنیا میں نیک نیت مطلق العنانی کی بہترین مثال ہے۔ اس نے ہندوستان میں کامل امن قایم کر دیا۔ اس نے کسی کی جانبداری نہ کی اور رقیب نسلوں، مذاہب اور ذاتوں میں توازن قایم رکھا۔ آخر بات یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کو حقیقی سیاسی ہستی بنا دیا۔ یہ وہ بات ہے جو ہندوستان کو پہلے کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ ہندوستان مستحکم طور پر ایک حکومت کے تحت میں متحد ہوا۔ اور یہ پُرامن برطانیہ کی حکومت تھی۔

لیکن انگریزوں کی خوبیوں نے ہی آئندہ کے فتنوں کا بیج بویا۔ ایسی نسلیں پیدا ہوئیں جو عدیم المثال طور پر ایک دوسرے سے واقف ہو کر امن وصلح کے ساتھ متحد ہوگئیں اور اپنی گزشتہ خرابیوں کو فراموش کرکے صرف یورپی لغزشوں کو دیکھنے لگیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ سیلف گورنمنٹ آزادی اور قومیت کے مغربی مفہوم کو سمجھنے لگیں مشرق کے دیگر حصص کی طرح ہندوستان میں بھی مغربی حکومت کے خلاف روز افزوں بے چینی کی تحریک کا ہونا ضروری تھا یہ نئی ایسی مختلف الحال تھی کہ بہ تفاوت حالات تدریجی خود مختاری کے معتدل مطالبات سے لیکر فوری آزادی کے انتہائی مطالبہ پر مشتمل تھی۔

انیسویں صدی کے ربع آخر تک برطانوی راج کے خلاف سیاسی شورش کا وجود نظم و انضباط کے ساتھ نہ تھا۔ جابجا ایک دو اشخاص نے دبی زبان سے احتجاجات کیے لیکن یہ صدائیں عوام میں مقبول نہ ہوئیں۔ ہندوستانی رعایا نے جو کسب معاش کی دائمی فکر میں مبتلا رہتی ہے ایسی گورنمنٹ کو نہایت خوشی سے منظور کر لیا جو اپنے

ہندوستان کا خیال بھی نہ آیا۔ فی الواقع ہندوستان سے برطانوی روابط خالص تجارتی کاروبار ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں شروع ہوئے لیکن جب ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیل گئی تو یورپیوں کو مجبوراً اپنے "کارخانوں" کی حفاظت کے لیے مقامی اختیارات حاصل کرنا پڑے۔ اور بعد میں چھوٹے حکمرانوں کی نااہلیت کی وجہ سے حریصانہ تجاویز کی رغبت ہوئی۔ انگریزوں نے اپنے یورپی رقیبوں کو بتدریج خارج کر کے ہندوستان میں مستحکم سیاسی بنیاد قائم کی۔ اس طوفان خیز طوائف الملوکی میں ایک ہی پائیدار عنصر تھا۔ وہ انگریز تھے۔ جنھوں نے لازمی طور پر اپنی حکومت کو وسعت دی۔ یہ عمل انھوں نے پہلے با دل ناخواستہ کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی عرصہ تک اصلاً تجارتی کاروبار رہی جس کا منشا رملک گیری کے مقابلہ میں تجارتی نفع اٹھانا تھا مگر بعد میں یہ ایک حقیقی حکومت کی صورت میں ترقی کر گئی اور اس نے بڑی حریصانہ الحاقی پالیسی اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے بہت سے ہندوستانی خائف ہونے لگے اور بالآخر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہو گیا۔ ہنگامہ فرو ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ٹوٹ گئی۔ ہندوستان براہ راست برطانوی راج کے ماتحت ہو گیا۔ اور بعد میں ملکہ وکٹوریہ کا خطاب قیصرۂ ہند اعلان کیا گیا۔ ان واقعات سے نہ صرف برطانوی سیاسی اقتدار کو استحکام ہوا بلکہ ہر قسم کے مغربی اثرات روز بروز سرایت کرنے لگے۔ ٹریکیں ریلیں اور نہریں جاری ہوئیں اور ان سے ہندوستان ایسا متحد ہوا کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ نہر سویز کی تعمیر نے یورپ سے آمد و رفت میں آسانی پیدا کر دی۔ اور یورپی طرز کی تعلیم نے مغربی خیالات کی اشاعت کی۔

اس سریع الانقلاب ہندوستان پر برطانوی راج قائم تھا۔ جو تاریخ عالم میں عدیم المثال طرز حکومت ہے۔ یہ صرف کئی سو ایسے نفوس کی حکومت تھی جنھیں امور انتظامی میں نہایت قابلیت و بصیرت تھی جن کی معاونت ایک چھوٹی سی پیشہ ور فوج

انیسویں صدی کے ختم پر ہندوستانی روشن خیال طبقہ ایسے سیاسی اختراعات کے لیے کھلم کھلا شورش کرنے لگا مثلاً مجلس مبعوثین، محصولات اور انتظامی معاملات پر مزید تسلط اور پبلک ملازمتوں کے انتہائی درجہ تک ہندوستانیوں کا داخلہ۔

جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں انیسویں صدی کے آخری سنین تک ہندوستانی بے چینی کم و بیش یورپی رنگ میں ڈوبے ہوئے روشن خیالوں کی جماعت قلیل تک محدود تھی۔ جو باوجود اپنے خود اختیار کردہ خطاب کے اس لفظ کے عام مفہوم کے مطابق مشکل سے قوم پرست کہی جا سکتی تھی۔ چند اشخاص کو چھوڑ کر ان کا نصب العین نہ کامل آزادی تھا اور نہ زبردست برطانوی نگرانی کا دور کرنا۔ بلکہ ہندوستانی زندگی کی مغربی طریق پر اصلاح کرنا تھا جس میں حکومت برطانیہ کی ماتحتی میں "سیلف گورنمنٹ" کا ترقی کن درجہ بھی شامل تھا۔

لیکن انیسویں صدی کے ختم پر اس حالت میں تبدیلی واقع ہوئی۔ دیگر بلاد مشرقی کی طرح ہندوستان میں بھی نسلی اور سیاسی خود شناسی کی جدید روح پیدا ہو رہی تھی۔ حقیقی قوم پرستوں کے آثار رونما ہونے لگے۔ ہندوستانی فضلاء نے اپنی گرد آلود تاریخوں اور مقدس کتابوں کا عمیق مطالعہ کر کے ہندوستان کی تاریخی ماضی کی عظمت کا اعلان کیا۔ آریہ سماج جیسے اصلاح شدہ ہندو فرقوں نے مذہبی اجازت عطا کی۔ متفرق روشن خیال جماعت قلیل میں دوسرے عناصر بھی شامل ہو گئے۔ جو مغربی نمونہ پر جزوی اصلاحات کو پیش نظر نہیں رکھتے تھے بلکہ ایک جدید ہندوستان کا منصوبہ باندھتے تھے جو خود اپنی قوت حیات سے جوان ہو کر اپنی قسمت کو اپنے طور پر پیدا کرنے کے لیے آزاد ہو۔ اب قوم پرستوں کی صفوف سے مبارز طلب صدا "بندے ماترم" (اے مادر زمین اٹھ) پیدا ہونے لگی۔[۱]

---

[۱] تحریکات قوم پرستی کے لیے ملاحظہ ہوں ارجرد چرول و ماریسن مذکور الصدر کی تصانیف۔

پیش روسے زیادہ مطلق العنان نہ تھی اور نہ بے حد اچھی تھی۔ خود شناس ہندوستانی حمایت قومی جیسی شے کا حقیقت کوئی وجود ہی نہ تھا۔

باقاعدہ شورش کی پہلی علامت ۱۸۸۵ء میں "انڈین نیشنل کانگریس" کی تنظیم تھی۔ اس کے نام ہی نے ظاہر کر دیا کہ برطانوی راج جو کل ہندوستان پر حاوی تھا خود ہی ہندوستان کے مختلف عناصر میں ایک خاص مشترک نقطۂ خیال اور تمنا پیدا کر رہا تھا۔ مگر ابتدائی کانگریس عام مفہوم اصطلاح کے مطابق ہندوستانی رائے عامہ کی نمائندگی کرنے سے بہت دور تھیں۔ برخلاف اس کے یہ جلسے اہل حرفہ، اخبار نویس، اور اہل سیاست کے چھوٹے طبقے کی نمائندگی کرتے تھے جو سب مغربی خیالات کے تعلیم یافتہ تھے۔ یورپی طریقۂ تعلیم نے جس کو برطانیہ نے جاری کیا تھا ایک ہندوستانی روشن خیال طبقہ پیدا کر دیا تھا جو انگریزی زبان سے واقف اور مغربی تہذیب میں خوب ڈوبا ہوا۔

یہ جدید روشن خیال طبقہ چونکہ مغربی مطامح نظر اور نتائج کی قدر و قیمت بخوبی سمجھتا تھا لہذا وہ ہندوستانی زندگی کی بعض صورتوں سے لازمی طور پر مطمئن نہ تھا۔ فی الواقع اس کے ابتدائی مساعی سیاسیات سے اس قدر تعلق نہ رکھتے تھے جیسا کہ معاشرتی اور اقتصادی اصلاحات سے مثلاً کم سنی کی شادیوں کا انسداد، عقد بیوگان اور اشاعت تعلیم۔ لیکن امتداد زمانہ کے ہم عنان سیاسی اصلاح کے معاملات بتدریج پیش پیش نظر آنے لگے۔ چونکہ یہ طبقہ انگریزی تاریخ اور سیاسی فلسفہ میں ڈوبا ہوا تھا ہندوستانی اہل بصیرت "سیلف گورنمنٹ" کے فقدان کلی کو روز بروز بہت زیادہ محسوس کرنے لگے اور یہ آرزو کرنے لگے کہ ہندوستان کو آزادی کی ان نعمتوں سے مالا مال کریں جو ان کے انگریز حکمرانوں کو نہایت عزیز ہیں بہت جلد زور دار دیسی مطمح پیدا ہو گیا جس نے نئی تلقین کر کے روشن خیالوں کو خود شناس اتحاد میں منسلک کرنا اور حقیقی رائے عامہ کا پیدا کرنا شروع کر دیا۔

اور اک کے بموجب صرف انگریز ہی نہ تھے بلکہ مسلمان بھی تھے۔ اس کے یہ معنی تھے کہ ماضی کو بڑی شد و مد سے زندہ کیا جائے صدیوں سے ہندو مسلمان کی بڑی تفریق ہندوستان بھر میں ایک غار کے طور پر رہی ہے۔ یہ غار کبھی نہیں پٹا۔ گو اس پر راج برطانیہ کی غیر جانبدار حکمرانی نے کچھ پردہ پڑ گیا تھا اب یہ پردہ بھی پارہ پارہ ہو گیا۔ اور مسلمانوں نے یہ دیکھا کہ ان کو اس قسم کے جنگجویانہ احیاء ہنود کا خوف درپیش ہے جس نے کہ دو سو سال پہلے شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کو پاش پاش کر دیا تھا۔ مسلمان صرف خوفزدہ ہی نہ ہوئے بلکہ اُن کی آتش غضب مشتعل ہو گئی جس طرح ہنود آریہ ورت ہندوستان کی عظمت کو یاد کرتے تھے مسلمانوں کو بھی سلطنت مغلیہ کی عظمت یاد آنے لگی۔ وہ اپنے کو ملک کا جائز مالک سمجھتے تھے۔ اور "ذلیل بت پرستوں" کا محکوم ہونا نہیں چاہتے تھے۔ مسلمانوں کو گورنمنٹ برطانیہ سے کوئی محبت نہ تھی لیکن ہندوؤں سے نفرت تھی۔ انھوں نے یہ دیکھا کہ ان کے موروثی دشمنوں کے قومی خطرہ کے مقابلہ میں جو کثرت تعداد میں ہیچ گو نہ تھے راج برطانیہ ہی ان کا حصن حصین ہے لہذا مسلمانوں نے ہندو قوم پرستی کو برا کہنا اور راج سے اعلان وفاداری شروع کیا۔ بلاشبہ ہندوستان کے مسلمان بھی اس شورش کے اس عام روح سے متاثر تھے جو مشرق میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بھی خود شناسی کے نو زائیدہ احساس کا ادراک کرتے تھے لیکن چونکہ ہندوستان میں وہ جماعت اقل تھے اُن کے خیالات قومی حب وطن کی صورت میں متشکل نہ ہوئے۔ بلکہ اتحاد بین الاسلامی

بقیہ نوٹ صفحہ ـ یعنی "عالمگیر نصب العین" مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۰۶ء۔ بپن چندر پال کا مضمون "ہندوستانی شورش کے اسباب" جو فروری سنہ ۱۹۱۰ء کے کنٹمپریری ریویو میں شائع ہوا۔ نیز لاجپت رائے کے مختلف مضامین بالخصوص "آریہ سماج" مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۵ء اور "نوجوان ہندوستان" مطبوعہ نیویارک سنہ ۱۹۱۶ء۔

اس ابتدائی ہندوستانی قوم پرستی کی نمایاں صورت یہ تھی کہ یہ اکل ہندو تحریک تھی۔ مسلمان اس کو شبہ اور مخالفت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کے اسباب بھی تھے۔ نئے قوم پرستوں کا نصب العین آریوں کا ہندوستان یعنی "عہد زریں" کا ہندوستان تھا۔ قوم پرستوں کی صدا ویدوں کی رجعت تھی اس میں ماضی کی حرمت اور جارحانہ مذہب براہمہ کی نشاۃ مضمر تھی۔ روشن خیال طبقہ میں غیر معمولی انقلاب پیدا ہوا۔ چند سال قبل جو لوگ مغربی خیالات کی فوقیت کا اعلان کرتے تھے اور بت پرستی جیسے "توہم" کا علانیہ مذاق بناتے تھے اب مغربی شئے کو برا کہنے لگے۔ اور ہندو دیوتاؤں کو نہایت عقیدت کے ساتھ بھینٹ چڑھانے لگے ہندوستان کی "مقدس زمین" اجانب سے پاک کرنا چاہیے ان اجانب میں قوم پرستوں کے

بقیہ نوٹ صفحہ ۔ نیز ایچ۔ سی۔ ایس کاٹن کی کتاب "ہندوستان حالت نقل و حرکت میں" مطبوعہ لندن ۱۹۱۱ء سے جے۔ این۔ فارکیوہر کی کتاب "ہندوستان میں جدید تحریکات مذہبی" مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۵ء۔ سرڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر کی کتاب "ملکہ کے عہد کا ہندوستان اور دیگر مضامین" مطبوعہ لندن ۱۹۰۳ء۔ ڈبلیو۔ ایس۔ للی کی کتاب "ہندوستان اور اس کے مسائل" مطبوعہ لندن ۱۹۰۲ء۔ سرورنی لویٹ کی کتاب "ہندوستانی تحریک قوم پرستی کی تاریخ" مطبوعہ لندن ۱۹۲۰ء سے۔ میکڈانلڈ کی کتاب "حکومت ہند" مطبوعہ لندن ۱۹۲۰ء سرتھیوڈور ماریسن کی کتاب "ہندوستان میں حکومت شہنشاہی" مطبوعہ لندن ۱۸۹۹ء سے جے۔ ڈی۔ ریس کی کتاب "اصل ہندوستان" مطبوعہ لندن ۱۹۰۸ء۔ سرجان اسٹریچی کی کتاب "ہندوستان۔ اس کی حکومت اور ترقی" چوتھی ایڈیشن مطبوعہ لندن ۱۹۱۱ء۔ کے۔ ریاس ماؤ کی کتاب "ہندوستان کی آئندہ حکومت" مطبوعہ لندن ۱۹۱۷ء۔

ملہ فصل سوم میں "عہد زریں" کے میلانات پر بحث ہو چکی ہے۔ ہندوستانی انتہا پسندوں کی نقطۂ نظر کے لیے ملاحظہ ہو اے۔ کمار سوامی کی کتاب "شیو جی کا رقص" مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۸ء۔ ایچ۔ متراکی کتاب "مذہب ہند"

اور مغربی تعلیم یافتہ روشن خیالوں کے درمیان ایک معاہدہ اتحاد ہوگئی۔ آخرالذکر فرقہ نے اپنے حوصلوں کو اس نظامِ عمل پر منحصر کردیا تھا کہ وہ بالاشتراک ہندوستان میں حکومت کرینگے۔

قوم پرستی کی تحریک میں اس رفیع تمنا سے سرعت اور مذہبی جوش سے اشتعال پیدا ہوکر بہت جلد حالت دیوانگی پیدا ہوگئی۔ جس کی خصوصیت ہر مغربی شے سے باطنی نفرت اور سب یورپیوں سے وحشیانہ عداوت تھی۔ جنگ روس و جاپان سے اس جذبہ کو سخت اشتعال پیدا ہوگیا۔ اور سال مابعد یعنی ۱۹۰۵ء ہی میں گورنمنٹ ہند کے ایک قانون سے اس طوفان محیط میں سرعت پیدا ہوگئی۔ یہ قانون مشہور "تقسیم بنگالہ تھا"، یہ تقسیم محض ایک انتظامی کارروائی تھی اور اس میں کوئی سیاسی غرض نہ تھی۔ لیکن قوم پرستوں نے اس کو ایک "امر اہم" بنادیا۔ اور اس شکایت کی بابت انھوں نے سخت تبلیغ شروع کردی جس سے ہندوستان میں بہت جلد مغویانہ بےچینی پھیل گئی۔ اس شورش کے روح رواں مسٹر بال گنگا دھر تلک تھے جن کو "ہندوستانی بےچینی کا باپ" کہا جاتا ہے۔ تلک نے قوم پرستی کی تحریک کو سانچے میں ڈھال دیا۔ وہ نہایت اچھے مغربی تعلیم یافتہ برہمن اور انگریزی حکومت اور مغربی تمدن کے جانی دشمن تھے۔ چونکہ وہ نہایت عمدہ مبلغ بھی تھے لہذا اُن کے لیکچروں سے سامعین کا جوش جنوں کے درجہ پر پہونچ جاتا تھا۔ اور اُن کا

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۔

بوبیلی کی کتاب "ہندوستانی امراء کو صلاح" مطبوعہ مدراس ۱۹۰۵ء۔ مسٹر ڈی بار اور سر ایف ینگ ہسبینڈ کے "سلطنت اور عیدیں" پر مضامین مطبوعہ لندن ۱۹۰۴ء مصنّف

اور بین الاسلامی قوم پرستی کے وسیع خیالات کی صورت میں ظاہر ہوئے جن پر ہم بحث کر چکے ہیں۔

ابتدائی ہندوستانی حمایت قومی محض ہندو خصائص کی نہ تھی بلکہ نمایاں طور پر برہمنی بھی تھی۔ روز بروز برہمن اس تحریک کے روح رواں بنتے گئے اور اس کے متلاشی تھے کہ مستقبل کے ہندوستان میں وہ اپنی فوقیت کو ایسا ہی اٹل کرا لیں جیسا کہ ماضی کے ہندوستان میں تھی لیکن اس سے ہندو جماعت کے بعض فرقوں میں خوف پیدا ہوا بست سے نیچ ذات اور پھر یا کو یہ ڈر ہوا کہ آزاد یا خود مختار ہندوستان میں بھی ظالم برہمنوں کی جماعت منتخب حکومت کرے گی۔ اور یہ جماعت اون کو اون فوائد سے بھی محروم کر دے گی جو حکومت برطانیہ کے تحت میں حاصل ہیں۔ اکثر ہندو راجاؤں نے مذہبی حکومت کے خیال کو ناپسند کیا۔ کیونکہ اس حکومت میں ان کی ہستی موہوم رہ جاتی۔ اس طور پر قوم پرستی کی تحریک بر خلاف

لہ ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے لیے جو زیادہ تر ہنود کے مخالف ہیں ملاحظہ ہوں ہز ہائی نس سر آغا خاں کی کتاب "ہندوستان تبدیلی کی حالت میں" مطبوعہ لندن ۱۹۱۸ء۔ صلاح الدین خدا بخش کے مضامین "ہندی و اسلامی" مطبوعہ لندن ۱۹۱۲ء، سر سید احمد خاں کی کتاب "ہندوستانی سیاسیات کی موجودہ حالت" مطبوعہ الہ آباد ۱۸۸۸ء، سید سردار علی خاں کی کتاب "ہندوستان میں شورش" مطبوعہ بمبئی ۱۹۰۸ء نیز ان کی کتاب "موجودہ ہندوستان" مطبوعہ بمبئی ۱۹۱۲ء مصنف

ﷺ "پست اقوام" کا طرز عمل بالخصوص اس کا اظہار جس طرح سے "نا سور جماعت" سے ہوا فصل سوئم میں بیان کیا جا چکا ہے اور آئندہ فصل میں بھی بعد کو بیان کیا جائے گا۔ مصنف

ﷺ دیسی والیان ریاست کے لیے ملاحظہ ہوں ارچرا و جرول کی تصانیف کردہ بالا نیز جے۔ پولن کا مضمون "دیسی ریاستیں اور ہوم رول" جو یکم جنوری ۱۹۱۸ء کو ایشیاٹک ریویو میں شائع ہوا تھا۔

معمور ہی۔ خونریزی کے سمندر میں مزید سرگرمی سے شناوری کرو!" خونریزی کا راگ بڑے زور سے الاپا گیا تھا۔ شیام کرشن ورما "انڈین سوشیالوجسٹ" میں کہتا ہی "سیاسی خونریزی قتل نہیں ہی اور جسمانی قوت کا استعمال اس حالت میں جائز سمجھا جائیگا جبکہ جارحانہ قوت کے مقابلہ میں مدافعانہ قوت استعمال ہو۔" یوگنتار نے لکھا "ہمیں چندے کی ضرورت ہی وہ صرف یہ ہی کہ ہر قاری ایک یورپی کا سر لائے"۔ اس خونی تبلیغ میں بچوں اور عورتوں تک پر بھی رحم نہ کھایا گیا۔ ایک انگریزی خاتون اور اس کی لڑکی کے قتل کا تذکرہ کرتے ہوئے "یوگنتار" نہایت مسرت سے چیخ اٹھا "رفتہ رفتہ بہت سی دیونیوں کو مارنا پڑیگا تاکہ اسوروں[1] کی نسل صفحہ زمین سے ختم کر دی جائے"۔ ان دیوانوں کے جنون کا اندازہ جو اس قتل و خون کے مرتکب ہوتے تھے اس بیان سے ہو سکتا ہی جو ایک بڑے انگریزی افسر "سرکرزن ولی" کے قاتل[2] نے اپنے پھانسی پر چڑھتے

---

[1] ہندو قصص میں تین مافوق الفطرت وجود مانے گئے ہیں یعنی دیوتا و دیت اور دانو۔ دانو تو وہ ہیں جو عرف عام میں دیو کہلاتے ہیں اور دیوتا وہ مقدس ہستیاں ہیں جنکی پرستش کی جاتی ہی دیت کو اسور بھی کہتے ہیں ان کو اپنی جسمانی قوت کی وجہ سے تفوق حاصل تھا۔ اہل ہنود کے دیوتاؤں کو اپنی عظمت و جبروت کے لیے اسوروں سے لڑنا پڑتا تھا۔ اسور کی اناث اس پر ایا پریاں کہلاتی ہیں لیکن اندر دیوتا کی بڑے دشمن اسوروں میں "ورترا" اور "راہی" ہیں چنانچہ مہابھارت کی لڑائی بھی اسی جنگ کا تتمہ خیال کی جاتی ہی۔ پانڈوؤں میں دیوتا اوتار لیکر پیدا ہوئے تھے اور کورو لشکر میں اسوروں کی نسل نے جنم لیا۔ (مترجم)

[2] اس قاتل کا نام مدن لعل دھینگڑا تھا۔ اس کا شیخ علی الغایتی مصری نے مرثیہ لکھا تھا اور اپنی کتاب "وطنیتی" میں شایع کیا تھا۔ اسی کتاب کی تقریظ لکھنے پر فرید بے اور شیخ شاویش کو سزا ہوئی تھی۔

(مترجم)

اخبار "یوگنتار" [1] جو کلکتہ سے نکلتا تھا نفرت، خونریزی اور بغاوت کے دور کی تلقین کرتا تھا "تلک" کے اشتعالی مساعی میں بہت جلد صریح نتائج پیدا ہوئے۔ اور متعدد ڈاکے ڈکیتیاں اور انگریزوں کے قتل واقع ہوئے۔ بیشک قوم پرستوں کے اُن کثیر التعداد اخبارات میں جو کچھ دیسی اور کچھ انگریزی زبان میں شایع ہوئے تھے ایک یوگنتر بھی تھا۔ یہ اخبارات مغویانہ تحریرات میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

قوم پرست اخبارات کی شدت کا اندازہ ان کے چند اقتباسات سے ہو سکتا ہے۔ یوگنتار کہتا ہے "انقلاب ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے غلامانہ جماعت خلاصی پا سکتی ہے۔ اگر تم زندگی میں اپنے آپ کو مرد ثابت نہیں کر سکتے تو مرنے میں تو مردانگی دکھاؤ۔ اجنبیوں نے باہر سے آکر یہ فیصلہ کیا کہ تم کس طرح جیو۔ لیکن اس کا انحصار قطعاً تم پر ہے کہ تم کس طرح مرو۔" "ہر گھر میں ایک عام انقلاب کی تیاریاں ہونی چاہئیں مسلح بھر پولیس اور فوج انقلاب کے اس سمندر کا مقابلہ نہ کر سکے گی بغاوت کرنے والے قید ہو جائیں، مر جائیں لیکن اُن کی بجائے ہزاروں اور پیدا ہو جائینگے تم خوف نہ کھاؤ! ہندوستان کی سرزمین بہادروں کے خون سے ہمیشہ شاداب رہی ہے ہمت نہ ہارو۔ نہ بہادروں کی کمی ہے نہ روپیہ کی عظمت تمہاری منتظر ہے۔ تمہاری ایک ہی ٹیڑھی نظر (چند بم کے گولے) نے دشمن کے دل میں ڈر بٹھا دیا ہے۔ بزدلی کے شور سے فضا آسمانی

---

[1] یوگنتر جو کلکتہ سے نکلتا تھا وہ بنگالی زبان کا پرچہ تھا اس کی ایڈیٹران مختلف اوقات میں مسٹر سین و مسٹر گھوش وغیرہ رہے مسٹر تلک کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا اُن کا اخبار تو کیسری تھا۔ مصنف کا یوگنتر کو مسٹر تلک کا اخبار بتانا غلطی ہے یہ ممکن ہے کہ تلک کا کوئی مضمون کیسری سے اس میں نقل کر دیا گیا ہو (

(مترجم)

سیاسی حقوق کی واپسی، مغربی تعلیم کے انسداد اور نہایت جابرانہ حکومت کے قیام پر زور دیا تھا۔ ان غضبناک مشوروں سے قوم پرستوں کے مزاج اور برہم ہوئے جن کا نتیجہ بارہ مظالم کا ارتکاب ہوا۔ اور ان کے جواب میں مزید سزائیں اور نئی دھمکیاں دی گئیں اس طور پر فریقین کے انتہا پسندوں نے ایک دوسرے کی آتش خشم کو مشتعل کرکے حالات کو بدتر کر دیا۔ چند سال تک ہندوستان میں بے چینی کی ایسی ہوا چلی جسے قیدیں، پھانسیاں اور جلاوطنی کی سزائیں روک نہ سکیں۔

مگر تھوڑے ہی دنوں بعد حالت میں کم از کم عارضی تبدیلی بہتری کی طرف ہوئی۔ انتہا پسند تو بالآخر نہایت قلیل التعداد تھے اور ٹھنڈے دماغ والے انگریز اور ہندوستانی دونوں اس مخمصہ میں مخلصی ڈھونڈ رہے تھے۔ گو کھلے جیسے قدامت پسند لیڈروں نے اس تخریبی دور کی ملامت کی۔ اور اپنے ہم وطنوں سے یہ درخواست کی کہ وہ پر امن طریقوں سے حصول توقعات کی کوشش کریں۔ دوسری طرف آزاد خیال انگریزوں نے گو خوفزدہ ہونے سے انکار کیا لیکن مصالحت کا نظام عمل تلاش کیا۔

اس زمانہ میں ہندوستان کے معاملات کی عنان انتظام مشہور لبرل مسٹر جان مارلے کے ہاتھ میں تھی اور اس کے مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۹ء کا قانون مجالس ہند پاس ہوا۔ یہ قانون اس غیر محدود مطلق العنانی میں ایک بین رخنہ تھی جس پر ہندوستان میں برطانوی حکومت کا اب تک عملدرآمد تھا۔ اس کی رو سے ہندوستان کی مجلس مخالفت[1] کو مشورہ نکتہ چینی اور بحث کے بہت زیادہ مواقع مل گئے۔ اور اس نے جو مجالس اضلاعِ قانون قائم کیں تھیں ان کیلئے محدود انتخاب کی ابتدا ہوئی۔ ان مراعات کا

---

[1] مجلس مخالف یعنی اپوزیشن پارٹی وہ پارٹی جو وزرا یا حکمراں جماعت کی مخالفت اور نکتہ چینی کرے۔

پہلے کیا تھا: "میرا یقین ہے کہ وہ قوم جو غیر ملک والوں کی سنگینوں سے محکوم بنائی جاتی ہے ہمیشہ حالت جنگ میں ہے۔ چونکہ ایک غیر مسلح نسل کے لیے کھلم کھلا جنگ کرنا ناممکن کر دیا گیا ہے۔ میں نے اچانک حملہ کیا چونکہ مجھ کو بندوق رکھنے کی ممانعت تھی۔ میں نے پستول نکالا اور فیر کیا۔ ایک ہندو کی حیثیت سے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرے ملک کی ذلت میرے دیوتاؤں کی ذلت ہے۔ ملک کا معاملہ 'سری رام' کا معاملہ ہے۔ ملک کی خدمت 'سری کشن' کی خدمت ہے۔ مجھ جیسا غریب اور کم عقل فرزند مادر وطن کو اپنے خون کے سوا اور کیا نذر دے سکتا ہے۔ لہذا میں نے مادر وطن کی قربان گاہ پر اپنے خون کی بھینٹ چڑھائی ہے۔ ہندوستان میں فی الحال جس سبق کی تعلیم کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ لوگ کس طرح مریں اور اس کی تعلیم دینے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ "ہم خود جان دیں"۔ لہذا میں جان دیتا ہوں۔ اور اپنی شہادت پر نازاں ہوں۔ انگلستان اور ہندوستان کے موجودہ غیر فطری تعلقات اگر ختم نہ ہوئے تو یہ لڑائی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ ہندی اور انگریزی نسلیں باقی رہینگی"

بلاشبہ اس قتل و بغاوت کے دور کا جواب گورنمنٹ نے سخت استبداد سے دیا۔ دیسی اخبارات کی زباں بندی کی گئی۔ فتنہ انگیزوں کو قید یں پھانسیاں ہوئیں اور حکام کے ہاتھوں کو تعزیری قوانین سے مضبوط کر دیا گیا۔ فی الواقع قوم پرستوں کے قتل و مظالم سے یورپی جماعت ایسی خشمناک ہوئی کہ اکثر انگریزوں نے موجودہ

سلہ چرول کی تصنیف مذکور الصدر میں انتہا پسندوں کی تنقید کا اچھا خلاصہ دیا ہوا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو سے جے۔ ڈی۔ رلیس کی کتاب "اصلی ہندوستان"، مطبوعہ لندن ۱۹۰۸ء و سلسلہ مضامین جو انتہا پسندوں نے مارچ ۱۹۱۰ء میں دی اوپن کورٹ میں شایع کیے۔ انتہا پسندوں کے ادبیات کا اچھا نمونہ مشہور رسالہ "ہندوستان کی انگلستان سے وفاداری" مطبوعہ ۱۹۱۵ء

قوم پرستوں میں جا ملے۔ لیکن مفویانہ شورش سے الگ رہے۔ فی الحقیقت قوم پرست دو جماعتوں یعنی اعتدال پسند اور انتہا پسندوں میں منقسم ہوگئے۔ انتہا پسندوں نے جنھیں اُن کے ہم وطن لعن طعن کرتے تھے غیر مسلسل دور اشتداد جاری رکھا۔ جس کی رہنمائی زیادہ تر وہ جلا وطن لیڈر کرتے تھے جو ممالک غیر میں پناہ گزیں تھے۔ اور اپنے مقلدین مقیم ہند کو مفویانہ شورش اور جبر و اشتداد کی ترغیب دیتے تھے۔

یہ تھی حالت ہندوستان میں جب جنگ عظیم شروع ہوئی۔ یہ حالت کسی نہج پر مشکلات سے خالی نہ تھی۔ لیکن اس حالت سے بہت کم پر شور تھی جو اب سے چند سال قبل رہ چکی تھی۔ بلاشبہ لڑائی سے نئے چینی اور تخویف میں زیادتی ہوگئی لیکن فی الجملہ ہندوستان پر سکون رہا۔ دوران جنگ میں ہندوستان نے شہنشاہی اغراض کے لیے روپیہ اور سپاہی نے چون وچرا دیئے۔ اور ہندوستانی افواج یورپی ایشیائی اور افریقی میدانہائے جنگ میں بکثرت موجود تھی۔

اگرچہ جنگ کے زمانہ میں کسی انقلابی اشتداد کا اظہار نہ ہوا مگر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ مزید سیلف گورنمنٹ کے مطالبہ کی کثیر الاشاعت تحریک بجھ یا دب گئی تھی۔ برخلاف اس کے جنگ سے اس میں تقویت ہوگئی۔ اب صرف اچھی گورنمنٹ ہی کا مطالبہ نہ تھا بلکہ ایسی گورنمنٹ کے لیئے شور مچنے لگا جو ہندوستانیوں کو جوابدہ ہونے کی وجہ سے محبان وطن کے قابل قبول ہو۔ یہ امر کہ ہندوستان نے سلطنت سے اپنی وفاداری ثابت کر دی اور اپنا خون اور خزانہ نہایت فیاضی سے کار سلطنت میں صرف کیا، بہت سی جدید دلیلیں تھیں جو حکومت خود اختیاری کے مزید طریقوں کے عطیہ کے لیے پیش کی جاتی تھیں۔ ہندوستانی رائے عامہ کے مختلف فرقوں نے برطانوی حکام کے سامنے بہت سی یادداشتیں پیش کیں۔ ان

اچھا اثر بہت جلد ظاہر ہوا۔ اعتدال پسند قوم پرستوں کا گروہ گو اس سے کلیتاً مطمئن نہیں ہوا۔ لیکن اس نے اس قانون کو مراعات مابعد کا بیعانہ اور برطانوی نیک نیتی کے ثبوت کے طور پر قبول کرلیا۔ انتہا پسندوں کی مغویانہ سازشیں اور تخریبی حرکات اگرچہ کلیتاً نہ مٹیں۔ لیکن وہ رک کر زیر زمین دب گئیں۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں شاہ جارج کی سیاحت ہند نے وفادارانہ جوش کی لہر پیدا کردی جو کل جزیرہ نما میں پھیل گئی۔ اور مستقبل کے لیے فال نیک معلوم ہوتی تھی۔

سنہ ۱۹۰۵ء لغایۃ سنہ ۱۹۰۹ء کے طوفانات کے بعد جو امن کا دور آیا اس کا بہترین زمانہ سنہ ۱۹۱۱ء تھا سنہ ۱۹۱۱ء کے بعد جب کونسل ایکٹ کے پہلے اثرات مٹے اور غیر ایفا شدہ توقعات کے احساس نے مزید خواہشات کو تیز کیا تو رفتہ رفتہ بےچینی پیدا ہونے لگی۔ فی الواقع ان سنین میں ہندوستانی قوم پرستی اپنی بنیادوں کو تیزیج وسیع کررہی تھی۔ ایک طور پر اس سے استحکام پیدا ہوگیا کیونکہ قوم پرستی کی تحریک محض انتہا پسندوں کی جماعت اقل نہ رہی بلکہ مسٹر گوکھلے جیسے اعتدال پسند لیڈروں کے زیر اثر ہوگئی جو مقاصد بعیدہ کے حصول کے لیئے ارتقائی طریقوں پر کام کرنا چاہتے تھے۔ مگر اس کا منشا یہ نکلا کہ اختیارات کو اور زیادہ منتقل کرنے کے لیے گورنمنٹ پر مزید بار ڈالا گیا۔ قوم پرستی کی ترقی کی سب سے زیادہ قابل الذکر علامت یہ تھی کہ مسلمانوں کا ایک حصہ قوم پرستوں سے آملا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں نے اپنی ایک جماعت یعنی آل انڈیا مسلم لیگ، قایم کرلی تھی یہ لیگ اپنے رنگ میں قوم پرستی کے بالکل متضاد تھی کیونکہ ابتداءً یہ اس غرض سے قایم کی گئی تھی کہ ہندوؤں کی امکانی فوقیت کے مقابلہ میں مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کی جائے۔ مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا بعض مسلمانان ہند و اعتدال پسندوں کے مواعید اور محبانہ طرز عمل سے متاثر ہوکر لیگ کے اس طرز عمل کو جو ہندوؤں کے مخالف تھا ترک کرنے لگے۔ اپنے

بر دعمل کے تمام خطرات سے احتراز کیا جائے جو اُن نظامات کے قایم ہونے سے پیدا ہو سکتی ہیں جن کو تجربہ قبل از وقت ثابت کرے۔

فی الواقع ۱۹۱۷ء کے اختتام پر مسٹر مانٹیگو انگلستان سے اس لئے روانہ ہوئے کہ دستوری اصلاحات کے مسئلہ پر ہندوستانی عام رائے کو پوری طور پر جانچیں۔ مہینوں تک اس مسئلہ پر نہایت غور کیا گیا۔ اور ہر نسل اور ہر مذہب کے نمائندوں سے گفتگو کی گئی۔ ان تحقیقاتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک قابل یادگار رپورٹ مسٹر مانٹیگو اور وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ کے دستخطوں سے مرتب ہوئی جو جولائی ۱۹۱۸ء میں شایع کی گئی۔

اس رپورٹ میں ایسے مراعات کی سفارش کی گئی تھی جو اس وقت تک برطانیہ عظمیٰ نے کبھی عطا نہ کئے تھے۔ اس نے کھلم کھلا ہندوستان کو حکومت خود اختیاری "جس قدر جلد ممکن ہو" دیا جانا تسلیم کیا۔ یہ بھی بیان کیا کہ یہ نعمت ہندوستانی شورش کی وجہ سے نہیں دی جا رہی ہے بلکہ "وہ ہم پر اعتماد رکھنے" کی بدولت دی جاتی ہے اس کے بعد حسب ذیل قابل یادگار الفاظ ہیں۔

"..... ہم کو پورا یقین ہے کہ وہ وقت آگیا ہے کہ جو مامون زندگی ہم نے ہندوستان کو دی ہے وہ اس کی قومی زندگی کو ضرر پہنچائے بغیر دیر تک قایم نہیں رکھی جا سکتی۔ اس وقت تک ہم نے جو نعمتیں اس ملک کے باشندگان کو عطا کی ہیں اس سے زیادہ بیش بہا عطیہ ہندوستانی باشندوں کے لئے ہمارے پاس ہے۔ یہ کہ سلطنت کے اندر قومیت اُن تمام چیزوں سے برتر ہے جو ہندوستان کو اس وقت تک حاصل ہوئی ہیں یہ کہ عوام کی جہل اور قابل افسوس قناعت ایسی زمین نہیں ہے جس سے ایسی ہندوستانیت کا بیج نشو و نما پا سکے اور یہ

یادداشتوں میں ہندوستانی قوم پرستی کے مختلف نظریات کا صحیح عکس تھا۔ سب کا نصب العین برطانوی اتالیقی سے خلاصی تھا۔ لیکن آپس میں اس پر بڑا اختلاف تھا کہ یہ خلاصی کب اور کیوں کر حاصل ہو۔ شدید قدامت پسند طبقہ نے اس پر قناعت کی کہ زیر نگرانی برطانیہ ترمیم شدہ سیلف گورنمنٹ عطا ہو۔ زیادہ باحوصلہ اشخاص نے یہ مطالبہ کیا کہ شہنشاہی برطانیہ کے شمول میں آسٹریلیا اور کنیڈا کی طرح کامل آزاد حکومت دی جائے۔ قدرتی طور پر انقلابی عنصر علیحدہ رہا۔ کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ صرف اشتداد ہی سے ان کا مقصد یعنی فوری اور غیر مشروط آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔

بلاشبہ زیادہ اعتدال پسند قوم پرستوں کے مطالبات میں بھی موجودہ طرز حکومت میں بڑی تبدیلیاں اور برطانوی تسلط کی ایسی کمی مضمر تھی جس کی منظوری کے لئے گورنمنٹ ہند فی الحال تیار نہ تھی۔ مگر گورنمنٹ ہند نے ان مطالبات کی بابت صلح کن طرز عمل اختیار کیا جس سے مستقبل قریب میں مزید مراعات کی توقع ہوتی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے کہا "میں یہ نہیں چاہتا کہ ہندوستان کے لئے سیلف گورنمنٹ سے قومی نصب العین کی حیثیت سے ایک لمحہ کے لئے بھی اعراض کروں یہ بالکل جائز تمنا ہے اور سب اعتدال پسندوں کو اس سے ہمدردی ہے۔ لیکن ہندوستان کی موجودہ حالت میں نظریات کی نہیں بلکہ عملی سیاسیات کی ضرورت ہے ہم کو واقعات کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ فضول امیدیں باندھنے اور ناقابل حصول مطالبات کی حوصلہ افزائی کرنے سے تاخیر ہی ہو سکتی ہے۔ اور سیاسی ترقی میں تعجیل نہ ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ عاقل اور صاحب ادراک ہندوستانیوں کا یہی خیال ہے۔ مجھ سے زیادہ کوئی اس کا متمنی نہیں ہے کہ ہندوستان کی جائز تمنائیں جلد بر آئیں۔ لیکن مجھ کو اس کی بھی فکر ہے کہ

پیچیدگیوں کا خوب اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس مسئلہ میں قوم پرستوں کے مابین سخت اختلاف ہے۔ اعتدال پسند طبقہ نے رپورٹ کا خیر مقدم کرکے اس امر پر رضامندی ظاہر کی کہ گورنمنٹ کی مجوزہ اسکیم سے وفادارانہ اشتراک عمل کیا جائے۔ اور انتہا پسندوں نے اِن تجاویز کو محض دام فریب اور تلبیس تصور کرکے رد کیا۔ اعتدال پسندوں کا طرز عمل اس اعلان میں بیان کیا گیا تھا جس پر اُن کے لیڈران نے بسرکردگی سر ڈنشا واچا ماہر اقتصادیات دستخط کیے۔ یہ بیان حسب ذیل ہے:-

"مجوزہ اسکیم کی ساخت بہت پیچیدہ ہے۔ اور بعض تفاصیل میں ترقی کی ضرورت ہے بالخصوص بالائی حصے میں۔ لیکن بہر نوع یہ ایک ترقی کن تدبیر ہے۔ اصلاحات میں یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے صوبجات کامل ذمہ دار گورنمنٹ کے درجہ تک پہونچ جائیں۔ فی الجملہ یہ تجاویز نہایت دور اندیشی پر مبنی ہیں۔ اور اُن میں ہندوستان کی سیاسی توقعات سے اصلی ہمدردی کی روح پائی جاتی ہے۔ جس پر نامور مصنفین ملک کے شکریہ کے مستحق ہیں" انتہا پسندوں کی ناپسندیدگی کا اظہار مسٹر تلک جیسے لیڈروں نے کیا۔ جو اس پر مصر تھے کہ "انڈین نیشنل کانگریس کے نصب العین پر قایم رہنا چاہیے" مسٹر بپن چندر پال کا ادعا ہے "یہ میری پختہ رائے ہے کہ اگر یہ تجویز مقبول ہوگئی تو گورنمنٹ آج سے بھی زیادہ با اقتدار اور خودسر ہو جائے گی"

قوم پرستوں کی مخالف جماعتوں بالخصوص مسلمانوں اور نیچ ذات ہندوؤں جو احتجاجات کیے وہ نہایت ہی دلچسپ تھے۔ کیونکہ یہ ایسا امر ہے جس سے ہندوستانی مسئلہ کی اس پیچیدگی کا اظہار ہوتا ہے کہ لاکھوں ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک سے خائف ہیں۔ اور راج برطانیہ کی خودسری کو قوم پرستوں کے ظلم اور جانبداری کے مقابلہ میں ڈھال سمجھتے ہیں۔ ہندوستان کی سیلف گورنمنٹ کے مسئلہ پر خود مسلمانان ہند میں سخت اختلاف ہے۔ مسلمانوں کی جماعت کثیر حمایت قومی کی تحریک سے

کہ ہم اس کو دیدہ و دانستہ مضطرب کر کے اس کے بہترین نفع کا کام کر رہے ہیں۔

رپورٹ کا لب لباب یہ تھا اس میں دو عملی حکومت کی سفارش کی گئی تھی۔ یعنی حکومت کی ذمہ داریوں کو برطانوی منتظمین کے نامزد کردہ مشیران اور واضعان قانون کی جماعت مبعوثین کے منتخب شدہ وزراء میں تقسیم کیا جائے یہ دو عملی حکومت کا اصول مرکزی اور صوبہ جات دونوں کی حکومتوں میں قائم کیا گیا تھا۔ مجالس قانون ساز کے انتخاب کے لیے پیشتر سے بہت زیادہ وسیع حق انتخاب دیا گیا اور ان جماعتوں کو بہت زیادہ اختیارات بھی دیے گئے۔ قبل ازیں ان کی حیثیت محض مجلس شوریٰ کی تھی۔ اب جماعت واضعان قانون کی حیثیت مغربی مفہوم کے مطابق ہو گئی۔ اگرچہ ان کے اختیارات اب بھی محدود رہے۔ بہت سے اختیارات، بالخصوص مالیات کے متعلق ہنوز منتظم حکام کے لیے محفوظ رکھے گئے۔ اس طور پر برطانوی حکومت منتظمہ کو آخری تسلط اور قول فیصل کا اختیار تھا۔ اس طور پر کوئی صحیح "توازن اختیار" قائم نہ رکھا گیا تھا بلکہ برٹش راج کا پلہ بالاعلان بھاری تھا۔ لیکن یورپ میں یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ اس نظام حکومت کو مستقل کرنے کا قصد نہیں ہو۔ بلکہ یہ بین طور پر ہنگامی کارروائی ہو بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ ایک مدرسہ ہو جس میں ہندوستانیوں کو اپنی طالب علمی کا زمانہ گزارنا چاہیے اور یہ کہ جب سیلف گورنمنٹ کے یہ سبق یاد ہو جائیں گے تو ہندوستان کو کامل حکومت مبعوثین دی جائے گی جن کو نہ صرف وضع قانون اور آغاز کا اختیار ہوگا بلکہ منتظم حکام پر بھی تسلط حاصل ہوگا۔

اس مانٹیگو چیمسفورڈ کی رپورٹ پر انگلستان اور ہندوستان دونوں جگہ کامل بحث ہوئی اور ان آزاد مباحثات سے ہندوستانی مسئلہ اور اس کی تمام

ہندوستانی آبادی کے بڑے فرقوں کی طرف سے ہوم رول کی خلاف ایسے احتجاجات پیدا ہونے پر اُن انگریزوں کو بھی پس و پیش ہوا جو اس مسئلہ سے واقفیت اور ہوم رول کی اصولی ضرورت کا یقین رکھتے تھے بلاشبہ ان احتجاجات نے بہت سے انگریزوں بالخصوص اُن اینگلو انڈین کے دلائل کو مضبوط کردیا جن کا یہ دعوےٰ تھا کہ ہندوستان ہنوز سیلف گورنمنٹ کے لیئے موزوں نہیں ہے۔ ان معترضین میں سے ایک نے راونڈ ٹیبل میں کہا "عوام سیاسیات کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہی نہیں کہ ہوم رول ہے کیا چیز۔ وہ انگریز حاکم ضلع کو پسند کرتے ہیں اور دائمی وہبی سکوت میں رہنے کے طالب ہیں۔ ان کو انگریزوں پر اس لیے اعتماد ہے کہ وہ ہمیشہ سے غریب پرور ہیں۔ اور وہ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان اور ایمانداری کے لیے مشہور ہیں" لارڈ سڈنہم نے مانٹیگو چیمسفورڈ کی تجاویز پر مفصل نکتہ چینی کرتے ہوئے بیان کیا "ہماری گورنمنٹ ہند

بقیہ نوٹ صفحہ ۔ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے اور لفظ ہندو کی عجیب و غریب تعریف ہو رہی ہے اتحاد بین الہنود کی تحریک میں نہ صرف اہل ہند بلکہ چین اور جاپان کے باشندے بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ اس جامعی تحریک میں اُن سب اقوام کو منسلک کرنا منصور ہے جو ایسے مذہب کے پابند ہوں جس کا آغاز ہندوستان سے ہوا ہو۔ اس تحریک کا ہنوز آغاز ہے اور اس کی اصولی نظریات کی تطبیق و تنقیح میں ابھی عرصہ لگے گا۔ موجودہ نظام نہ اشتراک خیال یا مذہب پر مبنی ہے اور نہ نسلی یا سیاسی بنا پر۔ اگر مذہبی نقطۂ خیال کو لیا جاوے تو اہل ہنود اور تبت کے مذہب لاما بالکل متضاد ہیں۔ اول الذکر خدا کے ماننے والے ہیں اور آخر الذکر منکرین ہیں۔ بودھ مت والے خود الوہیت کے منکر ہیں۔ اہل ہنود زیادہ تر آریہ نسل اور دراوڑی نسل کے ہیں اور اہل چین و تبت و جاپان و برما زرد رنگ یا منگولی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان ممالک کا تمدن بھی مشترک نہیں (مترجم)۔

اون کے ہندوانہ خصایص کی وجہ سے متنفر اور خایف ہے۔ مگر جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ایک جماعت اقلیت قوم پرستوں کے شریک حال ہوگئی ہے۔ اس جماعت اقلیت کی تعداد دوران جنگ میں بڑھتی گئی اور روز افزوں مودت کی بنا سیلف گورنمنٹ کی تمنا ہی نہیں بلکہ حکمت عملی پر غصہ بھی ہے جو اتحادیوں نے سلطنت عثمانیہ کے تجزیہ اور نیز مشرق ادنیٰ و وسطیٰ کے متعلق اختیار کی۔ ہندو قوم پرستوں نے مسلمانوں سے ان خارجی امور میں اظہار ہمدردی کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں فرقوں میں عدیم المثال اتحاد قایم ہو گیا۔

قوم پرستی کی تحریک میں اونچ ذات برہمنوں کی کثرت ہی نیچ ذات ہندؤں کی ہوم رول سے مخالفت کی وجہ ظاہر کرتی ہے۔ نیچ ذات والوں کو برطانوی راج کے تحفظ سے محروم ہو جانے اور اونچ ذات برہمنوں کی حکومت کے بوجھ میں دب جانے کا اس قدر خوف ہے کہ انھوں نے حال میں ایک جماعت الموسوم بہ "نماسدر"[1] قایم کی ہے جس کے سرگروہ ڈاکٹر نایر جیسے معروف اشخاص ہیں[2] موجودہ سیاسی زندگی میں جو برہمنوں کا دباؤ پڑتا ہے نماسدر اس کو نقل کر کے یہ بتاتی ہے کہ آیندہ کیا ہوگا۔ مثلاً متعدد انتخابات میں برہمنوں نے نیچ ذات رائے دہندوں کے دل میں دھمکی دے کر یہ ڈر پیدا کر دیا ہے کہ جو برہمن کو رائے نہ دیں گے وہ ذات باہر کیے جائیں گے۔ اور بھیڑیا یعنی ایسے اچھوت ہو جائیں گے جن کو ہندو معاشرت میں کوئی حق حاصل نہ ہوگا[3]۔

---

[1] مفصل بحث فصل ماسبق میں ہو چکی ہے (مصنف)

[2] فصل چہارم میں بیان کیا گیا ہے۔ (مصنف)

[3] اسالی ہندو نقطۂ نظر میں بڑا فرق پیدا کیا جاتا ہے۔ آجکل اچھوت ذاتوں کو دخل ملاحظہ

راضی کرنے کی امید نہیں کرسکتے۔ تاہم کو جس امر کی امید ہے وہ یہ ہے کہ مفید کارروائی کا وسیع ترشیدان پیدا کرکے ہندوستانی آبادی کا جو بہترین حصہ ہے اس کو انتہا پسندوں کے مضر اثر سے آزاد کریں[1]"

امر واقعہ یہ ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ نے مانٹیگو چیمسفورڈ کی رپورٹ کو مباحثہ کے لئے منظور کر لیا اور سنہ ۱۹۱۹ء میں اس کی سفارشات نے قانون کا جامہ پہنا۔ بدقسمتی سے ان اٹھارہ مہینوں کے دوران میں جو رپورٹ کی اشاعت اور اس کی قانونی صورت اختیار کرنے کے درمیان میں گذری ہندوستان میں حالات تاریک تر ہو گئی تھی۔ مبارزانہ شورش نے پھر سر اٹھایا۔ اور ہندوستان ایسا پرفتن ہو گیا کہ سنہ ۱۹۰۹ء کے بعد کبھی نہ ہوا تھا۔

اس کے چند وجوہ تھے۔ اولاً تو ان سب قوم پرست عناصر نے جو رپورٹ سے غیر مطمئن تھے انقلابی مخالفین سے سازو باز شروع کرکے ان کو جدید تخریبی عمل کی ہمت دلائی۔ غالباً ان کو یہ امید تھی کہ برطانوی پارلیمنٹ خائف ہو کر رپورٹ میں سفارش کردہ مراعات سے زیادہ کچھ عطا کرے گی۔ لیکن دیگر عام قسم کے متعدد وجوہات بھی تھے۔ سنہ ۱۹۱۸ء ہندوستان کیلئے بہت نازک تھا۔ انفلوائنزا کی وبا جو تمام دنیا میں پھیلی تھی اس نے ہندوستان میں بہت نقصان پہونچایا۔ اور اس مرض مہلک سے تقریباً ستر لاکھ اموات واقع ہوئیں۔ مزید براں ہندوستان میں خشک سالی ہوئی۔ فصلیں خراب ہوئیں اور قحط کا دیو مہیب ملک پر محیط ہو گیا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں اس سے بدتر خشک سالی ہوئی اور ایسا قحط پڑا کہ غالباً اس سے پیشتر کبھی نہ ہوا تھا۔ موسم گرما کے آخر میں تخمینہ کیا گیا

---

[1] سر ویلنٹائن چیرول کا مضمون "ہندوستان بحالت وردِ زہ" جو جولائی سنہ ۱۹۱۸ء کے ایڈنبرا ریویو میں شائع ہوا۔ (مصنف)

کہ موجودہ نظام میں بہت سے عیب ہیں - اصلاحات کی بے شک ضرورت ہے لیکن یہ اصلاحات ہندوستانی عوام کی بہبودی کے لحاظ سے ہونا چاہئیں۔ اگر عوام کے سکوت کو بیدار دانستہ توڑنے کی پالیسی پر جیسا کہ اعلان دالبیراسے مونٹیگو ہوا ہے عمل کیا گیا، اگر مشرق میں یہ خبر کہیں پھیل گئی کہ وہ اقتدار جو امن و امان قائم رکھتا تھا اور ہندوستانی قوم کی تدریجی تعمیر کا محافظ تھا کمزور ہو رہا ہے اور اگر موجودہ تجاویز کے بموجب پبلک سروس کے اختیارات سلب کر لئے گئے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ قدیم ملکہ تباہ کن دشمنیاں از سر نو پیدا ہو جائیں گی جو برہمنوں کی استبدادی قوتوں سے معاونت حاصل کر کے چند سال میں اس بڑے سے بڑے کام کو کالعدم کر دیں گی جو برطانوی قوم نے اپنی ہمتی کے زمانہ میں پایۂ تکمیل کو پہونچایا ہے۔"[1]

لیکن ہندوستانی معاملات کے دیگر انگریز ماہرین نے یہ دعوے کیا کہ مانٹیگو چیمسفورڈ تجاویز صحیح ہیں - اور اگر سخت ترین خطرات کو رفع کرنا مقصود ہے تو اس کو قانون بنانا چاہیے یہ رائے "لیونل کرٹس"[2] اور "سر ویلنٹائن چرول" جیسے اشخاص کی تھی - آخر الذکر کہتے ہیں "سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ غیر ضروری تاخیر نہ ہونا چاہیے - تعویق کے خطرات کا ہم کو کافی سبق مل چکا ہے اور دیگر مقامات کی طرح ہندوستان میں بھی وقت فتنہ انگیزوں کا معاون ہے - تاہم ہندوستانی نہایت پسندیدگی کو

---

[1] لارڈ سڈنہم کا مضمون "ہندوستان" جو نومبر ۱۹۱۸ء کے کنٹیمپرری ریویو میں شایع ہوا۔ مانٹیگو چیمسفورڈ کی تجاویز پر اس قسم کی نکتہ چینیوں کے لئے ملاحظہ ہو - جی - ایم چیسنی کی کتاب "ہندوستان زیر آزمائش" مطبوعہ لندن ۱۹۱۸ء اور ۲۰ دسمبر ۱۹۱۸ء کے اسپیکٹیٹر میں مضمون بعنوان "ہندوستانی طوائف الملوکی کی تنسیخ اوّل" مصنف

[2] لیونل کرٹس کے خطوط بنام باشندگان ہند در بارہ ذمہ دار حکومت جو فصل چہارم کے ختم پر منقول ہیں (مصنف)

پاس ہو گیا۔ مگر گورنمنٹ نے اس بل کو قیام امن کے لیے نہایت ضروری حفظ ماتقدم سمجھا۔ اور ۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں یہ قانون بن گیا۔

اِس سے معاملات انتہا کو پہونچ گئے۔ قوم پرستوں نے رولٹ بل کا نام کالا سانپ والا ایکٹ رکھ کر اس پر نہایت لعنت ملامت کی۔ انتہا پسندوں نے ایک جنگ جویانہ احتجاج کا دور اختراع کیا۔ اور یہ حکم لگایا کہ بل کے پاس ہونے کی تاریخ یعنی ۶ اپریل ۱۹۱۹ء قومی تحقیر کا دن منایا جاوے۔ اس تاریخ پر بڑے بڑے جلسے ہوئے جن میں قوم پرست فصحاء نے اپنی مغویانہ تقریروں سے عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیا۔ درحقیقت ۱۸۵۷ء کے بعد سے ستیہ گرہ کا دن نئی بےچینی کی بدترین لہر کا آغاز تھا۔ اس کے بعد تین ماہ تک بلووں اور استبداد کی وبا ہندوستان میں بالخصوص شمالی صوبجات میں پھیلی رہی۔ حکام کو قتل کیا گیا۔ انگریز سویلین مارے گئے۔ اور بلا امتیاز جائداد تباہ کی گئی۔ بعض وقت تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان انقلاب اور بدنظمی کے کنارہ آ گیا۔

لیکن گورنمنٹ نے استقلال سے کام لیا۔ سرکشی کی اینٹ کا جواب تشدد کے پتھر سے دیا گیا۔ بلوائی جماعتوں کو رائفل اور مشین گن کی باڑھوں سے بچھا دیا۔ یا نیچے اُڑتے ہوئے جہازوں سے بم گرا کے منتشر کر دیا گیا۔ ان واقعات میں سب سے زیادہ مشہور وہ واقعہ ہی جو امرتسر کا قتل عام کہلاتا ہی۔ جہاں برطانوی افواج نے مغویانہ جلسہ عام میں فیر کر کے پانسو کو مارا اور پندرہ سو کو زخمی کیا۔ بالآخر گورنمنٹ نے پورا قابو حاصل کر کے امن قایم کر دیا۔ مغویانہ لیڈر جیل بھیج دیئے گئے۔ اور انقلابی تحریک پھر زیر زمین چلی گئی۔ مانٹیگو چیمسفورڈ کے اصلاحی بل سے جس کو برطانوی پارلیمنٹ نے اختتام سال پر قانون بنا دیا تھا بہت کچھ کشاکش اور بےچینی میں کمی ہو گئی۔ اگرچہ ہندوستان کی حالت ہنوز حالت اعتدال سے بہت دور تھی اوائل ۱۹۱۹ء کے اندوہناک واقعات سے ایسی دشمنیاں پیدا کر دی تھیں جو کسی طرح رفع نہ ہوئیں۔ انقلابی عنصر دب گیا اور زیادہ سخت اور پہلے سے زیادہ

کہ فاقہ کشی سے تین کروڑ دس لاکھ اشخاص مر گئے اور پندرہ کروڑ جاں بلب تھے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ جنگ افغانستان چھڑ گئی جس سے شمالی اور مغربی سرحد پر شورش ہوا اور مسلمان عنصر جو ہنوز بے چین تھا اور بھی زیادہ پر شور ہو گیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ شورش کی لہر بلاشں تخریبی عمل اور مغویانہ سرگرمیوں کی وبا کی صورت میں رونما ہوئی جس سے برطانوی حکام کو سخت تشویش پیدا ہوئی۔ یہ حالت ایسی نازک معلوم ہوئی کہ تحقیقات کے لیے ایک خاص کمیشن مقرر کیا گیا۔ اور اس کے صدر جسٹس رولٹ نے اپنی رپورٹ میں انقلابی شورش کی نہایت مایوس کن تصویر کھینچی اس رپورٹ میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ صرف طبقہ اعلیٰ کے نوجوان تعلیم یافتوں کی تعداد کثیر ہی بد نظام تحریک کی ترقی میں شریک نہیں ہو بلکہ ان میں دیگر معاشرتی طبقات کے لوگ بشمول قوم والوں کے شریک ہیں۔ اور اس کی بیّن شہادت موجود ہو کہ دیسی افواج کی وفاداری پر نہایت کامیابی سے مضر اثر ڈالا گیا ہو۔ اس روز افزوں عدم موانست کے مقابلہ کے لیے ولٹ کمیٹی نے مزید انسدادی قانون بنانے کی سفارش کی کمیٹی کی رپورٹ کی نازک حالت سے متاثر ہو کر گورنمنٹ آف انڈیا نے ایک قانون کا مسودہ تیار کیا جو سرکاری طور پر بے چینی اور انقلابی جرایم کا ایکٹ کہلاتا ہو۔ اگرچہ عام طور سے اس کو رولٹ بل کہتے ہیں۔ اس قانون کی رو سے حکام کو بہت زیادہ اختیارات حاصل ہو گئے۔ مثلاً بلا کسی خاص شہادت کے محض مغویانہ کارروائی کے شبہ پر ان کو خانہ تلاشی اور گرفتاری کا حق حاصل ہو گیا۔

رولٹ بل پر قوم پرستوں نے نہایت مخالفت کی۔ انتہا پسندوں کے علاوہ بہت سے اعتدال پسندوں نے بھی اس کو جمعیت کی ہتھکڑی اور جدید مصائب کا باعث سمجھ کر نا مناسب قرار دیا۔ جب یہ بل ہندوستانی جماعت و اضعان قانون یعنی امپیریل لیجسلیٹو کاونسل میں مباحثہ کے لیے پیش ہوا۔ تو کل دیسی ممبروں نے باستثنائے شخص واحد اس کی مخالفت کی۔ اور یہ بل آخر کار صرف نسلی اصول پر مقرر شدہ انگریزوں کی کثرت رائے سے

تعجب انگیز ہے ویسا ہی اہانت آمیز ہے - وہ ہم پر بلا شبہ حکمرانی کچھ تو زور کی بدولت کرتے ہیں لیکن زیادہ تر ہزاروں طریقوں پر ہم سے اشتراک عمل کرا کے حکمراں ہیں - اور ہم کو روز بروز زیادہ ناچار اور تابع بناتے جاتے ہیں - ہم کو اصلاح شدہ مجالس شوریٰ و عدالتوں و نیز گورنریوں کو غلطی سے حقیقی آزادی یا اقتدار نہ سمجھنا چاہئے - یہ نامرد بنانے کی بڑی گہری چالیں ہیں - برطانیہ محض جبر سے ہم پر حکومت نہیں کر سکتی - اس لئے وہ اپنا ہندوستان پر قبضہ قایم رکھنے کے لئے ہر جایز اور ناجایز طریقہ سے کام لیتی ہے - وہ اپنی شہنشاہی حرص کیلئے ہندوستان کی دولت و افواج کی طالب ہے - اگر ہم اس کو روپیہ اور آدمی دینا بند کر دیں تو ہمارا مقصد یعنی سوراج، مساوات، مردانگی حاصل ہو جاوے گی ۔"

نان کواپریشن کی انتہائی تمنائیں پوری نہ ہوئیں - مانٹیگو چیمسفورڈ کی اصلاحات نفاذ پذیر اور ان اصلاحات کی رو سے پہلے انتخابات ۲۱-۱۹۲۰ء میں ہوئے لیکن مطلع ہنوز صاف نہیں ہوا ہے - انتخابات میں جو نہایت ہی کم رائیں ڈالی گئیں اُن سے اور نیز دیگر بے شمار طریقوں سے جن میں کارخانوں سے لیکر مدرسوں تک کی ہڑتالیں شامل ہیں نان کوآپریشن کے اثرات ظاہر ہوئے - ہندوستان آج شورش کے طوفان میں گرفتار ہے - یہ شورش محض سیاسی نہیں بلکہ معاشرتی بھی ہے - گزشتہ نصف صدی سے جو عظیم اقتصادی انقلابات ہندوستان میں عمل پذیر ہیں اس نے ہندوستانی جماعت کو بالکل غیر منتظم کر دیا ہے - ان انقلابات پر فضول مابعد میں بحث کی جائے گی - جو بات اس موقع پر نوٹ کرنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ انتہا پسند لیڈر معاشرتی بے چینی سے فائدہ اوٹھا رہے ہیں - اور بلا شک و شبہ انھوں نے بالشویک روس سے سازباز کر لیا - اس دوران میں شورش کے قدیم اجزا مفقود نہیں ہوئے ہیں حال میں راسخ الاعتقاد متعصب سکھوں نے جو مختلف الرائے سکھ زائرین کا قتل عام کیا اور اسی زمانہ میں جنوبی ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں اور دیسی عیسائیوں کے

غیر مصالحانہ ہو گیا۔ اور ہوم رول کے مخالفین کی رائے مستحکم ہو گئی کہ ہندوستان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اور تسلط کی گرفت ڈھیلی ہونے پر طوائف الملوکی کا دور لازمی ہے۔

عام خیالات میں ہیجان کی وجہ سے یہ وقت مانٹیگو چیمسفورڈ کی ترمیم شدہ اصلاحات کی ترویج کے لئے مناسب اور موزوں نہ تھا فی الواقع انتہا پسند اس پر تلے ہوئے تھے کہ ان کو مناسب آزمائش کا موقع نہ دیا جائے کیونکہ وہ ان اصلاحات کو دام فریب سمجھتے تھے۔ جس سے بہر طور احتراز لازمی تھا۔ انتہا پسندوں نے یہ دیکھ کر کم از کم فی الحال مسلح بغاوت ناممکن ہے ایک جدید خیال پیدا کیا جس کا نام نان کوآپریشن رکھا گیا۔ یہ دراصل ہر انگریزی چیز کا بڑے پیمانہ پر مقاطعہ تھا۔ جدید رائے دہندوں کو ہی انتخاب میں شریک ہونے اور مجوزہ مجلس قانون ساز کے لئے کسی ممبر کو انتخاب کرنے کی ممانعت نہ تھی بلکہ بیرسٹر اور وکلا اور فریقین مقدمہ بھی عدالتوں میں نہ جائیں ٹیکس دینے والے محاصل ادا کریں مزدور ہڑتال کریں اور دوکاندار انگریزی مال کی خرید و فروخت بند کریں اور طلبہ مدرسے اور کالج کو چھوڑ دیں۔ ہر انگریزی چیز کو اس طرح تکلیفاً "اچھوت" کر دینے سے تو انگریز ہندوستان میں ایک نئی قسم کی پھڑیا یعنی اچھوت ہو جاویں گے۔ ہندوستان میں برطانوی جماعت بالکل الگ رہ جاویگی۔ اور راج ناقابل عمل ہو جائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسی انتہا پسندوں کے مطالبہ سیلف گورنمنٹ کو ماننا پڑے گا۔

یہ تھا نان کوآپریشن کا خیال۔ اور اس خیال کو نہایت قابل حامی مل گیا۔ یہ حامی موہن داس کرم چند گاندھی تھے۔ جو ذاتی تقدس کے لئے عرصہ دراز سے مشہور تھے۔ لہذا ہندو عوام میں وہ خاص مذہبی جوش پیدا ہوا جو بعض قسم کے ہندوستانی سنیاسی ہمیشہ پیدا کر سکتے ہیں۔ گاندھی کی تبلیغ کا اندازہ ان کے ایک لیکچر کے حسب ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے:۔

"ایک لاکھ گوروں کا اکتیس کروڑ پچاس لاکھ ہندوستانیوں پر حکمران ہونا جنگلہ

فصل ہفتم

اقتصادی انقلاب

موجودہ تاریخ عالم کا سب سے زیادہ دلچسپ واقعہ وہ دوہری فتح ہے جو مغرب نے مشرق پر حاصل کی ہے۔ لفظ "فتح" عموماً ایک سیاسی مفہوم میں مستعمل ہوتا ہے اور اُن افواج کی صفوف جنگ کا منظر پیش نظر کرتا ہے جو ممالک غیر کو سر کر کے دور دراز کی اقوام کو مطیع بناتی ہیں۔ بلاشبہ اس قسم کی بھی سیاسی فتوحات مشرق میں واقع ہوئی ہیں اور ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ گزشتہ صدی میں مشرق ادنیٰ اور وسطیٰ کی بے دست و پا سلطنتیں کیونکر دول یورپ کی مسلح طاقت کا سہل شکار بن گئیں۔

لیکن جس امر کا ایسا عام طور سے احساس نہیں ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سیاسی فتح کی متوازی ایک اقتصادی فتح بھی تھی جو غالباً زیادہ مکمل تھی اور جس کی قسمت میں غالباً یہ لکھا تھا کہ اس سے بھی زیادہ عمیق اور دیرپا قسم کی تبدیلیاں پیدا کرے۔

اس اقتصادی فتح کی اصلی وجہ حرفتی انقلاب تھا جس طرح سے کولمبس اور "ڈیگاما" کے بحری سفروں سے یورپ کو سمندر میں حربی فوقیت اور اُسی کی بدولت دنیا میں سیاسی فوقیت حاصل ہو گئی اُسی طرح سے اواخر اٹھارویں صدی کی صنعتی اختراعات

بلوے ہوئے اُن سے مذہبی اور نسلی تعصب کی اس دبی ہوئی آگ کا اظہار ہوتا ہے جو ہندوستانی زندگی کی تہ میں سلگ رہی ہے۔

حقیقت معاملہ یہ ہے کہ آج ہندوستان ارتقائی اور انقلابی تبدیلی کی قوتوں کی رزمگاہ ہے۔ یہ پُرشور و شر زمانہ ہے۔ پرانا نظام بالبداہتہ گزر رہا ہے اور نیا نظام ہنوز نظر نہیں آتا۔ اس وقت اچھائی اور خرابی دونوں کے بڑے امکانات ہیں۔ اور نتیجہ کے بابت کوئی شخص یقینی طور پر پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔
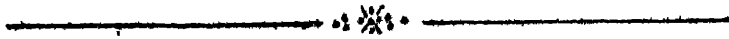
ارزاں اور تیز نقل و حرکت میں اُسی نسبت سے ترقی۔ ان دونوں اجزا سے یوروپ کی اقتصادی اور مالی حالت میں عظیم ترقی ہوئی کیونکہ یوروپ کل دنیا کا دار الصنع بن گیا۔ نفس الامر یہ ہے کہ اُنیسویں صدی میں یوروپ کا نیم دہقانی براعظم کارخانوں کا گنجان چھتہ اور اسباب و سرمایہ اور آدمیوں سے لبریز ہو کر اپنے سامان کو دنیا کے بعید ترین گوشوں میں بھیجے اور وہاں سے نئی ساخت اور تیاری کے لیے خام پیداوار کے تازہ ذخائر کھینچنے لگا۔

لہٰذا وہ مغرب جس میں اس طور کا انقلاب صنعت و حرفت ہو چکا تھا اُس مشرق کا مقابل ہوا جو اقتصادیات میں بھی سیاسیات اور حربیات کی طرح پستی اور جمود کی حالت میں تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مشرق میں کارخانہ یا کاروبار اِس مفہوم کے مطابق جیسا ان الفاظ سے آج ہم سمجھتے ہیں فی الحقیقت معدوم تھے۔ اقتصادی اعتبار سے مشرق کاشتکارانہ بنیاد پر تھا اور اقتصادی جز وہ نیم منفرد مواضعات تھے جو اپنی ضروریات کو خود پورا کر لیتے تھے مشرقی صنعت و حرفت محض ہاتھ کے ذریعہ سے ہوتی تھی اور کاریگروں کی قلیل تعداد عموماً بطور خود اور اپنے ہی نفع کے لیے کام کرتی تھی۔ اُن کی بنائی ہوئی چیزیں اگرچہ اکثر نہایت اعلیٰ قسم کی ہوتی تھیں اور زیادہ تر سامانِ عیش تھیں لیکن وہ ایسے سست اور پرانے طریقوں سے بنائی جاتی تھیں کہ اُن کی مقدار محدود اور اُن کی قیمت بازاری نسبتاً گراں ہوتی تھی۔ باوجودیکہ شرح مزدوری بہت کم تھی لیکن مذکورۂ بالا وجوہات سے ایشیا کی مصنوعات صرف دنیا کے بازاروں میں ہی یوروپی اور امریکی مشین کی بنائی ہوئی اشیاء کے ذخائر سے مقابلہ نہ کر سکیں۔ بلکہ خود اپنے مقامی بازاروں میں بھی اُن کو بہت کثیر نقصان پہونچا۔

مغربی صنعت و حرفت کے ساتھ اہلِ مشرق مقابلہ میں جو نا کامیاب رہے اُس کے اسباب طریقۂ ساخت کے علاوہ اور بھی تھے مثلاً کاریگروں کی دماغی حالت اور سرمایہ کی کمی۔ کل مشرق ادنیٰ اور وسطیٰ میں اقتصادی زندگی حیثیت کے اصول پر مبنی تھی۔ معاہدے

کی وجہ سے جس کی بدولت حرفتی انقلاب شروع ہوا۔ یورپ نے دنیا پر اقتصادی غلبہ
حاصل کر لیا۔ فی الحقیقت صنعت وحرفت کی ترقی سے دنیا نے علوم وفنون میں ایک جدید
عہد ایجادات واختراعات کا آغاز ہوا۔ اس کے نتائج تین صدی پیشتر کے جغرافی معلومات
کے عہد سے بھی زیادہ وقیع واہم تھے ان سے ہماری نسل کو قدرت کے خزائن پر ایسا
مزید قابو ہو گیا کہ اقتصادی زندگی کی آیندہ تبدیلی نے تمام چیزوں کی صورت کو کلیتاً
بدل دیا۔

فی الحقیقت یہ تبدیلی تاریخ عالم میں عدیم المثال تھی۔ اس وقت تک انسانی
مادی ترقی بتدریج تھی۔ بارود کے سوا انسان نے نہایت قدیم زمانہ سے مادی قوت
کے جدید مخرج کو نہیں کھولا تھا۔ ہمارے پردادا کے زمانہ کی گھوڑا گاڑی مصر کے گھوڑے
والے رتھوں کی ترقی یافتہ شکل تھی۔ بادبانی جہازات اپنا سلسلہ جنگ ٹرائے سے
قبل والے یولیسس کی تکونے بادبان والی کشتی تک پہونچاتے تھے اور صناعی ہنوز انسان
اور حیوان کے دست وبازو دیا ہوا اور پانی کے سادہ عمل پر منحصر تھی۔ دفعتاً یہ سب
حالت بدل گئی۔ دخان۔ بجلی۔ پٹرول اور ہرٹزی لہر نے قدرت کے مخفی قوتوں کو قابو
میں کر کے مسافت پر فتح پائی اور کرۂ ارض سکڑ کر محض ایک بالشت کا رہ گیا انسان
ایک جدید مادی دنیا میں داخل ہوا جو سلف کی دنیا سے کمیت کے علاوہ کیفیات میں
بھی مختلف تھی۔

جب میں لفظ "انسان" استعمال کرتا ہوں تو اوس سے جہاں انیسویں
صدی کا تعلق ہے یورپ کا گورا آدمی اور اُس کی نسلی آبادیاں ماورائے البحر مقصود ہیں
یہ باتیں گورے انسان کے دماغ ہی نے پیدا کیں اور لہذا ان ایجادات کے منافع سے
گورے انسان متمتع ہوئے۔ جدید نظام کی دو نمایاں مشینیں تھیں۔ اولاً کلوں سے
کارخانوں کا رواج اور اُسی کے ساتھ قلیل زمانہ میں کثیر المقدار پیداوار۔ دوم

اور میں نے مٹھی بھر اُٹھا کر اُن کو آہستہ آہستہ گرانا شروع کیا ۔ وہ ایسے چمکتے تھے جیسے دھوپ میں شبنم کے قطرے۔ تقریباً سات سو دیسی ریاستیں ہیں اور ہر رئیس کا خزانہ کم و بیش اعلیٰ پیمانہ پر ہی۔ علاوہ بریں ہر زمیندار اور ہر ہندوستانی خواہ چھوٹا ہو یا بڑا جو کچھ بھی بچا سکتا ہی اُس کو وہ اپنے پاس دھات کی صورت میں رکھتا جاتا ہی۔ نوساختہ کاغذ کے نوٹ جن کے رواج کی کوشش کی جاتی ہی شبہہ کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں بعض وقت وہ سکوں کو گلا کر اپنی بی بی کی چوڑیاں بنواتا ہی۔ اور بعض اوقات وہ اپنا روپیہ کسی اینٹ کو کھسکا کر اُس کے پیچھے چھپا دیتا ہی یا چولھے کی راکھ میں پتھر کے نیچے دبا دیتا ہی یا کہیں باہر گڈھا کھود کر دفن کرتا ہی۔[1]

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ موجودہ ہندوستان کی حالت ہی جس پر ایک صدی سے زائد برطانوی حکومت رہ چکی ہی اور مغربی خیالات کے سرایت کر جانے سے دیسی نقطۂ نظر میں نہایت اہم ترمیمات پیدا ہو گئی ہیں جن کا ذکر ہم بہت جلد کرینگے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دولت جمع کرنے کا میلان صرف ہندوستان کی خصوصیات میں نہیں ہی بلکہ کل مشرق میں عام ہی۔ تب ہم یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ ایک صدی قبل مشرق میں کاروبار میں لگانے کی اغراض کے لیے سرمایہ کیسا معدوم تھا۔ بالخصوص جب ہم یہ پیش نظر رکھیں کہ ملک کی امن کی مخدوش حالت اور سود کی مذہبی ممانعت اُن دور اندیش اشخاص کے سدراہ تھی جو اپنی جمع کردہ دولت کو تجارتی اغراض میں لگانا چاہتے تھے۔ مالی کاروبار کا فی الحقیقت ایک ہی راستہ یعنی سود خواری تھا اور قدیم مشرق کا کل قلیل رواں سرمایہ فی الحقیقت اسی کام میں لگایا جاتا تھا۔ لیکن یہ

---

[1] ایف۔ بی۔ فشر کی کتاب "ہندوستان کا خاموش انقلاب"، صفحہ مطبوعہ نیویارک ۱۹۲۰ء۔ مصنف

نہیں آتا کہ مشرقیوں نے نہایت خوب صورت[1] اور برتر دیسی مال کے مقابلہ میں کیوں مغربی کا ارزاں اور نکما مال جو مشرقی بازاروں کے لیے بالخصوص بنایا گیا تھا پسند کیا مگر اس کا جواب یہ ہے کہ عام مشرقی دست کاری کا دلدادہ نہیں ہے بلکہ ایسا غریب آدمی ہے جو فاقہ کشی کے غار کے عین کنارے کھڑا خطرناک زندگی بسر کرتا ہے وہ سستی چیزیں خریدنے کا خواہاں ہی نہیں بلکہ مجبور ہے۔ اور قیمتوں کا بڑا فرق فیصلہ کن جزو ہے بلاشبہ اس میں جدت کا عنصر بھی شامل ہے۔ اُن چیزوں کے علاوہ جو روزانہ کی استعمالی چیزوں کے بجائے رائج ہوئیں۔ مغرب نے بہت سی نئی اشیا جن کا فائدہ یا خوب صورتی نہایت دلکش ہے رائج کر دیں۔ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ سینے کی مشینیں اور مٹی کے تیل کے لیمپ بلاد مشرق کے ہر گوشہ میں کیونکر رائج ہو گئے۔ اسی نہج کی دیگر مثالیں بھی ہیں۔ فی الحقیقت مغربی صنعت کے نفاذ نے مشرقی اقتصادی زندگی کی ہر شکل کو بدل دیا ہے۔ جدید ضروریات معیشت پیدا کی گئی ہیں معیار معاشرت بلند اور قواعد مذاق تبدیل ہو گئے ہیں۔ ایک امریکی جو عمر بھر سے معاملات مشرق کا واقف کار رہ چکا ہے "اختراعات حاضرہ اور دیگر اغذیہ اور اشیا کے علم نے نئی ضروریات پیدا کر دی ہیں۔

---

[1] اگست ۱۹۲۳ء کے رسالہ "گوڈ اٹری" میں جو امپائر آرگنیزیشن کی تشویق اور ترویج کے لیے کلکتہ سے سرکاری رسالہ نکلتا ہے۔ اس پارچہ بافی کی خوبصورتی اور نفاست کا حال حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

ململ کا ایک باریک تھان جو ۱۵ گز لمبا اور گز بھر عرض کا تھا اُس کا وزن صرف نو سو گرین یعنی تقریباً ایک چھٹانک تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی نے اپنی لڑکی کو اس امر پر سرزنش کی کہ اُس کا لباس کافی ستر پوش نہ تھا باوجودیکہ شہزادی نے کہا کہ

سرمایہ کسی نفع کے کام کے لیے قرض نہیں دیا جاتا تھا۔ بلکہ عیاشی۔ آسائش تن اور ناقابلیت کے اغراض میں خرچ ہوتا تھا۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ اس سے کوئی نفع ہو، یہ تباہ کن ہوتا تھا اور اسی سے ہر قسم کے سرمایہ کے خلاف بدگمانی بڑھتی گئی۔

سو سال قبل مشرق کی اقتصادی زندگی یہ تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ متروک نظام کسی طور پر بھی اس مغرب کے عظیم مقابلہ سے عہدہ برآ نہ ہو سکتا تھا۔ جس میں کارخانہ جات سب سے پیش پیش تھے۔ ہر جگہ پر مغربی مشین کے بنے ہوئے مال کے انبار مشرقی بلاد میں آنے لگے اور دیسی سامان کو اپنے مقابلہ سے نیست و نابود کرنے لگے۔ جس طور پر قدیم مشرقی دست کاری۔ مثلاً ہندوستانی پارچہ بافی کی صنعت لنکاشائر کے سوتی کارخانوں کے تباہ کن مقابلہ سے بالکل نیست و نابود ہو گئی اسی قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

بالیقین بعض مشرقی مصنفین یہ حجت پیش کرتے ہیں کہ مغربی صنعت کی کامیابی اقتصادی وجوہات کے مقابلہ میں سیاسی وجوہات سے ہوئی اور ہندوستانی قوم پرست مندرجہ بالا لنکاشائر کے سوتی کارخانہ جات کی موافقت میں حکومت برطانیہ کی جد و جہد کو ہندوستانی پارچہ بافی کی دست کاری کی تباہی کا تنہا باعث بتاتے ہیں۔ لیکن یہ دلائل غلط معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکام کی جد و جہد سے برطانوی صنعت کی کامیابی سریع ہو گئی ہو۔ لیکن فی الجملہ یہ کامیابی لازمی تھی اس کا سب سے اچھا ثبوت یہ ہے کہ آزاد مشرقی ممالک مثلاً ترکی اور ایران میں بھی پارچہ بافی کی دست کاری مغربی مقابلہ سے اسی طرح تباہ ہوئی۔

مزید ثبوت یہ مسلمہ امر ہے کہ مشرقی اقوام نے مجموعی طور پر اپنے یہاں کے ہاتھ سے بنے ہوئے مال کے مقابلہ میں مشرقی مشین کے بنے ہوئے مال کو ترجیح دیکر خریدا۔ اکثر مغربیوں کے لیے یہ ایک معمائے لاینحل ہے۔ ان اشخاص کی سمجھ میں یہ

ایسے کم عرصہ میں تعمیر پاتے ہیں کہ اُن مواضعات کو دم مارنے کی مہلت نہیں ملتی جو صدیوں سے رسوم کی قیود میں محو خواب تھے۔ لہذا اُن اقتصادی احادین مقابلہ کے دفعتاً پیدا ہونے سے بڑا انقلاب ہوگیا ہی۔ جو لامعلوم زمانہ سے رُسوم کے پابند تھے[1]

یہ انقلاب عظیم محض مغربی اسباب کے آمد کی وجہ سے تھا۔ بلکہ مغربی سرمایہ کی ویسی ہی اہم آمد کی بدولت بھی نہ تھا۔ نفع بخش طور پر روپیہ لگانے کے مواقع اس قدر زیادہ تھے کہ مغربی سرمایہ مشرقی ممالک میں بہنے لگا۔ چونکہ مشرق میں خود سرمایۂ رواں مفقود تھا لہذا موجودہ مفہوم کے مطابق ہر اقتصادی کارروائی کی ابتدا کے لیے مغربی سرمایہ لگانا پڑا۔ ریلیں کانیں اور باغات کی قسم کی بڑے پیمانہ پر کاشتکاری اور بہت سے دیگر کام اس طور پر عالم وجود میں آئے۔ سب سے زیادہ قابل ذکر یہ بات ہی کہ شمالی افریقہ سے لیکر چین تک متعدد کارخانہ جات قائم کیے گیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے اصلی صنعتی شہر عالم وجود میں آئے جن کی مشینوں کا شور اور بلند چمنیوں کا دھواں اس کا اعلان کرنے لگا کہ مشرق بھی مغربی کارخانہ جات کی زندگی اختیار کر رہا ہی۔

مشرق کے اس صنعتی جدوجہد کے اہم معاشرتی نتائج پر فصل مابعد میں بحث کی جائے گی۔ اس فصل میں ہم اس کی اقتصادی پہلو پر غور کرنے پر اکتفا کریں گے۔ مزید براں چونکہ یہ کتاب مشرق ادنیٰ اور وسطیٰ سے متعلق ہی۔ لہذا اس میں چین اور جاپان کی صنعتی ترقی پر بحث نہ کی جائیگی مگر ناظرین کو مشرق اقصیٰ کی ترقیوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے کیونکہ یہ بھی زیادہ تر اُسی نوع کی ہیں جن پر ہم بحث کریں گے۔

---

[1] آر مکرجی کی کتاب "اقتصادیات ہند کی بنیادیں" صفحہ ۵ مطبوعہ لندن ۱۹۱۶ء مصنف

چین کا کسان پھلی کا روغن جلانے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ مٹی کے تیل کا طالب ہے ایشیائیوں کو ممالک غیر کے لیمپوں کی خریداری کا جو شوق ہے اُس کی برابری ممالک غیر کی گھڑیوں کی خواہش ہی کرسکتی ہے۔ شوقین شامی اپنے اجداد کی کچی چھتوں کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے اور فرانس سے آئی ہوئی سرخ کھپریل ہی سے خوش رہ سکتا ہے۔ ہر جگہ بدیسی بنائی ہوئی اشیا کی مانگ ہے۔ ...... علم سے ضروریات بڑھتی ہیں اور مشرق علم حاصل کر رہا ہے۔ آج وہ اُن صدہا چیزوں کا طلبگار ہے جن کا اُس کے اجداد نے نام بھی نہ سنا تھا۔

ہر جگہ ایک ہی قصہ ہے۔ ایک ہندوستانی مصنف اقتصادیات جو مغربی صناعی کا سخت دشمن ہے۔ اس امر پر اظہار رنج وغم کرتا ہے کہ "کاریگر اپنے پیشہ کو چھوڑ کر کشاورزی کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ باکو یا نیویارک کے ارزاں مٹی کے تیل نے تیلی کی ہستی کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ مسی و برنجی ظروف کو جو لامعلوم زمانہ سے مستعمل ہیں یورپ سے آئے ہوئے ارزاں تام چینی کے برتنوں سے خطرہ ہے ...... اس کے ساتھ ہی خریداروں کے مذاق میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ گُڑ چھوڑ کر صاف شکر استعمال کی جاتی ہے۔ خانہ ساز کپڑوں کو اُن کے بھدا پن کی وجہ سے ترک کر کے کلوں کے بنائے ہوئے کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ ہر ملکی صنعت و حرفت پر حملہ ہے اور اکثر تباہ ہو گئے ہیں۔ وہ مواضعات جو صدیوں سے رسمیات پر عمل گزیں تھے دفعتاً دنیا کے بازار سے اتصال پاتے ہیں۔ کیونکہ دخانی جہاز اور ریلیں جن سے سلسلہ اتصال قائم ہوا ہے

میں ململ کی ساخت تک پہنچی ہوئی ہوں (مترجم)

سلہ ڈبلیو رینڈ اسے ، یہ۔ براؤن کا مضمون "ایشیا میں اقتصادی انقلابات" ماہ مارچ ۱۹۰۶ء کے رسالہ دی سنچوری میں شائع ہوا۔ مصنف

مغربی اور مشرقی سرگرمیوں کا متحدہ نتیجہ جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں یہ ہوا
کہ مشرق میں مختلف مقامات پر بڑے کارخانوں کے مرکز پیدا ہو گئے۔ مصر کے متعلق ایک
فرانسیسی مصنف لکھتا ہے "دریائے نیل کے دونوں کناروں پر صنعتی اور شکر سازی
اور پارچہ بافی کے کارخانے بنے ہوئے ہیں ان کی دخان بار چمنیاں فلاحین کے کچے
مکانات سے اونچی نظر آتی ہیں"۔ سر تھیوڈر ماریسن ہندوستان کی بابت لکھتے ہیں
"بمبئی میں صنعتی انقلاب تکمیل پا چکا ہے۔ بمبئی موجودہ صنعتی شہر ہے جس میں موجودہ کارخانوں
کی زندگی کے عیوب اور خوبیاں دونوں بخوبی نظر آتی ہیں۔ بمبئی میں غریبوں کے غلیظ
محلے ہیں جن میں آبادی کی کثرت ایسی ہی خراب ہے جیسے کہ کسی یوروپی شہر میں۔ اس
میں ایسے مزدور پیشہ طبقے بھی ہیں جو مشین کے شور و شغب میں بہت دیر تک کام
کرتے ہیں۔ اس میں کروڑپتی بھی ہیں جن کے گراں قدر عطایا نے خوب صورت عمارات
سے اس کی سڑکوں کو مرصع کر دیا ہے دولت کی فراوانی اور میں یہ بھی کہوں گا کہ
تہذیب اور مذاق کے علامات جو بمبئی میں پائے جاتے ہیں اسے دیکھ کر اندرون

سر ولنٹائن چرول کی کتاب "ہندوستانی شورش" مطبوعہ لندن ۱۹۱۰ء۔
ڈی ایچ ڈوڈ ویل کا مضمون "ہندوستان میں اقتصادی نقل و حرکت" جو دسمبر ۱۹۱۰ء کے
رسالہ اکنامک جرنل میں شائع ہوا ہے۔ پی۔ جوش کا مضمون "ہندوستان کی موجودہ
حالت" جو جولائی ۱۹۱۰ء کے رسالہ جرنل آف ریس ڈویلپمنٹ میں شائع ہوا۔ مصنف
ایل برتراند کی کتاب "مشرقی سراب" صفحات (۲۰) و (۲۱) مطبوعہ
پیرس ۱۹۱۰ء مصنف

ان صنعتی اختراعات کی ابتدائی حالت یہ تھی کہ گویا مشرقی زمین میں خالص مغربی پودا نصب کیا گیا۔ چونکہ اس کی ابتدا مغربی سرمایہ سے ہوئی تھی لہذا اُس کا انتظام اور بندوبست بھی بالکل مغربی دماغ کر رہے تھے۔ چونکہ مشرقیوں میں موجودہ کاروبار کی روح معدوم تھی اور وہ استحصال بالجبر اور اقربا نوازی کے عادی اور فوری فائدہ کے خواہاں اور متواتر مشترکہ عمل کے ناقابل تھے۔ لہذا مغربی سرمایہ اُن کے سپرد نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن رفتہ رفتہ مغربی کاروبار کی کامیابی نے مشرقیوں پر ایسا اثر پیدا کیا کہ اُن میں سے دور اندیش اشخاص اپنا روپیہ لگانے اور کامیابی کیلئے جو امور ضروری تھے اُن کو حاصل کرنے کو تیار ہو گئے۔ فصل دوئم کے خاتمہ پر میں نے اسلامی دنیا میں موجودہ قسم کے کاروبار کی ترقی کا جو حال بیان کیا ہے وہ ہندوستان کی غیر مسلم آبادی پر بھی صادق آتا ہے۔ ہندوستان میں متعدد عناصر مثلاً پارسی اور ہندو بنیہ یعنی لین دین کرنے والے ایسے موجود تھے کہ جن کی پہلی تجارتی سرگرمیاں اور سودخواری نے اُن کو موجودہ مفہوم کے مطابق مالی اور کاروباری سرگرمیوں کی طرف مائل کر دیا۔ انھیں میں سے ہندوستان کی موجودہ دیسی کاروباری جماعتیں پیدا ہوئیں ہیں جن کی مثال کلکتہ اور بمبئی کے جوٹ اور پارچہ بافی کے کارخانہ جات اور بنگال کا ٹاٹا کا بڑا لوہے کا کارخانہ موجود ہیں۔ یہ کاروبار بالکل دیسی سرمایہ سے دیسی انتظام میں چل رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ان کامیابیوں کے علاوہ بہت سی افسوسناک ناکامیاں بھی ہوتیں ہیں۔ با ایں ہمہ یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ مغربی کارخانوں کی زندگی اب محض خارجی شے نہیں ہے بلکہ مشرقی زمین میں مستحکم طور پر جڑ پکڑ رہی ہے۔[1]

---

[1] ان امور کے لیے ملاحظہ ہو فنسٹر کی تصنیف مذکور الصدر۔ سر تھیوڈور ماریسن کی کتاب "ہندوستان میں اقتصادی نقل و حرکت" المطبوعہ لندن ١٩١١ء۔

جس میں آخر الذکر اب تک بہت آسانی سے فتحیاب ہوتے رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مغربی تجارت سے مقابلہ کرنے میں مشرق کو اس امر کا کامل احساس ہوگیا ہے کہ موجودہ طریقوں اور کلوں کے مقابلہ میں غیر ترقی یافتہ مشینوں اور طریقوں کو استعمال کرنا فضول ہے۔ اپنے پورانے دلجمعی کے خیال کو چھوڑ کر وہ اُن علوم و فنون کو حاصل کر رہا ہے جن سے مغرب کو مادی خوش حالی حاصل ہوئے۔ وہ اپنی تحقیقات کے نتائج سے عملی فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے اور عموماً مغربی طریقوں کو اپنی مختص ضروریات کے مطابق بنا کر بعض وقت اُن میں ترقی بھی کرتا ہے۔"

مشرق کی اس صنعتی روح کی بیداری کو اکثر گورے مبصرین نے بھی تسلیم کیا ہے جس زمانہ میں مذکورہ بالا مضمون لکھا گیا تھا ایک امریکی مصنف اقتصادیات دریافت حال کے لیے مشرق میں دورہ کر رہا تھا اور اُس نے یہ رپورٹ کی "ایشیا کے افلاس کے دو اصلی وجوہ ہیں۔ اولاً ایشیائی حکومتیں اپنی رعایا کو تربیت نہیں دیتیں۔ اور رعایائے ملک مشینوں کو استعمال کر کے اپنی پیداوار کی قابلیت کو نہیں بڑھاتیں۔ ایشیا کے افلاس کی ذمہ دار جہالت اور مشینوں کی عدم موجودگی اور امریکہ کے تمول کے ذمہ دار علم اور آلات جدید ہیں" یہ مصنف آگے لکھتا ہے کہ "ہم کو دیکھتے رہنا چاہیے۔ ایشیا کو ان واقعات کا اب احساس ہوگیا ہے اور اُن کے علاج کے لیے کوشاں ہے۔ لہذا ہم کو ان بیدار شدہ اقوام کی روز افزوں رقابت سے مقابلہ کرنا چاہیے جو افلاس اور مصائب میں جد و جہد کر کے طاقتور ہوگئے ہیں اور جو تجارتی فوقیت اور نسلی درستی کے لیے ہمارے رازوں کو معلوم کر کے اُن کو استعمال کرنے کے لیے کوشاں ہیں[له]" ایشیا کی اقتصادی

[له] کلیرنس پو کا مضمون "مشرق ہم کو کیا تعلیم دے سکتا ہے" جو جولائی ۱۹۱۲ء کی رسالہ ورلڈس ورک میں شائع ہوا۔ مصنف

ملک کے رہنے والے سیاح حیرت میں آجاتے ہیں۔ بھورے رنگ کے مواضعات اور کھیتوں کا لاانتہا ہی سلسلہ جن کے دیکھنے کی اُس کی آنکھیں عادی تھیں۔ اُس ہندوستان کی تصویریں ہیں جو رخصت سفر باندھ چکا ہو۔ بمبئی آنے والے ہندوستان کا پیش خیمہ ہے۔

بڑے قدرتی ذرائع کے قریب اور ارزاں مزدوری کی لاانتہا موجودگی نے مشرقی دماغوں میں بہت ہی بڑی اُمیدیں پیدا کردی ہیں۔ بعض مشرقی اس کے متمنی ہیں کہ مغربی سرمایہ اور مشرقی مزدوری متحد ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک ہندوستانی اقتصادیات کے مصنف نے اس کا پورا اظہار کیا ہے "انگریزی سرمایہ اور ہندوستانی مزدور یہ دونوں دنیا میں سب سے زیادہ ارزاں ہیں"[1]

بعض زیادہ دلیر طبائع یہ خواب دیکھتے ہیں کہ مشرق میں کارخانہ جات محض دیسی مساعی سے قائم کریں۔ اس سے مغرب کا اخراج ہی نہیں بلکہ اُس کا استیصال بھی مدنظر ہے۔ چند سال ہوئے کہ ایک ہندو نے اس رائے کا اظہار ایک مشہور ہندوستانی رسالہ[2] میں کیا تھا "ایک اعتبار سے مشرق مغرب کو فی الحقیقت دھمکی دے رہا ہے اور ایشیا اس امر میں ایسا سچا صاف باطن ہے کہ کوئی عذر و معذرت کی ضرورت نہیں۔ مشرق نے صنعت میں صنعتی جنگ کا پیام دیدیا اور اس وقت سے ایشیا کی قسمت میں ایسی تجارتی جنگ کا مشاہدہ کرنا لکھا ہے جو بتدریج شدید ہوتی جائے گی۔ مغرب والے تو مشرقی بازاروں میں اپنا قبضہ قائم رکھنے کے ساعی ہوں گے اور مشرقی یہ کوشش کریں گے کہ مغربیوں کو اُس جنگ میں شکست دیں

---

[1] سرٹی ارلین کی کتاب "ہندوستان میں اقتصادی نقل و حرکت" صفحہ ۱۰۱۔ مصنف

[2] منقول از مضمون نوشتہ جونس مذکور الصدر مصنف

[3] ہوی انڈین ریویو (مدراس) ۱۹۱۰ء مصنف

مزدوری بہت ارزاں تھی یعنی مردوں کو ساڑھے سات پنس سے لیکر دس پنس تک اور بچوں کو چھ پنس یومیہ ملتا ہے۔ بچے اور جوان بعض اوقات بارہ گھنٹے اور معمولاً پندرہ اور کبھی سولہ یا اٹھارہ گھنٹے یومیہ کام کرتے تھے۔ جب کام کی زیادتی ہوتی تھی تو بچے بھی رات کی باری میں بارہ گھنٹہ تک کام کرتے ہیں۔[1]"

ہندوستان میں بھی یہی حالت تقریباً یکساں ہے۔ ہندوستانی کارخانوں کی مکمل تحقیقات اولاً ۱۹۰۷ء میں ایک کمیشن نے کی جو کارخانہ کے مزدوروں کی حالت دریافت کرنے کو مقرر ہوا تھا۔ اس کی رپورٹ میں جو نتائج شائع ہوئے ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:۔

بمبئی کے سوتی کارخانوں میں باقاعدہ کام کرنے کے گھنٹوں کی تعداد تیرہ سے چودہ تک ہے۔

کلکتہ کے جوٹ کے ملوں میں مزدور عموماً پندرہ گھنٹے کام کرتے ہیں۔ روئی کے پیچوں کے کارخانوں میں ملازمین سترہ اٹھارہ گھنٹہ یومیہ کام کرتے ہیں۔ چاول اور آٹے کے پیچوں میں بیس یا بائیس گھنٹہ کام کرتے ہیں۔

ایک چھاپہ خانہ میں انتہائی مثال ملی جس میں سات دن متواتر ملازمین کو بائیس گھنٹہ یومیہ کام کرنا پڑا۔ شرح مزدوری یہ ہے کہ جوان جو تیرہ سے پندرہ گھنٹہ یومیہ کام کرتا ہے پندرہ سے تیس روپیہ ماہوار تک پاتا ہے۔ بچوں کی مزدوری کا بہت رواج ہے۔ اور چھ اور سات سال کے بچے نصف وقت کام کرتے جو بسا اوقات آٹھ گھنٹے روزانہ ہوتا ہے۔

اس رپورٹ کا یہ نتیجہ ہوا کہ گورنمنٹ ہند نے ایک قانون بنایا جس سے مزدوروں کی

---

[1] ایچ۔ این۔ بریلسفورڈ کی کتاب "جنگ جدید و تہذیب" صفحہ ۱۱ مطبوعہ لندن ۱۹۱۵ء۔ مصنف

حالات کا ایک دوسرا امریکی مبصر لکھتا ہے "کل ایشیا میں جدید کاروبار اور موجودہ کلوں کی ترقی کی روح سرایت کر گئی"[1] ہندوستان کے اقتصادی مستقبل کے لیے سر ٹیوڈماریسن اس نتیجے پر پہونچے ہیں "ہندوستان کے صنعتی انقلاب کا زمانہ قریب ہے طریقہائے صنعت و حرفت کے اختیار کرنے میں جو امور سد راہ تھے وہ دور ہو گئے کل ملک میں آمد و رفت کے وسائل پھیل گئے اور مشینوں کی خرید اور کارخانہ جات کی تعمیر کے لیے سرمایہ سہل شرائط پر مل سکتا ہے۔ یوروپ سے ماہرین مشین انجینیر اور کاروباری منیجر ہندوستانی کارخانہ جات کے آمدہ منتظمین کی تربیت کے لیے نوکر رکھے جا سکتے ہیں انگریزی ایسی مشترک زبان مل گئی جس میں ہندوستان کے ہر صوبہ اور مغربی دنیا کے بڑے حصہ سے مراسلت ہو سکتی ہے۔ غیر کے حملوں اور اندرونی شورش سے بیخطری بڑے کاموں کی ابتدا کا یقین دلاتی ہے۔ صنعت و حرفت کی عظیم تنظیم کے لیے سب باتیں موافق ہیں اور جب تنظیم مکمل ہو جائے گی تو ہندوستانی دولت کی سالانہ پیداوار میں ایسی افراط ہو جائے گی کہ جو اس سے پہلے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔"[2]

مشرق کی صنعت و حرفت میں ناتجربہ کاری اور غیر منافی کا بدل جو چیز سمجھی جاتی ہے وہ اسکی ارزاں مزدوری ہے مشرق کی ارزاں مزدوری اور زیادہ وقت کام کرنا مغربی ناظرین کو حیرت میں ڈالتے ہیں۔ مشرق ادنیٰ اور وسطیٰ کے صنعتی حالات کے متعلق مصر اور ہندوستان کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء [?] میں حالات مصر لکھتے ہوئے۔ ایچ۔ این۔ بریلسفورڈ انگریزی ماہر اقتصادیات لکھتا ہے "مصر میں اس وقت کوئی فیکٹری ایکٹ نہیں تھا۔ کل ملک میں روئی کے پینچ ہیں۔ جن میں سال میں چار پانچ مہینے کے لیے عارضی مزدور لگائے جاتے ہیں۔ تاکہ کپاس کو ممالک غیر میں بھیجنے کے لیے تیار کیا جاوے

[1] سی۔ ایس۔ کوپر کی کتاب "مشرق کی تجدید" صفحہ ۵ مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۴ء مصنف
[2] کتاب مذکور بصدر [?] صفحہ ۲۴۲-

پیدا نہیں کیے جن کی مشاقی اور محنت اور جفاکشی ایسی ہو جو یورپ اور امریکہ کے کارخانوں کے مزدوروں کو نقصان پہنچا سکے۔ مثلاً ہندوستان میں اگرچہ فلاکت زدہ اور کثیر التعداد آبادی ہے لیکن کارخانوں کو کافی یا قابلِ اعتماد مزدور نہیں ملتے۔ موسیو مینن کہتا ہے اتنی دیر تک کام کرنے اور ایسی سستی مزدوری ہونے کی وجہ سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی صنعت و حرفت مغربی صنعت و حرفت کے لیے خطرناک رقیب ثابت ہو گی لیکن اس کی کچھ اصلیت نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کام یہاں کیا جاتا ہے وہ خراب قسم کا ہے۔ کم مزدوری والے قلی ایسا خراب کھانا پکاتے ہیں اور کم زور ہوتے ہیں کہ ایک یورپی کی برابر کم از کم تین آدمی کام کرتے ہیں۔ علاوہ بریں ہندوستانی مزدوروں میں صرف قوت ہی کی کمی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے کام میں نہ تو مشاق ہیں نہ جی لگاتے ہیں اور نہ اس کو پسند کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں ہندوستانی ہی ایسا آدمی ہے جو چاہے کچھ کر کھائے مگر کارخانہ میں کام نہیں کرنا چاہتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ کارخانہ میں ردّی مزدور آتے ہیں۔ کارخانوں اور کھانوں میں مزدور بدرجۂ مجبوری آتے ہیں اور جو ہیں کہ وہ اپنے پہلے پیشے یا زیادہ نفع بخش کام کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو وہ کارخانوں کو چھوڑ دیتے ہیں لہذا کارخانوں کو اس کا یقین نہیں کہ اُن کو مزدور متواتر ملتے رہینگے سوال یہ ہے کہ کیا مزدوری میں اضافہ ہونے سے یہ شکایت رفع ہو جائے گی؟ اکثر مالکان یہ کہتے ہیں کہ نہیں جب مزدور کچھ ترقی کرتے ہیں تو وہ یا تو عارضی طور پر اس وقت تک کے لیے جب تک کہ اُن کا روپیہ صرف ہو جائے یا مستقلاً کسی زیادہ پسندیدہ کام کرنے کے لیے چھوڑ بھاگتے ہیں"۔ ایک ہندوستانی مصنف اقتصادیات بھی اتنا

صفحات ۲۸ لغایت ۳۰ و ۲۴۳ لغایت ۲۵۱

۲ مینن مذکورۃ الصدر صفحہ ۳۳۶۔

بالخصوص بچوں اور عورتوں کی حالت بہتر ہوئی۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں فرانسیسی ماہرِ اقتصادیات البرٹ میتن نے کامل تحقیقات کے بعد یہ رپورٹ کی کہ کارخانہ کی حالت زیادہ نہیں بدلی۔ فیکٹری کے قانون کو باقاعدہ طور پر نظرانداز کیا جاتا ہے۔ وقت بہت زیادہ اور مزدوری بہت کم ہی۔ بمبئی میں مرد دس سے بیس سینٹ یومیہ تک پاتے ہیں اور سب سے زیادہ مزدوری تیس سینٹ ہی۔ عورتوں اور بچوں کی زیادہ سے زیادہ دس سینٹ مزدوری ہی۔[1]

ایسی غیر معمولی کم شرح اور زیادہ وقت ہونے سے نظرِ اوّل میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر مشرق کو کافی سرمایہ اور جدید ترین کلیں مل جائیں تو وہ مغربی پیداوار کو مشرقی بازاروں سے ہی نہ نکال دیگا بلکہ مغربی بازاروں پر بھی حملہ کریگا۔ فی الحقیقت بہت سے مغربی مصنفین کو اسی کا خوف رہا ہی۔ تقریباً پچھتر سال ہوئے کہ گوبنیو نے یہ پیشگوئی کی کہ ایشیا سے یورپ پر صنعتی حملہ ہوگا۔[2] حال میں ماہرینِ اقتصادیات۔ مثلاً۔ ایچ این۔ برلیسفولڈ نے تنبہ کیا ہی کہ مشرقی ممالک میں کارخانوں کے دلفریب حالات سے مغربی سرمایہ منتقل ہوجانے کا خوف ہی۔ لیکن جہاں تک مشرقِ ادنیٰ اور وسطیٰ کا تعلق ہی[3] ایسا کوئی امر عالمِ شہود میں نہ آیا۔ بالیقین مغرب کو کچھ ناگوار استعجابات کا تجربہ چین سے اٹھانا پڑے[4] لیکن اسلامی دنیا اور ہندوستان نے فیکٹری کے ایسے مزدور

---

[1] موسیو لے۔ میتن کی کتاب "موجودہ ہند اور معاشرتی مطالعہ" صفحہ ۲۳۳ مطبوعہ پیرس ۱۹۱۸ء۔ مصنف

[2] اپنی کتاب مسومہ "فاسین ہیں سہ سالہ قیام" مطبوعہ پیرس ۱۸۵۵ء میں لکھا ہی۔ مصنف

[3] برلیسفولڈ مذکور الصدر صفحات ۸۳ و ۱۱۴ و ۱۱۵۔ مصنف

[4] چینی حالات کی بابتہ اور بالخصوص اہل چین کی غیر معمولی باضابطگی اور قابلیت کام کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "گوروں کے عالمگیر اقتدار کے خلاف رنگ کا اٹھتا ہوا طوفان"

ہی اصل خطرہ اور ہی ہے۔ بیں قربت کے بجائے روز افزوں بعد کا مشاہدہ کرتا ہوں وجہ یہ ہی کہ جب ہندوستان صنعتی قابلیت کے حصول کے لیئے ایک قدم بڑھاتا ہی تو مغرب دو قدم چلتا ہی۔ جب ہندوستان بائیسکل اور موٹر کا بنانا نہیں بلکہ ان کا استعمال شروع کرتا ہی تو مغرب ہوائی جہاز مکمل کر لیتا ہی۔ یہ صرف استعارہ ہی ہم کو معلوم ہی کہ جنگ نے کلوں کی ایجادات کو سریع کر دیا ہی اور کاریگروں کی آبادی پیدا کر دی ہی لیکن ہندوستان مقابلتاً ساکت و صامت ہی۔ اب تک کامل طور پر ازمنہ متوسطہ ہی کا ہندوستان ہی جس میں پرانی خانگی صنعت اور دستکاری ہی جاری ہی۔ سیدھی سیدھی کلیں بھی اس کی خاص صنعت و حرفت یعنی کاشتکاری میں ہنوز مستعمل نہیں ہوئیں۔ لیکن عمر بھر کی تنہائی کا زمانہ ختم ہو گیا اور ہندوستان اس کی طرف کبھی بھی رجعت نہیں کر سکتا یا ابہمہ مشرق و مغرب کا درمیانی غار بڑھ رہا ہی۔ سوال یہ ہی کہ اس کی تنبیں کرور آبادی کے لیئے اس تفرقہ کا کیا نتیجہ ہو گا۔ مشرق میں یہ خطرہ ہی کہ ہم تجارت کی بدترین خرابیوں کا نہایت وسیع پیمانہ پر مشاہدہ کریں گے اور ہندوستان کی بڑی آبادی ان کا شکار ہو گی یعنی مشرق دنیا کا غریب حصہ بن جائیگا"۔

خواہ یہ مایوس کن اندازہ صحیح ہو یا غلط لیکن یہ یقینی ہی کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ کل مشرق ایک عظیم تبدیلی کی منزل طی کر رہا ہی اور تبدیلی کا زمانہ ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہی۔ ہم اس وقت تک قصبات کے نئے صنعتی مزدوروں کا ذکر کر رہے تھے۔ لیکن قدیم تر معاشرتی طبقات پر بھی اسی قسم کا اثر ہی۔ پرانی قسم کے کاریگروں اور چھوٹے سوداگروں کو بھی ظاہر ا جدید صنعت اور کاروبار کے طریقوں سے خوف ہی اور کسان کچھ ہی بہتر حالت میں ہیں۔ اس میں صرف طریقہ کار ہی تبدیل

سلہ بیناگ اور فریس کی کتاب "ہندوستانی کشمکش" ۱۱۱ صفحات ۱۵ ؍ اقتباسہ ۱۹ ؍ مطبوعہ لندن ۔۔۔

بیانات کی پوری تصدیق کرتا ہے وہ کہتا ہے "ہندوستان میں بڑے کارخانے قائم کرنے میں سب سے بڑی دقت مزدوروں کی کم یابی اور ناقابلیت ہے۔ سستی مزدوری جب اس میں جسمانی قوت اور دماغی تربیت اور مشاقی نہ ہو تو بالآخر گراں ثابت ہوتی ہے۔ ہندوستانی مزدور زیادہ تر غیر تعلیم یافتہ ہیں وہ اپنے مالک یا اپنے کام سے کوئی ربط نہیں رکھتے۔ قصبات میں مزدوروں کی آبادی غیر مستقل اور غیر پیشہ ور ہے"[1]

اس طور پر ہندوستانی صنعت وحرفت اگرچہ بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لیکن وہ ابتدائی توقعات کو پورا نہ کر سکی۔ چنانچہ سرکاری سالانہ کتاب صاف صاف بیان کرتی ہے "المختصر ہندوستان ایسا ملک ہے جس میں تمام پیداوار اور صنعتی امکانات بہت کچھ ہیں۔ لیکن صناعی کی تکمیل بہت کم ہوئی ہے"[2] فی الحقیقت بعض مبصرین کو ہندوستان کا صنعتی مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی حالات کے ایک اہل الرائے انگریز نے حال میں لکھا ہے "چند سال ہوئے یہ ممکن معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان مغربی علم اور صنعتی مشاقی جلد حاصل کر کے جدید صنعت وحرفت کے طریقے حسب حال اختیار کر لے گا اور اس طور پر قریب قریب اقتصادی سطح پر پہنچ جائیگا۔ بعض لوگ مغربی دنیا کو اب بھی اس خیال سے ڈراتے ہیں کہ چین اور ہندوستان کی بڑی آبادیاں مشاق نظامات اور وسیع ذرائع اور مقابلتاً ارزاں مزدوری کی بدولت ترقی کر کے مغرب کو مفلس کر دیں گے۔ میری رائے میں یہ محض وہم

---

[1] عبداللہ یوسف علی کی کتاب "ہندوستانی زندگی اور مزدوری" صفحہ ۱۸۳ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۷ء مصنف

[2] "سنہ ۱۹۱۷ء تا سنہ ۱۹۱۸ء میں ہندوستان کی حالت" سرکاری طور پر کلکتہ سے شائع ہوئی

تکلیف دہ نہ تھا نہ بڑی دولت موجود تھی نہ اُس کے پیدا کرنے کے مواقع حاصل تھے۔ یہہ ناممکن تھا کہ ایک فرد واحد ایک بڑے گروہ کے بہت سے دماغوں اور ہاتھوں سے خدمت لیکر منفعت کثیر حاصل کرے۔ ایک بڑا انتظام قائم کرے اور اُس سے چھوٹے آدمیوں کی تعداد کثیر قلیل پیمانہ پر کاروبار کرتی تھی[1]" اس کے بعد سر ولیم ریمزے بیان کرتا ہی کہ موجودہ طریقہ ہائے کاروبار سے یہ دقیانوسی اقتصادی زندگی پارہ پارہ ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی کی ناقابل ترقی آبادی کے کل طبقات میں افلاس پھیل گیا۔

ہندوستان کی موجودہ تاریخ سے یہ بخوبی ثابت ہی کہ کاشتکاری پیشہ طبقات یعنی کاشتکار اور زمیندار دونوں یکساں طور پر تبدیل شدہ اقتصادی حالات سے کس درجہ نقصان اُٹھا رہے ہیں۔ فرانسیسی مصنف شیلے جو ہندوستانی مسائل کا مستند ماہر ہی کہتا ہی گزشتہ نصف صدی سے کاشتکاری پیشہ طبقات کے بہت سے افراد اپنی آراضیوں سے یا تو قطعاً محروم ہوتے جاتے ہیں یا اُن کی کاشتیں کم ہوکر بہت چھوٹی رہتی جاتی ہیں برخلاف اس کے جدید طبقات پیدا ہوکر اُن کی جگہ لے رہے ہیں۔ اس میں رعیت اور زمیندار دونوں مبتلا ہیں۔ پرانی قسم کے امراد زمانہ کے قدم بہ قدم نہ چل سکے وہ کاہل اور فضول خرچ ہیں۔ اور وہ زمیندار بھی جو کاشتکاری پیشہ ہیں صدیوں کی روایات کی وجہ سے ویسی ہی کوتاہ اندیش اور جاہل ہیں۔ برخلاف اس کے برٹش انڈیا کی اقتصادی حالات نئے قسم کے سرمایہ دار پیدا کر رہے ہیں جو اپنی دولت کو کسی کام میں لگانے کے متلاشی ہیں۔ ان سرمایہ داروں اور پرانے زمینداروں میں تصادم لازمی تھا اور نتیجہ ناگزیر تھا۔ دولت ہوشیار ترین کے پاس جاتی ہی۔ لہذا اراضی کا نئے مالکان کے پاس جانا ضروری ہوگیا۔ اس پر زراعتی طبقات بہت ناراض ہیں اور ان میں سے بعض تو محض

---

[1] سر ولیم ریمزے کا مضمون "اناطولیہ کے ترکی کاشتکار" جو جنوری ۱۹۱۷ء کے کوارٹرلی ریویو میں شائع ہوا۔ مصنف

نہیں ہوتا۔ بلکہ زندگی کی کل سطح نظر کی تبدیلی متضمن ہے۔ قدیم مشرق کی زندگی اگرچہ اُس میں افلاس اور مصائب تھے لیکن نہایت تن آسانی کی زندگی تھی جس میں وقت وقابلیت و پیداوار اور فروخت کا حقیقتًا کوئی خیال نہ تھا۔ بساطی اپنی دوکانوں میں پالتی مارے اپنے قلیل سامان کے بیچ میں بیٹھا ہوا نہایت خاموشی سے کاروبار کا انتظار کرتا تھا اور اپنے گاہکوں سے برابر حجت وتکرار کرتا تھا اور اگر بہت سے خریدار آجاتے تھے تو خوش ہونے کی بجائے بیزار ہوتا تھا۔ کاریگر عموماً تنہا اور بطور خود کام کرتے تھے۔ وہ اپنی حسب مرضی کام کرتا تھا۔ اور جب جی چاہتا تھا تو چھوڑ دیتے تھے۔ کسان علی الصباح اٹھتے تھے لیکن دوپہر کو وہ خود اور اُن کے مویشیان آرام کرتے تھے اور سہ پہر کو ٹھنڈا ہونے تک سوتے تھے۔ زاں بعد ذرا لوٹ پوٹ کر نہایت آرام اور لاپروائی کے ساتھ پھر کام پر چلے جاتے تھے۔

ایسے آدمیوں کو ہماری اقتصادی زندگی کی جلد بازی و باقاعدگی اور باضابطگی تکلیف دہ، خلاف مزاج ہے اور نہایت آہستگی اور سخت ترین ضرورت کی حالت ہی میں ان عادات کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال یہ اُن اشخاص کے مقابلے کی وجہ سے نقصان اُٹھا رہے ہیں جو اقتصادی جنگ میں بر تر سامان سے آراستہ ہیں۔ سر ولیم ریمزے نے نہایت دلکش مرقع اس امر کا کھینچ دیا ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں علاوہ اہلِ مغرب کے اُن دیسی عیسائی یعنی آرمینیوں اور یونانیوں کے اقتصادی دباؤ سے جن میں مغربی کاروباری خیالات اور طریقے کلیتاً نافذ نہیں ہوسکتے ہیں ایشیائے کوچک کی ترکی آبادی زمیندار اور تاجر سے لیکر کسان تک کس درجہ رو بہ انحطاط ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قدیم حالات میں ایشیائے کوچک میں نہ کوئی اقتصادی ترقی تھی اور نہ تجارتی۔ سال بہ سال پرانی حالت قائم تھی۔ سیدھا کاروبار جو کچھ بھی ہوتا تھا وہ ترقی یافتہ مغربی طریقۂ کاروبار اور مغربی تمدن کے خلاف تھا۔ لیکن یہ عوام کو

گورنمنٹ برطانیہ اور دیسی فرمانرواؤں دونوں نے ایک دوسرے سے بڑھ کر یہ کوشش کی ہی کہ مغربی زراعتی خیالات اور طریقہ جاری کیے جاویں اور چونکہ ہندوستانی دستکاروں کے مقابلہ میں ہندوستانی کسان زیادہ صلاحیت والے ثابت ہوتے ہیں۔ لہذا کسانوں کا ہوشیار تر نمونہ پیدا ہو رہا ہی جو زمانہ کے قدم بہ قدم چل سکیگا[1]۔ اس کی اچھی مثال دیہاتی

---

[1] میری رائے میں مصنف نے کاشتکاروں کی بابت غلط رائے قائم کی ہی۔ ہندوستان میں نہ جدید طریقۂ کاشت نے کوئی اثر پیدا کیا ہی اور نہ اس طرف کوئی کوشش ہوئی بلاشبہ گورنمنٹ نے منصوبہ رسم قائم اور افسران متعین کر دیے ہیں جو ہر قسم کی امداد کاشتکاران کو دے سکتے ہیں لیکن سب سے اہم مسئلہ تو کاشت کی بیجا ئیت کا ہی۔ جس کی طرف نہ کوئی توجہ ہوئی ہی اور نہ نتیجہ کی جلد امید ہی۔ غالباً مصنف کو یہ غلط فہمی کواپریٹو کریڈیٹ سوسائٹی کے قیام سے ہوئی ہی۔ بلاشبہ ان جماعتوں نے شرح سود میں کمی کر دی لیکن واقعہ یہ ہی کہ ان جماعتوں سے بھی ۹۰ فی صدی قرضہ محض خانگی ضروریات کے لیے دیا جاتا ہی اگرچہ ان کا مصرف امور کاشت دکھایا جاتا ہی۔ صنعت و حرفت میں جو کچھ ترقی ہی وہ صحیح ترقی ہی اور اس کی مزید توسیع کی امید بھی ہی کیونکہ اس کا تعلق تعلیمیافتہ طبقے سے ہی۔ کاشتکاری کا تعلق بالکل جاہل اور عیش پسند طبقے سے ہی۔ کاشتکار خود جہالت میں غرق ہی اور اس کا زمیندار عیش پسندی میں مبتلا۔ کاشتکار کو ایسی مقدرت نہیں کہ وہ خود اپنی بہبودی کا راستہ نکالے اور زمیندار کو اپنی لغویات سے فرصت نہیں۔ اگر کہیں یہ باتیں معدوم بھی ہیں تو قطعات کاشت کے اجتماع اور استحکام میں موجودہ قوانین جو ملکی رسوم پر مبنی ہیں سدراہ ہیں۔ ہر مہتمم بندوبست کو اپنی رپورٹ میں اس کا مرثیہ لکھنا پڑتا ہی کہ قطعات اراضی نہایت تیز اجزا میں منقسم ہو رہی ہی اور اوسط کاشت کم ہوتا جاتا ہی۔ اگرچہ اس کا علاج اب قطعاً اہالیان ملک کے ہاتھ میں ہی لیکن کوئی توجہ نہیں کی جاتی اب مجالس وضع قوانین میں ہندوستانیوں کی کثرت ہی اور ان کا فرض ہی کہ وہ اس طرف توجہ کرکے ان عیوب کو مٹائیں۔ اب وہ کسی قانون کی خرابی کا گورنمنٹ کو ذمہ دار نہیں بنا سکتے۔ کیا

کاشتکاری کے مزدور رہ جائیں گے[۵۱]

ہندوماہر اقتصادیات مسٹر مکرجی ہندوستانی گاؤں کی تنزل اور تجزیہ کی تصویر یوں کھینچتا ہے" دیہاتیوں کے دماغوں میں جدید اقتصادی خیالات اثر پیدا کر رہے ہیں بعض تو غیر ملکی مقابلہ کی وجہ سے اپنے پیشے چھوڑنے پر مجبور ہوئے لیکن زیادہ تر اپنے موروثی پیشے کو تو دہی ترک کر رہے ہیں۔ شہروں میں جاکر سرکاری ملازمت یا کسی پیشے کی تلاش کرتے ہیں متوسط طبقے کے لوگ بھی مواضعات کو چھوڑ کر کل ملک میں کسب معاش کے لیے پھیلتے جاتے ہیں۔ کسان اپنی موروثی زمین کو چھوڑ کر ایسے زراعتی مزدوروں کا طبقہ قائم کرتے جاتے ہیں۔ جن کے پاس کوئی اراضی نہیں ہے۔ مواضعات اپنے بہترین خون کے نکل جانے کی وجہ سے پژمردہ و مردہ ہوگئے۔ دیہات سے شہروں کی طرف جو نقل وحرکت ہو رہی ہے اس سے ہم لوگوں کی عادات اور مطامح نظر ہی میں انقلاب کلی نہیں پیدا ہو رہا ہے۔ بلکہ اس کے اقتصادی نتائج اس سے کہیں زیادہ نازک ہیں جو عموماً خیال کی جاتی ہیں اس نے ہمارے اوسط طبقے کو نوکری و چاکری کا غلام بنا لیا ہے اور ہمارے زمینداروں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا ہے اس نے ہمارے سامان خوراک کی فراہمی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اور اس سے ہماری دستکاری کے علاوہ ہمارے قومی صنعت و حرفت یعنی زراعت بھی معرض خطر میں ہے۔[۵۲]

خوش قسمتی سے یہ آثار نمایاں ہیں کہ کم از کم ہندوستانی زراعت میں نقل و حرکت کا زمانہ تکمیل پاکر ختم ہو رہا ہے اور یہ امید ہے کہ حالت بہت جلد رو بہ اصلاح ہو جاویگی

---

۵۱ جے۔ شیلی کی کتاب "برٹش انڈیا کی مسائل حکمرانی" صفحہ ۲۳۹۔ (انگریزی ترجمہ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۳ء) مصنف

۵۲ مکرجی مذکورہ صدر۔ مصنف

لیکن یہ روشن زراعتی مستقبل ہنوز دور ہے اور صنعت و حرفت میں تو اور بھی دور ہے۔ فی الحال انقلابی مشرق مصائب اور شورش سے لبریز ہے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اکثر مشرقی اپنے مصائب کو اقتصادی تبدیلی کے عمل سے منسوب نہیں کرتے بلکہ اُس کی وجہ یورپی حکومتوں کے سیاسی تسلط اور مغربی سرمایہ کے اقتصادی جلب منفعت بتلاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مغربی اقتصادی اور سیاسی تسلط سے خلاصی کے لیے شورش پیدا ہوتی ہے۔ فصل دویم کے خاتمہ پر ہم نے اس تحریک کا ذکر کیا ہے جو مسلمان اقوام میں "اقتصادی بین الاسلامی تحریک" کہلاتی ہے۔ ہندوستان کے ہندوؤں میں بھی اس قسم کی تحریک پیدا ہوئی ہے جو سودیشی تحریک کہلاتی ہے۔ حامیان سودیشی کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان کی اقتصادی خرابیاں محض اس وجہ سے ہیں کہ ہندوستان کی دولت انگلستان اور دیگر بلاد مغربی کو کھنچی چلی جارہی ہے لہذا وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انگریزی مال کو بائی کاٹ کیا جاوے۔ حتیٰ کہ برطانیہ ہندوستان کو سیلف گورنمنٹ عطا کرے۔ "سیلف گورنمنٹ" مل جانے پر ان کی تجویز ہے - کہ ہندوستانی پیداوار کے لیے حفاظتی محصول لگائے جائیں۔ برطانوی سرمایہ کی سرگرمیوں کو روکا جاوے اور بڑے مشاہرے پانے والے برطانوی حکام کے بجائے دیسی مقرر کیے جاویں تا کہ ملک ہندوستان کی دولت گھر کی گھر میں رہے[1]

(بسلسلہ گزشتہ) وکٹوریہ کے ہندوستان کی اقتصادی تاریخ مطبوعہ لندن ۱۹۰۶ء۔ ایچ ایچ گھوش کی کتاب "صنعت و حرفت کی ترقی" مطبوعہ کلکتہ ۱۹۱۰ء۔ پی سی رائے کی کتاب ہندوستانی فلاکت کا مسئلہ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۵ء۔ ایم جی رانیڈے کی کتاب "ہندوستانی اقتصادیات پر مضامین" مطبوعہ مدراس ۱۹۰۲ء۔ جادوناتھ سرکار کی کتاب "برٹش انڈیا کی اقتصادیات" مطبوعہ کلکتہ ۱۹۱۱ء۔ مصنف

[1] حامیان سودیشی کے خیالات کا بہترین اقتباس اُس کتاب میں ہے جس میں کل سودیشی لیڈران کی تقریریں جمع ہیں کتاب تحریک سودیشی یعنی نقل مجلس کہلاتی ہے جو ۱۹۱۰ء میں مدراس میں طبع ہوئی مندرجہ بالا مہریت اقتصادیات یعنی گھوش دمکرجی ورائے دسرکار اور نیز قوم پرست شورش انگیز لالہ لاجپت کی مختلف تصانیف ملاحظہ ہوں۔ موسیو گلوٹز کے مضمون "ہندوستان میں سودیشی تحریک" میں جو جولائی ۱۹۱۰ء کے رسالہ ریویو دو موامیں شائع ہوا ہے عمدہ اور مختصر تفسیر ملتی ہے۔ مصنف

کوآپریٹو، کریڈیٹ سوسائٹی کی ترقی ہی۔ گورنمنٹ برطانیہ نے اولاً اس کو ۱۹۰۴ء میں شروع کیا اور ۱۹۱۵ء میں سترہ ہزار سے اونچی ایسی جماعتیں قائم ہو گئیں جن کے ممبران کی تعداد آٹھ لاکھ پچیس ہزار اور سرمایہ تین کروڑ ڈالر تھا۔ یہ زراعتی جماعتیں کاشتکاری کے آلات چارہ، بیج کھاد کی فراہمی۔ کنوؤں کی تیاری۔ مغربی زراعتی کلوں کی خریداری اور اشد ضرورت کی حالت میں ذاتی اخراجات کے لیے قرض دیتی ہیں جن اضلاع میں یہ جماعتیں قائم ہو گئی ہیں سود خواری کا طاعون جو بیئے پھیلاتے تھے کم ہو گیا ہی اور شرح سود جو پہلے تباہ کن تھی یعنی بیس سے لیکر چھتر فی صدی تک تھی کم ہو کر لغایتہ ۱۸ فی صدی رہ گئی ہی۔ بلاشبہ اس وقت تک ایسی صورتیں بڑے خوفناک قاعدے کے محض استثنا ہیں مگر یہ سب روشن مستقبل کا پتہ دیتے ہیں۔[1]

(بسلسلۂ صفحۂ گزشتہ) یہ مسئلہ جو ہندوستان کی حیات کا مسئلہ ہی آزادی مطالع سے کم اہم ہی اس سے ممبران کونسل کی لاپروائی اینگلو انڈین اخبارات کے اعتراضات کو حق بجانب ثابت کرتے ہیں کہ اہلِ ہند سیاسیات کو محض حصول اقتدار و اختیار کا وسیلہ سمجھتے ہیں اور اپنی ذمہ داری کا کافی احساس نہیں کرتے (مترجم)

[1] ہندوستان میں کوآپریٹو تحریک کی بابتہ ملاحظہ ہو فشر کی کتاب "ہندوستان میں خاموش انقلاب" صفحات ۴۷ لغایتہ ۵۸۔ آر۔ ای۔ یونک کا مضمون "ہندوستان کی کوآپریٹو تحریک" جو اپریل ۱۹۱۶ء کے رسالۂ کوارٹرلی ریویو میں شائع ہوا ہندوستان کی زراعتی اور صنعتی دونوں قسم کے اقتصادی مسائل کو کثیر التعداد ہندوستانی ماہرین اقتصادیات نے نہایت غور سے مطالعہ کیا ہی ان میں سے بعض کی تصانیف نہایت دلچسپ ہیں۔ گوکھلے اور یوسف علی خاں کی تصانیف کے سب سے زیادہ قابل الذکر کتابیں حسب ذیل ہیں :۔ دادا بھائی نوروجی کی کتاب "ہندوستان میں افلاس اور برطانوی روایات کے خلاف حکومت" مطبوعۂ لندن ۱۹۰۱ء۔ آر سی دت کی کتاب "عہد

اندر قائم شدہ کارخانوں اور کلوں کی پیداوار دیشی صنعت کا اُسی شدت سے گلا دبا دیگی جیسا کہ زمانۂ گزشتہ میں لنکا شائر اور برمنگہم کی پیداوار نے دبایا[۵]۔

پرمتھانا تھ بوس[۱] ہندو مصنف نے جو نکتہ چینیاں کی ہیں وہ اس سے بھی زیادہ بیخ کن ہیں۔ مسٹر بوس کہتے ہیں کہ "نقصان" ہندوستان کو تباہ کرتا ہو لیکن کیا ہوم رول کا وہ پروگرام جس کو اکثر صاحبان تحریک سودیشی نے بنایا ہو۔ ہندوستان کی اقتصادی خرابی کو دور کریگا۔ یہ لوگ ہوم رول میں حسب ذیل امور کریں گے۔

(۱) حکومت میں انگریزوں کی بجائے ہندوستانیوں کو مقرر کرنا۔

(۲) ہندوستانی پیداوار پر حفاظتی محصول لگانا

(۳) ہندوستانی صنعت کی ترویج کے لیے سلطنت کی طرف سے ہمت افزائی کرنا

(۴) صنعتی تعلیم کی اشاعت کرنا۔

اب دیکھنا یہ ہو کہ ان امور کا کیا عمل ہوگا۔ برطانوی افسران کے بجائے ہندوستانیوں کے تقرر سے صرف میں ایسی کمی نہ ہوگی جیسا کہ حامیان ہوم رول خیال کرتے ہیں۔ ہندوستانی حکام اعلیٰ نے جو اس وقت موجود ہیں یوروپی طرز معاشرت کو اختیار کر لیا ہو لہذا نئے افسران کی جماعت پر بھی تقریباً اُسی قدر صرفہ ہوگا جتنا کہ سابق میں ہوتا تھا۔ نیز مرفہ الحال ہندوستانی حکام جو مثال قائم کرینگے اُس کا اثر ہندوستانی سوسائٹی میں اب سے زیادہ پیدا ہوگا اور مغربی اشیا کا مطالبہ نسبتاً بڑھ جائیگا۔ لہذا اجانب کی تجارتی جلب منفعت صرف اُسی طرح سے جاری نہ رہیگی جیسا کہ یوروپینوں کی موجودگی میں تھی بلکہ عجب نہیں کہ بڑھ بھی جائے۔ رہا حفاظتی ٹیکس اگر یہ ہوا تو یوروپی سرمایہ ہندوستان میں آجائیگا۔ مزدوروں

---

[۵] جے رمزے میکڈانلڈ کی کتاب "گورنمنٹ ہند" صفحہ ۱۴۳ مطبوعہ لندن ۱۹۱۹ء۔ مصنف

[۱] جو ۱۹۱۹ء میں بمقام کلکتہ ماڈرن ہندوستانی ریویو میں شائع ہوا۔ مصنف

مگر ان حامیانِ سودیشی کے دلائل کے جانچنے سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ ہندوستان کی خرابیوں کی یہ کافی وجوہات نہیں ہیں یہ خرابیاں زیادہ تر زمانہ کے عام اقتصادی رفتار کی بدولت ہیں۔ اور برطانوی تعلق کے کسی خرابی کی بدولت نہیں ہیں۔ برطانوی حکومت اور برطانوی سرمایہ کی قیمت تو ضرور زیادہ ہی۔ قیامِ امن اور تحفظ اور ترویجِ ترقی کے لیے برطانیہ کی مسلمہ قابلیت کو دیکھتے ہوئے دیسی حکومت اور دیسی سرمایہ کی ارزانی کے مقابلہ میں کچھ گراں نہیں۔ چنانچہ سر ٹی مارِیسن نے اس کو خوب بیان کیا ہی "برطانوی بحری قوت اور برطانوی ساکھ سے جو ہندوستان کو فائدے ہیں وہ اُن اخراجات کا کافی بدل ہیں جو انگریز ملازمین کی پنشنوں اور انعاموں میں صرف ہوتے ہیں ہندوستان برطانوی سلطنت کے سلسلے سے مالی نفع اُٹھاتا ہی لہذا میں اس سوال کا کہ ہندوستان ممالک غیر میں صرف کرنے سے کیا اقتصادی نفع اُٹھاتا ہی یہ جواب دونگا کہ ہندوستان جدید صنعت و حرفت کا سامان پاتا ہی اور اس کو ایسی حکومت ملتی ہی جو اقتصادی ترقی کے لیے موزوں ہی اور اس سے سستی ہی جو وہ خود قائم کرسکتا ہی"[1] اگرچہ جاپان کے بڑے مدافعتی بجٹ اور کمتر ساکھ اور پبلک اور پرائیویٹ قرضہ جات کے بڑی شرح سود سے مقابلہ کیا جاوے تو یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر ہوجاتا ہی۔

فی الحقیقت بعض ہندوستانی خود ہی سودیشی دلائل کی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ چنانچہ اُن میں سے ایک لکھتا ہی "نام نہاد اقتصادی "نقصانات" بے اصل محض ہیں زمانہ حال کی اکثر گرانیِ معیشت کی بدولت ہیں اور یہ صورت کل دنیا میں ہی"[2] اس کے ثبوت میں دیگر مشرقی ممالک بالخصوص جاپان[3] کی حالت کو نقل کیا ہی۔ برطانوی لیبر لیڈر ریمزے میکڈانلڈ نے جو ہندوستان کا بڑا دوست ہی یہ لکھا ہی "ایک بات بالکل ظاہر ہی کہ درآمد پر محصول لگانے سے نہ ہندوستان کی قدیم دستی صنعت اور نہ دیہات کی دست کاری دوبارہ زندہ ہوگی۔ خود ہندوستان کے

---

[1] سر ٹی مارِیسن کی کتاب "ہندوستان کا اقتصادی نقشہ" صفحہ ۲۴۰، ۲۴۱۔ نیز ملاحظہ ہو سر ویلنٹائن چرول کی کتاب "شورش ہند" صفحات ۲۵۵ لغایت ۲۶۴۔ ولیم ارچر کی کتاب "ہندوستان اور مستقبل" صفحہ ۱۳۱ لغایت ۱۴۸

[2] سید سردار علی خان کی کتاب "موجودہ ہندوستان" صفحہ ۔۔ مطبوعہ بمبئی ۱۹۰۸ء

اور کم وبیش تباہ کن پیشوں کا شوق پیدا کر کے اُن کی قابلیت کو گھٹا دیا۔ اُن لوگوں نے دیسی صنعت وحرفت کو براہ راست یا دیگر طور پر ترقی دینے کی بجائے اُس کے انحطاط کو تیز کر دیا اور اس طرح اپنے اور اپنے ملک کی اقتصادی دقتوں کو اور بڑھا دیا۔ جس چیز کی انھیں سب سے زیادہ ضرورت ہی وہ غذا ہی اور جدید ہندوستان چاہتا ہی کہ اُن بھوکوں کو اُس چیز کے دینے میں گورنمنٹ سے بھی آگے بڑھ جائے جسے تعلیم کہتے ہیں۔ لیکن اس تعلیم سے اُن کی کسب معاش کی قابلیت میں اضافہ نہیں ہوتا ہی بلکہ اُن میں وہ شوق اور عادتیں پیدا ہوتی ہیں جن کی بدولت وہ دیسی مصنوعات کی تحقیر کرتے ہیں اور اجنبی چال باز سرمایہ داروں کے متمتع کا شکار بن جاتے ہیں۔ دیسی صنعت وحرفت محض سیاسی اور اقتصادی وجوہات سے معدوم نہ ہوتی۔ اگر اُن کو اُس تبدیلِ مذاق سے مدد نہ ملتی جو مغربی ماحول نے پیدا کیا اور اس ماحول کا زبردست عنصر بہ نام نہاد تعلیم ہی

اس سبب سے مسٹر بوس اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ جن اصلاحات کے ہوم رول والے حمایت کرتے ہیں اُن سے ہندوستان کے مرض کا علاج نہ ہوگا۔ فی الواقع اس کا ہی امکان ہی کہ ہندوستان مغربی تمدن کے جال میں ایسا پھنس جائے کہ کبھی نکل ہی نہ سکے اور اُس کو کوئی ایسا نفع بھی نہ پہونچے جو کافی بدل ہو اور مغرب کی گرفت اُس پر ایسی مضبوط ہو جائے کہ آخر کار اُس کا فشار ہو جائے۔ لہذا مسٹر بوس کی رائے میں ہندوستان کو صرف یہ کرنا چاہیے کہ ہر مغربی شے سے انحراف اور قدیم ماضی کی طرف رجعت کامل کرے۔ چنانچہ اس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:۔

"ہندوستان کی نجات سیاسیات کے دائرہ کے اندر نہیں بلکہ اُس کے باہر ہی۔ اُس کی مکتی اُس میں نہیں ہی کہ وہ عہد حاضرہ کی

جانب منفعت کرکے منافع کو بٹور لے جائیگا۔ ہندوستان نے دیسی صنعت و حرفت کی ترقی میں مقابلتاً کسی قابلیت کا اظہار نہیں کیا ہے۔ بلاشبہ ارزاں مزدوری کی بدولت بہت سے ہندوستانی نفع اُٹھائینگے۔ لیکن یہ نفع اُٹھانے والے اُن کروڑوں کا دسواں حصہ بھی نہ ہوں گے جو فاقہ کشی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس صنعتی ترقی سے بہت سے جدید معاشرتی خرابیاں پیدا ہونگی۔ سلطنت کی جانب سے صنعت و حرفت کی ہمت افزائی کی بابت یہ ہے کہ یہ حفاظتی ٹیکس سے بھی زیادہ مغربی سرمایہ کو یہاں کھینچ لائیگا۔ نتیجہ وہی ہوگا جو اوپر لکھا جا چکا ہے۔ رہا صنعت و حرفت کی تعلیم یہ ضرور نہایت اچھا خیال ہے۔ مگر مسٹر بوس کہتے ہیں " لیکن ڈر یہ ہے کہ اس تحریک میں بہت تاخیر ہوگئی۔ گذشتہ ۳۰ سال میں مغربی اور جاپانی صنعت و حرفت میں ہم سے اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ اب ان سے مقابلہ کرنا ہر سال مشکل تر ہوجاتا ہے "

اصل میں مسٹر بوس مغربی تعلیم کے اُس پورے نظام پر نکتہ چینی کرتا ہے جو ملک ہندوستان میں رائج ہے۔ نہ تو اعلیٰ اور ادنیٰ تعلیم اکسیر ثابت ہوئی ہے " اعلیٰ تعلیم سے ہماری جماعت کے قلیل حصے کو فائدہ پہونچا ہے جس میں چند ہزار مرفہ الحال وکلاء۔ ڈاکٹر۔ اور ملازمان سرکاری ہیں۔ لیکن اُن کے پیشے کم و بیش بے ثمر یا مضر قسم کے ہیں لہذا ان کی مرفہ الحالی سے کل ہندوستان کی ترقی کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے چونکہ اُن کی مرفہ الحالی کے تناسب سے بدیسی اشیاء کے متعلق اُن کا مذاق بلند ہوتا جاتا ہے۔ لہذا وہ ملک کے اقتصادی نقصان کو گھٹانے کی بجائے بڑھا رہے ہیں جو ہمارے افلاس کے خاص اسباب میں سے ایک سبب ہے " اور نہ ابتدائی تعلیم نے فی الجملہ عوام کی خوش حالی میں زیادتی کی اس سے کاشتکاران میں یہ قابلیت نہ پیدا ہوئی کہ ایک بالی کے بجائے دو پیدا کرتے برخلاف اس کے اس تعلیم نے خواندہ مزدوروں میں جو اپنے طبقے کے سرمایہ ناز تھے اون کی موروثی طرز معاشرت اور ہمیشہ سے بدشوقی اور فضولیات اور نمائشی تکلفات

بڑے بڑے پروگرام بنائے ہیں۔ جن میں ہند و تصوف و ذات اور مغربی صنعت و حرفت اور اشتراکیت کی آمیزش ہے۔[1] یہ تجاویز پرلطف تو بہت ہیں مگر معقول نہیں ہیں۔ ان کے مصنفین کو یہ پرانا مقولہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ناممکن ہے کہ تم اپنی مٹھائی کھا بھی لو اور بچا بھی لو۔ جب ہم قدیم مشرق اور جدید مغرب کے اقتصادی نظام کے عظیم اور بے پایاں فرق کو محسوس کرتے ہیں تو یہ کوشش کرنا کہ ان دونوں کے پسندیدہ باتوں کو متحد اور اُن کی خرابیوں کو ترک کریں ایسا ہی ہے جیسے کہ قطبین کو ملانا یا دائرہ کا مربع بنانا۔ چنانچہ لوز ڈکنسن عاقلانہ نتیجہ اخذ کرتا ہے۔" تمدن ایک شے کامل ہے اُس کے فنون اُس کا مذہب اُس کی طرز معاشرت سب چیزیں اُس کی اقتصادی اور صنعتی ترقی سے وابستہ ہیں۔ مجھے شک ہے کہ کوئی قوم ایسا کرسکتی ہے کہ ان میں سے کچھ چن لے اور کچھ چھوڑ دے۔ مثال کے طور پر آیا مشرق یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم مغرب کے جنگی جہازوں اور کارخانوں اور طب کو تو لینگے لیکن ہم اُس کی معاشرتی پریشانی۔ اُس کی جلد بازی خستگی۔ بدصورتی اور زیادہ از ضرورت سرگرمی عمل کو نہ لیں گے .... مجھے امید ہے کہ مشرق خواہ مخواہ ان کل افراط و تفریط میں ہماری تقلید کرے گا اور تمدن کے اعلیٰ حصول کے لیے اُس کو بھی وہ ہی سب مراتب

---

[1] گرجی و لاجپت رائے مذکور الصدر کی تصانیف میں اس کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ مصنف

بڑی اقوام میں ہونے کی تمنّا کرے بلکہ اُس کو اپنی منکسرانہ حالت کے طرف عود کرنا چاہیئے۔ میرے خیال میں تنہائی کی پر عظمت حالت ہی اُس کی کمی اس میں نہیں ہی کہ وہ مغربی عدل کی راہ پر چلے بلکہ جہاں تک ہوسکے اُس سے دور رہے اور نہ اس میں ہی کہ مغربی تمدن کے بار یک بنتے ہوئے پھندوں میں روز بہ روز پھنستا جائے۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہو اُس سے بچے۔

مسٹر بوس کے زبردست نتائج یہ ہیں۔ ان ہی نتائج پر دیگر ہندوستانی حامیان نظریات مثلاً رابندرا ناتھ ٹیگور ایک حد تک پہونچے ہیں۔ لیکن اصلیت یہ ہی کہ یہ منصوبے نظری طور پر کتنے ہی دلفریب کیوں نہ ہوں محض خواب وخیال ہیں۔ اُن کنارہ کش افراد کی طرح جو سوسائٹی سے ترک علائق کرکے جوگیوں کی طرح جنگل میں رہتے ہیں کوئی کُل کی کُل قوم بلاوجہ دنیا سے قطع تعلق نہیں کرسکتی "عزلت نشین" اقوام کا دور ختم ہوگیا۔ یہ حالت ہندوستان اسپسے بڑے ملک کے لیے بالکل نا ممکن ہی جو مشرق کے چوراہے اور سمندر کے کنارہ پر واقع ہی اور جس میں مغربی خیالات کامل طور پر سرایت کرگئے ہیں۔

ہندوستانی طبائع میں عزلت گزینی کے جو میلانات قوی موجود ہیں اُن پر ایسی تنقیدات سے بڑا اثر ہوا۔

یہ لوگ اگرچہ نتائج میں اتفاق رائے نہیں کرتے۔ لیکن یہ کوشش ضرور کرتے ہیں کہ ایک طریقہ کار نکالیں جس کی رو سے قدیم نظام کی ہر پسندیدہ شئے کو قائم رکھ کر مغربی مخصوص اطوار سے بچیں اور اسی غرض سے ان لوگوں نے "جدید نظام" کے

فصل ہشتم

(معاشرتی انقلاب)

فی زمانناً مشرق کی جو قلب ماہیت ہو رہی ہے اس کی نوعیت کی اس سے بہتر کہیں بھی تصدیق نہیں ہوتی جیسی کہ ان انقلابات سے جو اس کی اقوام کی معاشرت میں پیدا ہوگئے ہیں۔ مغرب کا وہ قوی اثر جو دستور ہائے حکومت، سیاسی ادراکات، مذہبی عقائد اور اقتصادی اعمال کو ترمیم کر رہا ہے، امور معاشرتی کی صف میں بھی ویسا ہی زبردست ثابت ہو رہا ہے۔ اس کتاب کی تیسری فصل میں ہم نے یہ کوشش کی تھی کہ مذکورۂ بالا اصناف میں مغربی اثرات کا عام تذکرہ کریں۔ موجودہ فصل میں ہم ان معاشرتی انقلابات پر مفصل غور کرنے کی کوشش کریں گے جو آج پیش آ رہے ہیں۔

یہ معاشرتی انقلابات نہایت عظیم ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض ایسے نمایاں نہیں ہیں جیسے کہ دیگر اصناف کے انقلابات۔ مشرق میں رسم و روایت کا اثر افراد، خاندان اور اجتماعی حیات پر ایسا گہرا ہے کہ مشرق کے سطحی ناظرین یہ دعویٰ کرنے کی طرف مائل ہیں کہ ان امور میں کوئی بڑی تبدیلی ہی نہیں ہوئی ہے۔ باوجودیکہ بیرونی و مادی پہلو میں یہ تبدیلیاں صاف ہویدا ہیں۔ لیکن مشرق کے بڑے واقف کار اس سے مختلف ہیں۔ اور خود مشرقیوں کی یہ رائے بڑے شد و مد سے نہیں بنتے یعنی عموماً ان عظیم معاشرتی انقلابات ہی پر زور دیتے ہیں جو واقع ہو رہے ہیں۔ اور انہیں لوگوں کی رائیں زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ یہ کہنا کہ مشرق

براہ راست طے کرنا پڑیں گے جو ہم کو طے کرنا پڑے تھے"[1]

یہ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ کثیر شہادت کی بنا پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرق اپنے اس عہد کے انقلابی عمل میں مغرب کی تقلید کریگا۔ غالباً ہماری بعض بیّن غلطیوں سے احتراز کریگا۔ لیکن فی الجملہ انھیں طریقوں کو اختیار کریگا۔ اور جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں یہ تبدیلی مشرقی زندگی کے ہر صنف کو ترمیم کر رہی ہے ہم نے اُس عمل کا ذکر کر دیا ہے جو مذہبی سیاسی اور اقتصادی اصناف میں برسرکار ہے اب ہم کو معاشرتی پہلو کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

---

[1] جی لونز ڈکنز کی کتاب "ہند و چین و جاپان کے تمدنوں پر ایک مضمون" صفحات ۸۴ و ۸۵ مطبوعۂ لندن ۱۹۱۴ء۔ مصنّف

باوجودیکہ اس زمانہ میں قسطنطنیہ حمیدی حکومت کے بدترین استبداد میں مبتلا تھا۔ وہ لکھتا ہے "میں بار بار اپنے دل میں یہ سوال کرتا تھا کیا یہ ممکن ہے کہ یہ وہی ۱۸۵۶ء کے ترک ہیں۔ اور یہ تمام انقلابات کیونکر ہو گئے۔ میں شہر کی صورت دیکھکر حیران ہو گیا۔ قدیم لکڑی کے مکانوں کی بجائے پتھر کی عمارتیں بن گئی تھیں۔ میں سڑکوں کی چہل پہل دیکھکر حیران ہو گیا۔ اُن سڑکوں پر بکثرت گاڑیاں اور ٹریم کاریں چل رہی تھیں۔ جہاں چالیس سال قبل صرف زین سواری کے جانور مستعمل تھے۔ اور جب انجنوں کی کرخت آواز منارہ پر موذن کی غمناک اذان سے ملی تو جو کچھ میں نے دیکھا اور سُنا وہ مجھے قدیم مقولہ لا بدعات فی الاسلام کے خلاف جیتا جاگتا احتجاج معلوم ہوتا تھا۔ جب میں نے مکانوں کے اندر داخل ہو کر لوگوں کی حالت کا اندازہ ان کے ظاہری اسباب کے علاوہ انکے طرز خیال سے بھی کیا تو میری حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ قسطنطنیہ کے افندی[1] طبقہ کو میں نے اُس کی روشن و خیالات اور احباب سے برتاؤ میں بالکل بدلا ہوا دیکھا[2]"

وامبیری نے ترکی تعلیم یافتہ طبقہ کے اندرونی اور نیز ظاہری انقلاب پر بڑا زور دیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے "آج کل کا ک نہ صرف اپنے بیرونی حالات میں بلکہ اپنی خانگی زندگی کے ایسے مختلف امور میں مغربی اطوار و عادات کی طرف بڑا میلان ظاہر کرتا ہے جیسے سامان آسائش، کھانے کے آداب، مرد و عورت کے تعلقات وغیرہ وغیرہ یہ بہت ہی اہم بات ہے۔ کیونکہ ایک قوم دینی میدان میں

---

[1] یعنی تعلیم یافتہ طبقہ اعلیٰ۔ مصنف

[2] وامبیری کی کتاب "موجودہ اور چالیس سال قبل کی ترکی" ص ۱۳۔ مصنف

مادّی طور پر تو ترقی کر رہا ہے۔ لیکن معاشرت میں بالکل ساکن ہے یہ معنی رکھتا ہے
کہ آپ اس ابتدائی اصول کو نظر انداز کرتے ہیں کہ معاشرتی نظامات میں مادّی چیزوں سے
ویسا ہی فرق پڑتا ہے جیسا کہ محض خیالات سے۔ جس شخص نے اندرونی حالت کا معائنہ
کیا ہے وہ ریلوں، موٹر کاروں اور تاروں کی معاشرتی، اخلاقی اور تمدنی قوت کا کیسے
انکار کر سکتا ہے۔ کیا معاشرتی اور نیز مادّی طور پر یہ کوئی وقعت نہیں رکھتا کہ مشرق مغرب
کے بڑے اور چھوٹے، اہم اور لغو، مفید اور مضر ہزاروں ایجادوں کو اختیار کر لیا
ہے۔ کیا یہ معاشرتی اور نیز مادّی طور پر دقیق نہیں کہ مدینہ منورہ روضۂ نبوی میں بجلی
کی روشنی ہوتی ہے۔ اور مکہ معظمہ میں کعبہ شریف کے باہر تصویروں کے پوسٹ کارڈ
فروخت ہوتے ہیں۔ یہ محض قابل تماشہ مذاق معلوم ہوتا ہے کہ موذن مسجد کو ٹریم کار میں
سوار ہو کر جاتا ہے اور مسلمان تاجر اپنے حرم سے نکل کر صبح کا اخبار پڑھتے ہیں اور موٹر
میں سوار ہو کر اپنے دفتر کو جاتے ہیں جہاں جا نماز بھی موجود ہے اور عبادت سے
فارغ ہو کر ڈکٹا فون اور ٹیلیفون پر کام کرتا ہے تاہم یہ کیوں مان لیا جاتا ہے کہ اس
کی زندگی پر مسجد حرم اور جا نماز کا تو اثر ہے اور اس کے ساتھ ہی اس امر سے انکار
کیا جائے کہ مغربی اشیاء کا اس کی معاشرتی ہستی کی تشکیل میں کوئی قابل اعتنا حصہ
نہیں ہے۔ ان نمایاں اختراعات میں غیر نمایاں نئی چیزوں یعنی باقاعدہ تعلیم
و مغربی تفریحات اور مستورات کی جزوی آزادی کا اضافہ کرنے کے بعد ہم کو اس کا صحیح اندازہ
ہو سکتا ہے کہ معاشرتی قلب ماہیت جو عمل پیرا ہے وہ کس قدر عمیق اور وسیع ہے
مشرق کے ان حصص میں جنہیں مغربی اثرات کا زیادہ موقع ہے اس معاشرتی
قلب ماہیت نے ایک پشت قبل سے قابل لحاظ تناسب حاصل کر لیا ہے۔
ہنگری کا مستشرق وامبری جب چالیس سال کی غیر حاضری کے بعد ۱۸۹۶ء میں قسطنطنیہ
کو گیا تو وہ ان انقلابات کو جو ہو چکے تھے دیکھ کر حیران ہو گیا

صاحب البیت[51] ہونے کی وجہ سے اُن دردناک اشکال پر بہت زور دیا ہے جو قدیم سے
جدید کی طرف دوران انتقال میں ناگزیر ہیں لیکن وہ ضرورت سے زیادہ مایوس نہیں
ہے۔کیونکہ وہ یہ جانتا ہے کہ تبدیلی کا زمانہ ایک حد تک ضرور اخلاقی کمزوری، مذہبی
بے پروائی اور نمایشی تہذیب و فضول ہرزہ سرائی کا زمانہ ہوتا ہے۔ یہ عارضی خرابیاں
ہیں جن کو زمانہ خود درست کر دیگا" باایں ہمہ وہ موجودہ حالات کی نزاکت کو کم نہیں کرتا۔
جس میں قدیم معاشرتی نظام کی شکست و ریخت بالیقین متضمن ہے۔ وہ کہتا ہے "یورپی
خیالات کے حملوں سے ہماری خانگی زندگی اور معاشرتی رسوم کے قدیم نظام کی شکست
و ریخت کا سبب ہے زیادہ واضح اور نمایاں نتیجہ ہمارے مذہبی عقاید اور معاشرتی زندگی میں ہوگا
قدیم نظام میں باوجود اس کی خرابیوں کی بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ آج اس قدیم اور
تنگ خیال مگر خدا ترس دستور کی جگہ عجیب آزادی عمل اور خیال نے لی ہے۔
بوڑھیوں کا پاس، بڑوں کا ادب، اور دوسروں کی رائے کا لحاظ جلد معدوم ہو رہا ہے
قدیم دستور میں پیشوائے خاندان اس کے ممبران کا تنہا راہنما اور دوست تھا۔ اسکی ہدایت
قانون کا حکم رکھتی تھی یا یوں کہیے کہ وہ خاندانی قدر و منزلت کا محافظ تھا۔ اس
عالی مرتبے سے وہ معزول کر دیا گیا اور سب سے کم عمر ممبر اس سے مساوات کا مطالبہ
کرتا ہے[52]"

یورپی رسوم اور طرز معاشرت کو کلیتاً اختیار کرنے سے جو مصارف میں ترقی
ہوئی ہے اس پر مسٹر بخش اظہار تاسف کرتے ہیں وہ سوال کرتے ہیں "یہاں ہندوستان
میں کیا ہوا؟ ہم نے یورپی ملبوس یورپی طرز معاشرت یعنی یورپی عیوب شراب خواری اور

---

۵۱ صاحب البیت جیسا کہ عربی مقولہ صاحب البیت ادری بما فیہ ہے (مترجم)
۵۲ بخش کے مضامین متعلقہ اسلام و ہندوستان ص ۲۲۱ تا بابت ۲۲۶ - مصنف

ممالک غیر کے اثرات کو منظور قبول کر سکتی ہے اگر اس کو ان کے کارآمد و مفید ہونیکا یقین ہو جائے لیکن رسوم و عادات کو بہت دقت سے ترک کرتی ہے جو اسکے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکے ہیں۔ ترکوں نے اس بارے میں باوجود سرہائے کے بے شمار قربانیاں کی ہیں۔ اس میں کسی مبالغہ کو دخل نہیں میں دیکھتا ہوں کہ کل کی جماعت حتٰی کہ ملاؤں میں بھی، مغربی تمدن سے اتحاد کی ضرورت سرایت کر گئی ہے طریقۂ قبول کی بابت اختلاف رائے ہو سکتا ہے یعنی بعض تو یہ چاہتے ہیں کہ تمدن غیر پر قومی خصایص کا اثر ڈالیں برخلاف اسکے بعض ہماری دماغی شائستگی کے بجنسہ حامی ہیں اور اسمیں کسی قسم کی ترمیم کو ناجایز تصور کرتے ہیں[۵۱]"

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وامبیری نے حرم کی عزلت نشین مستورات کو بھی جو جہالت کا حصار تھیں بہت بدلا ہوا پایا۔ "ہاں میں اس کو پھر کہتا ہوں کہ مجکو ترکی میں مستورات کی زندگی گزشتہ چالیس سال کے مقابلہ میں بالکل بدلی ہوئی نظر آئی اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ تبدیلی دلی یقین اور بیرونی اثر کی وجہ سے پیدا ہوئی" تعلیم نسواں کی اشاعت اور اصلاحی تحریکات میں عورتوں کی روز افزوں شرکت دیکھکر وامبیری کہتا ہے "یہ بہت ہی اہم بات ہے کیونکہ جب عورتیں گھر میں جو ترقی کے عنصر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کرینگی تو معاشرت اور نیز سلطنت میں حقیقی اصلاحات لامحالہ رونما ہونگے[۵۲]"

ہندوستان کی معاشرتی زندگی میں بھی اسی قسم کے مغربی تمدن کا نفوذ مسلمان لبرل صلاح الدین خدا بخش نے بیان کیا ہے اگرچہ خدا بخش نے

---

[۵۱] وامبیری کی کتاب "موجودہ اور چالیس سال قبل کی ترکی" ص ۱۳ مصنف

[۵۲] وامبیری کی کتاب "موجودہ اور چالیس سال کی ترکی" ص ۱۸ مصنف

بھی اپنا عمل کر رہا ہے اور ہر قرن میں دیسی آبادی کے وسیع تر حلقوں میں اثر پیدا کر رہا ہے۔

مشرق میں جو مغربی تعلیم کی اشاعت گزشتہ چند قرنوں میں ہوئی وہ حقیقتاً حیرت انگیز ہے کیونکہ وہ مشرقی نصاب تعلیم سے بالکل متضاد ہے مراکش سے لے کر چین تک کل مشرق کی قدیم "تعلیم" محض یہ تھی کہ کتب مقدسہ اور مذہبی طریقہ عبادات کو حفظ کر لیا جائے۔ مسلمان اور ہندو طلب و سالہا سال تک اپنے اساتذہ کو کتب مقدسہ کے حصص سنایا کرتے تھے جو عربی یا سنسکرت میں لکھے ہوتے تھے۔ اور جنکو طلبا بالکل نہ سمجھتے تھے ذہانت کا اس سے زیادہ تباہ کن نصاب اور نہیں بنایا جا سکتا تھا دماغ کا ہر حصہ باستثنائے قوت حافظہ بیکار رہو جاتا تھا۔ اور جو کچھ اور اکی جودت اور اصلی تخیل کبھی کبھی ظاہر ہوئے وہ باعث تعجب ہے۔

آج بھی پرانا قاعدہ موجود ہے اور لکھو کا مشرقی نوجوان اس دماغ کو خراب کرنے والے نصاب میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ لیکن اس قدیم نصاب کے ساتھ ہی ساتھ ایک جدید نصاب بھی پیدا ہو گیا ہے جس میں کل تعلیمی امور ابتدائی کنڈر گارٹن سے لے کر یونیورسٹی تک قایم کئے گئے ہیں۔ ان میں مشرقی اطفال کو مغربی طریقہ پر تعلیم دیجاتی ہے۔ یہ نئی قسم کی تعلیم گاہیں ہر قسم کی ہیں۔ مدارس اور دار العلوم کے علاوہ کہ جہاں آزاد خیالی کی تعلیم دی جاتی ہے اور طلبا کو ملازمت سرکاری یا کسی پیشہ کے لئے تیار کیا جاتا ہے، ایسے بھی بہت سے صنعت و حرفت کے مدرسے ہیں جنمیں ماہر فن زراعت اور انجینیر پیدا ہوتے ہیں اور ایسے مدارس المعلمین اس لئے بنائے گئے ہیں تاکہ آیندہ نسلوں کے لئے عام مدرسین کافی تعداد میں میسر آسکیں مشرق میں پبلک اور پرائیویٹ کوششوں سے مغربی تعلیم کو پھیلایا جاتا ہے تمام یورپی حکومتوں نے اپنے زیر تسلط ممالک بالخصوص برطانیہ نے مصر و ہندوستان میں مغربی تعلیم کی

غلامانہ تو سیکھ لیں لیکن انکی خوبیوں کو نظر انداز کر دیا۔ اس کا علاج ہونا چاہیئے۔ یورپ کے قدموں میں تعلیم حاصل کرنا چاہیئے لیکن مشرقی امتیاز کو قربان نہیں کرنا۔ یہی وہ بات ہے جو ہم نہیں کر رہے ہیں۔ تھوڑی سی انگریزی اور یورپی تاریخ پڑھ کر اپنے مذہب اپنے ادب اپنی تاریخ اور اپنی روایات کو ذلیل سمجھنے لگے۔ ہم نے تاریخ اور اپنی تمدن کے سبق کو بھلا دیا اور اس کی بجائے ہم نے کوئی ایسی مستحکم اور شئے حاصل نہیں کی جو ہماری معاشرت کو بے پایاں انقلاب میں قائم رکھے" مختصر یہ تخریب نے اپنا کام کیا ہے اور تعمیر کا کام ہنوز شروع نہیں ہوا ہے[1]۔

دامیری کی طرح بخشی بھی عورتوں کی روز افزوں آزادی پر بڑا زور دیتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان خواتین جو انکا محض "بچہ کشی کی مشین" تصور سمجھی جاتی ہیں۔ روز بروز تعلیم پا کر اپنے حقوق کے لئے دعوے کرتی ہیں۔ اگرچہ رسم پردہ ہنوز رائج ہے لیکن وہ پچاس سال قبل کے سخت، شدید عزلت نشینی نسواں نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ یہ کم ہو رہا ہے اور خواتین وہ حقوق و آزادی حاصل کر رہی ہیں جو امتداد زمانہ کے بعد مشرقی خواتین کی کامل نجات وآزادی پر منتج ہونگے۔ چالیس سال قبل کی مستورات اپنے شوہروں کی غفلت و بے پروائی اور نیز بدسلوکی کو صبر سے برداشت کرتی تھیں لیکن اب یہ حالت باقی نہیں ہے۔"[2]

مشرق ادنے و وسطےٰ کے معاشرتی حالات کے ان دو بیانوں سے متذکرہ انقلابی عمل کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے بلاشبہ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر دو مصنفین اصلاً بڑے مقبات کے تعلیم یافتہ طبقۂ اعلیٰ کا ذکر کرتے ہیں مگر یہ مادہ تدریج نیچے کی طرف

---

[1] بخشی کے مضامین متعلقہ اسلام و ہندوستان ص ۲۴۰ ۔ مصنف

[2] بخشی کے مضامین مذکورہ بالا ص ۲۵۴ تا ۲۵۵ ۔ مصنف

سیاسی شورش اور قانون شکنی کا بہترین اور یقینی علاج ہو بہر نوع گورنمنٹ برطانیہ کے لیے یہ قطعی ضروری تھا کہ وہ ہندوستان کے ذہنی خلاصی کی کوشش کرے تاکہ برطانوی حکومت کی ضرورت کا بہترین ثبوت ہو۔ تاں بعد ہم کو تجربہ سے معلوم ہوا کہ اگرچہ تعلیم بہت سی خرابیوں کے لیئے اکسیر کا کام کرتی ہے اور صحیح ترقی کے لیئے بالیقین لازمی ہے لیکن اس زبردست دوا کا سطحی یا بلا سوچے سمجھے استعمال کرنا دیگر قسم کی خرابیاں پیدا کر سکتا ہے۔ یہ دقیانوسی معاشرت کے شیرازہ پر زبردست تحلیل کا عمل کرتا ہے۔ کمزور دماغوں کو جوش دے کر غیر دانشمندانہ امنگیں اور ایسی خلاف قیاس توقعات پیدا کر سکتا ہے جن میں ناکامی سخت اشتعال کا باعث ہوتی ہے۔[۱]

بلاشبہ مشرق کے بعض مبصرین بالخصوص نوآبادیات کے عمّال ان سیاسی و معاشرتی خطرات سے اس قدر خائف و متاثر ہیں جو نیم تعلیم یافتہ ناکامیابوں کی "اس" خواندہ طبقہ ادنےٰ کی موجودگی سے پیدا ہو رہی ہے کہ وہ مشرق میں مغربی تعلیم کی اشاعت ہی کو غلطی بتاتے ہیں۔ مثلاً لارڈ کرومر مغربی تعلیم یافتہ مصریوں کی قابلیت سے بالیقین بداعتقاد تھا۔[۲] اور ایک مسٹر بر آور دہ اینگلو انڈین افسر، ہندوستانی شورش

---

[۱] سر ویلنٹائن کی کتاب "شورش ہند" کا جو مقدمہ لکھا ہوا ان میں تحریر ہو (مصنف)

[۲] کرومر کی کتاب "موجودہ ہند" جلد دویم ص ۲۲۰ لغایتہ ۲۴۳ (مصنف)

خود حمایت کی ہے۔ علاوہ ازیں مختلف عیسائی تبلیغی جماعتوں نے مشرق میں مدرسوں کا
کا جال بچھا دیا۔ اکثر مشرقی حکومتوں مثلاً ترکی اور ہندوستان کی دیسی ریاستوں نے
رعایا میں مغربی تعلیم کے رواج کے لئے سچی کوششیں کی ہیں۔[۹۵]

جیسی ہر نئی ترقی کی ابتدائی حالت ہوتی ہے بلاشبہ اس کے بھی نتائج
شدہ ہنوز غیر مکمل ہیں ماضی کی ناقص روایتیں موجودہ مساعی کو نقصان پہونچا
جزواً رد کرتی ہیں۔ مشرقی طلباء اپنے ذہانت صرف کرنے کی بجائے ا
حافظہ کو استعمال کرنے کی طرف مائل ہیں۔ اور اس کے متلاشی ہیں ک
رٹ کر جلد ہی سے امتحانات پاس کرکے عہدے پا جائیں۔ ان کو اس کا خیا
نہیں ہے کہ علم حاصل کرکے آیندہ زندگی کے لئے اپنے کو قابل بنائیں نتیجہ
ہے کہ فیل ہونے والوں کی تعداد زیادہ ہے اور یہ بدبخت جو نیم تعلیم یافتہ اور
قسم کے سفید پیشہ کرنے کے ناقابل ہیں۔ بیکاری و فلاکت میں عمر گزارتے ہیں
لہذا وہ اس مغربی تمدن سے نفرت کرنے لگتے ہیں جس کو وہ نہیں سمجھتے
اور بدلطمانہ انقلابی شورش میں شریک ہو جاتے ہیں۔ سر ایلفرڈ لائل نے
کچھ ہندوستان کی بابت لکھا ہے اس سے مشرق میں مغربی تعلیم کے تاریک پہلو
کی خوب توضیح ہوتی ہے "مسلم امر ہے کہ جہالت بے شمار برائیوں کی جڑ ہے
اور یہ امر قدرتی تھا کہ گزشتہ صدی میں بعض حکما نے یہ خیال کیا کہ انسانی بد
کاریوں کا یقینی علاج تعلیم ہے۔ اور یہ کہ میکالے جیسے مدبر نے یہ اعلان کیا کہ تعلیم

---

[۹۵] مشرقیوں نے جو ترقی مغربی تعلیم یعنی یورپی اور دیسی سائنس عاطفت میں حاصل کی ہے
اسکے لئے ملاحظہ ہو ایل برتراند کی کتاب "مشرقی سراب" ص ۲۹۱ و ۲۹۲ اور سی ایس کوپر
کتاب "مشرق کی تجدید" صفحات ۳ تا ۱۳ و ۳۴ لغایۃ ۶۴۔ مصنف

پہنچتا ہے[1]۔

مشرق میں اشاعت تعلیم مغربی سے کچھ ہی خرابیاں کیوں نہ پیدا ہوں سوال یہ ہے کہ کیا یہی واحد قابل عمل طریقہ نہیں ہے؟ مشرق پر مغربی تمدن کا ایسا عالمگیر اثر ہے کہ محض کتابوں ہی تک محدود نہیں۔ اگر استدلال کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ نوآبادیات کی حکومتیں مغربی تعلیم کو بھی مفہوم کے مطابق نہ دیتیں تو کیا مشرقی دوسرے طریقوں سے مغربی تعلیم کو حاصل نہ کرتے؟ لہذا بجائے اس کے کہ مشرقی اس تعلیم کو معکوس اور خطرناک طریقوں سے بدقت سیکھیں یہ بدرجہا بہتر ہے کہ وہ مستند اساتذہ کے زیر نظر اچھی کتابوں سے تعلیم حاصل کریں۔

مشرق میں مغربی تعلیم کی اہمیت کا اس سے بہتر کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس نے طبقۂ اناث کی ترقی میں کامیاب نتائج پیدا کیے ہیں۔ مشرق میں عورتوں کی پست حالت ایسی معروف ہے کہ کسی توضیح کی ضرورت نہیں گرچہ اسلامی ممالک میں بھی عورتوں کی حالت کافی خراب ہے لیکن غالباً ہندوستان کے ہندوؤں میں بدترین ہے۔ جہاں کم سنی میں شادیاں بیواؤں کی بہتذل اور

---

[1] وامبیری کی کتاب "مشرقی بلاد میں مغربی تمدن" ص ۲۰۳ و ۲۰۴ (مصنف)

کی خاص وجہ اس نصاب تعلیم کو ٹھہراتا ہے جو ہم نے خود جاری
کیا۔ یہ اجرا جہاں تک اس کے جاری کرنے والوں کی تنگ نظر
ہیجبختی تھی صلاح نیک تھی اور لازمی نتائج کے لحاظ سے کورانہ حرکت تھی"
لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان ہمت شکن خیالات
میں اس کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے کہ ہر تبدیلی کی حالت میں کچھ
خرابیاں ہوتی ہیں جن سے مفر نہیں۔ مشرق کے دیگر مبصرین
نے اس جزو کا کافی خیال رکھا ہے۔ مثلاً دامبیری برطانوی
اور فرانسیسی شمالی افریقہ کی غیر مصافی ملازمت میں ایماندار
اور قابل دیسی حکام کے بڑے تناسب کے لحاظ سے جن میں غالب
تعداد مغربی تعلیم یافتوں کی ہے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ "سخت قلب بلند
مشرقی اور متعصب المزاج یورپی یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری
تہذیب کے داخل ہونے سے ایشیائیوں کی ابتدائی خوبیاں
مٹ گئیں اور یہ کہ غیر تہذیب یافتہ مشرقی اُن ایشیائیوں
کے مقابلہ میں زیادہ وفادار، دیانت دار اور قابل اعتبار
تھا جو مغربی اصول پر تسلیم پائے ہوئے ہیں، یہ سخت غلطی
ہے۔ ممکن ہے کہ یہ نیم تعلیم یافتہ اشخاص پر صادق آئے
لیکن اُن ایشیائیوں پر صادق نہیں آتا ہے جن کا دماغی
ارتقا، مکمل اور باقاعدہ تعلیم کی مستحکم بنیاد پر

---

[1] جے۔ ڈی۔ ریس کی کتاب "حقیقی ہندوستان" مطبوعہ
لندن ص ۱۶۲ (مصنف)

عورتوں کی حالت میں اس ترقی کے معاشرتی نتائج خود عورتوں ہی کے لیے نہیں بلکہ کل جماعت کے لیے بہت اہم ہیں۔ جیسا وامبیری نے بیان کیا ہے۔ مشرق میں حرم "جہالت کا حصن[۵۸]" ہے۔ چونکہ حرم کی عورتیں جاہل و متعصب ہوتی ہیں لہٰذا وہ اپنی جہالت اور تعصب کا نقش اپنی اولاد کے دلوں پر مرتسم کر دیتی ہیں۔ مشرقی ذہانت کے لیئے اس سے شدید اور کیا نقصان ہو سکتا ہے کہ اس کے لڑکپن کا زمانہ "پس پردہ" صرف ہوتا ہے۔ یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ روشن خیال مشرقی باپ اس بات کے عادی ہیں کہ اپنے لڑکوں کو جلد سے جلد مدرسے بھیجدیتے ہیں تاکہ وہ جلد سے جلد حرم کی زندگی کے تباہ کن اثرات سے نجات پا جائیں۔ مگر یہ علاج بھی محض مسکن ہی ثابت ہوا۔ بچپن کے اثرات ہمیشہ زیادہ دیرپا ہوتے ہیں اور جب تک مشرق کا نصف حصہ ترقی کے اثرات سے جدا رہا تو ہر آنے والی نسل کے لیئے مشرقی ترقی از سر نو شروع کرنی پڑی۔

روشن خیال مشرقی عورتوں کی تعداد بڑھنے سے اس مہلک مرض کا علاج ہو رہا ہے۔ چنانچہ ایک مغربی مصنف نے خوب لکھا ہے۔" ماؤں کے تعلیم دینے سے کل حالت بدل جاتی ہے وہ لڑکیاں جو قرآن شریف کے

---

[۵۸] وامبیری کی کتاب "موجودہ اور چالیس سال قبل کی ترکی" صفحہ ۳۴
(مصنف)

عاملانہ زندگی جو انگریزی قانون کی ممانعت سے پہلے زندہ جلائی جاتی تھیں اور بلاد اسلامی کے حرموں سے بھی زیادہ سخت پردہ داری رائج ہے۔ چنانچہ ایک انگریز مصنف نے اس کو خوب بیان کیا ہے۔ مغرب میں ہم کہتے ہیں "پیشتر خواتین" مشرق کا مقولہ ہے "عورتیں بعد میں" دونوں تمدنوں کے خانگی خیالات میں جو فرق ہے اس کا مکمل خلاصہ یہ ہے"۔

اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان گوشہ نشین ذوی الارواح تک مغرب کی ہوا ابھی نہ پہونچی ہوگی۔ لیکن نفس الامر یہ ہے کہ مغربی اثرات نے طبقات اعلےٰ کی خواتین میں بڑا اثر پیدا کیا ہے اور تعلیم نسواں اگرچہ مردوں سے کم ہے تاہم اس میں بہت کچھ ترقی ہو گئی ہے۔ مشرق کے زیادہ ترقی یافتہ حصص مثلاً قسطنطنیہ، قاہرہ اور ہندوستان کے شہروں میں نئی قسم کی خواتین یعنی خوددار، خود متکفل اور محترم خواتین نمایاں طور پر نظر آنے لگی ہیں۔ خاص طور سے مدرسوں کی معلمہ عالم شہود میں آئی ہیں۔

ایچ۔ اے۔ کاپلس کی کتاب "ہندوستان کے شہروں اور دیہات کی زندگی"، مطبوعہ لندن ص ۹

(مصنف)

میں نظر آتی ہے۔ مشرق کا امیر و غریب، شہری و دیہاتی اپنی طرز معیشت کو مغربی معیار میں تبدیل کر رہے ہیں۔ اور اس میں بڑی دور رس تبدیلیاں متصور ہیں۔ کیونکہ قدیم مشرق اور موجودہ مغربی دنیا کے مروجہ معیشتی حالات سے زیادہ کسی چیز میں تضاد نہیں ہے۔ یہ اصلی اختلاف دولت کے لحاظ سے نہیں بلکہ آسایش کی نسبت سے ہے۔ جبکہ اس لفظ کا وسیع تر مفہوم مراد ہو (مشرق میں بھی مغرب کی طرح بڑی دولت اور بڑا افلاس ہے) قدیم خیالات کے متمول مشرقی اپنا روپیہ زیادہ تر مشرقی تعیش مثلاً نفیس پوشاک، زیورات، عورتوں، گھوڑوں اور کثیر التعداد خدمتگاروں پر صرف کرتے ہیں اور جو کچھ بچتا ہے اس کو جمع کرتے ہیں۔ لیکن مغربی اعتبار سے وہ "آسایش" کے مفہوم سے بالکل نابلد ہیں۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ ایسی خانگی زندگی بسر کرتے ہیں جس کو مغرب کا مزدور بھی نظر حقارت سے دیکھتا[1] ہے۔

مگر آج مشرق بھی "آسایش" سے واقف ہوتا جاتا ہے اور بڑا چھوٹا اس کو خوب پسند کرتا ہے۔ وہ

---

[1] آسایش اور تعیش کے مقابلہ کے لیے ملاحظہ ہو سر بیمفیلڈ فلر کا مضمون "مشرق و مغرب اختلافات کا مطالعہ"، جو نومبر ۱۹۱۱ء میں "انیسویں صدی اور مابعد" میں شایع ہوا (مصنف)

نفرات کے سوا جن کے معنی وہ خود نہ سمجھتی تھیں ، دیگر امور کی تعلیم پا رہی ہیں وہ یقیناً اپنے اپنے خاندانوں میں لڑکیوں ، بہنوں اور ماؤں کی حیثیت سے اِن علوم کو رائج کریں گی ۔ وہ عورتیں جو امور خانہ داری جدید کھانا پکانے کے طریقے ، سینا پرونا اور حفظانِ صحت خانگی کفایت شعاری مدرسوں میں سیکھ رہی ہیں تو گھر واپس آنے پر ایک متمدن قوم کی فضا کو اپنے گھروں میں بالضرور پیدا کریں گی مشرقی خواتین کی قدیم الایام تصویر یعنی مسند پر پڑے پڑے وقت گزارنا مٹھائیاں کھانا اور ملازمین یا اپنی مثل دیگر جاہل عورتوں سے گپ مارنا ، یہ سب بدل جائے گا ۔ جدید عورت اپنے شوہر کی کنیز یا کھلونا ہونے کے بجائے رفیق ہوگی ۔ شادیاں ذلیل جسمانی تجارت سے ترقی کر کے حقیقی اتحاد پیدا کریں گی جس کی بدولت لڑکے اور باپ دونوں عورتوں کا احترام کریں گے ۔ اور عورت خود تعلقات کے جدید افتخار میں رونما ہوگی ۔[1]

جدید تر مشرق کے اِن مردوں اور عورتوں کی تبدیل شدہ خیالات کا پرتو ان کے معیارِ معیشت کی تبدیلی سے ظاہر ہوگا ۔ اگرچہ یہ شہروں کے متمول طبقات میں سب سے زیادہ نمایاں ہے لیکن اس کی جھلک آبادی کے سب طبقات

---

[1] کوپر کی کتاب "مشرق کی تجدید" ص ۲۸ لغایت ۲۹

(مصنف)

روپیہ کہاں سے آئے۔ اگر وہ غریب ہے تو اس کو اپنی ضروریات زندگی میں کمی کرنا پڑتی ہے اگر وہ متمول ہو تو اپنے موروثی تعیش کو ترک کرنا پسند نہیں کرتا نتیجہ یہ ہے کہ مصارف بالعموم بڑھتے جاتے ہیں[۱]۔

بقیہ نوٹ صفحہ ماقبل | اتباع میں اس ذلیل شے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ (مترجم)

[۱] ان مصارف بیجا کا یہی نتیجہ ہے کہ آج ہم بے سروسامانی اور پریشانی میں مبتلا ہیں اور ہر قسم کے اعمال قبیحہ کی طرف متوجہ ہیں اگر در اصل دیکھا جائے تو اسراف ہی کی بدولت ہندوستان میں رشوت ستانی کا یہ زور شور ہے۔ کم درجہ کے اہلکاروں اور منصب داروں نے تو اس کو شیر مادر سمجھ کر حق کے نام سے موسوم کیا ہے۔ علاوہ بریں وہ عہدہ داران جو ذی مرتبت ہیں محض مصارف کی بدولت اس فعل شنیعہ کے مرتکب ہوئے ہیں قیامت ہے کہ یہ عہدہ داران اپنے سے کم حیثیت اشخاص سے ایسی رقمیں وصول کر لیتے ہیں جس کی ادائگی ان پر نہایت شاق گزرتی ہے۔ ان لوگوں کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ بیچارہ کاشتکار یا کم حیثیت زمیندار یا اہل معاملہ جو ہم سے بھی کم ذرائع آمدنی رکھتا ہے کس طرح سے ایسی رقوم ادا کرتا ہے۔ جب ہماری بیش قرار تنخواہیں ہمارے مصارف کو کافی نہیں ہوتیں تو یہ بے بضاعت شخص ہم کو کہاں سے دے سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان اشخاص کو جو اس حرام خواری کے عادی ہو گئے ہیں یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ ہم اپنے ہی

بے شمار اشیار جن کی بدولت ہماری زندگی سہل اور خوشگوار معلوم ہوتی ہے یعنی لیمپ، بجلی کی روشنی، سینے کی مشین گھڑیاں شراب[1]، چھتریاں، حفظان صحت کی کلیں اور ہزار ہا دیگر اشیا جو کم وبیش ہماری زندگی کے روزمرہ میں ہیں مشرقیوں کے لیے خوش کن ایجادات ہیں جو نہایت دلکش ہیں۔ وہ ان کو طلب کرتا ہے اور روز افزوں تعداد میں خریدتا ہے۔ لیکن اس سے بعض نہایت اہم پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی خانگی کفایت شعاری ابتر ہو جاتی ہے۔ ان تمام اشیار کی جدید ضروریات کے آغاز سے معیار معیشت بہت بلند ہو جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس صرف کے لیے

---

[1] مغربی تمدن میں شراب فی الحقیقت سامان معیشت میں شمار کی جاتی ہے باایں ہمہ اس کے نقائص اور عیوب کے متعلق اور عام طور پر یورپی اقوام میں خود بہت بڑی تحریک جاری ہے اور امریکہ نے شراب فروشی کی ممانعت کر دی ہے الحمد للہ کہ ترکوں نے بھی اس ام الخبائث کے متعلق سختی سے ممانعت قایم کر دی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے ابتدا ہی سے اس کی بابت سخت نواہی جاری کیے اور یہی ایک ایسا مذہب ہے کہ جو شراب خواری کے دور کرنے میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ افسوس ہے اون مسلمانوں پر جو اپنے مذہب کی سچی اور نفع بخش تعلیم سے انحراف کرکے مغربی تمدن کے

یا شہری مزدور کو بسر اوقات یوماً فیوماً مشکل ہوتی جاتی ہے چنانچہ ایک مصنف نے اس کو خوب بیان کیا ہے" ان تبدیل شدہ اقتصادی حالات سے اِس وقت تک تکمیل حوائج کی قابلیت پیدا نہیں ہوئی مصارف معیشت، ذرائع آمدنی کے مقابلہ میں زیادہ سرعت سے بڑھ رہے ہیں۔"[۱]

جن اقتصادی اور معاشرتی مصائب سے آج مشرق گزر رہا ہے ان کے بڑے وجوہ میں سے ایک وجہ زیادتی آبادی کا مسئلہ ہے گو یہ وجہ کافی طور پر تسلیم نہیں کی جاتی ہے۔ مشرقی اقوام کی افزایش

---

[۱] ملاحظہ ہو ایل پر تران کی کتاب مذکور الصدر صفحات ۱۲۵ لغایۃ ۱۲۷ + جے شیلی کی کتاب "ہسٹاریکل انڈیا کے مسائل حکومت" صفحات ۱۳۸ و ۱۳۹۔ مغربی مصنوعات پر مزید اخراجات کے لیے ملاحظہ ہو اے جے براؤن کا مضمون "ایشیا میں اقتصادی تبدیلیاں" جو مارچ ۱۹۰۶ء کے رسالہ دی سنچوری میں شایع ہوا + جے پی جونس کا مضمون "ہندوستان کی موجودہ حالت" جو جولائی ۱۹۱۰ء کے رسالہ جنرل آف ریس ڈویلپمنٹ میں شایع ہوا + آر۔ مکرجی کی کتاب "ہندوستانی اقتصادیات کی بنیادیں" صفحہ ۵ (مصنف)

ان سب باتوں پر طرہ یہ ہے کہ کل دُنیا کی طرح مشرق میں بھی ضروریات زندگی یعنی خورو نوش، ملبوسات، ہیزم سوختنی، رہائش کا صرف گزشتہ دو قرن میں بہت بڑھ گیا ہے۔ ہم اس کو محسوس کر سکتے ہیں کہ مشرق معیارِ معیشت کے گراں ہو جانے میں کیا کیا مشکلات متضمن ہیں۔[1]

امر یقینی یہ ہے کہ تنازع للبقار اور اسی نسبت سے ہمہ گیر افلاس کا دباؤ روز بروز سخت تر ہو رہا ہے۔ ضروریات زندگی کے گراں ہو جانے اور بہت سے ادن اشیار کی ضروریات زندگی میں داخل ہو جانے سے جو قبل ازیں سامانِ عیش سمجھی جاتی تھیں یا ایک پشت قبل نامعلوم تھیں مشرقی کاشتکار

بقیہ نوٹ صفحۂ قبل | بھائیوں پر ظلم کرکے مبتلائے بلا اور ملک کی ہلاکت کو المضاعف کر رہے ہیں۔ میرا مقصد ہرگز اس سے یہ نہیں ہے کہ کل عمال و منصب دار اس مرض میں مبتلا ہیں بلکہ محض اُن حضرات سے روئے سخن ہے جو اس بد اعمالی میں مبتلا ہیں۔ (مترجم)

[1] مشرق میں گرانی صرف معیشت کے لیے ملاحظہ ہو چوول کی کتاب "ہندوستانی شورش"، ص ۱ اور ۳ فنتر کی کتاب "ہندوستان کا خاموش انقلاب" ص ۲۶ لغایت ۳۰ ٹی ٹروبیس کا مضمون "ہندوستان میں گرانی قیمت کی تحقیقات۔ جو دسمبر ۱۹۶۵ء کے اکنامک جنرل میں شایع ہوا۔

بڑی شرح اموات بھی جو مشرقی آبادیوں کو زائد از ضرورت تضعیف سے مانع تھی، گھٹکر ایسا تناسب حاصل کر رہی ہے جو مغربی اقوام کے اوسط اموات کے مقابلہ کی ہے۔ لیکن مشرق کی زائد از ضرورت شرح پیدائش کو کم کرنا چیزے دیگر ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ شرح پیدائش بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرق کے ان حصص میں جو مغربی سیاسی تسلط میں ہیں آبادی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ فی الواقع ان مشرقی ممالک نے بھی، جو اس وقت تک خود مختار ہیں مغربی حفاظت جان کی تدابیر کو اختیار کر لیا ہے۔ اور وہاں بھی آبادی میں تیزی سے کم و بیش اضافہ ہو رہا ہے۔

زائد از ضرورت آبادی کا مسئلہ ہندوستان میں سب* سے زیادہ نمایاں ہے۔ ایک صدی سے ہندوستان کا بڑا حصہ برطانوی تسلط میں ہے۔ ایک صدی قبل بھی ہندوستان کی آبادی گنجان تھی لیکن ان سو سال میں آبادی بڑھ کر دوچند یا سہ چند ہو گئی ہے[۵۱]۔ بلاشبہ ایسے عناصر جیسے ترقی یافتہ کاشت، آبپاشی، ریلیں اور جدید صنعت و حرفت کے اجراء نے ہندوستان کو اس قابل کر دیا کہ وہ برطانوی فتح کے وقت جس قدر آبادی کی پرورش کر سکتا تھا اس سے بہت زیادہ اشخاص کی پرورش کر سکے۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ آبادی میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اس مسئلہ کے تقریباً کل واقف کار اس امر پر متفق ہیں۔ چالیس سال ہوئے ڈیوک آف آرگایل

---

[۵۱] انیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستانی آبادی کا تخمینہ غالباً دس کروڑ کیا جاتا تھا اور سنہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے بموجب آبادی اکتیس کروڑ پچاس لاکھ ہے۔ مصنف

نسل کی تیزی ہمیشہ سے ضرب المثل ہے۔ اور یہ محض خواہش نفسانی کی زیادتی پر مبنی نہیں ہے بلکہ اقتصادی وجوہ کے باعث ہے۔ مثلاً عورتوں اور بچوں سے سخت نفع اوٹھانا اور غالباً اس کے سب سے بڑے باعث وہ مذہبی اوامر ہیں جو کم سنی کی شادیاں اور بہت سے لڑکوں کے پیدا ہونے کا حکم دیتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ مشرق کی آبادی ہمیشہ ایسی رہی ہے جو معاش کے حدود میں بہ مشکل سما سکتی ہے۔ مگر ماضی میں یہ زیادتی خود بخود ایسے اجزا سے کم ہو جاتی تھی جیسے جنگ بدنظمی، وبا اور قحط۔ جن کی وجہ سے اس قدر کثیر التعداد اشخاص کم ہو جاتے تھے کہ شرح پیدایش کی زیادتی کے باوجود آبادی ہمیشہ ایک ہی سطح پر رہتی تھی۔ مشرقی زندگی کے دیگر مناظر کی طرح یہاں بھی مغربی اثرات نے حالت کو بالکل بدل دیا ہے۔ بلاد مشرقی میں یورپی سیاسی تسلط کی وسعت نے اندرونی فسادات کو مسدود کر دیا۔ حکومتی حفظ ما تقدم نے وبائی بیماریاں اور قحط کے آثار کم ہو گئے۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ وہ قدرتی موانع جو پہلے آبادی کو بڑھنے نہ دیتے تھے اب معدوم یا کم ہو گئے ہیں۔ حفاظت جان کی مغربی سرگرمیوں کی بدولت

جان بھی ضایع نہ جائے گی۔ نتیجہ یہ کہ آبادی نہایت گنجان ہو گئی ہے۔ اور
اس میں سے بے شمار اشخاص محض قوت لایموت پر بسر کرتے ہیں۔ اس واقعہ
کا کامل احساس ضروری ہے کہ مشرق کے مطیع عوام پر حکومت کرنے کی سب سے
بڑی مشکلات اچھی اور ہمدرد حکومت کی بدولت پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اس
احساس سے اکثر تجاہل برتا جاتا ہے[1]"

اس سوال کے جواب میں کہ ترقی یافتہ خارجی حالات سے
ہندوستان میں خوش حالی کیوں نہ پیدا ہوئی؟ ولیم آرچر نے اس معاملہ
کو خوب بیان کیا ہے "میری رائے میں اس کی وجہ بالکل صاف ہے۔ اور وہ
یہ ہے کہ اچھی حکومت کے نفعے کم از کم جزواً بیکار ہو جاتے ہیں۔ جبکہ اشخاص اچھی
حکومت سے نفع اٹھا کر نہ تو دولت جمع کرتے ہیں اور نہ اپنے معیار معیشت کو
بلند کرتے ہیں۔ بلکہ افزایش نسل کو اس حد تک پہونچاتے ہیں کہ آمدنی خرچ کو
بمشکل کافی ہوتی ہے۔ ہنری جارج کہا کرتا تھا جو منہ پیدا ہوا وہ اپنے ساتھ
دو ہاتھ بھی لایا ہے۔ اگرچہ یہ علم ترکیب اجسام حیوانی کا مسئلہ مسلمہ ہے لیکن
اس سے جو اقتصادی نتیجہ منصور ہے وہ اس وقت تک صحیح ثابت نہ ہوگا
جب تک کہ ان دونوں ہاتھوں کو کسی نفع بخش کام میں استعمال کرنے کا موقع
بھی نہ موجود ہو۔ اگر غذا کے مقابلہ میں کھانے والوں میں اضافہ زیادہ
ہو تو زیادہ افلاس پھیلے گا[2]"

---

[1] کرومر کا مضمون "یوروپ اور ایشیا میں حکومتوں کے بعض مسایل" جو مئی ۱۹۱۳ء دو نائن
ٹینتھ سینچوری اینڈ آفٹر" (انیسویں صدی اور مابعد) میں شایع ہوا۔ مصنف

[2] آرچر کی کتاب "ہندوستان اور اس کا مستقبل" مطبوعہ لندن ص ۱۵۰ و ۱۲۲۔ مصنف

نے بیان کیا تھا "جہاں نہ کوئی ذخیرہ ہے نہ سامان ہے، نہ دولت ہو
کے لوگ سال بہ سال کم خوراک پر بمشکل بسر کرتے ہیں اور جہاں باوجود ان
مصائب کے ایسی تیزی سے افزائش نسل ہو کر المضاعف ہو جاتے ہیں۔ وہاں
اس امر کا کم ازکم مشاہدہ کرتے ہیں کہ افزائش کی یہ قوت و طاقت آسائش
تو درکنار حفاظت کی بھی شاہد نہیں"۔ گزشتہ صدی کے ختم پر سر ولیم ہنٹر نے
آبادی کو ہندوستان کا "اصلی مسئلہ" قرار دے کر یہ بیان کیا کہ "ہندوستان
میں مہذب حکومت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ملک کے غذا پیدا کرنے کی طاقت
پر ایسا بار پڑا ہے کہ سابق میں کبھی نہ پڑا تھا۔ ہندوستانی اعداد و شمار
سے یہ امر بدیہی ہو گیا ہے کہ ایشیائی ممالک میں آبادی کے قدیم ظالمانہ موانع
کا رفع ہونا ایشیائی اقوام کے لئے کسی نہج پر خالص نعمت ہی نعمت نہیں
ہے"[1]

ہندوستان کے افلاس کی بابت لارڈ کرومر لکھتے ہیں "وہ محض رفاہ عام
کے کاموں سے دور نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ امر یقینا قطعی ہے کہ رفاہ عام کے
کام خرابی کو بڑھا رہے ہیں۔ اگرچہ ایسا کہنا بے رحمی اور بعید از عقل معلوم ہوتا ہو
لیکن یہ امر مشاہدہ ہے کہ پہلے زمانے میں ہیضہ، قحط اور اندرونی فسادات آبادی
کو بڑھنے سے روکے رہتے تھے۔ صرف قابل ترین اشخاص ہی زندہ رہتے تھے
اب تو جنگیاں ممنوع ہیں۔ اور خلاف عقلاء کے طالبان نیچ میں پڑ کر
بچا سکتے ہیں کہ اگر علوم، مغربی مہارت اور استعداد بچا سکتی ہے تو ایک

---

[1] سٹیر ہڈ ڈبلو۔ ڈبلیو ہنٹر کی کتاب "ملکہ کے عہد کا ہندوستان اور دیگر مضامین" مطبوعہ
لندن ۱۹۰۳ء ص ۱۳۴-۱۳۳ مصنف

سب ہے۔ لیکن ہم میں سے ہر شخص سے میرا یہ سوال ہے کہ آیا اس کو اپنی زندگی کے کسی اہم ترین موقعہ پر ایک بڑے خاندان کی پرورش ہی حارج نہیں آئی ہے۔ اور آیا اس کفالت کی بدولت ترقی کے اون مواقع پر جو ابتدائی استعداد و اہلیت اور غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے حاصل تھے اثر نہ پڑا ہو۔ اس سوال پر فی نفسہ غور کرنا چاہیے۔ یہ ایک جسمانی واقعہ ہے اور اس کو سیاسی ماحول اور مذہبی علت و حرمت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ہم کو اس غلطی سے نقصان پہونچا ہو تو کیا یہ ہمارا فرض نہیں ہے کہ اس کی خرابیوں کو حتی الامکان رفع کیا جائے۔ افلاس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں ہے۔ یہ بات میں رونجانت کا اپنے دل میں پورا احترام رکھ کر کہتا ہوں۔ متاہل زندگی میں احتیاط کی بابت جو زور ان صفحات میں دیا گیا ہے وہ سرزنش کے خیال سے نہیں ہے۔ کثیر عیال داری سے جو مصائب پیدا ہوتے ہیں اس کو محسوس کر کے اور اس ملک میں کثیر التعداد شرفا کی مشکلات سے متاثر ہو کر میں نے یہ جرات کی ہے کہ اس سانحہ کو صاف صاف بیان کر دوں جو ہر نوجوان پر گزرتا ہے لیکن اس کو اس طور پر بیان کرنے کی پرواہ نہیں کرتا کہ اس خرابی کا سدباب ہو جائے[1]"

مسٹر واٹل اپنے قارئین سے عقل کو کام میں لانے

---

[1] واٹل ص ۱ لغایتہ ۳ ۔ مصنف

اس حالت کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ بدقسمتی سے بہت کم مشرقی اصحاب فکر اس کو محسوس کرتے ہیں کہ مشرق کے افلاس کا بڑا باعث آبادی کی زیادتی ہے۔ بلا استثنیٰ اس سب کا الزام سیاسی عناصر بالخصوص مغربی سیاسی تسلط کے ذمہ لگایا جاتا ہے۔ فی الواقع میرے علم میں ایک ہی مثال ہے کہ جس میں کسی مشرقی بافکر نے اس مسئلہ کی نہایت دلیری سے وضاحت اور انسداد نسل کی وکالت کی ہے۔ یہ کتاب جس کا نام "مسئلہ آبادی ہندوستان" ہے پانچ سال ہوئے۔ پی۔ کے واٹل[1] نے شائع کی جو ہندوستانی محکمہ مالیات میں ایک دیسی افسر ہیں اور ان کی یہ کتاب جو اپنی نوعیت کی پہلی ہے اس قابلیت سے لکھی گئی ہے کہ اس پر خاص توجہ کی جائے۔ اور اس لحاظ سے کہ اس سے مشرقیوں کی زیادہ بیداری کی روشنی کا اظہار ہوتا ہے نمایاں اہمیت رکھتی ہے۔

اس کتاب کے آغاز میں مسٹر واٹل اپنے ابنائے وطن سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس مسئلہ پر بغیر تعصب کے عقلاً غور کریں۔ وہ کہتے ہیں "اس مضمون کو یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ یہ ہمارے ملک کی روحانی تہذیب پر حملہ یا مغربی مادیت کی دیگر طور پر مدح سرائی ہے میرا منشا، اس سے یہ ہے کہ ہم اس خاص مسئلہ حیات یعنی اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے نفس معاملہ پر غور کریں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ہم غریب قوم ہیں۔ ہمارا افلاس غالباً بہت سے وجوہات کی بدولت

---

[1] پی۔ کے۔ واٹل ہندوستان کے محکمہ مالیات میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل (مددگار صدر محاسب) ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۱۶ء بمقام بمبئی طبع ہوئی۔ مصنفہ

اس معاملہ کی بدترین صورت یہ ہے کہ مصلحین کی مساعی کے برخلاف کم سنی کی شادیوں میں زیادتی ہو رہی ہے۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری سے معلوم ہوا کہ ۱۹۰۱ء لغایت ۱۹۱۱ء کے عرصہ میں بیاہی عورتوں کی تعداد فی ہزار پانچ سال کی عمر تک ۱۳ سے ۱۴ ہو گئی اور پانچ لغایت دس سال کی عمر والیوں کی تعداد (۱۰۲) سے (۱۰۵) اور (۱۰) لغایت (۱۵) سال والیوں کی ۴۲۳ سے ۴۳۰ اور ۱۵ لغایت ۲۰ سال والیوں کی ۷۷۰ سے ۸۰۰ ہو گئی یا یوں کہنا چاہیئے کہ ۱۹۱۱ء میں ہر ہزار ہندوستانی عورتوں میں سے ⅒ کی شادی دس سال کی عمر سے پہلے ہو گئی۔ پندرہ سال کی عمر سے پہلے ½ کی اور بیس سال سے پہلے ⅘ کی ۔[1]

اس سب کا یہ نتیجہ ہے کہ شرح پیدائش میں عظیم افزائش ہے لیکن یہ کوئی امر قابل مبارکباد نہیں ہے۔ ہم نے اپنے شرح اموات میں زیادتی اور اس کے انسداد کی تدابیر کی بابت اکثر ذکر سنا ہے لیکن کیا اس کا یقین واثق ہو سکتا ہے کہ

---

[1] مذکورہ بالا ص ۱۳ - مصنف

کی درخواست کے بعد اپنے اصل بحث کی توضیح کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں زیادتی آبادی کی پہلی وجہ کمسنی کی شادیاں ہیں۔ برخلاف مغربی ممالک کے جہاں آبادی کو دانشمندانہ شادیوں اور انسداد پیدائش سے کم کیا جاتا ہے۔

"ہنود کے لیے شادی ایک مقدس فرض ہے جس کا ادا کرنا بلا اس لحاظ کے ضروری ہے کہ آیا فریقین ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں برداشت کرنے کے قابل ہیں یا نہیں۔ ہر ہندو مرد کو شادی کرنا اور اولادیوں کھو لڑکے پیدا کرنا لازمی ہے تاکہ وہ اوس کی کریہ کرم کریں ورنہ اس کی آتما دنیا کے ویرانوں میں ماری ماری پھرے گی۔ لڑکے کے لفظ یعنی "پتر" کے معنے ہیں کہ وہ جو اپنے باپ کی آتما کو اس دوزخ سے جس کا نام "پت" ہے۔ بچائے۔ ایک ہندو دوشیزہ جو سن بلوغ کے وقت بن بیاہی ہو اپنے خاندان کی بدنامی اور اپنے اجداد کے عذاب کا باعث ہے۔ مسلمانوں میں بھی (اگرچہ وہ اپنے سزا و جزا کے احکام سے سے متقیہ نہیں) ازدواجی حالت کچھ تو ہنود سے کے اختلاط تمدن اور کچھ ابتدائی معاشرت کے عام حالات کی وجہ سے جہاں کہ۔ بیوی خانہ داری کی دیکھ بھال اور کاشتکاری میں امداد کے لحاظ سے لازمی ہے، اسی قدر عام ہے"[۵]

---

۵ وائل ص ۲ مصنف

کالے رنگ کے اصلی باشندوں کے قبائل اور پھر یہ یعنی کووات ہی ہیں۔ جن کی تعداد بہت زیادہ ہو رہی ہے۔ کل آبادی کی قوت حیات میں بھی تنزل معلوم ہوتا ہے۔ مردم شماری کے اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھوں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ اور اوسط عمر بھی جس کی امید پر دستے اعداد ہو سکتی ہے کم ہو رہا ہے۔ رنیو اس نسل کو زندگی کے آغاز کرنے میں سخت دقتیں ہیں۔ اور عمر دراز تک زندہ رہنے کے مواقع بیشتر یعنی ۳۰ یا ۴۰ سال قبل کے مقابلہ میں بہت کم ہیں۔ کیا ہم نے کبھی اس پر غور کیا ہے۔ کہ اس کا کل قوم کی حیات پر اثر پڑنے سے ہمارا کیا حال ہوگا؟ اس کا منشا یہ ہے کہ وہ اشخاص جو اپنے تجربہ اور دانشمندی کی وجہ سے ملک کی مختلف پبلک جدوجہد میں سردار ہونے کے قابل تھے۔ ان کو موت ہم سے چھین لیتی ہے۔ اور یہ کہ سرداری اور رہنمائی جو ممالک مغربی میں معمر اور تجربہ کار اشخاص کا حصّہ ہے۔ ہندوستان میں نوعمر اور ایسے لوگوں کو ملتی ہے جو کم قابل اعتبار ہوں[1]"

اپنے ہموطنوں کو اس سے متنبہ کرنے کے بعد کہتا تو زراعت کے ترقی یافتہ طریقے نہ صنعت وحرفت کی افزونی نہ ترک وطن فی الحقیقت آبادی کے اس روزافزوں بار کو کم کر سکتے ہیں جو وسائل معیشت پر پڑ رہا ہے۔ وہ چند امید افزا آثار کا ذکر کرتے ہیں یعنی مذہب ورسوم کے اثر کے باوجود نزاکت موقع کا احساس ہونے

---

[1] مذکورہ عدد ص ۱۹ الغایۃ ۲۱ مصنف

اگر ہماری شرح اموات انگلستان یا اسکاٹلینڈ کی برابر ہو جائے تو ہم موجودہ شرح پیدایش یعنی ۳۰ فی ہزار کو اسی طرح قایم رکھ سکتے ہیں۔ ہم اس سے زیادہ اشخاص کو عالم وجود میں لاتے ہیں جن کی بخوبی پرورش ہو سکتی ہے۔ اور اسی کا خمیازہ ہم بھگت رہے ہیں۔ لہذا اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک میں شرح اموات کم ہو جائے تو ہم کو شرح پیدایش بھی ان ممالک کی طرح کم کرنا چاہیے جہاں شرح اموات کم ہیں لہذا ہماری شرح پیدایش کی زیادتی ہی معاشرتی خطرہ ہے۔ اور شرح اموات کی زیادتی اگرچہ افسوسناک ہے لیکن ہماری شرح پیدایش کی زیادتی کا لوازمہ ہے[1]''

مسٹر واٹل اس کے بعد ہندوستان کی شرح اموات کے افسوسناک مدات کو بیان کرتے ہیں۔ یعنی عورتوں کی موتیں جو زیادہ تر کم عمری میں بچہ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہیں اور مساوی خطرناک بچوں کی موتیں جن میں سے ۵۰ فی صدی قبل از وقت پیدایش یا پیدایشی کمزوری کی وجہ سے مرتے ہیں۔ یہ کم سنی اور ہرکس وناکس کی شادی کے لازمی نتایج ہیں کیونکہ ہندوستان میں ''ہرکس وناکس شادی کرتا ہے اور کم سے کم عمر میں جبکہ فطرت اس کی اجازت دیتی ہے صاحب اولاد ہو جاتا ہے'' یہ عمل نہایت ہی مضر صحت ہے۔ یہ نسلی صفات کو کمتر اور قوت کو زایل کر رہا ہے۔ یہ آبادی کی پست عنصر ہے یعنی

---

[1] مذکورہ صدر ص ۱۴ - مصنف

اور جس طرح دیو جانس نے اسکندر سے کہہ دیا تھا کہ "میری دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو" ہم ان سے نہیں کہہ سکتے۔ اس عظیم معمار بہ عالم کے بعد بعد آبادی کے نظریات پر نظر ثانی کی جائیگی اور ممکن ہے کہ کمسنی کی شادیوں اور کثیر العیالی کو مستحسن سمجھا جائے۔ لیکن اس سے

اولاً ہمارے خاص مسئلہ آبادی حل نہ ہوگا

دوہم یہ کہ ردعمل صرف عارضی ہوگا

قانون آبادی کے عمل میں روک تھام ہو سکتی ہے لیکن اس عمل کو کوئی مفر نہیں ہے[1]

یہ عجیب و غریب رسالہ اس طور پر ختم ہوتا ہے مزید براں ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ خواہ زیادتی آبادی سے ہندوستان سخت ترین مصائب میں مبتلا ہو لیکن حالات کل مشرق میں اصلاً یکساں ہیں۔ ہر جگہ دانشمند اپنے قیود اور پیدائش میں معقول روک تھام بالکل ہی مفقود[2] ہیں۔ اس بات کو پیش نظر رکھکے کہ نہ یادتی آبادی کے علاوہ دیگر اقتصادی و معاشرتی خرابیاں ہیں جن پر بحث پہلے ہو چکی ہے تو ہمیں یہ دیکھکر تعجب نہیں ہوتا کہ کل مشرقی ممالک سخت افلاس اور معاشرتی ذلت کا شکار رہیں۔

---

[1] واٹل مذکورالصدر صفحہ ۸۲ مصنف

[2] مشرق ادسٹے کی حالت کے لئے ملاحظہ ہو پرتر اناد کی کتاب صفحات ۱۱۰ و ۱۲۴ و ۱۲۵ لغایتہ ۱۲۸ مصنف

لگا ہے اور ہندوستان کے بعض حصص میں پیدائش کو کم کرنے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سنہ ۱۹۱۰ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں بنگال کی شرح پیدائش میں جو خفیف کمی ہوئی تھی اس کی سرکاری طور پر جو وجہ بیان کی گئی ہے اس کو نقل کیا ہے۔!
"شادی کی عمر کو تبدیل کرنا ہی تنہا وجہ اس کمی شرح پیدائش کی نہیں ہو سکتی۔ دیدہ دانستہ تولید و تناسل کو روکنا بھی اس کا جزو اً ذمہ دار ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ آسام کے باغات چاء کے قلی ایسے ذرایع استعمال کرتے ہیں جن سے استقرار حمل نہ ہو اور اگر ہو تو اسقاط ہو جائے۔ اور آسام کے کمشنر حفظان صحت کی سنہ ۱۹۱۳ء کی رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے کہ ناقص شرح پیدائش کا اہم سبب دیدہ و دانستہ پیدائش کو روکنا معلوم ہوتا ہے[1]"

مگر شرح پیدائش میں روک تھام کی یہ شروعات بالکل مقامی اور جزوی ہیں اور ان سے ہندوستان کی روز افزوں آبادی کی زیادتی میں کوئی فوری فائدہ نہیں ہو سکتا ہے۔ نزاکت موقع کے مزید احساس اور فوری عمل کی ضرورت ہے۔ نتیجہ ناگزیر ہے۔ ہم اس وبا سے جو ہماری معاشرت میں پھیلی ہوئی ہے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ بیل گاڑی کے ملک میں موٹریں چل رہی ہیں۔ اب مغرب کی زیادہ ترقی یافتہ اقوام سے مقابلہ ہے

---

[1] واٹل کی کتاب مذکورہ ص ۲۸ مصنّف

ہیں۔ ان کے صحن بھی تنگ ہیں جو کوڑے سے پٹے ہوتے ہیں اور جن میں اکثر مویشی بندھے ہوتے ہیں۔ ان کے حاجات میں ایسی غلیظ سطح کا پانی سرایت کرتا ہے۔ اور یہ خاندان بے ترتیب گھروں میں چھپے رہتے ہیں اور ان گھروں کے مجموعہ کا نام قصبہ یا شہر رکھ لیا جاتا ہے

شہروں میں دیہات سے بھی بدتر حالت ہے اور مشرق کے غلیظ محلے مغرب کے غلیظ محلوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ فرانسیسی ماہر سیاسیات لوئی برتراند یوانٹ کے بڑے شہروں مثلاً قسطنطنیہ و قاہرہ و بیت المقدس کے غربا کے محلوں کی کریہہ تصویر کھینچا ہے ہم اس کے تکلیف دہ تفاصیل کو چھوڑ کر قاہرہ کے مکانات کا بیان ذیل میں درج کرتے ہیں:-

"مصر کے دیگر حصص کی طرح قاہرہ میں بھی غربا کے محلوں کی تباہی اور گندگی غالباً مشرق کے دیگر ممالک سے بھی بڑھکر اندوہناک ہے۔ اپنے تاریک اور بند کمروں کے سامنے ایک دالان ہوتا ہے جو خود بھی تاریک ہوتا ہے چھت اور دیواروں کے کرم خوردہ دھنیوں سے چونہ چھوٹ چھوٹ کر برابر غلیظ فرش پر گرتا ہے۔ بوریا اور بستر چوہوں سے پٹا ہوتا ہے"[۲]

ہندوستان کی بھی وہی حالت ہے۔ فشر کہتے ہیں۔ "کارخانوں کی ترقی شروع ہونے سے قبل ہی ہندوستان کے شہروں میں غارت مکانات کا مایوس کن مسئلہ دلچسپ ہو گیا۔ یہ بڑے صنعتی کارخانے اپنے ہزاروں مزدوروں کو ایک مشرقی شہر کی

---

[۱] ڈاکٹر ڈی۔ را س کا مضمون "سیاسی شورش کا باعث فلاکت ہے" جو ۱۸ فروری ۱۹۱۲ء کے دی سروے میں شائع ہوا۔ مصنف

[۲] برتراند مذکور الصدر ص ۱۱۱ و ۱۱۲ مصنف

دیہاتی اور شہری عوام دونوں قوت لایموت پر گذر کرتے ہیں۔ مصری فلاحین کی حالت برطانوی ماہر سیاسیات بریلیفورڈ یوں بیان کرتا ہے۔ "مواضعات میں ایسا افلاس نمایاں تھا جو میں نے پر نظم مقدونیہ کے پہاڑوں اور ڈونیگل[1] کے دلدلوں میں بھی کبھی نہ پایا تھا.... مواضعات کچے جھونپڑوں کے گندے محلے ہیں جن میں نہ کوئی درخت ہے نہ پھول نہ باغ۔ ان جھونپڑوں میں نہ تو کوئی کھڑکی نہ مسطح فرش۔ یہ پختہ مٹی کے چھوٹے چھوٹے زندان ہیں۔ ان میں معمولاً دو کمرے ہوتے ہیں جن میں نہ کوئی سفیدی ہوتی ہے اور نہ فرش۔ جن جھونپڑیوں میں داخل ہوا ان میں کوئی سامان نظر نہ آیا۔ محض کھانا پکانے کے چند برتن اور سونے کی ایک چٹائی اور ایک مٹی کی کوٹھی تھی جس میں خاص غذا یعنی جوار رکھی ہوئی تھی"[2] ایک برطانوی افسر حفظان صحت غریب تر ہندوستانی کسانوں کی طرز معاشرت کی یوں تصویر کھینچتا ہے۔ "ضرورت یہ ہے کہ ان گھروں کی اندرونی حالت بھی اصلاً دیکھی جائے جن میں ایک خاندان ایک ہی کوٹھری میں مجبوراً رہتا ہے جس کی دیواریں اور فرش دونوں کچے

---

[1] ڈونیگل۔ آئرلینڈ کے السٹر کی ایک کاونٹی ہے۔ اس کا ساحل بالکل ویران اور کوہستانی ہے اکثر سمندر کا پانی بڑے حصہ پر سے گذر جاتا ہے۔ مترجم

[2] ایضاً۔ این بریلسفورڈ کی کتاب "فولاد اور سونے کی جنگ" صفحات ۱۱۲ و ۱۱۳۔ نیز ملاحظہ ہو ٹی۔ رتھسٹائن کی کتاب "تباہی مصر" صفحات ۲۹۸ تا ۳۰۰ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۰ء مسٹر ڈبلیو۔ ڈبلیو رمیز ے کا مضمون "اناطولیہ کے ترکی کا شتکار" جو جنوری سنہ ۱۹۱۸ء کے کوارٹرلی ریویو میں شائع ہوا۔ مصنف

ہیں اور ایک دوسرے سے بالکل ملے جلے رہنے کے لئے تعداد کثیر میں یکجا بند کر دیے گئے ہیں[1]"۔

طرہ یہ ہے کہ شہر کے حالات بجائے بہتر ہونے کے بدتر ہوتے جاتے ہیں مکانات میں باشندوں کی زیادتی کا مسئلہ خصوصیت کے ساتھ نہایت مشکل ہوتا جاتا ہے۔ موجودہ صدی کے ابتدائی سنین میں ہندوستان کے صنعتی مراکز مثلاً کانپور۔ بمبئی۔ لکھنؤ کے مکانات میں باشندوں کی زیادتی لندن سے تگنی یا چوگنی تھی۔ جنگ گزشتہ نے مکانات کی مشکلات کو اور بھی دشوار کر دیا ہے۔ مغرب کی طرح مشرق میں بھی جنگ کی وجہ سے شہروں کی آبادی بڑھنے لگی اور صرفہ تعمیر کی بےپناہ گرانی کے سبب سے تعمیر کا کام بند ہو گیا۔ لہٰذا کرایہ مکانات بہت بڑھ گیا اور مالکان مکانات میں بے طرح نفع اٹھانے کی وبا پھیل گئی۔ فشر کہتا ہے کرایہ مکانات بید غلبان کرا کرا کے تگنے کیے گئے۔ بمبئی میں اس کے خلاف ایک عام جلسہ ہوا اور گورنمنٹ کو دخل دینے کی ضرورت پڑی اور ایسے مکانات کا جن میں دستکار اور مزدور رہتے تھے انتہائی کرایہ معین کر دیا گیا۔ مگر انتہائی کرایہ معین کر دینے سے بھی جگہ بڑھ تو نہیں جاتی"۔

مگر یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ کرایہ میں زیادتی تو صرف معیشت کی اس عام گرانی کا ایک پہلو ہے جو ایک پشت سے مشرق میں عمل پیرا ہے اور ۱۹۱۴ء سے خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہو گئی ہر ایک فرن

---

[1] ڈاکٹر بالچندر کرشنا صاحب کو عبداللہ یوسف علی نے اپنی کتاب "ہندوستان کی معاشر اور مزدوری" میں صفحہ ۵۳ مطبوعہ لندن ۱۹۱۷ء

پیچدار گلیوں اور مضر صحت آب و ہوا کے شور و شغب میں ٹھونس رہے ہیں۔ صبح تڑکے سے اندھیرا ہو جانے کے بعد تک کام کرنے کے بعد مرد و عورت ایسے تھک جاتے ہیں کہ حتی المقدور تو وہ سونے کے لئے اپنے کارخانے سے دور جانا پسند نہیں کرتے جب قریب کے مکانات ایسے بھر جاتے ہیں کہ دم خفا ہونے لگتا ہے تو وہ سڑکوں پر رہنا اور سونا شروع کر دیتے ہیں۔ بیس سال[1] ہوئے کلکتہ کے ان حصوں میں جہاں مکانات بہت گنجان ہیں زمین کی قیمت دو لاکھ ڈالر فی ایکڑ ہو گئی تھی (بیگھہ)" ایک مغربی اہل قلم نے بیان لکھا ہے[2] کہ کلکتہ تو مشرق کے لئے بھی باعث شرم ہے پیچوں کے مزدور اور جہازوں کے قلی غریب محلوں میں رہتے کیا ہیں سوروں کی طرح بند ہوتے ہیں۔ مکانات مضر صحت تنفس سے گھٹے جاتے ہیں۔ نالیاں اور صحن غلاظت سے بھر جاتے ہیں۔ پھیلے سڑے ہوئے کوڑے کو سڑکوں میں کوٹ دیتے ہیں۔ گائیں ان حاجات کا پانی پیتی ہیں جن میں نالیوں کی گندگی جذب ہوتی ہے اور مطبخ کے فرش بھی ایسے ہی گندگی سے دھوئے جاتے ہیں[3]" ہندوستان کے دیگر صنعتی مراکز میں بھی عملاً حالت یکساں ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں جو رپورٹ مرتب ہوئی اس میں بمبئی کے ایک دیسی افسر حفظان صحت نے کرایہ پر اٹھنے والے حصہ کی بابت لکھا تھا "ان مکانات میں جن میں بیماریوں کے جراثیم اور کیڑے پیدا ہوتے ہیں اور امراض۔ افلاس۔ خرابی اور جرائم کے مرکز ہیں ہر قسم کے اشخاص یعنی مریض اوباش، شرابی، نادار، بلا امتیاز ٹھونس دیے گئے

---

[1] یعنی سنہ ۱۹۱۰ء مصنف

[2] فنشر کی کتاب "ہندوستان کا خاموش انقلاب" ص ۵۱ مصنف

[3] بیٹ بلیا۔ اسٹیونس کی کتاب "ہندوستان میں" جس کو فنشر نے صفحہ ۵۱ پر نقل کیا مصنف

فصل نہم

(معاشرتی بے چینی اور بالشویزم)

ہر انقلاب بالخصوص فوری انقلاب اور عدم سکون کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ماضی سے ہر انقطاع میں خواہ وہ انقطاع کیسا ہی طبعی اور لازمی کیوں نہ ہو تغیر یافتہ حالات سے موانست پیدا کرنے کی ضرورت متضمن ہوا کرتی ہے۔ جس سے موانست مطلوبہ کے پیدا ہونے تک سخت کشمکش کا عارضی احساس لازمی ہے۔ بے چینی کوئی واقعہ نادرہ نہیں ہے۔ یہ ہر انسانی جماعت میں جو کامل سکون میں مبتلا نہ ہو مضمر ہے۔ قدرے قلیل بے چینی کو آثار مرض کی بجائے صحیح و سالم نشو ونما کی علامت سمجھنا چاہیے۔ نفس الامر یہ ہے کہ بے چینی کے اقل مدارج اس نام سے ہی موسوم نہیں ہوتے۔ بلکہ طبعی ترقی کے لوازم شمار کیے جاتے ہیں۔ فی الحقیقت معمولی حالات میں معاشرتی نظام جسم انسانی کے نظام کی طرح اپنا عمل کرتا ہے۔ اور تبدیل ہونے والے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ہی وہ بھی برابر فنا اور پیدا ہوتا رہتا ہے۔ بعض اوقات یہ تبدیلیاں بہت بڑی ہوتی ہیں۔ لیکن ایسی تدریجی ہوتی ہیں کہ ان کا احساس تقریباً ہوتا ہی نہیں۔ ایک صحیح نظام میں جو اپنے ماحول کے کلیتاً ہم رنگ ہو قبول نقش کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ گرد و پیش کے تغیر کو طبعاً

سے زیادہ عرصہ ہوا کہ مشرق ادنےٰ کے متعلق برٹرانڈ نے لکھا تھا "لیوانٹ کے ایک کنارے سے دوسرے کنارہ تک قسطنطنیہ وسمرنا و دمشق و بیروت اور قاہرہ میں جینے مرفہ سینٹ کی گرانی کی شکایت ایک ہی سنی اور یہ شکایت یورپی و غیر وطنی دونوں کو ہے"۔ آج اس سے بھی زیادہ مشکل درپیش ہے۔ جنگ کے آغاز سے مصر کی حالت کی بابت سر ویلنٹائن چرول[1] کہتے ہیں۔ "اگرچہ شرح مزدوری میں بہت زیادتی ہوگئی لیکن پھر بھی ضروریات زندگی کی بے اندازہ گرانی کے قدم بقدم نہ چل سکی۔ یہ خاص طور پہ شہر و نیز صادق آتا ہے۔ کیونکہ یہاں طبقات ادنےٰ یعنی کثیر التعداد مزدور ٹھیلے والے گاڑی والے۔ دوکاندار اور دیگر قسم کے ملازمین کے لئے ایسا سخت وقت آگیا ہے کہ ان کو گزر کرنا دشوار ہے"۔[2] ان تمام پریشان حالیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرتی تنزل کے مختلف صور مثلاً شراب خواری بداعمالی اور جرائم بہت عام ہو رہے ہیں۔ آخری بات گو اہمیت کے لحاظ سے کسی سے کم نہیں یہ ہے کہ مشرق بے چینی اور انقلابی شورش کے آثار بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور ان پر ہم فصل مابعد میں تبصرہ کریں گے

---

[1] سر ویلنٹائن چرول کا مضمون "مصر میں انگلستان کا خطرہ" جو ۱۹۱۹ء کے لندن ٹائمس سے ماخوذ ہے مصنف

[2] ملاحظہ ہو برٹرانڈ اور قشر کی مذکورالصدر تصانیف مصنف

جنھیں اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

مگر اونیسویں صدی کے آغاز پر اسلامی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ معاشرتی بے چینی کے آثار پھر نمایاں ہونے لگے۔ وہابیت محض مذہبی خرابیوں کو مٹانا نہیں چاہتی تھی بلکہ اس زمانہ کی جماعت اسلامی کی پستی کے خلاف بھی ایک عام احتجاج تھی۔ متعدد بار یہ تحریک حکومت قایم شدہ کے خلاف بغاوت کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اسی زمانہ میں ایسی ہی بابی تحریک جو ایران میں رونما ہوئی اس پر بھی یہی صادق آتا ہے[1]۔

بلاشبہ ان نوزائیدہ تحریکات بیداری کو بہت کچھ امداد مغربی خیالات اور اسالیب کے سیلاب سے ملی جو اونیسویں صدی کے امتداد کے ساتھ روزافزوں طور پر مشرق میں نفوذ کرنے لگے۔ بلاشبہ مشرق کی تبدیلی جو نتیجہ ہو رہی تھی اس سے زیادہ اور کیا چیز ہر قسم کی بے چینی کا باعث ہو سکتی تھی۔ یہ تبدیلی ایسی فوری، اس قدر شدید اور اس حد تک مسلسل عمل متابعت کی محتاج تھی کہ ارتقائی ہونے کی بجائے اصلاً انقلابی تھی۔ ان عمیق تبدیلیوں کی تفاصیل پر جو سیاسی، مذہبی، اقتصادی اور معاشرتی تھیں ہم بحث کر چکے ہیں اور ہم اس عمیق اضطراب و تحیر اور مصائب کا بھی ذکر کر چکے ہیں جس میں اس عظیم تبدیلی کے زمانہ میں سب ہی طبقے مبتلا تھے۔

اس تبدیلی کے دور کی اصلی انقلابی نوعیت کو جس کی مثال ہندوستان میں اچھی ملتی ہے، ایک برطانوی ماہر اقتصادیات نے خوب

کہنے کو سب سنّی مسلمان ہیں لیکن عام عقائد میں رجحان شیعوں نیز مسیحیوں کی طرف بھی ہے۔ (مترجم)

[1] اس بے چینی کے ان ابتدائی صور کے لیے ملاحظہ ہو سی۔ بی۔ غالی ایر کی کتاب "انیسویں صدی کا اسلام" مطبوعہ پیرس ۱۸۸۳ء (مصنف)

محسوس کرکے اس تیزی سے ان کی متابعت کرتا ہی کہ عدم مطابقت کے مضر نتائج سے
محفوظ رہتا ہی۔

نئے چینی کے شدید تر اظہارات ہی مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ انقلابات
عظیم ماضی سے فوری انقطاع اور ان عمیق عدم موانست کے یقینی علامات ہیں
جو فوراً درست نہیں ہوتے۔ بالفاظ دیگر شدید نئے چینی معاشرتی بیماری کو ظاہر کرتی
ہی اور اس سخت معارک کے امکان کا جو "انقلاب" کہلاتے ہیں، پتہ دیتی ہی۔

اسلامی مشرق کی تاریخ اس مندرجہ بالا استقرار کی بہترین مثال ہے
عربی تہذیب کے تعمیری عہد کی خصوصیت تغیرات کی سرعت اور تخئیلی ہیجان کی شدت
تھی "معتزلی" تحریک میں نہایت مختلف الخیال اشخاص شامل تھے۔ اور اس تحریک
کے جمہوریت پسند متبعین ایسے مذہبی سیاسی اور معاشرتی اصول کے معتقد تھے جو
سخت انقلابی قسم کے تھے۔ یہ انقلابی زمانہ سطحی اور مختصر تھا۔ عرب زورمندی اور اسلامی
روح اس سے ناقابل ثابت ہوئی کہ قدیم مشرق کی عظیم مجہولیت کو مستقلاً متحرک کردے
بہت جلد قدیم روایات کا پھر دور شروع ہو گیا (بالیقین یہ کچھ ترمیم ہو گئی تھیں لیکن اصلاً
وہی تھیں) عربی تمدن غیر مبدل اور متحجر ہو گیا اور اس تجربت کے ساتھ ہی تغیر آفریں نئے چینی
فنا ہو گئی۔ کہیں کہیں جمہوری روایات محفوظ رہیں۔ اور خفیہ طور پر اندرون عرب کے خوارج
اور بکتاشی[1] درویشوں جیسے چند گمنام فرقوں میں منتقل ہوتی رہی ہیں۔ یہ محض سربستہ راز تھے

---

[1] اس فرقہ کے بانی اول حاجی بکتاشی بتائے جاتے ہیں۔ جن کی نسبت عام خیال ہی کہ ایک ولی اللہ
تھے۔ جاں نثاری فوج کا نام "ینی چری" انہیں کے فرمانے سے پڑا۔ اصلاً یہ فرقہ اول سلسلہ مشائخ میں
تھا جس کا آغاز خلیفہ اول سے ہوتا ہی۔ لیکن اس فرقہ کے اصلی بانی "بیلم بابا" تھے جو ۹۲۲ھ میں
فوت ہوئے اس فرقہ کے عقائد میں اکثر ملحدانہ بت پرستوں اور مشرکوں کی باتیں داخل ہو گئی ہیں

حالات کے سخت مخالف ہیں۔ یہ ابتدائی حالت میں تو ہو لیکن ایسا ہر امر میں نہیں ہو۔ رواجی مزدوری کے ساتھ ایسی مزدوری بھی دی جاتی ہو جو مقابلہ سے معین ہوتی ہے۔ بعض وقت قیمتیں رواج کے بموجب مقرر ہوتی ہیں لیکن بعض وقت آزاد اقتصادی وجوہات سے بھی ان کا تعین ہوتا ہو۔ اوس آبادی میں سے جو اُس سرزمین میں سے عمیق طور پر وابستہ ہیں کچھ اشخاص بہتر اجرت کی خواہش میں باہر چلے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اقتصادی وجوہات نے دفعتاً اور جزواً اُس ملک میں مداخلت کی جس میں اخلاق ہنوز ابتدائی حالت میں ہیں۔ اگر ہم شہری ہندوستان کی طرف متوجہ ہوں تو ہم کو ایسی ہی مخالف حالت ملتی ہو۔ ... ان دونوں حالتوں میں نہ تو صحیح اختلاط ہو اور نہ مکمل نفوذ۔ فی الواقع یہ دونوں نظامات ایسے منفصل اور بعید ہیں کہ آسانی سے مجتمع نہیں ہو سکتے۔

لہذا ہندوستان کی ایک عظیم اور پیچیدہ جماعت کے کل طبقات میں اقتصادی انقلاب کی حالت موجود ہے۔ اگر یوروپ میں کوئی بھی ایسا وقت تھا جو موجودہ ہندوستان سے ذرا بھی مشابہ ہو تو وہ صنعتی انقلاب کا وقت تھا۔ جس کے صدمہ سے ہم اب بھی مقابلتاً کامل طور پر مطمئن نہیں ہوئے ہیں۔ اس کو یوروپ کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیے کہ وہ ذہنی تحریک جو انقلاب فرانس پر منتج ہوئی صنعتی انقلاب کے وقت ظاہر نہ ہوئی۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ یورپی معاشرت بالکل ہی تباہ ہو جاتی۔ لیکن اس حالت میں بھی جبکہ فرانسیسی انقلاب کا زور فتوحات نپولین میں ختم ہو چکا تھا صنعتی انقلاب نے کافی معاشرتی اور سیاسی بے اطمنانیاں پیدا کیں۔ جب اقتصادی انقلاب کی وجہ سے اقوام کے پورے طبقات کو اپنی طرز زندگی بدلنا

بیان کیا ہے[1]۔ وہ سوال کرتا ہے کہ ہندوستان کے دیہات اور شہروں میں جو تقابل ہے اوس سے زیادہ اور کیا شے مختلف الحیثیت ہو سکتی ہے؟ "ہندوستان کے دیہات ابتدائی یا ازمنہ متوسط کی حالت میں ہیں۔ ہندوستان کے شہر بالکل جدید ہیں" ہندوستان کے شہروں میں مغربی زندگی کے سب آثار یعنی ہٹلوں اور کارخانوں سے لیکر اشتہار شایع کرنے والے اشخاص تک جو تم نے لندن کی نالیوں میں چھوڑے تھے ملتے ہیں۔ یہ سب دیہاتی ہندوستان کے ساتھ ساتھ موجود ہیں" اور اقتصادیات کی تاریخ میں یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ یہ دونوں اس طور پر پہلو بہ پہلو موجود ہوں۔ ہندوستان کی موجودہ حالت کی نظیر یوروپی اقتصادی تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی" اگر عہد حاضرہ اور ازمنہ متوسط کے اشخاص جو بالکل ہی مختلف الخیال ہیں۔ یوروپ میں یک جا کر دیئے جائیں، تو تم سمجھ سکتے ہو کہ اس کا اثر کیا ہوگا؟ یوروپ میں یہ اس وجہ سے نہیں ہوا کیونکر "اقتصادی دنیا میں یوروپی ترقی ارتقائی ہے" یعنی یہ عمل صدیوں میں تکمیل کو پہونچا۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں یہ اقتصادی تبدیلی اپنی نوعیت کے لحاظ سے انقلابی ہے۔

دیہاتی ہندوستان کی حالت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی اقتصادی تبدیلی کس قدر غیر ارتقائی ہے۔

"دیہاتی ہندوستان اگرچہ اپنے خصایص کے لحاظ سے زیادہ تر ابتدائی رسوم کا پابند ہے لیکن اس میں ایسے خیالات داخل ہوگئے ہیں جو قدیم

---

[1] ڈی۔ ایچ۔ ڈاؤمیل کا مضمون "ہندوستان میں اقتصادی نقل و حرکت" ہو دسمبر ۱۹۱۲ء کے اکونامک جرنل میں شایع ہوا۔ (مصنف)

ہندوستان ایشیائی ملک نہ ہوتا تو مدّتوں پہلے اس سے خوں فشاں انقلاب ہوچکا ہوتا"

دراصل مذکورہ بالا سطور بیسویں صدی کے آغاز میں لکھی گئی تھیں۔ جبکہ دنیا ہنگامہ ستیخیز سے پارہ پارہ نہ ہوئی تھی اور نہ نیم ایشیائی روش میں جارحانہ معاشرتی انقلاب جاگزین ہوا تھا۔ لیکن سینٹ قبل از جنگ میں بھی دیگر واقف کاران مشرق روز افزوں اہمیت کے معاشرتی اضطراب کی پیشینگوئیاں کر رہے تھے۔ ہندو قوم پرست لیڈر بپن چندر پال نے لکھا "یہ نام نہاد بے چینی دراصل سیاسی نہیں ہے یہ فی الحقیقت ذہنی و روحانی عروج اور ایک عظیم معاشرتی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ جس میں جدید منطق اور جدید فلسفہ حیات[1] ہوگا" اور فرانسیسی ماہر سیاسیات شیلے نے ہندوستان کے بارے میں لکھا "اقتصادی انقلاب کا ایک سلسلہ رونما ہوگا جس سے لازمی طور پر کشمکش اور مصائب پیدا ہوں[2] گے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ قبل از جنگ کے زمانہ میں حالات معیشت کی زیادہ مشکلات اور اسی کے ساتھ مغربی آسایش کے خیال اور اسی نہج کے دیگر رفیع تر معیاروں کے اختیار کرنے سے مشرقی آبادی کے مختلف اجزا میں تصادم پیدا ہوگیا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں ایک برطانوی ماہر حفظان صحت نے ہندوستان کی سیاسی بے چینی کی اصل وجہ "فلاکت[3]" بتائی۔ ہندوستان کے عوام کے قابل افسوس حالات کا

---

[1] بپن چندر پال کا مضمون "ہندوستان میں بے چینی کے معین قوتیں" جو فروری ۱۹۱۰ء کے ہمعصر ریویو میں شایع ہوا (مصنف)

[2] جے شیلے کی کتاب "برٹش انڈیا کے انتظامی مسایل" صفحہ ۳۴۹ مطبوعہ لندن ۱۹۱۰ء (انگریزی ترجمہ) مصنف

پڑتی ہی تو یہ لازمی ہے کہ بہت سے اشخاص مبتلائے مصائب ہوں۔ اس سے بے اطمینانی پھیلتی ہے سیاسی اور تباہ کن تحریکات بالیقین پیدا ہونے لگتی ہیں ۱۸۴۸ء کے انقلاب کے علاوہ اشتراکیئین کا گروہ بھی صنعتی انقلاب سے پیدا ہوا۔

لیکن وہ انقلاب اس قدر عظیم اور ہمہ گیر نہ تھا جیسا کہ آج ہندوستان میں سرگرم عمل ہی۔ یورپ میں مشین اور دخانی قوت کی ایجاد اُن مدت ہائے دراز میں جاکر عظیم الشان واقعہ قرار پائی۔ جن میں کہ تجارت اور صنعت متواتر وسعت پارہی تھیں، سرمایہ بہت جمع ہو گیا تھا اور اقتصادی اصول بتدریج رائج ہو رہے تھے...... امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے عظیم صنعتی انقلاب سے بھی عظیم تر اور اہم تر واقعہ ہندوستان کا اقتصادی انقلاب ہی۔ ایسے اضلاع میں ریلیں بن گئی ہیں جہاں گزرنا ممکن تھا۔ آج بھی سڑکیں نہیں ہیں۔ کارخانے قایم ہو گئے اور انہیں ایسے آدمی کام کر رہے ہیں جو صنعتی کاروبار کے عادی نہیں ہیں۔ سرمایہ اس ملک میں پہونچ گیا ہی جو اس قسم کی ترقی کے لیئے بالکل تیار نہ تھا۔ اور ان سب باتوں کا نتیجہ کیا ہی! ہندوستان کے معاشرتی نظام کا شیرازہ بکھر رہا ہی۔ برہمن اب پوجاری کا کام نہیں کرتے۔ رعیت کے لیے یہ مجبوری نہیں ہے کہ وہ آراضی ہی کے ساتھ بندھا رہے۔ پیشہ صرف بیوہار ہی نہیں رہا۔ کپڑا بننے والوں کو فنا ہوجانے کا ڈر ہے۔ اور ٹھیروں کو کام چلانا مشکل ہے۔ یورپ کے اس اضطراب کو پیش نظر رکھ کر جو کثیر تبدیلی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اگر تم اُن کثیر التعداد اشخاص کی پریشانی پر غور کرو جو اس فوری انقلاب کی بدولت اپنے موروثی پیشہ کا کام نہیں کر سکتے ہیں۔ تو تم کو اس کا اندازہ ہوگا کہ سیاسی سنسنی کا خاص منشا کیا ہے۔ یہ ذرا بھی حیرت انگیز نہیں ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ سنسنی اس سے زیادہ کیوں نہ ہوئی۔ اگر

چنانچہ ایک امریکی ماہر عمرانیات نے کل صنعتی مشرق میں روز افزوں غریب محلوں کی خرابی کی بابت لکھا ہو "سب سے بڑا خطرہ اس امر سے ہو کہ مشرقیوں کو انسانی جان کی قدر کا وسیع مغربی احساس نہیں ہے۔ اور ہماری روشن خیالی رائے عامہ جیسی کوئی پابندی نہیں جو ہم میں صدیوں کی صنعتی جد و جہد کے بعد پیدا ہوئی ہے جبتک یہ عناصر بھی پیدا نہ ہوں اس وقت تک ایسے مصائب اور خرابیوں کا خطرہ لگا رہے گا جس کا مغرب کو کبھی بھی علم نہ ہوا"[51]

یہ سب معاشرتی نئے چینی "نوزائیدہ طبقوں پر منتہی ہوتی ہے۔ یعنی روشن خیال اور صنعتی شہروں کے کارخانے کے مزدور۔ روشن خیال طبقے بالخصوص اس کے نیم تعلیم یافتہ ناکامیابوں کے انقلابی رجحانات کا ذکر ہو چکا ہے۔ بلاشبہ ان آخر الذکر اشخاص نے موجودہ مشرق کی سب انقلابی شورشوں میں شمالی افریقہ سے لیکر چین[52] تک نمایاں حصہ لیا ہے۔ صنعتی مزدوروں کی روایت پسندی، جہالت اور عدم توجہی کی وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ ان کی دوہری معاشرتی بے چینی کے مرکز یعنی روشن طبقے کے درمیان کوئی حقیقی ربط نہیں ہے۔ بعض مصنفین کی رائے میں یہ اغلب نہیں کہ یہ زمانۂ قریب میں بڑا انقلابی جزو بن جائیں۔

اس نقطۂ خیال کو فرانسیسی ماہر اقتصادیات متین نے خوب بیان کیا ہے۔ اصلاً ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے "قوم پرستی کی

بقیہ نوٹ صفحہ ماقبل ۱۔ مزدوری، صفحہ ۳۲ و ۳۳ مطبوعہ لندن ۱۹۱۱ء (مصنف)

[51] اے۔ ڈبلیو کاپن کا مضمون "مشرق پر مغربی اثر کا عمرانی انداز" جو مئی ۱۹۱۱ء میں امریکن جرنل آف سوشیولاجی میں شایع ہوا۔ (مصنف)

[52] پی۔ کوراٹ کا مضمون "چینی انقلاب کا علم النفس" جو ۱۵ مارچ ۱۹۱۲ء کے "ریویو دی دو مونڈیا

ذکر کرنے کے بعد اس نے لکھا "بلاشبہ یہ کہا جائے گا کہ یہ حالات تو ہندوستان میں اتنا ہی زمانہ سے موجود ہیں، اور آج بھی اُن میں نئے چینی پیدا کرنے کی قوت ہو جس قدر کہ پہلے تھی۔ میری رائے یہ ہو کہ نئے چینی وہاں ہمیشہ سے خفیہ طور پر موجود رہی ہو علاوہ بریں اوس زمانہ کے عوام اپنے حالات کا دیگر خوش قسمت اقوام کی حالت سے موازنہ نہ کر سکتے تھے۔ اب وہ اپنے غلیظ محلوں اور گندے "دیسی مکانات" کا مقابلہ برتر اور باقاعدہ چھاؤنیوں کے مقامات اور برطانوی حکام اور نیز اپنے متمول بھائیوں کے مکانوں سے کر سکتے ہیں۔ جہاں تک میری عقل کام کرتی ہو یہ غربت ہی ہو جو کل عوام کی بے چینیوں کا ہمیشہ اصلی باعث ہوتی ہے......... مفویانہ مجالس، سیاسی گفتگو، بابو صاحبان اور سر برآوردہ حضرات کی توقعات عمیق تر شورش کے سطحی اظہارات ہیں"[1]

بلاشبہ یہ روز افزوں معاشرتی کشمکش اس وجہ سے اور بھی ترقی کر گئی کہ مشرقیوں کو اُن سب اشخاص کی تکالیف میں کوئی دلچسپی نہ تھی جو اُن سے خاندان، ذات یا رسومات کے رشتہ سے وابستہ نہ تھے۔ کل مشرق میں مغربی مفہوم کے مطابق "معاشرتی خدمت" کا عملاً علم ہی نہیں ہو۔ اس مسئلہ کو چند مشرقیوں نے خود لکھا ہو۔ ہندوستان کی شہری زندگی کا ذکر کرتے ہوئے ایک ہندوستانی اہل قلم لکھتا ہو "معاشرتی آداب کا کوئی عام معیار نہیں ہو......... اس وقت تک ہندوستان میں معاشرتی اصلاح میں افراد یا خاندان کی زندگی کا لحاظ کیا گیا ہو لیکن اس کا اطلاق جس طور سے عام نوع انسان اور بالخصوص مضطر انسانیت کی اُن نئے روح جماعتوں پر ہوتا ہو جن کو شہر کہتے ہیں۔ وہ ایسی مقدس کتاب ہے جس کی تلقین ہنوز باقی ہے"[2]

---

[1] ڈاکٹر دونلڈ وسن کا مضمون "سیاسی شورش کا ایک سبب فلاکت ہو" جو رسالہ دی سروے میں ۱۸ فروری ۱۹۱۹ء کو شایع ہوا۔ (مصنف) [2] عبداللہ یوسف علی کی کتاب "ہندوستانی زندگی اور"

اس طور پر ہندوستان کی صنعت و حرفت ہنوز حالت جنین میں ہے نفس الامر یہ ہو کہ مادّی ارتقار جو اپنے آپ کو تعمیر کارخانہ جات سے ظاہر کرتا ہو اور معاشرتی ارتقار جو مزدوری پیشہ جماعت پیدا کرتا ہے ابھی صرف ظاہر ہی ہوا ہے۔ اور ذہنی ارتقار جس سے معاشرتی مطالبات پیدا ہوتے ہیں ابھی شروع ہی نہیں ہوا۔[1]

ہندوستان کے صنعتی حالات کے دیگر مبصرین موسیو ہتین کی رائے سے متفق نہیں ہیں۔ چنانچہ جے۔ ایمزے میکڈانلڈ برطانوی حزب العمال کا لیڈر کہتا ہے "یہ خیال کرنا کہ پست ہندوستانی مزدور فرقہ وار لڑائی میں ایک خودشناس فوج بن جائیں گے مغربی دماغ کی بلند پروازیوں میں سب سے زیادہ ناقابل حصول خواب و خیال ہے۔ لیکن بعض وقت میں یہ خیال کرکے متحیر ہو جاتا ہوں کہ بالآخر یہ خیال بالکل ہی ناقابل حصول نہیں ہو اول تو یہ کہ کارخانہ جات کے کاروبار کی ترقی سے نئے خانماں مزدوروں کی جماعت پیدا ہو گئی ہے جس کا کسی دوسرے سرمایہ دار جماعت میں اس قسم کی اقتصادی جماعت سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خیال کرنا کہ اس طبقہ کا ہندوستانی سیاسیات میں داخلہ ممکن نہ ہوگا یا نہ ہونے دیا جائے گا۔ اس خیال سے بھی زیادہ لغو اور بے ہودہ ہے کہ ان کی سیاسیات کو مغربی دستور پر ترقی دی جائے۔ مزید براں محنت کرنے والوں نے ٹریڈس یونین کے ضوابط کے بموجب عمل پیرا ہونے پر مستعدی ظاہر کی ہے۔ صنعتی جماعتیں بنا رہے ہیں اور ہڑتالیں بھی کرتے ہیں ہندوستانی صاحب فہم اشخاص

---

[1] البرٹ ہتین کی کتاب "موجودہ ہند اور اس کے معاشرتی مسایل کا مطالعہ" صفحات ۳۰۹ تا ۳۲۵ (مصنف)

تحریک کا آغاز اوسط طبقہ سے ہوتا ہے اور اس سے سرمایہ داروں یا بڑے ملا
جائداد کی باقاعدہ مخالفت ظاہر نہیں ہوتی۔ اقتصادی امور میں یہ اون کے معید
ہیں[1]،،مزدوروں کی بابت یہ ہے،، قلیوں کو یہ خیال نہیں ہے کہ اِن کی
حالت بہتر ہوسکتی ہے۔ رعیت اور کاشتکاری کے مزدوروں کی طرح
بغاوت کی کوئی علامت ظاہر نہیں کرتے یہ کس کے پاس اپنی فریاد لے جائیں
سوسائٹی کے دروازہ ان کے لیے بند ہیں کسی ذات سے تعلق نہ رکھنے کی وجہ
سے ان لوگوں کو پرانے قسم کے کاریگر بھی ذلیل سمجھتے ہیں۔ جو باوجود اپنی پستی کے
اپنی ذات کی حیثیت پر نازاں ہیں۔ ایک ہندو کے لیے قلی ہو جانا سب سے بڑ
کو ذات ہو جانا ہے۔ کارخانوں کے مزدوروں کی تعداد ہنوز ایسی بڑی نہیں
کہ ایک مستقل اور طاقتور مزدوروں کا گروہ بنالیں جو قدیم معاشرت پر دبا
ڈال سکیں۔ اگرچہ وہ کبھی کبھی ہڑتال بھی کر ڈالتے ہیں تو بھی وہ موجودہ ٹریڈ یونین
سے ایسے بعید ہیں۔ جیسے کہ قدیم کام کرنے والے ذات سے۔ نہ ان کو یہ امید
ہے کہ روشن خیال طبقہ ادنیٰ اون کی رہنمائی کرے گا کیونکہ قوم پرستی کی
تحریک اپنی،،شہری،، صورت سے خارج نہیں ہوئی ہے۔ اور ہمیشہ سرمایہ دا
کی طرفدار ہے۔

بقیہ صفحہ ماقبل۔ شایع ہوا۔ ایل ہترا تہذ کی کتاب،، مشرقی سراب،، صفحہ ۱۶۴ لغایۃ ۱۶۶ جی ٹی۔ ویلس کی کتاب
،،مصلی ہند،، صفحہ ۱۶۲ و ۱۶۳ (مصنف)

[1] البرٹ میتں کی کتاب،، موجودہ ہند اور اس کے معاشرتی مسائل کا مطالعہ،، صفحہ ۲۰۲ مطبوعہ پیرس ۱۹۱۸
[2] کسی خاص تجارت یا صنعت میں کام کرنے والے مزدوروں کی جماعت جو اپنے مشترکہ مفاد
کے تحفظ کی کوشاں ہو۔ (مترجم)

سچ ہے کہ اجانب اور سرمایہ کی بکثرت درآمد نے اوس وقت میں تعویق پیدا کر دی جبکہ مصری قوم کے شہری اور دیہاتی مزدور۔ اُن برائیوں کو جو اون سے کیجا ہی ہیں۔ بالمشافہ دیکھ سکیں۔ وہ اشتراکیت کے اثر تعلیمی کے فقدان کو محسوس کریں تاہم یہ ممکن ہو کہ یہ بیداری وقت سے بہت پہلے ہی پیدا ہو جائے۔ ذہانت محض مصری کامیاب اور خوشحال اشخاص ہی میں نہیں پائی جاتی ہے۔ جن اشخاص کی مزدوری روز بروز کم ہو رہی ہے وہ اسی قدر ذکی الفہم ہیں۔ اب حقیقتاً یہ سوال رہ گیا ہے کہ وہ وقت کب آئے گا جبکہ اسلامی اشتراکیت کا شعلہ اول مرتبہ بلاد اسلامی میں فروزاں ہوگا؟ اسی طرح الجزائر میں بلجیم کے ایک سیاح نے جنگ عظیم سے کچھ ہی پہلے شہر کے مزدوروں میں مزدوری پیشہ جماعیت کی بیداری کے آغاز کو معلوم کیا۔ مغربی خیالات کی سرعت اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا "الجزائر کے گھاٹوں پر اسلام جامہ بوسیدہ کی طرح پارہ پارہ ہو رہا ہے۔ بندرگاہوں پر کام کرنے والے۔ کوئلہ لانے والے۔ اور انجن صاف کرنے والے خواہ کسی نسل کے کیوں نہ ہوں اپنا اسلام چھوڑ کر اصلی مزدوری پیشہ جماعت کا اخلاق سیکھ رہے ہیں۔ اور وہ اپنے رفقاء یورپ کے شریک کار ہو رہے ہیں۔ اگر الجزائر میں بہت سے بڑے بڑے کارخانے کھل جائیں تو اسلامی راسخ الاعتقادی وہاں سے بالکل اسی طرح ناپید ہو جائے گی جیسا کہ ہمارے یہاں صنعتی تصادم سے قدیم قسم کے کیتھولک اعتقادات ناپید ہو گئے۔[۵۲]

مشرق میں مزدوروں کی باقاعدہ تحریکات کی سریع اشاعت کے مواقع کیسے ہی کیوں نہ ہوں لیکن ایک امر یقینی ہے کہ جنگ عظیم

---

[۵۱] جارجس توکارٹ۔ منقول از لٹریری ڈائجسٹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۱۰ء صفحات ۲۲۵۔۲۲۶ مصنف

[۵۲] اسے۔ دانٹرنپ کی "الجزائر میں" مطبوعہ پیرس ۱۹۱۲ء صفحہ ۱۸۲ مصنف

سے جو بعض معاشرتی اصلاحی تحریکات جاری کی ہیں اُن میں ٹریڈ یونین کے انعقاد کی مخصوص کوشش کی ہے اور ایسے خیالات کی تلقین کی ہے جن سے ہم بسلسلۂ تبلیغ ٹریڈ یونین واقف ہیں۔ اگر ہندوستان میں عزائم عامہ کی پالیسی سرمایہ دارانہ ہوگئی تو اس تحریک سے صرف اشتعال ہی نہ ہوگا جیساکہ جاپان میں ہوا تھا بلکہ جاپان میں تو قانون بنا کر اس کو روک لیا گیا تھا لیکن ہندوستان میں یہ تحریک کسی طرح نہ دبے گی۔ اس وقت تک حقیقی مزدوری پیشہ طبقہ جو اپنے جنم بھوم کے گانوں سے دور ہوکر ہندوستانی نظام جماعت سے بالکل سے تعلق ہوکیسر ہیچ ہے۔ مگر یہ طبقہ بڑھ رہا ہے اور میرا یقین ہے کہ دیگر ممالک کے سرمایہ دار مزدوری پیشہ جماعت کے اصول پر بہت جلد مرتب ہو جائے گا۔ جب اس کو اپنی سیاسی اہمیت کا احساس ہوگا تو بالیقین اس کی تنظیم بھی انھیں اصول پر ہوگی ،،

اب ہم مشرق ادنےٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ایک قرن سے زیادہ ہوا کہ ایک فرانسیسی سوشلسٹ مصنف نے عام مصریوں کی مشکلات معیشت کو دیکھ کر معاشرتی نئے چینی کے آثار محسوس کیے اور سخت اضطراب کی پیشینگوئی کی۔ اس نے لکھا ''کارخانہ جات کی افزونی اور اوس کی بدولت جو فوری اور دفعتاً ترقی ہوئی ہے اوس سے ایک حقیقی مزدوری پیشہ جماعت پیدا ہوگئی ہے۔ صرف معیشت گرانی کی اس حد تک پہونچ گیا ہے کہ اس سے پہلے مصر میں کبھی نہ تھا۔ لیکن شرح مزدوری میں خفیف سی ترقی ہوئی ہے۔ افلاس اور احتیاج کی کثرت ہے۔ اس کل وادی نیل (ڈیلٹا) میں جو بظاہر شاداب ہے ایک نہ ایک دن عوام تکالیف سے برانگیختہ ہوکر شکایت بلکہ غصہ کرنے لگیں گے۔

---

۱۵ ب۔ ریمزے میکڈانلڈ کی کتاب ''گورنمنٹ ہند'' ، صفحات ۱۳۳-۱۳۴ مطبوعہ لندن

کے کنارہ تک پہونچا دیا۔ اس پرشگون اضطراب میں روسی بالشیویزم کا منحوس اثر پڑا جو اس سب منتشر نے چینی کو باقاعدہ طریقوں سے خاص اغراض کے لیئے مجتمع کر رہا تھا۔ بالشویزم کی غرض اصلی دنیا کا انقلاب اور مغربی تہذیب کی بربادی ہے اس مقصد کے حصول کے لیے بالشیوک لیڈروں نے صرف مغرب ہی پر براہ راست حملے نہ کیے بلکہ ایشیا و افریقہ میں پہلوؤں پر بھی حملہ کرنے کی فکر کی۔ ان کو یقین تھا کہ یہ آگ اگر مشرق میں لگ جائے گی تو روسی بالشیویزم کو طاقت حاصل ہو جانے کے علاوہ مغرب میں جو جنگ سے بالکل متزلزل ہو گیا تھا اقتصادی اشتعال اس زور کا ہوگا کہ صنعتی بربادی شروع ہو جائے گی۔ اور اوس سے یورپ میں انقلاب کا راستہ کھل جائے گا۔

بالشیویزم کے تبلیغی مساعی اپنے احاطہ اور وسعت کے لحاظ سے عالمگیر تھے۔ دنیا کا کوئی حصہ ان کے کارکنوں کی سازش سے خالی نہ تھا اور نہ ہیجینی کے کسی امکانی ذریعہ کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ بالشویزم کے اسلحہ خانے میں خالص سرخ "اصول یعنی مزدوری پیشہ جماعت کی رہنمائی کے علاوہ اور بہت سے اسلحہ بھی تھے چونکہ پہلی بات جو مطلوب تھی وہ موجودہ نظام عالم کی بربادی تھی لہذا ہر شئے جو نظام کے مخالف تھی خواہ وہ بالشویزم سے اصولاً کتنی ہی بعید کیوں نہ ہو بالشویکی اغراض کی تکمیل کے لیئے کام میں لائی گئی۔ لہذا یورپ کی طرح ایشیا، افریقہ، امریکہ اور اسٹریلیا میں بالشویک فتنہ انگیزوں نے ہر غیر مطمئن کے کان میں اپنی نفرت اور انتقام کا منتر پھونکا۔ بالشویزم جو جبر اور مقاتلہ کی آگ بھڑکا رہا تھا اس میں ہر قوم پرستی کی توقع اور ہر سیاسی شکایت اور ہر معاشرتی ناانصافی اور ہر نسلی دشمنیا ایندھن کا کام دیتا تھا۔

ا‍ے بالشیوک تبلیغ کے عالمگیر صور کے لیے ملاحظہ ہو پال میلیو گوٹ کی کتاب بالشویکی تحریک ایک

کے حالہائے نابل میں جو بے چینی اکثر حصص مشرق میں پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ زیادہ تر سیاسی تھی لیکن اس کا معاشرتی پہلو بھی تھا۔ ۱۹۱۱ء کے اختتام پر ایک سربرآوردہ اینگلو انڈین اخبار نے یاس سے یہ لکھا۔ "اس وقت تک ہم اس قدر تباہی کی طرف جانے والی سڑک پر اتر گئے ہیں کہ اب ایسے اضلاع کو بھی جو ہندوستان کے بڑے پُرامن مقامات کہلاتے تھے متمول اشخاص اس لیے ترک کر رہے ہیں کہ ان کا مال و اسباب وہاں محفوظ نہیں ہے۔ قانون کی تحقیر اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اس کو بد اندیش اشخاص نے گناہوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ سرحدی پٹھان ایسے دلیرانہ جرایم کا ارتکاب کرتے ہیں جن کا یقین نہیں آتا۔ ان امور کے لیے جو مہذب اشخاص کا کام نہیں ہیں عام جلسے اور شورش کی جاتی ہے۔ خانگی یا ممالک غیر کی سیاسیات میں کوئی معاملہ ایسا نہیں ہے جس پر غیر ذمہ دار اشخاص اپنے غیظ و غضب کا اظہار نہ کرنا چاہتے ہوں، چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بڑی بڑی شکایات کا رنگ دیکر پیش کیا جاتا ہے۔ ایک حاکم ضلع کی زندگی جو حقیقتاً با قاعدہ اور با فرصت بسر ہونا چاہیئے۔ اُن متضاد اثرات کی مداخلت بیجا سے پریشانی میں بسر ہوتی ہے جو عوام میں مادۂ اطاعت کے کم ہو جانے سے پیدا ہو گئی۔ خود بڑی ملازمتوں کے طبقۂ اوسط میں ٹریڈ یونین قایم ہو گئی ہیں۔ فوج اور پولس کے افسران کو یہ شکایت ہے کہ پرانے کے مقابلہ میں نئے رنگروٹ کم فرماں بردار کم پابند ضابطہ اور بات بات پر شکایت کرنے والے ہیں[1]"

بلاشبہ جنگ عظیم نے مشرقی بے چینی کو اور زیادہ کر دیا۔ مشرق ادنیٰ کے اکثر حصص میں بالخصوص سخت مصائب و یاس اور سخت نفرت نے معاشرت کو بدنظمی

---

[1] دی انگلشمین (کلکتہ) جو ۱۰ر فروری ۱۹۱۲ء کے لٹریری ڈائجسٹ میں نقل کیا گیا ہے صفحہ ۲۶۹ مصنف

ضرورت نہ پڑی۔ حکومت زار نے اِن کاموں کو پشتہا پشت سے کیا تھا اور اس کے متعلق پوری معلومات پٹروگرڈ کے دفاتر اور نیز باقی ماندہ زار کے وکلاء کے دماغوں میں موجود تھیں۔ اور یہ وکلاء جدید کام میں ہاتھ لگانے کے لیے پہلے کی طرح مستعد تھے۔

بالشویک تحریک کے اس وسیع جال میں جس میں آج کل مشرق پھنسا ہوا ہے ہم کو بالشویک کے دو مقاصد میں امتیاز کرنا چاہیے۔ ایک تو فوری یعنی مغربی سیاسی اور اقتصادی تفوق کی بربادی دوسرا انتہائی یعنی مشرقی عامۃ الناس کو بالشویک بناکر دیسیوں کے طبقات اعلیٰ و اوسط کو اسی طرح فنا کرنا جیسا کہ روس میں ہوا۔ اور جیسا کہ مغرب کے دیگر ممالک کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ منزل اوّل میں بالشویزم مشرقی عقائد رسوم کے احترام اور مشرقی تحریکات قوم پرستی کی حمایت کو مستعد ہے۔ منزل دوم میں مذاہب مثلاً اسلام اور حامیان قوم مثلاً کمال پاشا کو "طبقہ اوسط کے شہری ہونے کا" ملزم قرار دے کر بے رحمی سے تباہ کرنا مقصود ہے۔ ہم اس پر تبصرہ کریں گے کہ بالشویک (ڈپلومیسی) حکمت عملی ان دونوں تجاویز پر ایک ہی وقت میں عمل پیرا ہونے کی کیونکر کوشش کرتی ہے

روسی بالشویزم کی مشرقی پالیسی ۱۹۱۷ء کے ختم پر اپنے برسر اقتدار ہونے پر ہی معین ہو گئی تھی۔ ۱۹۱۸ء بہت بڑی تیاریوں کا زمانہ تھا۔ ایک عظیم تبلیغی نظام مختلف ذرائع سے مدون کیا گیا تھا۔ پرانی زار کی حکومت کے وکلاء اور ماہران حکمت عملی جو معاملات مشرق سے خوب واقف تھے خوشامد سے یا حکماً

بقیہ نوٹ صفحہ ماقبل: رہا ہونے کے بعد ممالک غیر کو چلا گیا۔ اور سترہ سال سوشلسٹ لیڈر رہا اکتوبر ۱۹۱۷ء میں پیٹروگریڈ واپس آکر حکومت کرنے والی کا باعث ہوا۔ (مترجم)

بالشویک سرگرمی کے لیے مشرق ادنیٰ و وسطیٰ نہایت ہمت افزا مقامات تھے۔ علاوہ اس کے کہ یہ مقامات ہر قسم کی سخت شورشوں کا شکار ہو چکے تھے قدیم زار کی شہنشاہیت کے موروثی منازل مقصود تھے۔ لہٰذا اُن کے حالات روسی وکلا نے خوب معلوم کر لیے تھے اور "پرامن مداخلت" کا خاص فن مرتب کر لیا تھا جو ان اغراض کے لیے بآسانی کارآمد ہو سکتا تھا۔ ترکی، ایران، افغانستان اور ہندوستان کی پہلے ہی سے ایسی حالت تھی کہ انھیں انگلستان کے خلاف سیاسی نسلی اور مذہبی ہیجان پیدا کرنے کے لیے ٹراٹزکی[1] اور لینن[2] کو کسی نئی تدبیر سوچنے کی

بقیہ نوٹ صفحہ قبل:۔ بین الاقوامی خطرہ ہے" مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۲۰ء نیز مصنف کی کتاب "گوروں کے عالمگیر اقتدار کے خلاف رنگ کا اُٹھنے والا طوفان"، صفحات ۲۱۸ لغایت ۲۲۱۔ اور نیز مصنف کا مضمون "بالشویکی تحریک یعنی اراذل کی مخالفت"، جو جون ۱۹۱۹ء دی سنچوری میں شائع ہوا۔ (مصنف)

[1] ٹراٹسکی سنہ ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ یہودی عطار تھا۔ اوڈیسہ میں تعلیم پائی۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں سائبیریا کو جلاوطن کیا گیا۔ وہاں سے فرار ہو کر جنیوا پہنچا اور اعتدال پسند انقلابی جماعت کا صدر رہا۔ اور انتہا پسندوں سے ربط پیدا کیا۔ پھر گرفتار ہو کر سائبیریا بھیجا گیا۔ لیکن وہاں سے بھاگ کر فرانس جرمنی اور سوئیزرلینڈ میں اخبار نویسی کا کام کرتا رہا۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں لینن کے ساتھ روس واپس آیا اور سوویٹ کا صدر منتخب ہوا۔ (مترجم)

[2] لینن سنہ ۱۸۷۰ء میں بمقام سمبرسک پیدا ہوا۔ امرا کے خاندان سے ہے۔ سمبرسک میں تعلیم پانے کے بعد کازان کی یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ لیکن گورنمنٹ کے خلاف ایک جلوسے میں شریک ہونے کی پاداش میں یونیورسٹی سے خارج کیا گیا۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں پیٹروگریڈ کے دارالعلوم میں قانون اور اقتصادی درجوں میں شریک ہوا۔ چار سال بعد جرمنی چلا گیا۔ اسی سال واپس ہو کر اشتراکیین کی سرگرمیوں میں شرکت کی بنا پر گرفتار ہو کر سائبیریا جلاوطن کیا گیا۔ سنہ ۱۹۰۰ء

مصر وغیرہ کے دیگر قوم پرستوں کی ماسکو نے کیسی حمایت کی۔ مشرق وسطےٰ میں بھی
بالشویکوں کو اہم فتوحات حاصل ہوئیں۔ ۱۹۱۹ء کی بہار میں جو بلووں اور منو یانہ
جبر کی لہر شمالی ہند میں پھیل گئی صرف اسی میں بالشویک جدوجہد کا اثر نمایاں نہ تھا بلکہ
افغانستان[۱] میں بھی برطانیہ کو سخت ضرب پہونچائی گئی۔ جنگجو کوہستانیوں کا ملک
جو ہندوستان کی شمالی و مغربی سرحد پر دائمی ابر برفبار کی طرح واقع ہے جنگ عظیم
میں محض اس وجہ سے ساکت رہا کہ اس کے حکمران امیر حبیب اللہ خاں کی روش
برطانیہ پسند تھی۔ لیکن اوائل ۱۹۱۹ء میں حبیب اللہ خاں قتل کردیئے گئے۔ یہ معلوم
نہیں کہ اس معاملہ میں بالشویک ہاتھ تھا یا نہیں۔ لیکن بالیقین انھوں نے اس سے
فائدہ اٹھایا کیونکہ حبیب اللہ خاں کے لڑکے امیر امان اللہ خاں برسر اقتدار ہوئے
جو انگلستان کے مسلمہ دشمن تھے اور دوران جنگ میں ان کے تعلقات ترکی و
جرمنی دکلا سے رہتے تھے۔ امیر امان اللہ خاں نے فوراً ماسکو سے رسل و رسائل
شروع کردیئے۔ اور کچھ دنوں بعد عین اس وقت جبکہ پنجاب میں شورش کا
ہیجان انتہا کو پہونچ چکا تھا انھوں نے انگلستان سے جنگ کا اعلان کردیا۔ اور
ان کے وحشی قبایل نے سرحد کے پار آکر شمالی مغربی سرحد کو مشتعل کردیا۔ سخت لڑائی
کے بعد انگریزی افواج کو افغان حملے کے روکنے میں کامیابی ہوئی اور امیر امان اللہ
کو مجبوراً صلح کرنا پڑی۔ لیکن یہ ظاہر تھا کہ گورنمنٹ برطانیہ امیر امان اللہ خاں کو زیادہ دبانے
کی جراءت نہ کرسکتی تھی۔ لہذا شرایط صلح میں امیر کو اپنی پہلی پابندی سے کہ سوائے برٹش
انڈیا کے کسی دوسری قوم سے سیاسی تعلقات نہ رکھیں، آزادی مل گئی۔ امیر
امان اللہ خاں نے اپنی خود مختاری کا فوراً اعلان کیا اور ماسکو سے دھوم دھام کے تعلقات

---

[۱] ملاحظہ ہو فصل ششم

اس خدمت پر مامور کیے گئے تھے۔ روسی مسلمانوں کی آبادی مثلاً جنوبی روس کے تاتاریوں اور وسط ایشیا کے ترکمانوں میں سے بہت سے اشخاص اس کام کی غرض سے لیے گئے تھے۔ جنگ عظیم کے ختم پر جو جلا وطن ترکی دایران و ہندوستان اور دیگر مقامات سے روس میں جمع ہو گئے تھے بہت زیادہ کارآمد ثابت ہوئے دوران جنگ کی ترکی حکومت کے تقریباً کل سربرآوردہ اشخاص مثلاً انور۔ طلعت۔ جمال وغیرہ دول ائتلاف کے فاتحانہ انتظام کے ڈر سے بھاگ کر روس میں پناہ گزیں ہوئے یہی اُس ہندو لیڈر کا حال تھا۔ جو زمانۂ جنگ میں جرمنی ملازم تھا اور اب جسے لینن کی خدمت میں باریابی حاصل تھی۔ ۱۹۱۸ء کے ختم تک بالشویزم کا محکمۂ تبلیغ مشرق بالکل درست ہو کر تین شعبوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ پہلا اسلامی ممالک کے لیے دوسرا ہندوستان کے لیے اور تیسرا مشرق اقصےٰ کے لیے۔ مشرق اقصےٰ میں جو بالشویکی جد و جہد رہی اُس سے اِس کتاب کو تعلق نہیں ہے۔ اگرچہ قارئین کو یہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ موجودہ روسی تاریخ میں چینیوں نے کیا حصہ لیا۔ اسلامی اور ہندوستان کے شعبہ جات نے بہت سرگرمی دکھائی اور متون بالشویکی تحریرات کو مختلف مشرقی زبانوں میں ترجمہ کیا۔ اور بہت سے خفیہ وکلاء اور مبلغین کو "میدان عمل" اور کل غیر مطمئن اور انقلابی عناصر سے اتصال کے لیے تیار کیا۔

۱۹۱۹ء کے ابتدائی مہینوں میں مشرق ادنےٰ و وسطےٰ میں بالشویکو کی جد و جہد بہت نمایاں ہو گئی۔ ائتلاف نے مشرق ادنےٰ کے قوم پرستوں کی توقعات کو جو نامنظور کیا اِس سے جس قدر یاس و غصہ کا طوفان اُٹھا وہ بالشویک کے ہاتھوں میں اچھا آلۂ کار بن گیا[1]۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ مصطفےٰ کمال اور ترکی و ایران و

---

[1] ملاحظہ ہو فصل پنجم مصنف

۱۹۲۰ء میں بالشویک جدوجہد کل مشرق ادنیٰ اور وسطیٰ میں اور واضح ہو گئی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ بالشویک روس نے ترکی اور ایرانی قوم پرستوں کی تحریکات کی کیسی زبردست حمایت کی۔ فی الواقع اتلافٹ کی غیر دانشمندانہ تنگ نظر پالیسی قوم پرستوں کو انبوہ در انبوہ لینن کے آغوش میں ڈھکیل رہی تھی۔ باوجود ان کو خود ماسکو کے بین الاقوامی اصول سے سخت نفرت تھی۔ مثلاً ماسکو کو جو افغان مشن گیا تھا اس کے گروہ نے سوویٹ روس سے دوستی کے وجوہ کو دوران ملاقات میں آزادی سے ظاہر کیا اور اس کو سرکاری سوویٹ اخبار ازویسٹا نے طبع کیا "میں نہ کمیونسٹ[1] ہوں نہ سوشلسٹ[2] لیکن میرا سیاسی پروگرام اس وقت تک یہ ہے کہ

بقیہ نوٹ صفحہ ماقبل

کی کوشش" جو ۱۰ جون ۱۹۲۰ء کو نیو یورپ میں شایع ہوا سیفیس وینڈنٹ کا مضمون "گزشتہ مشرق کی تباہی" جو شمال و جنوب میں مئی ۱۹۲۰ء میں شایع ہوا۔ جارج ینگ کا مضمون "روسی خارجی پالسی" جو یکم جولائی ۱۹۲۰ء کو نیو یورپ میں شایع ہوا۔ (مصنف)

[1] کمیونسٹ وہ گروہ ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ انفرادی ملکیت کو ختم کر کے ہر شے ملکیت مشترکہ قرار دی جائے (مترجم)

[2] سوشلسٹ۔ وہ گروہ جو اس امر کا خواہاں ہے کہ ہر شخص مساوی حالت کا ہے۔ حتےٰ کہ ہر شخص کی املاک بھی مساوی ہوں۔ اس اصول کے بقا و قیام کے لیے یہ فرقہ کہتا ہے کہ کاروبار جماعت کے ماتحت انصرام پائے اور اس میں تقابل اور مسابقت کو دخل نہ ہو

(مترجم)

قایم رکھے۔ نفس الامر یہ ہے کہ بالشویکیوں نے اب روسی ترکستان میں ایک اہم تبلیغی ماتحت مرکز سرحد افغانستان کے قریب ہی قایم کر دیا تھا۔ اور اس دفتر کی جدوجہد میں نہ صرف افغانستان بلکہ ہندوستان کا وسیع میدان کار بھی شامل تھا۔[1]

---

[1] افغانستان اور ایشیائے وسطیٰ کے واقعات کے لیے ملاحظہ ہو سرتی۔ ہولڈ رج کا مضمون "افغانستان میں بالشویزم کا اثر" جو ۴ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو نیو یوروپ میں شایع ہوا۔ اقبال علی شاہ کا مضمون "بخارا کا زوال" جو ۲ر اکتوبر ۱۹۱۹ء کو نیر ایسٹ میں شایع ہوا اور نیز اس کا مضمون ایشیائے متوسط کی گتھی جو اکتوبر ۱۹۲۰ء ایشیاٹک ریویو میں شایع ہوا۔ مشرق ادنیٰ و وسطیٰ میں بالشویکی سرگرمیوں کے لیے ملاحظہ ہو میلیو کو دکی کتاب مذکورۂ بالا اور میجر جنرل سر جارج اسٹن کا مضمون "مشرق میں بالشویک تبلیغ" جو اگست ۱۹۲۰ء کو فورٹ نائٹلی ریویو میں شایع ہوا۔ ڈبلیو۔ ای۔ ڈی۔ ایلن کا مضمون "گزشتہ اور موجودہ ماورائے قفقاز" جو اکتوبر ۱۹۲۰ء کو کوارٹرلی ریویو میں شایع ہوا۔ مسز ویلینٹائن چرول کا مضمون "مشرق ادنیٰ میں متضاد پالسیاں" جو یکم جولائی ۱۹۲۰ء کو نیو یوروپ میں شایع ہوا۔ ایل دیومون ولیان کا مضمون "بیدار ہونے والی ایشیا" جس کا ترجمہ فرانسیسی سے ۸ر اگست ۱۹۲۰ء کو لونگ ایج میں شایع ہوا۔ میجر جنرل لارڈ ایڈورڈ گلائیشین کا مضمون "مسلمانون اور مشرق وسطیٰ کی گتھی" جو دسمبر ۱۹۱۹ء کو نیشنل ریویو میں شایع ہوا۔ پیکستن ہیون کا مضمون "روس اور صلح" جو ۲۶ر جنوری ۱۹۲۱ء کو نیشن (نیو یارک) میں شایع ہوا۔ ہرفان ہافت کا مضمون "ترکی میں قوم پرستی کی تحریک" جو ڈیفشرج ریویو میں دسمبر ۱۹۱۹ء میں شایع ہوا۔ آر۔ جی۔ ہنٹر کا مضمون "انلافت ملی اور اسلام" جو ۲۶ر اگست ۱۹۲۰ء کو نیو یوروپ میں شایع ہوا۔ "تیسرا" کا مضمون "عرب بغاوت کا قصہ" جو اگست ۱۹۲۰ء کو بالکن ریویو میں شایع ہوا۔ سیاح کا مضمون "لینن کی تسخیر اسلام"

نظامات کا احترام کیا جائے گا۔ اور ان کو "خود انفصالی" کا حق ہوگا۔ مثلاً ۱۹۱۹ء کے ختم پر جو بالشویکوں کا اعلان لینن کے دستخط سے ترکوں کے لیے جاری ہوا حسب ذیل ہے:" دنیا کے مسلمانو! سرمایہ داروں کے مظلومو! بیدار ہو۔ روس نے زار کی اس پالیسی کو ترک کر دیا ہے۔ جو تمہارے لیے مضر تھی اور تم کو انگریزوں کے ظلم کے استیصال میں مدد دینے کو تیار ہے۔ وہ تم کو مذہب اور سیلف گورنمنٹ کی آزادی دے گا قبل از جنگ کی سرحدوں کا احترام کیا جائے گا۔ کوئی ترکی ملک ارمینیا کو نہ دیا جائے گا۔ درہ دانیال تمہارا رہے گا قسطنطنیہ ہی اسلامی دنیا کا دارالسلطنت ہوگا۔ روسی مسلمانوں کو سیلف گورنمنٹ دی جائے گی۔ اس کے بدلے میں ہم تم سے یہ چاہتے ہیں کہ تم بے رحم سرمایہ داروں سے لڑو جو تمہارے ملک کو لوٹ کر نو آبادی بنانا چاہتے ہیں اپنی رعایا سے مخاطبت میں بھی یہی عام لہجہ قایم رکھا گیا تھا۔ ان روسی افواج کے احکام میں جو ہندوستان کی سرحد پر تعینات تھے یہ بیان کیا گیا تھا "پامیر ڈویژن کے رفقا! تم کو اہم کام دیا گیا۔ سوویٹ کی جمہوریت تم کو پامیر کی چوکیوں کی محافظت کو بھیجتی ہے جو ہندوستان و افغانستان کے دوستانہ ممالک کی سرحد پر ہیں۔ پامیر کا حدب انقلابی روس اور ہندوستان کے درمیان حایل ہے۔ ہندوستان کی تیس کروڑ آبادی کو مٹھی بھر انگریزوں نے غلام بنا رکھا ہے۔ اس حدب پر انقلاب کے علم برداروں کو آزادی دینے والی فوج کا سرخ جھنڈا بلند کرنا چاہیئے۔ کاش اہل ہند کو جو ظالم انگریزوں سے لڑ رہے ہیں معلوم ہو جائے کہ دوستانہ امداد دور نہیں ہے۔ شمالی ہند کی حریت پسند اقوام سے نئے تعلقات ہو جاؤ ان انقلابی ترقی میں واسطے ورمے سخنے مدد کرو اور اُن الزامات کی تردید کرو جو برطانوی شہزادوں، اسیروں اور ساہوکاروں کے کارپردازوں نے سوویٹ روس کے خلاف شایع کیے گئے ہیں۔ پائندہ باد مخالف

ایشیا سے انگریزوں کو نکالا جائے۔ ایشیا میں یوروپی سرمایہ داری کا جس کے بڑے نمائندے انگریز ہیں، میں جاپانی دشمن ہوں۔ اس امر پر میں کمیونسٹ سے متفق ہوں اور اس بارہ میں میں تمہارا قدرتی حلیف ہوں۔ افغانستان ہندوستان کی طرح سرمایہ دار کی سلطنت نہیں ہے۔ اور یہ غیر اغلب ہے کہ پارلیمنٹی حکومت ان ممالک میں جڑ پکڑ سکے۔ اس وقت یہ کہنا مشکل ہے کہ واقعات مابعد کیا صورت اختیار کریں گے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ اس مشہور خطبہ نے جو سوویٹ گورنمنٹ نے کل اقوام عالم کے نام بھیجکر سرمایہ داروں کے خلاف جنگ کرنے کی درخواست کی تھی۔ ہم پر بہت بڑا اثر کیا۔ کیونکہ ہمارے نزدیک تو سرمایہ دار "اجنبی"، یا اگر صاف صاف کہا جائے انگریز کا مرادف ہے۔ اس سے بھی زیادہ ہم پر اس بات کا اثر ہوا کہ روس نے ادن خفیہ عہد ناموں کو کالعدم کر دیا جو شہنشاہیت پسند حکومتوں نے کیے تھے۔ اور یہ اعلان کر دیا کہ ہر قوم خواہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو اس کو یہ حق ہے کہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے۔ اس فعل سے ایشیا کی وہ قومیں جن کو لوٹ لیا گیا تھا اور تمام فرقے جو ابھی اشتراکیت سے بہت بعید ہیں۔ سوویٹ روس کے پاس آموجود ہوئے "! بلا شبہ ہم کو جو علم بالشویک مبلغین کی چالوں کا ہے اس سے ہم کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ افغانی سفیر نے وہ باتیں کہیں جو اڑولسٹیا نے بیان کی ہیں۔ اگر یہ ملاقات فرضی بھی ہو تو جو الفاظ اس کے منہ سے ادا کیے جاتے ہیں کثیر التعداد مشرقیوں کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور ممالک مشرق میں بالشویک مبلغین کی کامیابی کی خاص وجہ کا اظہار کرتے ہیں۔

فی الحقیقت بالشویک تبلیغ کی ترقی ایسی کامیاب ہوئی کہ سوویٹ کے لیڈر کھلم کھلا اپنے مقاصد کے لیے کام کرنے لگے۔ پہلے ماسکو نے اپنے آپ کو مغربی "شہنشاہیت" کے خلاف مشرقی اقوام کا حامی ظاہر کیا۔ اس کی مخاطبت "اقوام" سے بلالحاظ طبقات تھی۔ اور اس نے یہ وعدہ کیا تھا کہ دیسیوں کے خیالات اور

ترکستان کو کامل "حق خود انفصالی عطا کر دیا تھا۔ اور باشندوں نے اپنے دیسی حکمرانوں کا خیر مقدم کر کے اپنی قدیم سلطنتیں قایم کر لی تھیں۔ جو ایک نوع پر جماعتی رشتہ میں روس کے ماتحت تھیں۔ مگر اوایل ۱۹۲۰ء میں سوڈیٹ گورنمنٹ نے ترکستان کو "معاشرتی انقلاب" کے لیے تجوزوں تصور کیا۔ لہذا دیسی حکمرانوں کو معزول کر کے کل سیاسی اختیار مقامی سوویٹ کو دیدیے گئے (جو روسیوں کے تحت میں تھے) دیسی طبقات اعلےٰ و اوسط کا مال لوٹ لیا گیا۔ اور جو منتشر مقاومت ہوئی اس کو قتل و اذیت اور دیگر بالشوکی تخویفی ذرایع سے فرو کیا گیا۔[۱] قفقاز میں بھی آذربائیجان کے سوویٹی بنانے کے ساتھ ہی معاشرتی انقلاب شروع ہو گیا۔ آذربائیجان کی تاتاری جمہوریت قدیم صوبہ ماوراے قفقاز کا ایک حصہ تھی۔ اور اس نے ۱۹۱۷ء میں حکومت زار کے زوال پر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ مشرقی ماوراے قفقاز بحیرہ خزر کے پاس آذربائیجان کا دار السلطنت باکو تھا جو اپنی تیل کی کانوں کے لیے مشہور ہے۔ تیل کی تجارت نے باکو کو مغربی طریقہ کا کاروباری مرکز بنا دیا تھا۔ اور اس کی آبادی زیادہ تر مزدوری پیشہ جماعت پر مشتمل تھی جو روسی اور ایشیائی اختلاط نسل سے پیدا ہوئی ہے۔ اس شہری مزدوری پیشہ جماعت کے نوزائیدہ جماعتی احساس کو بھڑکا کر بالشویک روکلا نے ۱۹۲۰ء کی بہار میں سیاسی ضرب لگا کر قوم پرست حکومت کو مغلوب کیا۔ اور روسی امداد سے آذربائیجان کو سوویٹ جمہوریہ بنا لیا۔ اس کے بعد معاشرتی انقلاب

---

[۱] اقبال علیشاہ مذکور الصدر (مصنف)

"انقلابیں یورپ و ایشیا"

بالشویک تبلیغ کی منزل اول اس قسم کی تھی۔ مگر تھوڑے عرصہ بعد بالکل دوسری قسم کی تبلیغ ظاہر ہونے لگی۔ اس میں شک نہیں کہ اس تبلیغ کی منزل دویم میں مغربی سرمایہ داروں کی شہنشاہی پر برابر حملے ہوتے رہے لیکن اب ان مخالف مغرب حملوں کے متوازی ۔یا نمول میں عامۃ الناس سے خاص اپیل ہونے لگی۔ جس میں ان کو سب "سرمایہ داروں" اور "ابنفراد معاشے کے شہریوں کے" خلاف خواہ دیسی ہوں یا اجنبی مشتعل کیا گیا تھا اور اُن کی سب بیماریوں کا علاج "مزدوروں کی جماعت" بتائی گئی تھی ۱۹۲۰ء کے موسم گرما میں جو بالشویکی اعلان عام ترکوں کے لیے شایع کیا گیا تھا حسب ذیل ہے۔ یہ ایک سال قبل کے اعلان سے بالکل مختلف ہے۔ اس دلچسپ دستاویز میں لکھا تھا "مزدور ہر جگہ کے ساہوکاروں کے خلاف جد و جہد کر رہے ہیں۔ یہ اشخاص امرا اور ادن کے پٹھوؤں کی مدد سے ترکی مزدوروں کو اپنے سلاسل بلا میں گرفتار رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ یورپ کے ساہوکار ہی ہیں جنھوں نے ترکی پر قہر توڑا۔ یارو آؤ۔ ہم دنیا کے مزدوروں سے متحد ہوجائیں اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو ہم کو کبھی سر نہ اٹھانے دیا جائے گا۔ انقلاب، ترکی کے بہادروں کو بالشویزم میں شریک ہونا چاہیے۔ زندہ باد سویم مجلس بین الاقوامی المجمع الشیوعی"

اسکو نے ان جدید مساعی میں صرف باتوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عمل بھی شروع کر دیا۔ مشرقی اقوام میں سب سے پہلے بالشویزم کا نفاذ روسی ترکستان میں ہوا۔ آخر ۱۹۱۷ء میں جب بالشویکی اولاً برسر اقتدار ہوئے تو انھوں نے

ایران کے کاشتکارو اور مزدورو! قاچاری حکومت طہران اور اس کے خدام یعنی خوانین صوبہ جات نے صدیوں سے تم کو لوٹا اور برباد کیا ہے۔ وہ زمین جو قانون شریعت کے بموجب تمہاری مشترکہ ملکیت تھی حکومت طہران کے خوشامدیوں نے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ اشخاص اس اراضی کو اپنی مرضی کے مطابق خرید و فروخت کرتے ہیں اور تم پر جیسا چاہتے ہیں ٹیکس لگاتے ہیں۔ اور جب اپنی بدانتظامی کی وجہ سے انھوں نے ملک کو اس حالت پر پہونچا دیا کہ خود اس سے کافی نفع نہ اٹھا سکے تو انھوں نے ایران کو سال گزشتہ انگریز سرمایہ داروں کے ہاتھ بیس لاکھ پونڈ کو فروخت کر ڈالا تاکہ آخرالذکر ایران میں ایک فوج ترتیب دیں جو تم پر پیش از پیش ظلم کرے۔ خوانین اور حکومت طہران کے لئے محاصل جمع کریں انھوں نے جنوبی فارس میں تیل کے چاہات فروخت کر دیئے اور اس طور پر ملک کی لوٹ میں مدد کی۔

کاشتکاران جزیرۃ العرب! انگریزوں نے تمہارے ملک کی آزادی کا اعلان کیا۔ لیکن تمہارے ملک میں اسی ہزار انگریزی فوج مقیم ہے جو لوٹ مار، قتل، اور تمہاری عورتوں کو بے حرمت کر رہی ہے۔

کاشتکاران اناطولیہ! انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی حکومتیں اپنی توپوں کے زور سے قسطنطنیہ پر قابض ہیں۔ انھوں نے سلطان کو مقید کر رکھا ہے اور اس پر مجبور کیا ہے کہ وہ خالص ترکی ممالک کے تجزیہ پر رضامندی ظاہر کر دیں۔ اور ملک کے مالیات کو ممالک غیر کے سرمایہ داروں کے سپرد کریں تاکہ وہ ترکی قوم سے خوب جلب منفعت کر سکیں۔ جو چھ سال کی لڑائی کے بعد خود ہی فلاکت میں مبتلا ہے۔ انھوں نے ہر قلیہ کی کوئلہ کی کانوں

کے معمولی لوازمات یعنی اعلےٰ اور اوسط طبقات کی لوٹ مار قتل عام شروع ہوگیا۔ اور کل جائداد بیرحمانہ جبر و استبداد کے بعد بحق قصباتی مزدوری پیشہ جماعت و زراعتی مزدوران ضبط ہوگئی۔ اس طور پر سنہ ۱۹۲۰ء کے شروع مہینوں میں بالشویزم مشرق ادنےٰ وسطےٰ دونوں جگہ حقیقتاً عمل پیرا ہوگئی۔[۵]

مشرق میں پورے طور پر قدم جمانے کے بعد بالشویزم کی اتنی قوت مل گئی کہ وہ نقاب کو دور کردے۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے موسم خزاں میں سوویٹ گورنمنٹ نے باکو میں ایک "مشرقی اقوام کی کانگریس" منعقد کی جس کا مقصد مشرق کو مغربی تسلط سے آزادی دلانے کے علاوہ بالشویکی بنانا بھی تھا۔ اس بڑے مقصد کو چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اور اس وقت جو لہجہ اختیار کیا گیا تھا ایسا تعجب خیز تھا کہ ہم کو اس کی طرف پوری توجہ کرنا چاہیئے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کانگریس کے انعقاد کا جو نوٹس تیسری (ماسکو) بین الاقوامی جماعت نے جاری کیا تھا۔ وہ مشرق کے "کاشتکاروں اور مزدوران" کے لئے تھا۔ دعوتی اشتہار حسب ذیل تھا:۔

---

[۵] قفقاز کے واقعات کے لئے ملاحظہ ہو۔ ڈبلیو ای۔ ڈی ایلن کا مضمون "گزشتہ اور موجودہ ماوراے قفقاز" جو اکتوبر سنہ ۱۹۲۲ء کو کوارٹرلی ریویو میں شایع ہوا۔ سی۔ ای بیکہوفر کا مضمون۔ "ماوراے قفقاز کی حالت" جو ۲ دسمبر سنہ ۱۹۲۰ء کو نیو یوروپ میں شایع ہوا۔ "ڈی۔ زیڈ۔ ٹی کا مضمون آذربائیجان پہلی مسلمان جمہوریت" جو سنہ ۱۹۱۹ء میں ریویو آف دی مسلمان ورلڈ میں شایع ہوا۔ بیکسٹن نہیں کا مضمون گرجستان کا دروازہ جو ۳۰ مارچ سنہ ۱۹۲۱ء کو نیشن (نیو یارک) میں شایع ہوا۔ (مصنف)

مقابلہ میں زیادہ طاقتور رہیں اور تمہیں زیادہ لوٹ سکتے ہیں

تم خود ان سب باتوں کو سمجھتے ہو۔ ایران کے کاشتکار اور مزدوروں نے اپنی حکومت طہران کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جزیرۃ العرب کے کاشتکار انگریزی افواج کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں۔

اے اناطولیہ کے کاشتکارو! تم حملہ غیر کے خلاف لڑنے کے لئے کمال پاشا کے جھنڈے کے تلے جمع ہو رہے ہو لیکن اس کے ساتھ ہم یہ بھی سنتے ہیں کہ تم خود اپنی پارٹی کی تنظیم کے لئے بھی کوشاں ہو۔ اگر ترکی پاشا اتحادی وطیروں سے صلح بھی کر لیں گے تو یہ اصلی کاشتکاروں کی پارٹی جنگ کو قایم رکھے گی۔ شام میں امن نہیں ہے۔

اے کاشتکاران ارمینیہ! تم کو اتحادی باوجود اپنے مواعید کے فاقوں سے مرنے دیتے ہیں۔ تاکہ تم پر کامل تسلط رکھ سکیں تم روز بروز یہ سمجھتے ہو کہ اتحادی سرمایہ داروں سے نجات کی امید رکھنا حماقت ہے۔ تمہارے طبقہ اوسط کی حکومت جو اتحادیوں کی پٹھو ہے اس کو بھی امن اور مدد کے لئے روس کی حکومت کے لئے مزدوروں اور کاشتکاروں سے درخواست کرنا پڑتی ہے۔

اے مشرق ادنےٰ کے کاشتکارو اور مزدورو! اگر تم اپنا نظام قایم کر لو۔ اگر تم اپنی حکومت کاشتکاران و مزدوران بنا لو۔ اگر تم اپنے آپ کو مسلح کر لو اگر تم سرخ روسی

پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور تمہارے بندرگاہوں کو دبا لیا۔ اور تمہارے ملک میں اپنی فوج بھیج رہے ہیں جو تمہاری کاشت کو پامال کر رہی ہے

کاشتکاران و مزدوران آرمینیا! قریباً قرن گزر گئے کہ تم ممالک غیر کے سرمایہ داروں کی سازشوں کا شکار ہو ان سرمایہ داروں نے قتل عام کے خلاف زبانی جمع خرچ کر کے تمہیں ابھارا کہ سلطان کے خلاف جنگ کرو۔ اس سے ان کا منشا یہ تھا کہ تمہارے خون کے بدلے میں خونخوار سلطان سے جدید مراعات اور تازہ منافع روزانہ حاصل کریں۔ دوران جنگ میں ان لوگوں نے تم سے صرف آزادی کا ہی وعدہ نہ کیا بلکہ تمہارے تجار تمہارے مدرسین، اور تمہارے پیشوایان مذہبی کو یہ بھی لالچ دیا کہ وہ ترکی کاشتکاروں کی زمین طلب کریں۔ تاکہ ارمینیوں اور ترکیوں میں دائمی جنگ رہے اور اس لڑائی سے وہ خود ہمیشہ نفع اٹھاتے رہیں۔ کیونکہ جب تک تمہارے اور ترکوں کے درمیان جنگ رہے گی اسی وقت تک انگریز فرانسیسی اور امریکی سرمایہ دار ارمنی بغاوت کے خوف سے ترکوں کو روک سکیں گے۔ اور کردوں کے فتنہ کے خوف سے ارمینیوں کو لقمہ توپ بنا سکیں گے۔

اے کاشتکاران شام و عرب! انگریزوں اور فرانسیسیوں نے تم سے آزادی کا وعدہ کیا تھا اور اب انہوں نے تمہارے ملک میں فوجیں ڈال کر قبضہ کر لیا ہے۔ اب انگریز اور فرانسیسی اپنے قوانین تم پر نافذ کرتے ہیں۔ تم نے اپنے آپ کو ترکی سلطان اور حکومت قسطنطنیہ کے پنجہ غضب سے آزاد تو کر لیا۔ لیکن اب تم پیرس اور لندن کی حکومتوں کے غلام ہو۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ جدید آقا سلطان کی حکومت کے

بھی نمائندے تھے۔ بلاشبہ روسی سوویٹ گورنمنٹ کا تسلط تھا۔ اور اس نے کل کارروائیوں کو بالکل اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ ان کارروائیوں کی نوعیت کا خلاصہ مشہور بالشویک لیڈر زینو ولو کے ایڈریس میں ہے۔ یہ تیسری (ماسکو) بین الاقوامی جلسے کی کمیٹی کا رکن کا صدر تھا۔

زینو ولو نے کہا "ہم اس کانگریس کو تاریخ کے سب سے بڑے واقعات میں سے شمار کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس سے صرف یہی نہیں ثابت ہوتا کہ یورپ اور امریکہ کے ترقی کن مزدور اور جفاکش کاشتکار بیدار ہوئے ہیں۔ بلکہ ہم نے آخرکار اس دن کا بھی مشاہدہ کرلیا جبکہ مشرقی اقوام کے نہ صرف چند بلکہ لاکھوں اور کڑوروں مزدور بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ یہ اقوام کل دنیا کی آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہیں۔ لہذا یہ انہی کا حصہ ہے کہ سرمایہ اور مزدوری کی جنگ کو آخری نتیجہ تک پہونچا دیں"۔

"کمیونسٹ بین الاقوامی جلسہ نے اپنی پیدایش ہی سے یہ کہا کہ یورپ سے جو گنے اشخاص ایشیاء میں بستے ہیں۔ ہم کل اقوام کو جو مزدوری پیشہ ہیں آزاد کریں گے .... ہم جانتے ہیں کہ مشرق کی مزدوری پیشہ جماعت پست حال ہے۔ لیکن یہ ان کی غلطی نہیں ہے وہ نہ پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔ وہ جہل اور توہمات میں مبتلا ہیں۔ وہ ارواح خبیثہ پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ نہ اخبار پڑھ سکتے ہیں اور نہ ان کو واقعات عالم کی خبر ہے۔ ان کو ابتدائی قواعد قانون حفظان صحت کا بھی علم نہیں ہے۔ دوستو! ہمارے ماسکو کے بین اقوامی

مزدوروں اور کاشتکاروں کی فوج سے متحد ہو جاؤ تو تم انگریز
فرانسیسی و امریکی سرمایہ داروں کا مقابلہ کرسکو گے۔ تب تم اپنے
دیسی قزاقوں سے انتقام لے سکو گے۔ تب تمہارے لئے یہ ممکن
ہوگا کہ دنیا کی جمہوریت مزدوران سے متحد ہوکر اپنے مفاد کی
محافظت کرسکو! ۔ تب تم کو یہ معلوم ہوگا کہ اپنے ملک کے ذرائع
کو کیوں کر ترقی دو تاکہ تم کو خود اور کل دنیا کے اُن مزدوری پیشہ
اقوام کو فائدہ ہو جو اپنی محنت کے ثمار سے ایمانداری کے
کے ساتھ تبادلہ کریں گے۔ اور ایک دوسرے کی مدد کریں گے
ان تمام مسائل پر ہم تم سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ لہذا
یکم ستمبر کو باکو میں شریک کانگریس ہونے کے لئے حتی الامکان
کوشش کرو۔ اور جتنی بڑی تعداد میں ممکن ہو آؤ۔ تم سال بہ سال
ریگستان میں ہوکر مقامات مقدسہ کو جاتے ہو اور وہاں پہونچکر
خدا اور اپنے ماضی کی حرمت کا اظہار کرتے ہو۔ اب تم ریگستانوں
کوہستانوں اور دریاؤں کا سفر کرتا کہ اس مسئلہ کو طے کرسکو کہ تم
غلامی سے کیونکر آزاد ہو اور کیوں کر بھائیوں کی طرح متحد رہو تاکہ
آزاد اور مساواتی زندگی بسر کرسکو"

اس طلبی سے باکو کی کانفرنس کی نوعیت کا اندازہ ہوسکتا
ہے۔ فی الواقع یہ قوم پرستی کی جماعت ہونے کی بجائے معاشرتی
انقلابیوں کی جماعت تھی۔ انیس سو نمائندوں میں سے تیرہ سو مسلمہ
کمیونسٹ تھے۔ سب سے بڑے وفد ترکی، ایران، ارمینیہ اور
قفقاز سے آئے۔ عرب، ہندوستان اور مشرق اقصیٰ کے

کام ہے۔

مشرق اور دیگر مقامات کی مزدوری پیشہ جماعت کے مذہبی اعتقادات پر ہم بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ لیکن اس کانگریس میں تم کو یہ بتا دینا ہمارا فرض ہے کہ جو کچھ کمال پاشا کی گورنمنٹ ترکی میں کر رہی ہے تم کو نہیں کرنا چاہیئے۔ تم کو سلطان کے اقتدار کی حمایت نہ کرنا چاہیئے۔ خواہ تمہارے مذہبی خیالات تمہیں اس پر مجبور کرتے ہوں۔ تم کو آگے قدم بڑھانا چاہیئے اور پیچھے نہ ہٹنا چاہیئے۔ ہمارا یقین ہے کہ سلطان کا وقت پورا ہو گیا۔ تمہیں چاہیئے کہ کسی قسم کے خود سرانہ اختیار کو باقی نہ رکھو۔ تم کو جو عقیدت سلطان سے ہے اس کو ختم کر دینا چاہیئے۔ حقیقی سوویٹ نظامات کے حصول کے لیے کوشش کرنا چاہیئے۔ روس کا شتکاران بھی زار کے بڑے معتقدین میں تھے۔ لیکن عوام کا حقیقی انقلاب جب وقوع پذیر ہوا تو زار سے یہ عقیدت بالکل معدوم ہو گئی۔ جب کاشتکاروں کا ایک حقیقی انقلاب ارض سیاہ میں وقوع پذیر ہو گا۔ تو یہی واقعہ ترکی اور کل مشرق میں پیش آئے گا۔ عوام کو اپنے سلطان اور اپنے آقاؤں سے عقیدت جاتی رہے گی۔ ہم پھر کہتے ہیں کہ ترکی میں موجودہ حکومت عوام نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے وہ کمیونسٹ کی بین الاقوامی پالیسی نہیں ہے۔ یہ ہماری پالیسی نہیں ہر باایں ہمہ ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ گورنمنٹ برطانیہ کے خلاف ہر انقلابی جنگ میں ہم امداد دینے کو تیار ہیں۔

ہاں ہم انگریزی سرمایہ داروں کے مخالف ہیں۔ ہم انگریزی شہنشاہیت کی گردن پکڑ کر اس کو پامال کرنا چاہتے ہیں۔ یہ انگریزی سرمایہ داری ہی ہے جس کے خلاف بدترین و مہلک ترین ضرب لگنی چاہیئے۔ یہ امر واقعہ ہے

جلسہ میں اس مسئلہ پر بحث ہوئی تھی کہ آیا ممالک مشرق میں اشتراکی انقلاب
قبل اس کے کہ یہ ممالک سرمایہ داری کی منزل کو طے کریں، ہو سکتا ہے
یا نہیں؟ تم کو علم ہے کہ عرصہ دراز تک یہ خیال رہا کہ ہر ملک کو
اولاً سرمایہ داری کے دور سے گزرنا چاہیئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تب ہی اشتراکیت کے مسئلہ میں جان پڑ سکتی ہے۔ اب ہم کو
یقین ہو گیا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ روس نے ایسا کر کے دکھا دیا۔ اور
اس وقت سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چین، ایران، ہندوستان، ترکی اور
اربینیہ کے لئے بھی یہ ممکن ہے۔ اور ان ممالک کو نظام سوویٹ کے
حصول کے لئے فوراً لڑنا چاہیئے۔ یہ ممالک بھی اپنے آپ کو سوویٹ جمہوریتا
کے لئے تیار کر سکتے ہیں اور تیار کرنا چاہیئے۔

میری غرض یہ ہے کہ ہم ان اشخاص کی جماعتوں کو بھی مدد دیتے ہیں
جو ہمارے خیالات پر یقین نہیں رکھتے ہیں۔ اور بعض امور میں مخالف بھی ہیں
چنانچہ سوویٹ گورنمنٹ ترکی میں کمال پاشا کی اسی لحاظ سے مدد کرتی ہے
ہم ایک لمحہ کے لئے بھی یہ فراموش نہیں کرتے کہ جس تحریک کے سردار
کمال پاشا ہیں وہ کمیونسٹ تحریک نہیں ہے۔ میرے پاس ترکی جمہوری
حکومت انگورہ کے پہلے اجلاس کی پوری رپورٹ کے لخصات ہیں۔ اس
میں کمال پاشا نے خود کہا ہے کہ خلیفہ کی ذات مقدس اور واجب الاحترام
ہے کمال پاشا کی تحریک کا یہ مقصد ہے کہ خلیفہ کی مقدس ذات کو دشمنوں
کی دسترس سے بچایا جائے۔ یہ ترکی قوم پرستوں کا نقطہ خیال ہے کیا یہ
کمیونسٹ نقطہ خیال بھی ہے؟ ہرگز نہیں! ہم عوام کے مذہبی اعتقادات کا
احترام کرتے ہیں اور عوام کو دوسری تعلیم دینا بھی جانتے ہیں، لیکن یہ خیال

سے ادا کئے حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اب ان کو یہ یقین نہ رہا۔ اگرچہ
مشرق میں مزدوری پیشہ جماعت کی تعداد جو اپنے طبقہ کی
اہمیت سے واقف ہو بہت تھوڑی تھی اور کمیونسٹ فلسفہ
مشرقی عوام کی سمجھ سے فی الحقیقت باہر تھا۔ باایں ہمہ سوویٹ روس
کی ہستی ہی ایسی شے تھی جو نظر انداز نہ کی جا سکتی تھی۔ روس میں کمیونسٹ
کی تعداد قلیل جو ان کے کہنے کے بموجب چھ لاکھ سے زیادہ نہ
تھی ستر کروڑ نفوس پر غیر محدود مطلق العنانی قایم کئے ہوئے تھی
مغربی ممالک اپنی عام تعلیم اور باضابطہ آزادی کے مستحکم روایات
پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ لیکن مشرق میں بالشویزم کے خلاف ایسا کوئی
حصن حصین نہ تھا۔ فی الواقع مشرق کی حالت بالکل روس جیسی تھی
عوام میں وہی سخت جہالت تھی اور بڑا طاقتور طبقہ وسطے ویسا ہی
معدوم تھا۔ مطلق العنانی کی روایات بھی وہی تھیں۔ بےرحم جماعت
اقل کی حکومت سے عام طور پر راضی ہو جانے کے میلان بھی موجود
تھے۔ اور آخر بات یہ ہے کہ سوویٹ شدہ ترکستان اور آذربائیجان
کی منحوس مثالیں موجود تھیں۔ مختصر یہ کہ مشرقی قوم پرستوں کو پرانی
ضرب المثل کا خیال آیا "شیطان کے ساتھ کھانا کھانے کے لئے بہت
بڑے چمچے کی ضرورت ہے"۔

ہر جگہ قصہ ایک ہی تھا۔ ایشیار کوچک میں مصطفےٰ کمال پاشا
نے بالشویکی مبلغین کو گرفتار کیا اور روسی و ترکی افواج کئی بار
متنازعہ فیہ سرحد قفقاز پر دوچار ہوگئیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ لارڈ ملنر
اور مصری قوم پرست لیڈروں کے درمیان کیسا خاطر خواہ تصفیہ

لیکن اس کے ساتھ ہی ہم کو مشرق کی مزدوری پیشہ جماعت کو نفرت
کی تعلیم دینا چاہیئے۔ اور یہ تعلیم دینا چاہیئے کہ وہ کل متمول طبقات سے
بلا خیال ذاتیات لڑنے کو آمادہ ہو جائیں۔ مشرق میں جو انقلاب رونما
ہو رہا ہے اس کی بڑی اہمیت یہ نہیں ہے کہ ہم انگریز حامیان شاہنشاہی
سے یہ درخواست کریں کہ وہ اپنا قدم اس لئے ہٹا لیں کہ متمول ترک
نہایت آسائش سے اپنے قدم جما لیں۔ نہیں! ہم سب متمول اشخاص سے
نہایت خلق کے ساتھ یہ کہیں گے کہ آپ اپنا منحوس قدم ہٹا لیجئے تاکہ
ہم میں نہ کوئی عیش پرستی رہے نہ تمرد و مباہات۔ نہ عوام کی حقارت رہے
اور نہ بیکاری۔ بلکہ دنیا پر مزدوروں کا محنت کش ہاتھ حکمران ہو جائے"

بالشویزم کی مسلمہ مہم یعنی کل مشرق کو بالشویک بنانے کی مقصد
میں باکو کی کانگرس جنگ کا پہلا گولا تھی۔ اس کے بعد سوویٹ کارروائیوں
میں ترقی ہوئی اور اچھی خاصی کامیابیاں بالخصوص قفقاز میں ہوئیں چنانچہ
۱۹۲۱ء کی بہار میں گرجستان اور ارمینیہ دونوں ملک بالشویکی ہو گئے
مگر ان کامیابیوں سے ہی سوویٹ روس کے ان قوم پرست
وظیفہ خواروں میں روز افزوں بے چینی پیدا ہونے لگی۔ مختلف مشرقی قوم پرستوں
کی جماعتوں کو جنہوں نے اتحادی سلطنتوں کے خلاف ماسکو کی امداد کا
نہایت سرگرمی سے خیر مقدم کیا تھا یہ احساس ہونے لگا کہ ان کی توقعات
حب وطن کے لئے روسی بالشویزم ایسی ہی خطرناک ثابت ہو گی جیسا کہ
مغربی شاہنشاہیت۔ بلا شبہ قوم پرست لیڈروں نے ماسکو کے
اصل مقصد کو ہمیشہ سے پہچان لیا تھا۔ لیکن انھوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ
اس نازک موقعہ پر پورے حاوی ہیں اور روسی مدد کو بلا ماسکو کی قیمت

بعض ان مشرقی قوم پرست اور قدامت پسندوں کو بالشویزم سے متفقہ خوف ونفرت پیدا ہونے لگی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اگر دیگر امور حارج نہ ہوتے تو ماسکو کی پیش قدمیاں فوراً ہی رک دی جاتیں۔ اور بالشویک کارپردازوں کا جلد استیصال ہو جاتا۔

بدقسمتی سے مشرقی قوم پرست اپنے آپ کو اشوقی اور مغربی شہنشاہیت کے سمندر کے درمیان پاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ ان دونوں سے ایک دوسرے کے خلاف کام لیں یعنی اتحادیوں کی ہر جارحانہ حرکت سے ماسکو کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور رسوویٹ لینن کی ضرب سے مغرب کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ مغرب کے مدبرین کو اس کا احساس ہو جانا چاہیئے اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بالشویزم کا سب سے اچھا کارپرداز زینو ولو نہیں ہے۔ جس نے باکو میں دھوال دھار تقریر کی بلکہ جنرل گورو ہر جو شام اور اندرون عرب کے ممالک میں اہل سینیگال کی فوج کے ساتھ "زبردست تدبیروں" سے کام لے رہا ہے۔

بلاشبہ اگر بالشویزم مشرق میں کسی بڑے پیمانہ پر رائج ہو گیا تو خود مشرق اور کل دنیا کی بڑی بدنصیبی ہوگی۔ اگر مغرب میں بالشویزم کی فتح سے بربریت مراد ہے تو مشرق میں اس سے قطعاً سبعیت قائم ہو جائے گی۔ اگر مشرق کے جاہل اور وحشی عوام اپنے قدیم مذہبی اور رسمی قیود سے دفعتاً آزاد ہو جائینگے اور معاشرتی انقلاب کے سیلاب میں چھوٹے طبقات اعلیٰ و وسطے غرق ہو جائینگے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ کل مشرقی تہذیب و تمدن برباد

محض اسی وجہ سے جلد ہو گیا کہ مصری قوم پرستوں کو مشرقی انقلاب کی
فتنہ انگیزوں کا ڈر لگا ہوا تھا جو فلاحین کو مشتعل کر رہے تھے۔ سر ولنٹائن چیرول[1]
نے ۱۹۱۸ء کی بہار میں یہ محسوس کیا کہ ہندوستان میں ہندوستانی رائے عامہ
پر روس کی سلطنت کی تباہی اور بالشویکی اثر کے فتح نے اچھا اثر ڈالا۔ وہ
لکھتے ہیں کہ بافکر ہندوستانیوں نے یہ دیکھ لیا کہ جب کل حکومت کے
اجزا تیزی سے منتشر ہو گئے تو روسی روشن خیال طبقہ (جو ہندوستانی
روشن خیال طبقہ کے مقابلہ میں کثیر التعداد اور قدیم الایام تھا) جاہل عوام
پر قابو رکھنے میں کیسے بے بس ثابت ہوئے[2] افغانستان میں بھی امیر کو
بھی اپنے بالشویکی حلیفوں سے محبت کم ہونے لگی۔ سوویٹ شدہ ترکستان
سے جو پناہ گزینوں کا سیلاب ان کی سرحد میں آیا اور ان میں ان کے
رشتہ دار امیر بخارا بھی تھے تو امان اللہ خاں کو بہت فکر ہوئی۔ اسی زمانہ
میں روسی سرحد پر افغان فوج میں بغاوت ہوئی۔ اور باغیوں نے یہ
مطالبہ کیا کہ روسی نمونہ پر ان کو سپاہیوں کی مجلس شوریٰ قایم کرنے کا
حق دیا جائے۔ بالشویک کارپردازوں نے ہندوستان کو لوٹ کا لالچ
دلایا لیکن امیر کو یہ نظر آتا تھا کہ ہندوستانی لوٹ کس کام آئے گی۔ جبکہ
ان کی اپنی باغی رعایا انھیں لوٹ کر مار ڈالے گی۔ اس طرح امتداد زمانہ کے

---

[1] سر ولنٹائن چیرول کا مضمون "گرفتار آلام ہندوستان" جو جولائی ۱۹۱۸ء کو ایڈنبرا ریویو میں شایع ہوا
نیز ملاحظہ ہو ہزہائی نس آغا خاں کی کتاب "ہندوستان بحالت نقل و حرکت" صفحہ ۱۰ مطبوعہ لندن
۱۹۱۸ء مصنف

[2] اقبال علی شاہ مذکور الصدر (مصنف)

مشرق ادنےٰ و وسطیٰ پر ہمارا تبصرہ ختم ہو گیا۔ اس تبصرہ کی نمایاں صورت کیا ہے؟ انقلاب! بالآخر غیر متحرک مشرق متحرک اور کامل طور پر متحرک ہو گیا۔ آج مشرق کامل انقلاب، سیلان اور ہیجان کی حالت میں ہے اور یہ انقلاب، سیلان اور ہیجان جس قدر فوری اور عمیق ہے اس قدر پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ دنیائے اسلام ایک ہزار سال تک جمود اور سکون کی حالت میں رہ کر اب پھر ایک مرتبہ سرگرم تگاپو نظر آتی ہے۔

منزل مقصود؟ ہم بالکل نہیں جانتے۔ کون ہے جو اس عظیم ہیجان، اس سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، مذہبی اور اس سے بہت زیادہ پہلوؤں کو لئے ہوئے ہیجان کے نتائج کی پیشینگوئی کرنے کی جرات کر سکے؟ ہم اپنی عقل کی بساط کے موافق جرات کر کے جو کچھ کر سکتے ہیں وہ صرف اسی قدر ہے کہ اس عظیم تغیر کے مختلف عناصر کی تحقیق اور تحلیل کریں۔

لیکن یقیناً یہ بھی بہت زیادہ ہے۔ اس عظیم تغیر پر جو سرگرم عجلت ایک نظر خواہ سرسری ہی کیوں نہ ہو ڈالنا اور اس کے بے شمار پہلوؤں کو کسی قسم کے سلسلہ میں مربوط کرنا اور اس الجھی ہوئی گتھی میں صحیح سر رشتہ میلان کا پتہ لگانا ہی آئندہ ترقیات کا جو یکے بعد دیگرے پیش آنیوالے ہیں کم از کم عارضی علم اور ان کی اہمیت

ہوگیا۔ اور مشرق طوائف الملوکی کے غار میں ایسا گرا کہ وہ پشتہا پشت
تو کیا صدیوں کے بعد نکل سکے گا۔

کا اندازہ کرنے کی قابلیت حاصل کرنا ہے۔

پرانا مقولہ ہے کہ کسی شے کا علم ہی اس کا ادراک ہے اور میں اس پر یہ مستزاد کرتا ہوں کہ امید قائم کرنا بھی ہے۔ لہذا ان حالات کے علم سے یہ امید ہوتی ہے کہ موجودہ تکلیف جو عظیم ہونے کے ساتھ ہی مبہم بھی ہے اس نوزائیدہ مشرق کی دردِ زہ ہی ثابت ہوگی جو نئی دنیا میں عنقریب اپنا مقام اور وقار حاصل کرنے والا ہے۔